

پاک سوسائٹی

WWW.PAKSOCIETY.COM





- 158 سیاہ کاشیہ صائمہ اکرم
70 ستہر خواب نازیہ کنول

- 10 رضیہ جمیل پہلی شعاع
11 برگ یوسفی حمد
11 مولانا محمد علی جوہر نعت
12 ادارہ نئی کی باتیں



- 58 کمینہ نور علی کام کی چیز
62 ایمیل رضا سارہستی
94 زینت زونی حبابا ان حبابا
154 نیر کاشف خیابانی



- 24 سمیرا حمید روبرو
17 عادل مراد بندھن
32 شاہین رشید دستک
35 ادارہ شعاع کے ساتھ



- 264 داغ دہلوی غزل
263 ادا جعفری نظم
263 عطاء الحق قاسمی غزل
264 سحر انصاری غزل



- 38 رخسانہ نگار عدنان ایک تھی مشال



- 184 آسیہ زاتی پہلی بار
98 نگہت سیما خواب تھا کوئی
232 زرین آرزو مسکراتی ہے زندگی

تر سالانہ بیک لیتھریجسٹری

پاکستان (سالانہ) --- 700 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ --- 5000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا --- روپے

انتباہ: ماہنامہ شعاع ڈائجسٹ کے جملہ حقوق محفوظ ہیں، پبلشر کی تحریری اجازت کے بغیر اس رسالے کی کسی بھی کہانی، ناول، یا سلسلہ کو کسی بھی انداز سے نہ تو شائع کیا جاسکتا ہے، نہ کسی بھی ٹی وی چینل پر ڈرامہ، ڈرامائی ٹھیکیل اور سلسلہ وار قسط کے طور پر یا کسی بھی شکل میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ خلاف ورزی کرنے کی صورت میں قانونی کارروائی عمل میں لائی جاسکتی ہے۔



رکن آل پاکستان نیوز پیپر سوسائٹی
رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز
MEMBER
APNS
CPNE

270	خالہ جیلانی	کھٹا کسی پتہ	272	رضیہ جمیل	خط آپ کے
286	خالہ جیلانی	موسم کے پیکوان	265	ادارہ	مُسکراہٹیں
290	ادارہ	خوبصورت بننے	280	واصفہ آہیل	آئینہ خالے میں
			267	شگفتہ جاہ	بالوں سے خوشبو لے
			288	امت الصور	تاریخ کے جھروکے
			282	سائرہ رضا	اردو ہے جس کا نام

اپریل 2015
جلد 29 نمبر 8
قیمت 60 روپے

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ شعاع، 37 - اردو بازار، کراچی۔
رضیہ جمیل فلوئین حصن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا - مقام: ۲۰ بی پی اے لری سی پریچ ایس سوسائٹی، کراچی
Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 0092-21-32766872
Email: shuaa@khawateendigest.com website: www.khawateendigest.com



شجاع کا اپریل کا شمار آپ کے ہاتھوں میں ہے۔
یہ کائنات اللہ تعالیٰ کے کچھ متعین کردہ قوانین کے تحت چل رہی ہے۔ انسان اس کائنات کا مرکز و محور ہے۔ جب انسان اپنی زندگی قوانین قدرت کے مطابق ڈھال لیتا ہے تو دونوں جہاں میں اس کے لیے کامیابی اور کامرانی کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ قدرت کے متعین اصولوں سے انخواف تباہی و بربادی ہے۔ غلط راستوں پر چل کر وقتی کامیابی ضرور حاصل کی جاسکتی ہے، لیکن غلط راستوں کا انتخاب کرنے والے بالآخر ناکام ہی ٹھہرتے ہیں۔ کیونکہ قدرت کا ایک قانون مکافات عمل بھی ہے۔ ظلم، جبر، زیادتی کرنے والے بچ نہیں سکتے۔ انہیں جلد یا بدیر سزا ضرور ملتی ہے۔

زندگی میں راست سوچ اور درست عمل ہی کامیابی کی ضمانت ہے۔ صحیح سمت کا شعور سب سے بڑی دانائی ہے۔ رہنمائی بھی انہیں ہی ملتی ہے جو ذوقِ سفر رکھتے ہیں۔ اور کامیاب وہی ہوتے ہیں جو جستجو کرتے ہیں۔

سیاہ حاشیہ،

صائمہ اکرم کا نام تاریں کے لیے نیا نہیں ہے۔ انہوں نے بے شمار افسانے، ناولٹ اور ناول لکھے ہیں۔ صائمہ کی تحریروں کی نمایاں خوبی کہانی کا بہاؤ ہے۔ ان کے کردار ہمیشہ فیصلہ کن اور دو ٹوک رویہ اختیار کرتے ہیں جس کی بنا پر کہانی تیزی سے آگے بڑھتی ہے اور قاری کی توجہ بھٹکنے نہیں پاتی۔
”دیمک زدہ محبت کے بعد وہ آپ کے لیے سیاہ حاشیہ لے کر آئی ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ ان کی دیگر تحریروں کی طرح یہ ناول بھی آپ کو پسند آئے گا۔“

اس شمارے میں،

، آسیہ رزاقی کا مکمل ناول۔ پہلی بار،
، نگہیت سیما کا مکمل ناول۔ خواب تھا کوئی،
، زہین آرزو کا مکمل ناول۔ زندگی پھر مسکرائی،
، صائمہ اکرم اور نازیہ کنول نازی کے ناولٹ،
، کینز نور علی، ایل رضا، زینت زونی اور شیر کاشف کے افسانے،
، عادل مراد اور مریم مراد کا بندھن،
، سمیرا حمید آپ کے سوالات کے ساتھ۔ روبرو،
، معروف شخصیات سے گفتگو کا سلسلہ۔ دستک،
، پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں۔ احادیث نبویؐ کا سلسلہ،
، خط آپ کے اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔
شجاع پڑھ کر اپنی رائے سے ضرور نوازیے گا۔ ہم آپ کی رائے کے منتظر ہیں۔



اک لفظ کن ہی باعث نقش و نگار ہے
یارب تو کائنات کا پروردگار ہے

یہ عرش و فرش لوح و قلم، مہر و ماہ و نجم
ہر شے پہ یا کریم تجھے اختیار ہے

معبود ہے تو ہی یہاں مسجود ہے تو ہی
ہر چیز تیرے سامنے سجدہ گزار ہے

میرے مقدرات کی تحریر کو بدل
بندہ نوازیوں کا تیری انتظار ہے

تو ہے غفور، تو ہی رحیم و کریم بھی
بندوں کے حال پر کرم بے شمار ہے

اے برگ اس کی کون ثنا کر سکے یہاں
یہ حمد شاعری کا میری شاہکار ہے

برگ یوسفی

تنہائی کے سب دن ہیں، تنہائی کی سب راتیں
اب ہونے لگیں اُن سے خلوت میں ملاقاتیں

ہر لحظہ تشفی، ہر آن تسلی ہے!
ہر وقت ہے دل جوئی، ہر دم ہیں ملاقاتیں

کوثر کے تعلقے ہیں، تسنیم کے وعدے ہیں
ہر روز یہی چرچے، ہر رات یہی باتیں

معراج کی سی حاصل، سجدوں میں ہے کیفیت
اک فاسق و فاجر میں اور ایسی کراماتیں

بے مایہ سہی لیکن شاید وہ بلا بھیجیں
بھیجی ہے درودوں کی کچھ ہم نے بھی سوغاتیں

مولانا محمد علی جوہر



دنیا میں تکلیف

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”جب اللہ تعالیٰ اپنے بندے کے ساتھ بھلائی کا ارادہ فرماتا ہے تو اسے (اس کے گناہوں کی) سزا جلد ہی دنیا میں دے دیتا ہے (یعنی تکلیفوں اور آزمائشوں کے ذریعے سے اس کے گناہوں کی معافی کا سامان پیدا کر دیتا ہے) اور جب اپنے بندے کے ساتھ برائی کا ارادہ کرتا ہے تو اس سے اس کے گناہ کی سزا (دنیا میں) روک لیتا ہے یہاں تک کہ قیامت والے دن اس کو پوری سزا دے گا۔“

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مزید فرمایا۔

”بدلے میں بڑائی آزمائش میں بڑائی کے ساتھ ہے (یعنی آزمائش جتنی عظیم ہوگی بدلہ بھی اسی قدر عظیم ہوگا)۔ اور اللہ تعالیٰ جب کسی قوم کو پسند فرماتا ہے تو اس کو آزمائش سے دوچار فرما دیتا ہے چنانچہ جو (اس سے) راضی ہوتا ہے اس کے لیے (اللہ کی) رضا ہے اور جو (اس کی وجہ سے اللہ سے) ناراض ہوتا ہے اس کے لیے (اللہ کی) ناراضی ہے۔“

(اسے ترمذی نے روایت کیا اور کہا ہے: اس کی سند

حسن ہے۔)

فوائد و مسائل :

1 - اس سے معلوم ہوا کہ آزمائشیں بھی اس دنیا میں مومن کے لیے ایک نعمت ہیں جن سے بقدر آزمائش اس کے گناہ معاف ہوتے اور عند اللہ اجر و ثواب میں اضافہ ہوتا ہے اس لیے ہر آزمائش اور

تکلیف میں صبر و رضا ضروری ہے کیونکہ اس کے بغیر یہ شرف و فضیلت حاصل نہیں ہو سکتی بلکہ بے صبری سے گناہوں میں مزید اضافہ ہوگا۔

2 - خیر اور شر کا خالق حقیقی اللہ تعالیٰ ہے لیکن اہل اللہ کا شیوہ یہ ہے کہ وہ ہر خیر کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کرتے ہیں اور شر کی نسبت اپنی جانب کرتے ہیں جیسا کہ آدم علیہ السلام سے رسول اکرم صلی اللہ

علیہ وسلم تک انبیاء کی منقول دعاؤں سے ظاہر ہوتا ہے۔ پھر شر انسانوں کے لحاظ سے ہوتا ہے نہ کہ اللہ تعالیٰ کے اعتبار سے کیونکہ اس کا کوئی امر حکمت اور خیر سے خالی نہیں ہوتا اور پھر ہم اس بات کا بھی مشاہدہ کرتے ہیں کہ ایک کام ایک آدمی کے حق میں شر ہوتا ہے اور دوسرے کے حق میں خیر۔

3 - حدیث میں مذکور جملے ”جب اللہ کسی بندے سے برائی کا ارادہ کرتا ہے“ کا مطلب یہ ہے کہ اس کے گناہوں کی وجہ سے بڑی آزمائش میں ڈالنا چاہتا ہے اور اسے خیر سے محروم کرنا چاہتا ہے۔

صبر

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔

حضرت ابو طلحہ رضی اللہ عنہ کا ایک لڑکا بیمار تھا۔

ابو طلحہ (جب کام کاج کے لیے) باہر چلے گئے تو لڑکا فوت ہو گیا۔ جب واپس آئے تو پوچھا۔

”میرے بیٹے کا کیا حال ہے؟“

تو ام سلیم نے کہا اور وہ بچے کی ماں تھیں۔

”وہ پہلے سے کہیں زیادہ سکون میں ہے۔“

چنانچہ بیوی نے ان کے سامنے رات کا کھانا رکھا جو انہوں نے تناول کیا، پھر بیوی سے قربت کی۔ جب ابو طلحہ فارغ ہو گئے تو بیوی نے بتلایا کہ (بچہ تو فوت ہو گیا ہے) اب اسے دفنا دو!

چنانچہ جب انہوں نے صبح کی تو ابو طلحہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور یہ سارا ماجرا بیان کیا۔ آپ نے پوچھا۔ ”کیا تم نے رات کو قربت کی تھی؟“ انہوں نے جواب دیا ”ہاں!“ آپ نے دعا فرمائی۔

”اے اللہ! ان دونوں کے لیے برکت عطا فرما۔“ چنانچہ (اس دعا کے نتیجے میں مدت مقررہ کے بعد) ان کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا۔ (حضرت انس فرماتے ہیں کہ) مجھ سے ابو طلحہ نے کہا (ابو طلحہ حضرت انس کی والدہ ام سلیم کے دوسرے خاوند یعنی حضرت

انس کے سوتیلے باپ تھے۔ ان کے پہلے خاوند مالک بن نضر تھے جو اسلام لانے کی بجائے شام چلے گئے تھے۔ اور وہیں فوت ہو گئے۔ ان کی والدہ نے اس کے بعد ابو طلحہ سے نکاح کر لیا۔) ”اس بچے کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے جاؤ“ اور کچھ کھجوریں بھی ساتھ دے دیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا ”کیا اس کے ساتھ کوئی چیز ہے؟“

انہوں نے کہا: ہاں، کچھ کھجوریں ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ کھجوریں لے لیں اور ان کو منہ میں چبایا، پھر وہ اپنے منہ سے نکال کر بچے کے منہ میں ڈال دیں اور (وہ) اسے گھٹی دی اور اس کا نام عبد اللہ رکھا۔ (بخاری و مسلم)

اور بخاری کی ایک روایت میں ہے کہ ابن عمنہ نے کہا ”انصار کے ایک آدمی نے انہیں بتایا کہ میں نے (اس) پیدا ہونے والے (لڑکے) عبد اللہ کی اولاد سے نو لڑکے دیکھے، سب کے سب قرآن کے قاری تھے۔“

اور مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ ابو طلحہ رضی اللہ عنہ کا ایک بیٹا جو ام سلیم کے بطن سے تھا فوت ہو گیا۔ تو ام سلیم نے اپنے گھر والوں سے کہا۔

”تم ابو طلحہ کو ان کے بیٹے کے بارے میں مت بتلانا، میں خود ہی ان کو یہ بات بتلاؤں گی۔“

چنانچہ ابو طلحہ آئے تو ام سلیم نے رات کا کھانا ان کے سامنے رکھا۔ انہوں نے کھایا پیا۔ پھر پہلے سے کہیں زیادہ بن سنور کے ان کے پاس آئیں۔ قربت کی پھر کہا۔

”اے ابو طلحہ رضی اللہ عنہ! ذرا بتلاؤ کہ اگر کچھ لوگ کسی گھر والوں کو کوئی چیز عاریتاً (عارضی طور پر) دیں، پھر وہ اپنی عاریت کے طور پر دی ہوئی چیز واپس مانگیں تو کیا ان کے لیے جائز ہے کہ وہ دینے سے انکار کر دیں؟“

ابو طلحہ رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: نہیں۔“ چنانچہ ام سلیم نے کہا۔ ”تم اپنے بیٹے کے بارے میں اللہ سے تواب کی امید رکھو۔“

(یعنی تمہارا بیٹا بھی جو اللہ ہی کی دی ہوئی امانت تھی اس نے اسے واپس لے لیا ہے۔) یہ سن کر وہ غضب ناک ہوئے اور فرمایا۔

(جب میں گھر آیا تو کچھ بتلائے بغیر) تو نے مجھے یوں ہی چھوڑے رکھا کھانے پینے اور قربت کے بعد تو نے مجھے میرے بیٹے کی (وفات کی) خبر دی؟ (اس کے بعد) وہ گئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور جو کچھ ہوا وہ بیان کیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سن کر دعا فرمائی۔ ”اللہ تعالیٰ تم دونوں کے لیے تمہاری اس رات میں برکت عطا فرمائے۔“

چنانچہ ام سلیم کو حمل قرار پایا۔

(راوی حدیث) حضرت انس نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک سفر میں تھے حضرت ام سلیم بھی (اپنے خاوند ابو طلحہ کے ہمراہ)

آپ کے ساتھ تھیں۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ معمول تھا کہ جب (سفر سے) مدینہ واپس تشریف لاتے تو رات کو تشریف نہ لاتے۔

جب یہ قافلہ مدینے کے قریب پہنچا تو ام سلیم کو درد زہ (زچگی کے عین وقت جو درد ہوتا ہے) شروع ہو گیا۔ چنانچہ ابو طلحہ ان کی خدمت کے لیے رک گئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا سفر جاری رکھا۔

حضرت انس نے کہا: ”ابو طلحہ کہتے تھے: ”اے رب! تو جانتا ہے کہ مجھے یہی پسند ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینے سے باہر جائیں تو میں بھی آپ کے ساتھ جاؤں اور جب آپ مدینے میں داخل ہوں تو میں بھی آپ کے ساتھ ہی داخل ہوں۔ اور تو دیکھ رہا ہے کہ میں رک گیا ہوں“ (جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آگے تشریف لے گئے ہیں۔)

ام سلیم نے (یہ سن کر) کہا: ”ابو طلحہ! اب مجھے وہ درد محسوس نہیں ہو رہا جو پہلے مجھے ہو رہا تھا“ اس لیے چلو۔“

چنانچہ ہم وہاں سے چل پڑے۔ جب وہ دونوں مدینہ پہنچ گئے تو انہیں پھر درد زہ شروع ہو گیا (جو پہلے ابو طلحہ کی دعا سے وقتی طور پر ختم ہو گیا تھا۔) چنانچہ ان کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا، تو میری والدہ (ام سلیم) نے مجھے کہا۔

”اس کو اس وقت تک کوئی دودھ نہ پلائے جب تک تم صبح صبح اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش نہیں کر دیتے۔“

چنانچہ صبح ہوتے ہی میں اسے اٹھا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے گیا۔ آگے باقی حدیث بیان کی (جو پہلے گزر چکی ہے)۔ (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل : 1 - اس حدیث سے ہمیں معاشرتی زندگی کے لیے بہت سی ہدایات ملتی ہیں، مثلاً ”ایک صابرو شا کر عورت کا کردار۔ کہ بچہ فوت ہو گیا لیکن کوئی جزء فزع، واولا، بین اور نوحہ و ماتم

نہیں کیا، حتیٰ کہ خاوند جب گھر آتا ہے تو پہلے ایک خدمت گزار بیوی کی طرح خاوند کی تمام ضروریات کا اہتمام کرتی ہیں اور اس کے بعد خاوند کو نہایت اچھوتے انداز سے بچے کی وفات کی اطلاع دیتی ہیں۔ جس سے یہ سبق ملتا ہے کہ خاوند کی خدمت اور اسے آرام و سکون پہنچانا ایک مسلمان عورت کا اولین فرض ہے۔

2 - گھر میں خاوند کے لیے بناؤ سنگھار اور زیب و زینت کا اہتمام کرنا مستحسن ہے۔

3 - ولادت کے بعد بچے کو کسی نیک آدمی کے پاس لے جا کر اس سے تعنیک کروانا (گھٹی دلوانا) جائز ہے۔

4 - مصیبت میں جو اللہ کے فیصلے پر راضی رہتا ہے، اللہ تعالیٰ اسے بہترین بدلہ عطا فرماتا ہے۔

5 - مجاہدین کے ساتھ، خواتین بھی جہاد میں شریک ہو سکتی ہیں اور اپنی حدود میں رہ کر مجاہدین کی جو خدمت وہ بجالا سکتی ہیں، بجالائیں، مثلاً ”زخمیوں کی

مرہم پٹی، بیماروں کی تیمارداری، پانی روٹی وغیرہ کا انتظام۔

6 - ایسا تعریض و کنایہ (توریہ) جائز ہے جس سے دوسرا شخص مغالطے میں پڑ جائے، تاہم وہ جھوٹ نہ ہو۔

7 - میت گھر میں موجود ہو تو کھانا وغیرہ پکایا اور کھایا جاسکتا ہے، البتہ مستحسن یہ ہے کہ ہمسائے یا کوئی اور عزیز میت کے گھر والوں کے لیے کھانے کا بندوبست کریں۔

8 - اہل علم کو چاہیے کہ اگر کوئی شخص ان کے سامنے اپنا مسئلہ بیان کرے یا وہ کسی آدمی کو کسی مسئلے میں پریشان دیکھیں یا کسی کی کوئی اچھی بات ان کے سامنے آئے تو ان کے لیے دعا کریں۔

9 - کسی کام کے جائز یا ناجائز ہونے میں شک ہو تو اہل علم سے دریافت کر لینا چاہیے۔

طاقت ور

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”طاقت ور وہ نہیں ہے جو پچھاڑ دے“ اصل طاقت ور (پهلوان) وہ ہے جو غصے کے وقت اپنے نفس پر قابو رکھے۔ (بخاری و مسلم)

فائدہ : اس میں اس امر کی ترغیب ہے کہ غصے میں انسان کو بے قابو نہیں ہونا چاہیے بلکہ غصے کو ضبط کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

غصہ

حضرت سلیمان بن صرد رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا اور دو آدمی ایک دوسرے سے گالی گلوچ کر رہے تھے ان میں سے ایک کا چہرہ (مارے غصے کے) سرخ ہو گیا اور اس کی رگیں پھول گئیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (اسے دیکھ کر) فرمایا۔

”ترجمہ : میں ایک کلمہ جانتا ہوں اگر یہ اسے پڑھ لے تو اس کا غصہ دور ہو جائے۔ اگر یہ شخص کہے ”اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم۔“

”میں شیطان مردود سے اللہ کی پناہ میں آتا ہوں۔“ تو اس کا جوش و غضب ختم ہو جائے گا۔ لوگوں نے اس سے کہا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔ ”شیطان مردود سے اللہ کی پناہ طلب کرو۔“ (بخاری و مسلم)

فائدہ : غصے کے وقت یہ شعوری احساس کہ یہ غصہ شیطانی و سوسہ ہے مجھے شیطان سے اللہ کی پناہ طلب کرنی چاہیے، یقیناً ”غصے کے ازالے کے لیے بہترین نسخہ ہے۔“ کاش کہ! مغلوب الغضب قسم کے لوگ اس نسخے پر عمل کر کے دیکھیں۔

غصہ پینے والا

حضرت معاذ بن اس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”جو شخص غصے کو پی جائے جب کہ وہ اسے نافذ کرنے پر قادر بھی ہو اللہ تعالیٰ قیامت والے دن اسے تمام مخلوقات کے سامنے بلائے گا اور اس سے کہے گا کہ وہ جس حور عین کو چاہے اپنے لیے پسند کر لے۔“ (اسے ابو داؤد اور ترمذی رحمۃ اللہ نے روایت کیا ہے۔ اور امام ترمذی نے کہا: یہ حدیث حسن ہے۔)

فوائد و مسائل : حور حوراء کی جمع ہے نہایت سفید رنگ کی خوب صورت عورت۔ عین عیناء کی جمع ہے، مولی آنکھوں والی۔ مراد دونوں سے خوب صورت ترین عورت ہے جو مومنوں کو جنت میں ملے گی۔

2۔ اس میں اس شخص کی فضیلت اور ضبط نفس اور اجر و ثواب بیان کیا گیا ہے جو قدرت و طاقت اور وسائل سے بہرہ ور ہونے کے باوجود، شخص اللہ کا حکم سمجھ کر غصے کو پی جاتا ہے اور غصے سے بے قابو ہو کر اپنی طاقت کا مظاہرہ نہیں کرتا۔

وصیت

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی۔

”مجھے وصیت فرمائیے!“ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”غصہ نہ کیا کرو۔“ اس نے کئی مرتبہ اپنی درخواست دہرائی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے (ہر مرتبہ) اسے یہی وصیت کی: ”غصہ مت کیا کرو!“ (بخاری)

فوائد و مسائل : 1۔ غصہ جو مذموم ہے اور جس سے روکا گیا ہے یہ وہ غصہ ہے جو دنیاوی معاملات میں ہو۔ لیکن جو غصہ اللہ اور اس کے دین کے لیے ہو، یعنی اللہ کی حرمتیں پامال کرنے پر انسان کو غصہ آئے تو یہ غصہ محمود و مطلوب ہے۔

2۔ جس کے مزاج میں تیزی اور غصہ ہو اسے بار بار غصہ نہ کرنے کی تلقین کی جائے تاکہ اسے اپنی اس

کنزوری کا احساس ہو اور وہ اس سے بچنے کی کوشش کرے۔

3 - غصے سے شیطانی مقاصد کی تکمیل ہوتی ہے، اس لیے یہ بہت ہی بری چیز ہے، اسی لیے اس موقع پر شیطان سے پناہ مانگنے کی ہدایت کی گئی ہے۔

4 - عالم دین اور مہربانی کو مزاج شناس ہونا چاہیے، تاکہ وہ لوگوں کو ان کی طبیعت اور مزاج کے مطابق وعظ و نصیحت کر سکے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ خوبی تھی کہ آپ ہر سائل کو اس کے حالات اور طبیعت کے مطابق نصیحت فرماتے۔

5 - بزرگوں سے ملنے اور ان سے نصیحت کی درخواست کرنے سے انسان کی اصلاح ہوتی ہے اور انسان کو اپنی کنزوریوں کا بھی علم ہوتا ہے۔ دورِ حاضر کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ جس کو دین کی چند باتیں معلوم ہو جائیں، وہ اپنے آپ کو علما سے بے نیاز سمجھ بیٹھتا ہے، حالانکہ اصلاحِ نفس اور حصولِ تقویٰ کی سرپرستی ضروری ہے۔

آزمائشیں

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
”مومن مرد اور مومن عورت پر اس کی جان، اولاد اور مال میں آزمائشیں آتی رہتی ہیں (جن سے ان کے گناہ معاف ہوتے رہتے ہیں) یہاں تک کہ جب وہ اللہ کو ملتے ہیں (ان کو موت آتی ہے) تو ان پر کوئی گناہ نہیں ہوتا۔“

(اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے: اس کی

سند حسن صحیح ہے۔)

فائدہ : اس سے معلوم ہوا کہ مومن بظہورِ خاص، آزمائشوں کا ہدف رہتا ہے اور اس میں اس کے لیے بھلائی کا پہلو یہ ہے کہ ان سے اس کے گناہ معاف ہوتے رہتے ہیں، بشرطیکہ وہ صبر کا دامن پکڑے رکھے اور ایمان پر مضبوطی سے قائم رہے۔

عہدہ نہ ملنے پر صبر

حضرت ابو یحییٰ اسید بن حفص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک انصاری آدمی نے کہا۔

”اے اللہ کے رسول! کیا آپ مجھے عامل نہیں بناتے (کسی سرکاری کام پر مقرر نہیں فرماتے) جس طرح فلاں شخص کو آپ نے عامل بنایا ہے؟“
آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”بلاشبہ تم میرے بعد اس صورت حال سے دوچار ہو گے کہ دوسروں کو ترجیح دی جائے گی۔ چنانچہ تم صبر کرنا، یہاں تک کہ مجھے (قیامت والے دن) حوض پر بلو۔“ (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل : 1 - نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو پیش گوئی فرمائی تھی، وہ پوری ہو گئی، جو کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ اور آپ کی صداقت کی دلیل ہے۔

2 - حوض، وہ حوض کوثر ہے جو آپ کو جنت میں یا میدانِ محشر میں عطا کیا جائے گا، جہاں آپ اپنے دست مبارک سے اپنے قمع اور موحد مسلمان کو شرابِ طہور کے جام پلائیں گے، جس سے پینے والا پھر کبھی پیاسا نہ ہوگا۔

3 - عہدوں کی طلب اچھی بات نہیں ہے۔ ایسے طلب گارانِ عہدہ و منصب کو عہدے دینے سے روکا گیا ہے، البتہ صرف اس صورت میں عہدہ طلب کرنا جائز ہے کہ جب کوئی شخص اپنے کو اس کا اہل تر سمجھے اور کوئی دوسرا اس جیسا سمجھے دارِ معاملہ فہم اور صاحبِ زہد و تقویٰ نہ ہو جیسا کہ یوسف علیہ السلام نے کیا تھا۔



سرورق کی شخصیت

ماڈل ----- نیلیم منیر
میک اپ ----- روز بیوٹی پارلر
فوٹو گرافر ----- موسیٰ رضا

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو پیسے کمانے کے لئے شریک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو مائیل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو
- ✧ ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✧ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

عادل مراد ہمارے مراد

شاہین رشید

بندھن کے سلسلے میں آج ہم وحید مراد کے صاحب زادے عادل مراد سے آپ کی ملاقات کروا رہے ہیں۔ سینئر فنکار ہوں یا ان کی اولاد؟ دو باتیں مشترکہ ہوتی ہیں۔ گفتگو میں نرمی اور شائستگی اور وقت کی پابندی اور یہ چیزیں ہم نے آج کے فنکاروں میں نہیں دیکھیں۔ انٹرویو اس طرح دیتے ہیں۔ گویا ہم پر احسان کر رہے ہوں ابھی نہیں۔ آدھے گھنٹے بعد۔ آدھے گھنٹے بعد کہیں گے ارے ابھی تو مصروف ہیں۔ مزید ایک گھنٹے بعد کریں۔ پھر وہ وقت بھی آجاتا ہے تو۔ ”چلیں کل کر لیں“ یا پھر فون ہی نہیں اٹھاتے۔ خیر۔

”کیسے مزاج ہیں عادل مراد صاحب! آپ کے؟“

”جی اللہ کا شکر ہے۔“

”ڈراموں میں تو آپ کو دیکھتے ہی رہتے ہیں آج کچھ فیملی انٹرویو ہو جائے کیا خیال ہے آپ کا؟“

”بالکل بالکل۔ ضرور کریں۔“

”تو بتائیے کہ شادی کو کتنا عرصہ ہو گیا۔ اور بچے کتنے ہیں اور زندگی کیسی گزر رہی ہے؟“

”جی 27 دسمبر 2004ء میں ہماری شادی ہوئی اور ماشاء اللہ سے دو بیٹے ہیں ہمارے بڑے کا نام ایان ہے جو آٹھ سال کا ہے اور چھوٹا ارمان سات سال کا ہے۔“

”یہ بتائیے کہ مریم صاحبہ سے کہاں ملاقات ہوئی اور لومینج ہے آپ کی یا ارنج؟“

”یہ باتیں تو آپ مریم سے پوچھیں۔ ویسے ہماری ارنج میسج ہے اور یہ میری امی کی پسند ہیں۔ کوئی ریلیشن بھی نہیں ہے۔ بس یہ تو اتفاق تھا کہ مریم کو دیکھا۔ فیملی میں بات ہوئی اور پھر رشتہ بھیجا اور بس میں

نے انہیں لاہور میں ایک دعوت میں دیکھا تھا۔“

”میرا یہ ماننا ہے کہ پہلے انسان چیز کی پیکنگ دیکھتا ہے اور گھر لا کر جب پیکنگ کھلتی ہے تو پھر پتا چلتا ہے کہ اندر کیا ہے تو جب مریم آگئیں تو کیسا پایا؟“

”تمہارے بہت زیادہ مختلف نہیں پایا، لیکن جب انسان ایک دوسرے کے قریب رہتا ہے تو پھر کھل کر سامنے بھی آتا ہے اور اچھائیاں برائیاں بھی سامنے آجاتی ہیں اور میں نے مریم میں اچھائیاں زیادہ دیکھی ہیں۔“

”سسرال کا کنبہ کتنا بڑا ہے۔ سالیاں کتنی ہیں؟ اور بیگم ہاؤس وائف ہیں؟“

”ماشاء اللہ تقریباً 9 سالیاں ہیں۔ اور میرے سسرال والے لاہور میں رہتے ہیں اور ہم کراچی میں رہتے ہیں بیگم ہماری بیٹکر ہیں۔“

”مزاج کی کیسی ہیں؟ لڑائی جھگڑا کرتی ہیں؟“

”مزاج کی تیز ہیں بہت لڑائی جھگڑا کرتی ہیں اور گھر میدان جنگ کا نقشہ پیش کرتا ہے۔ ملک کی طرح ہم بھی حالت جنگ میں رہتے ہیں۔ میں مذاق کر رہا ہوں اسے آپ سچ نہ سمجھ لیجئے گا۔ ویسے یہ ہے کہ جب ایک بولتا ہے تو دوسرا خاموش رہتا ہے تاکہ بات آگے نہ بڑھے۔“

”یقیناً“ آپ مذاق کر رہے ہوں گے ورنہ دس سال نہ گزرتے خیر فضول خرچ ہیں؟“

”نہیں۔ اس معاملے میں تو وہ قابل تعریف ہے کہ بالکل بھی فضول خرچ نہیں ہے۔ گھر کو سنبھالنا چیزوں کو قرینے سے رکھنا کوئی فضول خرچی نہ کرنا اس کی خوبیوں میں شامل ہے۔“

”اپنی کمائی اپنے تک محدود رکھتی ہیں یا ہاتھ بٹاتی

ہیں؟ اور بیوی کو کمانا چاہیے کہ نہیں؟“
 ”اللہ کا شکر ہے کہ ضرورت ہی نہیں پڑتی اور ضرور کمانا چاہیے۔ اس کا ٹیلنٹ اور پڑھائی ضائع نہیں ہونی چاہیے۔“

”آپ بھی کام کرتے ہیں، بیگم بھی دونوں ہی صبح نکل جاتے ہوں گے تو گھر کو مہینج کون کرتا ہے؟ کیا جوائنٹ فیملی ہے؟“
 ”جوائنٹ فیملی کیا ہوگی، بس میری مدد ہوتی ہیں ہمارے ساتھ اور ٹائم مہینج ہو جاتا ہے اور اللہ کا شکر ہے کہ گھر میں میڈ بھی ہے، کک بھی ہے اور دیگر کام کرنے والی بھی ہے۔“

”شادی کے بعد ایک مرد کی لائف میں کتنی تبدیلی

آتی ہے؟“
 ”مرد کی زندگی میں کافی تبدیلیاں آتی ہیں، آہستہ آہستہ اس کی ذمہ داریوں میں اضافہ ہوتا ہے، جب ملک سے باہر تھا تو اکیلا رہتا تھا۔ کوئی ذمہ داری نہیں تھی تو میں سمجھتا ہوں کہ مرد کی زندگی میں تو بہت زیادہ پیچیدگی آتا ہے۔“

”محبت میں وقت کے ساتھ ساتھ اضافہ ہوتا ہے یا کمی آتی ہے؟“
 ”کمی تو نہیں آتی، شاید اظہار کم ہو جاتا ہے اور یہ فرق بھی آ جاتا ہے کہ سالگرہ ہو یا شادی کی سالگرہ، سادگی سے مناتے ہیں۔“

”منہ دکھائی میں کیا دیا تھا اور ہنی مون کہاں منایا تھا؟ اور منگنی کتنا عرصہ رہی؟“

”منہ دکھائی میں کچھ بھی نہیں دیا تھا، کیونکہ مجھے اس رسم کے بارے میں کوئی علم نہیں تھا اور نہ ہی مجھے کسی نے بتایا، نہ کسی نے مجھ سے پوچھا منگنی تقریباً ایک سال رہی، صرف بات ہوتی تھی، کیونکہ میں ملک میں تھا ہی نہیں ہماری شادی بھی آج کے وقت کی طرح بہت دھوم دھام سے نہیں ہوئی، بہت سادگی کے ساتھ ہوئی اور مجھے مندی کی رسم زیادہ اچھی لگی جو تا چھپائی میں خرچا بہت ہوتا ہے، (تقریباً)۔ اور ہنی

مون کے لیے بھی گئے تھے۔“
 ”ظاہر ہے نو کمالیاں ہوں گی تو خرچ تو ہو گا۔ بیگم کی اچھی اور بری عادت بتائیں؟“

”ذمہ داری کا احساس ہے یہ اچھی عادت ہے اور بری عادت یہ ہے کہ شارٹ نمپرس اور ہریات میں شارٹ نمپرس۔ ضدی بھی ہیں۔ اچھی عادت میں ایک یہ بھی ہے کہ کھانا اچھا پکاتی ہیں اور فرمائش کر کے کافی کھانے پکواتا ہوں اور مجھے زیادہ تر کانٹی نینٹل کھانے پسند ہیں جو کہ مویم اچھا پکاتی ہیں۔“

”شادی کے فائدے ہیں یا نقصانات؟ اور بیوی کا خوب صورت ہونا کتنا ضروری ہے؟“

”میں تو وہ ہی محاورہ استعمال کروں گا کہ جو کھائے وہ بھی پچھتائے اور جو نہ کھائے وہ بھی پچھتائے۔ ایک

ذمہ داری ہے جو نبھانی پڑتی ہے، مگر سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ نئی جزییشن آ جاتی ہے اور زندگی حسین ہو جاتی ہے اور بیوی کا خوب صورت ہونا انتہائی ضروری ہے۔ (تقریباً)۔ سب سے پہلے تو انسان شکل ہی دیکھتا ہے۔“

”رشتے بنتے آسمانوں پہ ہیں اور ٹوٹے زمین پہ، کون خطا کار ہوتا ہے بیوی، شوہر یا رشتے دار؟“

”اگر میاں بیوی کا رشتہ مضبوط ہو تو تیسرا ہاتھ اس میں آ نہیں سکتا اور اگر میاں بیوی میں ہی انڈر اسٹینڈنگ نہیں ہے تو پھر کسی کی بھی مداخلت سے کچھ بھی ہو سکتا ہے۔“

”اور جناب! جن لوگوں کی ابھی شادی نہیں ہوئی، ان کے لیے کچھ کہنا چاہیں گے؟“

”ہنستے ہوئے۔“ ہاں جب تک بچ سکتے ہو، بچو اور شادی کریں تو اپنے ساتھ اپنے پارٹنر کی Compatibility (ذہنی مطابقت) کے ساتھ کہ زندگی بڑا لمبا سفر ہے اور اگر آپ کے پارٹنر کا مائنڈ آپ کے ساتھ نہیں ملتا اور Compatibility آپ کے ساتھ نہیں ہوتی تو یہ جتنا خوب صورت ساتھ ہے اتنا کمزور بھی ہے، یا جتنا خوب صورت سفر



”بس جاب... بچے اور گھر... یہ ہی مصروفیات ہیں میری۔ اس کے علاوہ کسی کام کے لیے ٹائم نہیں ملتا۔ میں بینک میں ہوں۔ صبح ساڑھے چھ بجے اٹھتی ہوں۔ تیار ہو کر اور بچوں کو تیار کر کے ایک بیٹے کو سات بجے اسکول چھوڑتی ہوں اور دوسرے کو ساڑھے آٹھ بجے پھر بینک جاتی ہوں۔ لنچ بریک میں گھر آتی ہوں، بچے آچکے ہوتے ہیں۔ عادل پک کرتے ہیں بچوں کو۔ بچوں کو دیکھ کر اور ضروری کام کر کے پھر واپس بینک چلی جاتی ہوں اور پھر شام کو جم سے ہوتی ہوئی آتی ہوں۔ بینک سے گھر تک میری دس منٹ کی ڈرائیو ہے، ایک گھنٹے کی بریک ہوتی ہے اور چونکہ مجھے بینک میں کام کرتے ہوئے کافی سال ہو گئے ہیں۔ اس لیے پندرہ منٹ آگے پیچھے ہو جائیں تو کوئی مسئلہ نہیں ہوتا۔“

”کچھ اپنے بارے میں بتائیں؟“

”میں بنیادی طور پر لاہور سے تعلق رکھتی ہوں اور وہیں میری پرورش ہوئی اور تعلیم و تربیت بھی شادی کے بعد کراچی آگئی۔ ہم سات بہن، بھائی ہیں، چھ بہنیں اور ایک بھائی ہے اور گریجویٹ ہوں میں۔“

”ہے اتنا برا بھی ہو سکتا ہے۔“

”چلیں جی... اب ذرا آپ کی بیگم سے بھی دو چار سوال ہو جائیں۔“

”کیوں نہیں... ضرور۔“

مریم عادل

”مریم عادل... کیا حال ہیں آپ کے؟“

”اللہ کا شکر ہے... اور آپ؟“

”جی الحمد للہ... میں بھی ٹھیک ہوں۔ ماشاء اللہ دس سال ہو گئے آپ کی شادی کو۔ اور آپ دونوں ہمارے ہاتھ ہی نہیں آئے؟“

”آپ نے کوشش ہی نہیں کی کبھی، ہم تو بڑی آسانی سے ہاتھ آجاتے ہیں۔“

”جی یہ تو ہے کہ سینئر لوگ اور اچھے آرٹسٹ بڑی

آسانی سے نہ صرف ہاتھ آجاتے ہیں، بلکہ وقت کی بھی بہت پابندی کرتے ہیں۔ جبکہ آج کل کے آرٹسٹ اللہ معاف کرے، بہت نخرے دکھاتے ہیں... خیر یہ بتائیے کہ کیا مصروفیات ہیں آپ کی؟“

14 اگست میری پیدائش کا دن ہے۔
 ”اچھا؟ عادل صاحب تو کہہ رہے ہیں کہ میری
 9 سالیاں ہیں۔“

فقہ۔ ”اچھا۔ اصل میں میرے بھائی، بہنیں
 شاید کچھ زیادہ ہیں اس لیے انہیں یاد نہیں رہتا۔ بس
 چھیڑتے رہتے ہیں اور میں ہنستی رہتی ہوں۔ پہلے تو
 بچے اتنے ہی ہوتے تھے اور اب تو بس دو یا تین ہوتے
 ہیں۔ کیونکہ آج کل کے بچے بہت ڈیمانڈنگ ہوتے
 ہیں اس لیے بچے دو ہی اچھے۔ ہم تو بڑے آرام سے
 اپنے والدین کی بات سن بھی لیا کرتے تھے اور مان بھی
 لیا کرتے تھے مگر اب ایسا نہیں ہے۔“
 ”آج کے بچے برگر فیملی سے بھی تو تعلق رکھتے ہیں

اور کمپیوٹر دور کے بچے ہیں۔“

”آپ کی بات ٹھیک ہے، لیکن میں نے اپنے بچوں
 کی تربیت بڑے سادہ طریقے سے کی ہے، باہر جا کر کھانا
 بھی چھ ماہ میں ایک آدھ دفعہ ہی ہوتا ہے۔ زیادہ تر ہم گھر
 ہی کھاتے ہیں۔ چونکہ لاہور سے تعلق ہے، کشمیری
 فیملی ہیں تو آپ کو پتا ہی ہوگا کہ لاہوریوں کو کھانے
 منے کا بہت شوق ہوتا ہے تو بچے بھی کھانے پینے کے
 شوقین ہیں۔ عادل بھی کھانے پینے کے شوقین ہیں،
 لیکن اتنے نہیں ہیں جتنی میری فیملی ہے۔“

”کب کہاں ملاقات ہوئی عادل سے۔؟“

”میری امی کی ایک دوست ہیں جو کہ میری ساس کی
 بھی دوست ہیں تو ایک جگہ پہ ڈنر تھا تو وہاں پہ ان سے
 ملاقات ہوئی تھی، پہلے انہوں نے مجھے دیکھا اور بعد
 میں میں نے انہیں دیکھا۔“

”وحید مراد صاحب کے چاہنے والوں کی تعداد آج
 بھی بہت زیادہ ہے تو جب ان کے بیٹے کا رشتہ آیا تو کیا
 تاثرات تھے آپ کے؟“

”اچھا تو لگا۔ لیکن یہ اس وقت امریکہ میں رہتے
 تھے اور میں پاکستان سے باہر جانے کا کوئی ارادہ نہیں
 رکھتی تھی۔ میں چاہتی تھی کہ میری شادی جہاں بھی
 ہو، لیکن میرے والدین مجھ سے نزدیک ہوں۔ کیونکہ

میری ایک بہن امریکہ میں ہے اور اتنی دور سے آنا جانا
 آسان نہیں ہوتا، تو مجھے تھوڑا سا اعتراض تھا، مگر جب
 ان کی امی سے فیملی ملی، ان کی بہن سے ملے، باتیں
 کلنڈر ہوتی گئیں اور رشتے بنتے چلے گئے تو پھر بات چلی
 ہو گئی۔“

”جوڑے تو آسمان پر بنتے ہیں۔ اچھا لگا ایک مشہور
 بندے سے رشتہ جوڑ کر؟“

”جی بالکل۔۔۔ یہ بات بھی درست ہے کہ جوڑے
 آسمانوں پہ بنتے ہیں، کبھی سوچا ہی نہیں تھا اس رشتے
 کے بارے میں، عادل سولہ سترہ سال امریکا میں رہے
 ہیں میں لاہور میں، تو کبھی ذہن میں بھی نہیں تھا کہ
 میرا فیوجران کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔“

”ڈر لگتا تھا کہ اتنا عرصہ باہر رہ کر آئے ہیں پتا نہیں

کیسے ہوں گے؟“

”میرا ہمیشہ سے اس بات پر یقین رہا ہے کہ شادی
 ایک ”جوا“ ہوتی ہے، کوئی فرق نہیں پڑتا اس بات سے
 کہ کوئی باہر رہے یا یہاں رہے۔ جو ہونا ہوتا ہے وہ
 ہو جاتا ہے اور باہر سے زیادہ ہمارے یہاں کا (پاکستان
 کا) ماحول خطرناک ہے اور جب تک مل کر نہ رہیں
 کوئی ایک دوسرے کو جان نہیں سکتا۔“
 ”سسرالی فیملی کو کیسا پایا آپ نے؟“

”میری ساس بہت اچھی ہیں، بہت فریڈنلی ہیں،
 بہت سوشل ہیں، پورا گھر میں سنبھالتی ہوں، وہ کبھی
 مداخلت نہیں کرتیں۔“

”بہت مشہور بات ہے کہ ”ساس کبھی ماں نہیں
 ہوتی“ ایسا ہے؟ لڑائی جھگڑا ہوا؟“

”قصور دونوں سائیڈ سے ہوتا ہے، ایک سائیڈ سے
 نہیں، اللہ کا شکر ہے کہ کوئی لڑائی جھگڑا نہیں ہوا،
 کیونکہ لڑائی جھگڑے کے لیے ٹائم ہی نہیں ملتا، ہنستے
 ہوئے۔ گھر پہ رہیں تو شاید لڑنے کا ٹائم بھی مل
 جائے۔“

”آپ کی ساس بھی بہت سوشل ہیں، کبھی کہا کہ
 ہو آپ گھر بیٹھو اور چھوڑو جاں کو۔ یا پسند کرتی ہیں

آپ کا جواب کرنا؟

”نہیں۔ بالکل بھی نہیں، کبھی کوئی پابندی نہیں لگائی، فری ہنڈ ہے جو میرا دل چاہتا ہے میں کرتی ہوں“ مجھے کوئی روک ٹوک نہیں ہے اور پسند کرتی ہیں میری حجاب کو، بہت لبرل ہیں، جو نہیں، جو کھائیں، جب آئیں جب جائیں کوئی پابندی نہیں کسی بھی قسم کی بھی۔ درحقیقت بڑے عزت اور بہار چاہتے ہیں اور وہ ہم انہیں دیتے ہیں تو وہ ہم سے خوش رہتے ہیں، آپ بیاہ کر آئیں اور آتے ہی یہ چاہیں کہ سب کچھ ہماری مرضی سے ہو تو ایسا ممکن نہیں ہے، نئے گھر میں اپنی جگہ بنانے کے لیے آپ کو کچھ سال تو لگتے ہی ہیں۔“

”لڑکیوں کی خواہش ہوتی ہے کہ ہم علیحدہ گھر میں رہیں جہاں کوئی تیسرا نہ ہو، آپ کی بھی ایسی کوئی خواہش تھی؟“

”نہیں میری ایسی کوئی خواہش نہیں تھی، بلکہ میں تو چاہتی تھی کہ بھرا گھر ہو، کیونکہ میں ایک بھرے ہوئے گھر سے آئی تھی۔ تو جب میں بیاہ کر آئی تھی تو بڑی پریشانی ہوئی تھی۔ تو جب تک بچے نہیں ہوئے، بڑا مشکل لگتا تھا وقت گزارنا۔“

”عادل بتا رہے ہیں کہ شادی سادگی سے ہوئی تھی؟“

”جی۔ آج کل کے حساب سے تو سادگی سے ہی ہوئی تھی اور میں کہتی ہوں کہ سادگی سے ہی ہونی چاہیے۔ شادی ہماری لاہور میں ہوئی تھی اور وہاں کراچی میں ہوا تھا اور میں تو کہوں گی کہ جو پیسہ ماں، باپ شادی میں خرچ کرتے ہیں وہ اپنے بچوں کو گفٹ کر دیا کریں تو زیادہ بہتر ہے۔“

”کتنی بھی اچھی زندگی گزر رہی ہو، جب مرد کے دماغ کا میٹر گھومتا ہے تو پھر وہ اسلام کی آڑ میں دوسری شادی کر لیتا ہے۔ اگر عادل نے ایسا کیا تو۔؟“

”اسلام میں چار شادیوں کی اجازت ہے، میں تو پانچ کی اجازت دے دوں گی، قہقہہ۔ کیونکہ زبردستی آپ کسی کے ساتھ زندگی نہیں گزار سکتے، چار کریں، دو

کریں۔ مجھے کوئی فرق نہیں پڑے گا، بس مجھے علیحدہ کرویں، کیونکہ میں کچھ دباؤ نہیں کر سکتی۔“

”عادل اپنے والد کی طرح رومانٹک مزاج ہیں؟“

”نہیں جی، کوئی خاص نہیں، ہاں کبھی روٹھ جاتے ہیں تو پھر پھر پھر پھر لے جاتے ہیں، ورنہ تو ہم گھر پہ ہی کھاتے ہیں۔“

”آپ انہیں میک اپ میں پسند ہیں یا بغیر میک اپ کے؟“

”میں بہت سادگی پسند ہوں۔ مجھے عادت ہی نہیں ہے، زیادہ میک اپ کی، جب کہیں جانا ہوتا ہے تو میں عادل سے پہلے تیار ہو جاتی ہوں اور ان کا انتظار کرتی ہوں کہ یہ تیار ہوں تو چلیں۔ ہمارے یہاں الٹا حساب ہے۔“

”نہیں جاتے ہیں آپ دونوں تو لوگ ان کو پہچانتے ہوں گے، آپ گھبرا آئی ہیں؟“

”ان سے زیادہ لوگ ان کی امی کو پہچانتے ہیں، کیونکہ وہ کافی سوشل ہیں اور میں بالکل بھی نہیں گھبراتی کہ لوگوں کا پیار ہی ہے جو آپ کا اتنا نام ہوتا ہے۔ اگر اللہ نے آپ کو عزت دی ہے تو اس کی قدر بھی کریں۔“

”عادل مزاج کے کیسے ہیں، بجٹ بنا کر خرچ کرتے ہیں آپ دونوں؟“

”مزاج کے بہت اچھے ہیں، دل کے بہت اچھے ہیں، مزاج ٹھنڈا گرم مکس ہے اور میرا بھی ایسا ہی ہے اور ہم



کمانی کو برا نہیں سمجھا جاتا۔ اگر باعزت جاب مل رہی ہے تو کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں اور پھر اپنی کمانی کا مزہ ہی کچھ اور ہوتا ہے، کسی کو جواب نہیں دینا پڑتا۔
”کوئی بات جو آپ دس سالوں میں عادل سے نہیں کہہ سکیں، اب اس انٹرویو کے ذریعے کہنا چاہتی ہیں۔“

”مجھ میں ایک ہی بری عادت ہے کہ میں دل میں کوئی بات نہیں رکھتی کبھی کبھی سوچتی ہوں کہ یہ اچھی عادت نہیں ہے، مگر میرا خیال ہے کہ بات کو فوراً ”کلیئر کر دینا اچھی عادت ہے۔“

”عادل کہہ رہے ہیں کہ شادی کے لیے لڑکی کا خوب صورت ہونا بہت ضروری ہے، آپ بتائیں کہ کیا لڑکے کا خوب صورت ہونا بھی ضروری ہے؟“
”لڑکے کا بہت حسین ہونا ضروری نہیں ہے، لیکن اتنا ضرور ہو کہ آپ برداشت کر سکیں۔ اور لڑکوں کی نیچر اچھی ہونی چاہیے، کیونکہ وہ ساری زندگی رہتی ہے۔ بعض مرد بہت خوب صورت ہوتے ہیں، مگر نیچر اچھی نہیں ہوتی۔“

”آپ کی جب لڑائی ہوتی ہے تو کیا گھروالوں کو بتاتی ہیں؟“

”نہیں بالکل نہیں، اگر آپ میں کوئی بات ہے تو ایک دوسرے سے کہہ دیں، کیونکہ میاں بیوی کا رشتہ ایسا ہے کہ آپ لڑتے بھی ہیں تو تھوڑی دیر کے بعد پہلے جیسے ہو جاتے ہیں۔“

”اور آپ سے یہ آخری سوال کہ جب عادل صاحب کمرے میں آئے تھے تو پہلا جملہ کیا بولا تھا آپ سے؟ اور لڑکیوں سے کچھ کہنا چاہیں گی؟“

ہنستے ہوئے۔ ”یہ تو یاد نہیں۔ سچ کہہ رہی ہوں۔ اور لڑکیوں سے یہ ہی کہنا چاہوں گی کہ شادی میں سب سے بڑی چیز کھپو و مائز ہوتی ہے اور شروع کے کچھ سال آپ اپنے میاں کو اور سسرال کو دیں گی تو اس کے بعد ہر چیز آپ کی ہوگی۔“

اور اس اس کے ساتھ ہی دونوں سے اجازت چاہی اس شکریے کے ساتھ کہ انہوں نے ہمیں وقت دیا۔

دونوں ہی دل میں کوئی بات نہیں رکھتے جو گلہ شکوہ ہوتا ہے، منہ پر کہہ دیتے ہیں۔ عادل تو بجٹ کا خیال نہیں رکھتے جو آیا خرچ کر دیتے ہیں، جبکہ میں بہت دیکھ بھال کے خرچ کرتی ہوں۔ اگر میرے پاس زیادہ بھی ہے تو ضائع نہیں کرتی۔ جو عورت خود جاب کرتی ہے اسے پیسوں کی قدر ہوتی ہے۔“

”عادل بتا رہے ہیں کہ انہوں نے آپ کو منہ دکھائی میں کچھ نہیں دیا تھا۔ کیسا لگا تھا؟ اور ہنی مون کے لیے کہاں گئی تھیں؟“

”بہت عجیب لگا اور اگلے دن میری کزنز اور میری بہنوں نے پوچھا تو میرے پاس چونکہ کافی جیوری تھی تو میں نے ان میں سے دکھادی۔ بعد میں ان سے گلہ کیا تو کہنے لگے کہ مجھے تو اس رسم کا پتا ہی نہیں تھا، لیکن خیر عادل دل کے اتنے اچھے ہیں اور اتنا میرا خیال رکھتے ہیں کہ مجھے کچھ زیادہ محسوس نہیں ہوا اور ہنی مون کے لیے امریکہ گئے تھے ہم اور میری نظر میں ہنی مون منانا ضروری نہیں ہے، بلکہ میں تو اسے ویسٹ آف منی کہتی ہوں اور عادل کا چونکہ پلان بن رہا تھا، امریکہ جانے کا تو سب نے کہا کہ تم بھی چلی جاؤ، ہنی مون ہو جائے گا۔“ مریم نے ہنستے ہوئے کہا۔

”کبھی روٹھ کر میکے جانے کا اتفاق ہوا اور میکہ دور ہونا چاہیے یا نزدیک؟“

”نہیں جی۔ میکہ دور ہے نزدیک ہونا تو ضرور چلی جاتی، عادل کہتے ہیں میکہ نزدیک ہونا چاہیے، اکثر کہتے ہیں تم میکے کیوں نہیں جاتیں، بچوں کے اسکول

اور اپنی جاب کی وجہ سے بھی جلدی میکے نہیں جاسکتی۔“

”لڑکیوں کا یا بیوی کا کمانا ضروری ہے؟“

”میں کہتی ہوں کہ آج کل کے معاشرے میں ضروری ہے، کیونکہ وقت اور حالات کا کچھ پتا نہیں ہوتا، اگر آپ اپنے پیروں پہ کھڑے ہوں تو کوئی برائی نہیں ہے، ایکسٹرا چیز اگر آرہی ہے تو اس میں آپ کے بچوں کا ہی فائدہ ہے، اب وہ دور آگیا ہے کہ عورت کی



خواتین اور دوشیزاؤں کیلئے اپنی طرز کا پہلا ماہنامہ

خواتین ڈائجسٹ



اپریل 2015ء

کے شمارے کی ایک جھلک

● سالگرہ نمبر کی خصوصی پیشکش مصنفین سے سروے،

● عمیرہ احمد کا ناول ”آپ حیات“،

● نمرہ احمد کا مکمل ناول ”نمل“،

● تنزیلہ ریاض کا مکمل ناول ”عہد الست“،

● نعیمہ ناز کا مکمل ناول ”آئینہ“،

● فاخرہ جمیں اور سحر ساجد کے ناولٹ،

● عنبرین اعجاز، سعدیہ ملک، کنیز نور علی، تمثیلہ زاہد اور ایمیل رضا کے افسانے،

● ماضی کی فنکارہ ”ایمن خان“ سے ملاقات،

● مذاق رات کے ڈی جے ”محسن عباس حیدر“ سے باتیں،

● معروف شخصیات سے گفتگو کا سلسلہ ”دستک“،

● کرن کرن روشنی، نفسیاتی ازدواجی الجھنیں عدنان کے مشورے اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں،

خواتین ڈائجسٹ کا اپریل 2015 کا شمارہ آج ہی خرید لیں۔

سمیرا حمید

ادارہ

سب تعریفیں خدا بزرگ و برتر کے نام جو ہر تخلیق کی ابتدا اور اس کی تکمیل پر قادر ہے۔

مصنف وقت کی نبض پر سانس لیتا ہے اور جہاں میں پھیلی رمزیں بوجھتا ہے۔ تاریخ کی پریش کھولتا، انسان کو کھو جتا، ذات کو کھنگالتا، سرگوشیوں کو سنتا، گویائی پر کان دھرتا اور بصارت کے ماخذ کو ڈھونڈتا، مصنف اپنے قلم سے کائنات کو آشکار کرتا ہے۔ پوری انسانی جستی جس کے قلم کے عروج پر زوال سے بچی رہتی ہے وہ ”مصنف“ ہے۔ میں قصہ گو ہوں سمیرا حمید۔

میرے نام کا عربی اور فارسی مطلب ”قصہ گو“ ہے۔ عرب، دمشق، بغداد وغیرہ میں باقاعدہ قصہ گو ہوا کرتے تھے اس لیے یہ مطلب مجھے مبہوت کیے رکھتا، کہ یہ قصہ گو لوگوں کے مجمع میں اپنی پُر اثر آوازوں سے قصہ گوئی کرتے ہیں اور رات میں جو کہ قصے سنانے کے لیے بہترین وقت سمجھا جاتا ہے، کے دوران ان کے اطراف مشعلیں اور چراغ روشن رہے ہوں گے۔ اور اب میں اس مطلب پر اس لیے مبہوت رہ جاتی ہوں کہ میں خود بھی مشعلوں اور چراغوں کی روشنی میں قصہ گوئی کر رہی ہوں۔ میری مشعلیں اور چراغ آپ ہیں، وہ روشنی کہ اگر میسر نہ ہو تو اندھیرے ہر شاہکار کو نکل لیں۔

میں خدا کے بعد ہر پڑھنے والی آنکھ اور متاثر ہونے والے ذہن کی شکر گزار ہوں۔ آپ نے ناول یارم کو پڑھا، یارم کے کرداروں کو، واقعات کو، جملوں کو پسند کیا، سراہا، مجھے داد دی، دعا میں دیں، یہ سب میرے لیے معمولی ہر گز نہیں ہے اور ایسا بھی نہیں ہے کہ میں انہیں کسی اعزاز سے کمپائی ہوں۔ آپ کرداروں کے

لیے حساس ہوئے، ان سے محبت کی، ان کے ساتھ بنے، ان کے لیے غمگین ہوئے، ان کے دکھ اور خوشی کو اپنے دل پر محسوس کیا۔ آپ کے ان محسوسات کی مجھے ہمیشہ قدر کرتے رہنا ہے، اور مجھے اس حقیقت کا بھی پابند رہنا ہے کہ قصہ گو کے گرد اگر اہل سماعت اپنے شوق کو لیے موجود نہ ہوں تو وہ آفاقی داستانیں

سنائے یا طریقہ قصے وہ بہر حال اپنی حیثیت میں بے مول ہو گا۔

اور آپ یہ بھی جان لیں کہ لکھنے والا ہاتھ جس قدر اہم ہے پڑھنے والی آنکھ بھی اتنی ہی اہم ہے اور میں ان پڑھنے والی آنکھوں کی اہمیت کو فراموش نہیں ہونے دوں گی۔

یارم، یارم میرے لیے کیا ہے شاید میں اس سوال کا جامع جواب بھی نہ دے سکوں، ہاں میں خدا کی شکر گزار ہوں کہ میں تھوڑی بہت اس قاتل ہو سکی کہ اس ناول پر تکبر سے پاک فخر کر سکوں۔

یارم ایک سال یا اس دورانہ کی کہانی نہیں ہے، جس میں یہ لکھی یا سوچی گئی، یہ ان کئی سالوں کی کہانی ہے جن میں ہمیں تجربات اور مشاہدات کرتی رہی اور تجزیے نکالتی رہی۔ یارم کے لیے میں نے کہانی کی بہت کرداروں کی آمد اور تشکیل، لفظوں کے استعمال میں نئے انداز اپنانے کی کوشش کی۔ کہانی، کہانی کی بہت کردار نگاری، منظر نگاری اور لفظوں کا بہترین چناؤ میرے پہلے ہدف ہوتے ہیں۔ میری یہ کوشش ہوتی ہے کہ جس قدر بہتر لکھ سکوں اسے لکھنے کی کوشش کرتی رہوں۔ میں نہ ایک بڑی مصنفہ ہوں نہ ادیب، نہ لکھاری اور میں پھر وہی کہوں گی کہ چند کہانیاں لکھ

لینے سے کوئی ادیب نہیں بن جاتا، میں بھی نہیں بنی۔
ہاں بس میں کوشش کرتی ہوں اور صرف اس غور و فکر
میں رہتی ہوں کہ کس طرح میں اپنے کام کو اور بہتر کر
سکتی ہوں۔ میں اپنی کوشش اور غور و فکر میں کتنی
کامیاب رہی، اس کا فیصلہ ہر پڑھنے والے کو اور وقت کو
کرنا ہے اور کرتے رہنا ہے۔ میں نے جانفشانی، لگن،
محنت اور بھرپور ارتکاز سے لفظوں، کرداروں،
تصورات، خیالات کو مجسم کر کے بصورت ”یارم“
پیش کر دیا ہے۔

ناول یارم میں میں نے اپنے آئندہ ناولوں کے
کرداروں کو بھی متعارف کروایا ہے اور میں انہیں
گاہے بگاہے کہانی میں لاتی رہی ہوں۔ پہلا کردار خلیفہ
کا ہے (خلیفہ، کردار اور ناول کا نام) یہ کردار قسط نمبر چھ

میں آیا ہے۔ تین مختلف اور الگ الگ ناولوں کے
کردار اور ناول قسط آٹھ میں آئے۔ فشاری (کردار کا
نام، دوسرا ناول) توپ باف (ناول کا نام) اور آمنہ اور محمد
بخش (جو تھے ناول کے کردار) اور آخری قسط میں میں
نے اپنا ایک ناول گیت رکھ کر لکھا۔

”مشک آہونے نیل کی وسعتوں کو پاٹا اور زقند بھرتا
ہرنی کے سامنے آکھڑا ہوا۔ پھر دونوں ان دونوں کے گرد
چو کڑیاں بھرنے لگے اور پھر آمنے سامنے کھڑے
ہو گئے اور اصفہان کے قالین باف نے زرا حمر کے
تاروں سے انہیں شاہکار میں بدل دیا اور ان میں ایک
گہرے گیت راز کو نقش کر دیا جو ان کی رونمائی تک
راز ہی رہنے والا ہے۔“ آخری قسط میں موجود یہ
سطریں، یہ راز میری سب سے زیادہ عزیز کہانی کے
بارے میں ہے۔ ناولوں اور کرداروں کو میں جس
ترتیب سے لانی ہوں ضروری نہیں کہ وہ اسی ترتیب
سے لکھے جائیں یا پہلے صرف یہی لکھے جائیں۔

اب میں آپ سب کے سوالات کی طرف آتی
ہوں، وہ سوالات جنہیں پڑھ کر میں اندازہ لگا سکتی ہوں
کہ آپ نے کتنی باریک بینی سے ناول کا مطالعہ کیا۔
میری کوشش ہوگی سب کے سوالات کے جوابات

دینا۔

بہت سے قارئین نے امرجہ اور عالیان کے ناموں
کا مطلب پوچھا ہے۔ امرجہ (خوشی، اچھی خبر) عالیان
(عالی مرتبہ) دونوں نام عربی ہیں۔ اور مجھے بہت حیرت
ہے کہ آپ نے کارل کے بارے میں اتنا کچھ پوچھا ہے،
لیکن اس کے نام کا مطلب نہیں پوچھا۔

پہلے تین سوال لاڑکانہ سے حذیفہ ابو بکر نے کئے
ہیں کہ امرجہ کا نام امرجہ ہی کیوں رکھا۔
برنگ مین والے سین کی انسپریشن کہاں سے
ملی؟

اور اگر ویراعلا ظریفی نہ دکھاتی تو کہانی کی صورت کیا
ہوتی؟

میں ان ناموں کا انتخاب کرتی ہوں بجن کی ادائیگی
مناسب ہو۔ تلفظ یا ساؤنڈ میرے لیے بہت اہم ہوتے

ہیں۔ سب کرداروں کے نام، جملے، بیانیہ یا یوں کہہ
لیں ایک ایک لفظ تلفظ کی جانچ اور پرکھ کے بعد لکھے
گئے۔ امرجہ اور لیڈی مہر کے نام پہلے کچھ اور تھے،
جنہیں ساؤنڈ کی وجہ سے میں نے ان موجودہ ناموں
سے تبدیل کر دیا۔ تو نام امرجہ اپنے معنی اور ساؤنڈ کی
وجہ سے مجھے کہانی اور کردار کے عین مطابق لگا تو میں
نے اس کا انتخاب کر لیا۔

علامتی، ظاہری، مخفی، ہر معنی میں برنگ مین امرجہ
کے دکھ اور اس سین کی جذباتی کیفیت سے مطابقت
رکھتا تھا۔ ایک برنگ مین ایک برنگ وومین۔
ڈریگن ریڈ بہار کا آغاز جہاں امرجہ کو پروپوز کیا گیا کا
الٹ برنگ مین جہاں عالیان کو کوئی تیسرا پروپوز کر رہا
تھا۔ ایک نئے سال، نئے وقت اور بہار کا ماخذ ”ریڈ“
ایک خاتمے کی علامت ”آگ“۔ ایک دن اور ایک
رات۔ تو یہ وہ مطابقت یا وجوہات تھیں جن کی بنیاد پر
میں نے برنگ مین کا انتخاب کیا۔ براہ راست کوئی
تحریک یا محرک نہیں جس سے میں متاثر ہوئی تھی۔
بس یہ میرے تصورات تھے جنہیں میں نے تعمیر کیا اور
دنیا بھر میں ہونے والے تہوار اور ایوٹس مجھے متاثر

رکھتی ہوں اور ایک خدشہ جو مجھے لاحق رہتا ہے اور مجھے متحرک رکھتا ہے کہ اگر میرے دماغ کا تجزیہ کیا جائے اور نتیجہ یہ سامنے آئے کہ میں نے اپنے دماغ کا دو فیصد یا بمشکل ایک فیصد حصہ ہی استعمال کیا ہے تو میں افسوس کروں گی کہ میں نے پورا دماغ استعمال کیوں نہیں کیا۔ میں افسوس کرنے والوں میں سے ہونا نہیں چاہتی اور اندھے گونگے اور بہروں میں سے بھی نہیں۔

سعدیہ ضیاء کراچی اور ام طلحہ ابیٹ آباد سے پوچھ رہی ہیں کہ یارم لکھنے کا خیال کیسے آیا اور اس کے پیچھے کیا تحریک کارفرما تھی؟

اور عمارہ حیدر مری سے پوچھ رہی ہیں کہ آپ نے دو سراہی ناول اتنے تجھے ہوئے انداز میں لکھا ہے کہ لگتا ہے آپ دس بارہ ناول لکھ چکی ہیں اتنا پختہ انداز کیسے حاصل کرپائیں؟

اگر آپ کا سوال مرکزی کہانی کی طرف ہے تو میں

حقیقتاً "اس بارے میں نہیں بتا سکتی کہ مرکزی خیال کب ذہن میں آیا لیکن ہاں اس کی ابتدا میرے لکھنے سے پہلے ہوئی تھی۔ کیونکہ میں مختلف چیزوں اور خیالات پر بہت شوق سے کسی بھی مقصد کے بغیر سوچتی ہوں تو لکھاری بننے سے پہلے چند ایک واقعات ہوئے تھے کہ میں نے سوچا تھا کہ اگر ایک امرجہ جیسی لڑکی اپنے ماحول سے پریشان یورپ کی کسی یونیورسٹی میں چلی جائے تو وہ کن کن مراحل سے گزرے اور کن کن مسائل کا سامنا کرے۔ کہانی کی صورت نہیں بس ایسے ہی میں سوچا کرتی تھی۔ (جیسے کہ میں اور بھی بہت چیزوں کے بارے میں سوچا کرتی تھی اور سوچتی ہوں) کچھ اسٹوڈنٹس کو میں جانتی تھی جنہوں نے امرجہ کی طرح آن لائن اسکالرشپ فارمز فل کیے، لیکن وہ سب ناکام رہے سوائے ایک کے جسے کینیڈا کا اسکالرشپ ملا جس کا کردار امرجہ سے اپنے دوست کی پوتی کی حیثیت سے کرتے ہیں۔ ایسے ہی چھوٹے چھوٹے کئی واقعات ہیں جو میرے مشاہدے میں

کرتے ہیں اور مجھے انہیں اپنی کہانیوں میں شامل کرنا اچھا لگتا ہے۔

اگر ویرا اعلا ظریفی نہ دکھاتی تو کہانی تھوڑی بدل جاتی اور سب کے درمیان کئی سالوں کے فاصلے آجاتے اور سب اپنی اپنی جگہ ٹھیک اور غلط ہو جاتے۔ لیکن چونکہ ویرا کی شخصیت میں اتنا خود غرضی اور ضد نہیں تھی اس لیے اس نے ویرا نے میں جا کر رونا مناسب سمجھا اور اس حقیقت کو تسلیم کرنا کہ جن دو لوگوں کے جذبات میں قدر مشترک ہو ان کے جذبات کے حق میں احترام سے فیصلہ دے دینا قابل ستائش ہوتا ہے۔ اور ویرا نے یہ ستائش حاصل کی۔

مصباح کھاریاں سے پوچھ رہی ہیں کہ یارم کا نام یارم ہی کیوں رکھا اور شہرت کیسی لگ رہی ہے؟

کیونکہ لفظ یارم بیک وقت قدیم اور جدید وقت سے جڑا ہوا ہے اور فارسی کی ساری شاعری اور کلام کی

طرح مجھے یہ پڑ معنی، مسحور کن اور محویت میں بے مثال سا لگتا ہے۔ آپ کے دوسرے سوال کا جواب صرف اتنا ہے کہ میں جو لکھ رہی ہوں اسے پڑھا جا رہا ہے میرے لیے یہی کافی ہے۔ اور ہم سب اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ رہے نام اللہ کا۔

سائرہ غلام نبی نے کراچی سے پوچھا ہے کہ سیرا کی تحریر میں زبردست قوت مشاہدہ کے ساتھ ایک ایسا سچا تجزیہ ملتا ہے کہ اس سے پھر انکار ممکن نہیں رہتا اور ہم با آسانی اس سے متفق ہو جاتے ہیں اتنی سی عمر میں اتنا باشعور ہونا کیسے ممکن ہوا؟

سائرہ! آپ کا شکریہ کہ نہ صرف آپ یارم پڑھتی رہیں بلکہ مجھے اپنی رائے سے بھی آگاہ کیا۔ میرا مشاہدہ بہت زیادہ نہیں ہے اور شاید تجزیہ بھی اور جو تھوڑا بہت ہے وہ صرف اس لیے کہ میں غور و فکر کو بہت پسند کرتی ہوں اور کسی بھی خیال یا سوچ یا کسی کتابی بات یا کسی عظیم شخصیت کی بات پر آنکھ بند کر کے یقین نہیں کرتی۔ میں ہر بات کو وہ کہیں بھی کہی یا بیان کی گئی ہو یا میرے آس پاس نظر آئے خود جا چکی اور

رہے۔ امرجہ، عالیان، کارل، ویرا، لیڈی مر، یہ سب کہانی کے خاکے (مختصر کہانی) کے ساتھ ساتھ اور لکھ کر بننے رہے۔ لیکن کہانی کی ابتدا بہر حال ایک لڑکی سے ہوئی۔

میں نے یارم کہانی کا خاکہ جب پہلی بار بنایا تو اسے لکھ کر پڑھ کر رکھ دیا کہ ابھی میں اسے لکھنے کے قابل نہیں ہوئی اور اگر میں نے اسے فوراً لکھنا شروع کیا تو میں اس کا حلیہ بگاڑ دوں گی۔ آپ اسے میری عادت کہہ لیں یا فطرت میں باقاعدہ کسی کام کو کرنے سے پہلے خود کو اس کے قابل بنانے کی کوشش کرتی ہوں۔ کسی بھی کہانی کو اس لیے لکھ دینا کہ اس کا پلاٹ ذہن میں آگیا اس پلاٹ کے ساتھ نا انصافی ہوگی اگر ہم اس کے ساتھ انصاف نہ کر سکیں۔ ایک تخلیق کو اپنے نام سے بگاڑ کر کسی دوسرے کی دسترس سے بھی نکال دینا قابل افسوس عمل ہے۔ جو خیالات، الہام یا وارد ہوتے ہیں وہ ایک تخلیق کار کے لیے بیش قیمت خزانے سے کم نہیں ہوتے۔ ان خزانوں سے بے

پردائی برتنے سے بہتر ہے کہ ہم انہیں زیادہ قابل لوگوں کو دے دیں یا خود کو ان کے قابل کریں۔ تو عمارہ! میں نے کوشش کی کہ میں اس کے ساتھ انصاف کر سکوں۔ اس کہانی کو باقاعدہ لکھنے کے پیچھے جو محرک تھا، وہ صرف وہ الہام تھا کہ بس میں اس کہانی کو لکھنا شروع کروں اور دو تین بار مزید اس کا خاکہ بنانے کے بعد میں نے اسے لکھنا شروع کر دیا۔

سحرش فاطمہ کراچی سے پوچھ رہی ہیں ”کہ کون سا کردار لکھتے ہوئے مزا آیا؟“

”سب کے سب کردار لکھتے ہوئے بہت اچھا لگا سحرش! حتیٰ کہ وقتی طور پر آنے والے جم، جوڑن، ایما اور شارلٹ کے سسرال والوں تک کو لکھتے ہوئے بھی۔ آپ کہہ سکتی ہیں کہ ہر کردار نے مجھے ہمیشہ پر جوش رکھا اور ان کی کردار نگاری کرتے ہوئے میں نے خاص طرح کی خوشی محسوس کی۔“

صباحت سلیم سرگودھا سے پوچھ رہی ہیں ”عالیان

نے امرجہ کی بند ہوئی آنکھوں کو دیکھ کر جو تکلیف محسوس کی اسے لکھتے ہوئے آپ کے کیا جذبات تھے؟“

”میں اس تکلیف کا مشاہدہ کر چکی ہوں اور اسی مشاہدے کے تحت میں نے یہ تکلیف عالیان کو دی اور اس نے انگلیوں کی جھری میں سے ذرا کی ذرا جھانکا اور پھر جھری سمیٹ لی۔ لکھتے وقت میں تکلیف سے گزرے بغیر اس تکلیف کو عالیان کے ذریعے واضح کر رہی تھی۔“

جنید کامران نے پورے والا سے پوچھا ہے ”امرجہ نے کہا، لاہور میں برف باری ہوتی ہے تو کیا لاہور میں برف باری ہوتی ہے؟“

”تو کیا نہیں ہوتی؟ فرق صرف اتنا ہے کہ لاہور میں برف باری بارش کے ساتھ ڈالہ باری کی صورت ہوتی ہے۔ اب امرجہ کا لاہور پر اتنا حق تو بنتا ہے کہ وہ ڈالہ باری کو برف باری کہہ کر لاہور پر کروادے۔ لاہور کو یقیناً اس پر اعتراض نہیں ہوگا، ہمیں بھی نہیں ہونا چاہیے۔“

فرح سہیل کراچی سے پوچھ رہی ہیں کہ مائچسٹر یونیورسٹی کو چننے کی کوئی خاص وجہ۔ کیا آپ کا کوئی رشتہ دار، کزن، یا دوست یا کوئی اور رابطہ یونی میں پڑھتا ہے کہ آپ نے اتنی اچھی طرح سے یونی کو پوزیٹ کیا اور شروع میں سوچا تھا کہ ٹاول اتنا زیادہ ہٹ ہوگا؟“

”مائچسٹر ایک امن پسند یونیورسٹی ہے اور اس کا ماحول بہت دوستانہ ہے۔ اور دوسری یونیورسٹیوں کی نسبت اس کے ماحول میں مضراثرات کم ہیں۔ پھر مجھے مائچسٹر شہر کی پرسکون فضا بہت پسند آئی، یہ ایک بڑا شہر نہیں ہے، لیکن یونیورسٹی کی تقدیس کا بہر حال کسی طور خیال رکھتا ہوا سا ہے۔ یونی کی محراب مجھے بہت پسند ہے اور لائبریری بلڈنگ اور یونی کے اندر موجود دوسری بہت سی چیزیں ایسی ہی چھوٹی چھوٹی کئی وجوہات ہیں۔ ویسے مائچسٹر کی جگہ ٹاول کسی اور یونی پر تھا پھر میں نے عین وقت پر اپنا ارادہ بدل دیا کیونکہ وہ یونی ایک دوسری

کہانی کے لیے پرفیکٹ تھی کیونکہ وہاں سٹیروئیڈ ٹیس کی کافی تعداد تھی اور یارم کوئی الحاح سٹیروئیڈ ٹیس کی ضرورت نہیں تھی۔

نہیں میرا کوئی رشتہ دار یا کزن یا کوئی دوست یونی میں زیر تعلیم نہیں ہے۔ ہاں لیکن اب میں بہت سے اسٹوڈنٹس کو جاننے لگی ہوں۔ ساری یونی کا ماحول بورڈریٹ کرنا ناممکن سا تھا کیونکہ ہرڈیو پیارمنٹ کا ہر ہال کا اپنا الگ ماحول ہوتا ہے جو اسٹوڈنٹس کے آنے جانے کے ساتھ ساتھ بدلتا رہتا ہے۔ ہر جگہ کی ایک روح ہوتی ہے، ہر ماحول کی، ہر شہر کی، ہر چیز کی جیسا کہ پاؤلو کوئیلہو لکھتا ہے کہ دنیا کی مکائنات کی ایک روح ہے۔ تو میں بس اس روح کو سمجھنے کی کوشش کرتی ہوں ورنہ جو درس گاہیں ہوتی ہیں وہ اپنا ماحول بدلتی رہتی ہیں اور وہاں کچھ بھی مستقل طور پر قائم نہیں رہ پاتا۔ اس لیے میں نے اپنی تخلیق اور شعور کی آنکھ زیادہ استعمال کی۔ جیسا کہ ایک پاکستانی لڑکی جو وہاں پڑھتی ہے نے مجھے کہا کہ اس نے کبھی غور نہیں کیا مائچسٹر یونی پر دھند کیسے اترتی ہے لیکن جب تیسری قسط میں پڑھا تو غور کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ منظر واقعی

مبہوت کر دیتا ہے۔ تو یہ دیکھنے والی آنکھ پر ہے کہ وہ مختلف واقعات، چیزوں اور عوامل کو کس انداز سے دیکھتی اور پھر کس انداز سے بیان کر پاتی ہے۔

اگر میں ہٹ ہونے کے بارے میں سوچتی تو متکبر ٹھہرتی۔ میرا کام کھل اور نکاز اور محنت سے لکھنا تھا یا یوں کہہ لیں محنت اور کمال فن میرا حلف تھا اور کامیابی اللہ کا وعدہ۔ میرا کام اپنے حلف کی پاس داری تھا بس۔ فرہاد نے لاہور سے پوچھا ہے کہ ”سماں ہجر والی شاعری کہاں سے لی ہے؟“

”سماں ہجر اور سماں یار یہ سب شاعری نہیں ہے فرہاد۔ ”یارم“ میں فارسی رباعی کے علاوہ جو کچھ ہے وہ جسے آپ شاعری سمجھ رہے ہیں وہ میرے لکھے لفظ اور لفظوں کی ترتیب ہیں۔ انہیں شاعری نہیں کہا جا سکتا کہ وہ شاعری کے پیمانے پر نہیں لکھے گئے۔ اے

آنکھ تو کیوں روتی ہے میں ایک شمال گری میں سب آستان میں نے آسمانوں کی دسترس سے اسے اترتے دیکھا، وغیرہ یہ سب الفاظ کی صورت میں بیانیہ کہانی کے انداز ہیں۔ یعنی نثر ہی لیکن نثر نہیں کہانی کے درمیان کہانی سے جڑے ہوئے۔“

فارما فاطمہ علی گڑھ انڈیا ”اخت تقویٰ مہراب پورا اور عشنا ملک چیچہ وطنی سے۔ ان سب کی خواہش ہے عالیان، کارل، امرجہ، ویرا وغیرہ سے ملنا“ آگے لکھا ہے میں ان سب کو لکھنے والی سے ملنا چاہتی ہوں اور یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ کیا یہ کردار حقیقت میں آپ سے ملے ہیں اور کیا یہ کردار اصلی ہیں؟“

”میری تحریر کو آپ نے پڑھا تو آپ تو پہلے ہی مجھ سے مل چکی ہیں فاطمہ! البتہ اب آپ سے ملاقات میرے لیے خوشی کا باعث بن رہی ہے۔ کردار اصلی نہیں ہیں۔ اخت اور عشنا۔ تصوراتی بھی نہیں کہہ سکتی میں کہ میں نے انہیں اسی دنیا کے انسانوں میں سے اٹھایا ہے۔“

حنابل لندن سے کافی سارے سوالوں کے ساتھ آئی ہیں ”آپ ایسے شان دار جملے کیسے لکھ لیتی ہیں۔ آپ نے پاپولر فکشن میں کلاسک لکھنے کی ہمت کی“

آپ کو ڈر نہیں تھا کہ ناول رجیٹر کر دیا جائے گا۔ ویرا جیسی بہادر لڑکی کہاں ملی، لیڈی مہر کی کہانی کیسے ذہن میں آئی اور آپ نے اے آر رحمان، اقبال، فیض، بانو قدسیہ، غالب اور پتا نہیں کون کون جنہیں آپ نے ناول میں شامل کیا اس کے پیچھے کیا وجہ تھی؟“

”آپ کو میرے لکھے فقرے اچھے لگے مجھے اچھا لگا جان کر۔ کہانی لکھتے ہوئے میں اس کی جنس کے بارے میں نہیں سوچتی نہ ہی اس کی درجہ بندی کرتی ہوں کہ یہ پاپولر فکشن ہے یا کلاسک یا کچھ اور۔ میری تخلیق کو جس شکل میں نمایاں ہوتا ہے، جس پیمانے پر ترتیب اور توازن پر اسے رکھ کر لکھا جاتا ہے۔ میں ان سب کے بارے میں سوچتی ہوں۔ اگر میں یہ سوچوں کہ اسے پاپولر فکشن کے رنگوں سے لکھنا ہے یا کلاسک فکشن کے

دکن

ماہنامہ دکن
اپریل 2015 کا شمارہ شائع ہو گیا

✽ اداکار "عمران رضوی" سے شاہین و شہید کی ملاقات

✽ اداکارہ "منمن جنگ" کہتی ہیں "میری بھی سنبھلے"

✽ "آواز کی دنیا سے" اس ماہ تہان ہیں "لہنا شاہ"

✽ اس ماہ "روبینہ لیات" کے "مقابل ہے الینہ"

✽ "اک ساگر ہے زندگي" نثار سمید کا سلسلہ وار ناول

✽ "ردائے وفا" فرحین اظفر کا سلسلہ وار ناول

✽ "میں گمان نہیں یقین ہوں" نیلا پرہیز کا مکمل ناول

✽ "منتہا" سائرہ کرم چودھری کا مکمل ناول

✽ "مدیا" عید ملک کا مکمل ناول

✽ "خالا، سالا اور اوپر والا" فاخرہ گل کی دلچسپ مزاحیہ تحریر

✽ "اذان بھار" شہناز صدیقی کا ناول

✽ "میوی غفلتوں کو خبر کھاں" شاہد شوکت کا ناول

✽ درخشاں بلال، راشدہ رفعت اور سورج اللک کے افسانے اور مستقل سلسلے

اس شمارے کے ساتھ دکن کتاب

کرن کتاب

"گھر کا ڈاکٹر"

کرن کے ہر شمارے کے ساتھ ملحد سے ملت پیش خدمت ہے۔

برغوں سے سجانا ہے تو میری تخلیق ایک فارمولے کے تحت ہوگی اور تخلیق میں کوئی فارمولا نہیں ہوتا۔ اور جرات و ہمت کو میں پسند کرتی ہوں کیونکہ اگر ایک تخلیق کار جرات مند نہیں ہوگا تو پھر وہ پرانے راستوں پر نئے انداز سے چلے گا لیکن نئے راستوں کی داغ بیل نہیں ڈال سکے گا۔ جیسا کہ رسول حمزہ توق کہتے ہیں کہ "اگر کوئی فنکار اپنی روح میں پرورش پانے والے پرندے کو آزاد کرے اور وہ اپنی طرح کے پرندوں کے جھنڈ کا ایک حصہ بن جائے تو اسے فن کار نہیں کہا جاسکتا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس نے جو پرندہ خلق کیا ہے وہ اس کا پرندہ نہیں نہ انوکھا اور نہ ہی ہوش ربا پرندہ۔ ایک عام چڑیا ہے جسے چڑیوں کے کسی جھنڈ میں پہچانا نہیں جاسکتا ہو سکتا ہے یہ چڑیاں بھی من موہنی ہوں لیکن ہیں تو معمولی چڑیاں جن میں کوئی خاص بات نہیں۔ تو بس ہم سب کو انفرادی طور پر اپنے اپنے پرندے خلق کرنے کی کوشش کرنا چاہیے۔

دیرا حقیقتاً "روس سے ہی ملی۔ میرے بھائی روس گئے تھے اور ان کی آنکھ سے روس کو دیکھتے روس کو جانتے روس کا مشاہدہ کرتے دیرا مجھے مل گئی۔ لیڈی مہر کی کہانی دراصل میرا الگ سے ناول تھا جو لیڈی مہر اور ان کے دس بچوں کے گرد تھا۔ خاص کر شارلٹ اور مہر گن کی کہانی لیکن پھر چند وجوہات کی بنا پر میں نے اسے پارم میں مدغم کر دیا۔ لیڈی مہر کی کہانی اس سوچ کا نتیجہ تھی جس پر میں نے تبھی سوچا تھا کہ صرف بے اولاد یا ضرورت مند ہی کیوں بے سہارا بچوں کو لے کر پالتے ہیں۔ سب خاص و عام کیوں نہیں جو ان کے اخراجات اٹھا سکتے ہیں۔ یعنی معاشرے میں اس اچھے عمل کا رجحان کیوں نہیں ہے۔

بانو قدسیہ، اشفاق احمد، ابونواس، بوعلی ابن مکتلا اور ایسے ہی بہت سے دوسرے نام یا چیزیں ناول میں شامل کرنے کے پیچھے بہت ساری وجوہات ہیں جن میں سے چند ایک میں آپ کو بتا دیتی ہوں۔

پہلی وجہ ان کے لیے میری عقیدت ان کے کام کو

ماہنامہ شعاع اپریل 2015 29

میں عالیان جیسے لوگوں کو جانتی ہوں اور یہ حقیقت میں ہوتے ہیں۔“

عاصمہ اور رویسا علی اسلام آباد سے پوچھ رہی ہیں کہ ”آپ مائچسٹرونی کے بارے میں اتنا کیسے جانتی ہیں، تحقیق کے ذرائع کیا رہے؟“

”تحقیق کے ذرائع بے شمار رہے، چاہوں بھی تو گنوا نہیں سکتی۔ ایسے ہی جیسے ایک تصویر پوری کہانی کہہ دیتی ہے اور اسی کہانی کو بیان کرنے کے لیے ایک ہزار لفظ بھی کم ہوتے ہیں تو دور بیٹھے انسان کو ان ہی ایک ہزار الفاظ یعنی ایک ہزار ذرائع کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ معمولی باتوں کے لیے اتنے پارہ بٹینے پڑتے ہیں کہ بس۔ میرے مشینی ذرائع تو اخبارات، رسائل، بلاگز، گوگل، آرٹھ، اسٹریٹ ویو، اسٹوڈنٹ ڈائریاں، کچھ کارپسٹل ڈیٹا، کالم، ذاتی رابطے، ہزاروں کی تعداد میں اسٹوڈنٹس جنہیں فالو کرنا پڑا، گروپس اور ایسی ہی دوسری بے شمار چیزیں رہیں۔ یہ اوپر اوپر کے ذرائع ہیں۔ باقی اکی مہلذ، بات چیت اور بہت اندر کی باتوں کے لیے مجھے کئی مختلف انداز اور طریقے اپنانے پڑے۔ جیسے کہ یونین کی بلڈنگ میں موجود سیف روم تک جا پہنچنا، کسی معجزے سے کم نہیں تھا، کیونکہ مائچسٹر کے کم ہی اسٹوڈنٹس اس سیف روم کے بارے میں جانتے تھے۔ اور عالیان اور کارل کا ہال، اس کے اندرونی حصوں کی تصویریں مجھے خاصی مشکل سے ملیں، خاص

کر میوزک روم کی جہاں ویرانے جا کر کارل پر اسپرے کرنا تھا۔ روم کو جانتا ہے تو گوگل کرو لیکن رومیوں کو جانتا ہے تو رومیوں سے ملو تو مائچسٹروالوں کو جاننے اور خاص کر مائچسٹر آنے والے اسٹوڈنٹس کو جاننے کے لیے میں نے مائچسٹروالوں کو تنگ کیا۔ حتیٰ کہ میں نے ہوٹلز اور بارز وغیرہ کے اسٹاف کو بھی کھنگالا۔ اور حقیقتاً ”اسٹوڈنٹس کی اصلی صورت مائچسٹروالوں نے مجھے دکھائی اور اسی لیے تو میں وہ فقرہ لکھنے میں کامیاب ہو پائی تھی کہ یہ یونی چک جو نہ کریں وہ کم ہے۔ بہر حال میں انسان ہوں، نقص سے پاک نہیں ہو سکتی، اپنی

خراج تحسین۔ دوسری وجہ یہ کہ ماضی سے اٹھا کر اگر ہم اپنے یاروں اور خاص کر اعلیٰ پائے کے فنکاروں اور شخصیات کو حال تک لا کر مستقبل میں اپنے ساتھ نہ لے گئے تو یہ سب ماضی کے قبرستانوں میں دفن ہوتے جائیں گے۔ انہیں بار بار گاہے بگاہے زندہ کرتے رہنا ہو گا۔ دوسری وجہ ان سب کو دوسری اقوام تک لے جانا ہے، اگر بحکم خدا میں اپنی تحریریں دوسری اقوام تک لے جانے میں کامیاب ہو گئی تو وہ ایک کہانی کے ساتھ بہت ساری چیزوں کے بارے میں جانیں گے۔ اشفاق احمد کو، بانو قدسیہ کو، لاہور کو، ابونواس کی شاعری کو، ابو علی ابن سینا کی خطاطی کو، غالب کے کمال فن کو، اقبال کے سحر آگے کلام کو اور فیض کے عشق کو اور ناول میں شامل دوسری بہت سی چیزوں اور باتوں کو۔ یہ صرف چند وجوہات ہیں، باقی وقت ظاہر کر دے گا۔ اور اے آر رحمان کا ذکر صرف اس لیے کہ رحمان جو کہانیاں اپنی دھنوں سے لکھتا ہے، میں وہ کہانیاں بڑھنے کی کوشش کرتی ہوں اور ان کی کچھ دھنوں نے مجھے کچھ جملے اور تصورات دیے، جنہیں میں نے یارم میں شامل کیا تو شکریہ کا ایک انداز ان کے لیے۔“

رابعہ الماس حیدر آباد سے پوچھ رہی ہیں کہ ”عالیان کا کردار بہت زبردست تھا۔ کیا یہ آپ کا سوچا ہوا تھا یا حقیقت میں آپ نے دیکھا ہے، کیا ایسے کردار حقیقت میں ہوتے ہیں؟“

”ویسے حقیقی نہیں جیسا آپ سوچ رہی ہیں۔ لیکن چند ایک لوگ جو میرے مشاہدے میں رہے وہ قریب قریب عالیان جیسے ہیں، بس وہ عالیان کی طرح عمارتیں نہیں پھلانگتے۔ میرے ایک غیر ملکی دوست کی خوبیاں عالیان کے کردار کے لیے مستعار لی گئیں۔ غصہ نہ کرنا، کمپروں، جو توں کو صرف استعمال کی چیزیں سمجھنا، زیادہ چیرٹی کرنا، والدین سے الگ اپنے بل بوتے پر سب کرنا، بہت طیش پر بھی کبھی نہ بھڑکنا اور ہمیشہ بہت تحمل کا مظاہرہ کرنا وغیرہ سب۔ تو آپ کہہ سکتی ہیں کہ

نے پوچھا ہے ”کارل کا کردار کس سے متاثر ہو کر یا
کے سامنے رکھ کر لکھا؟ کارل سے ملی ہیں تو مجھے بھی
ملو ادیس؟“

”میرا خیال ہے عندلیب کارل سے میں نے آپ کو
ملو ادیا ہے ”یارم“ میں ”اور وجہہ! مجھے ایک ایسے لڑکے
کا کردار بنانا تھا جو اتنے اٹھے دماغ کا ہو کہ ڈسک کو ہارٹ
راک میں چلو ادے ”امرہ کو اسٹور میں لاک کر دے“
جو عالیان کا دوست بھی ہو اور دشمن بھی اور جو امرہ پر
مختلف افتادلاتا رہے۔ اور یہ اٹھے دماغ کا انسان باقی کے
کام بھی قدرتی بات ہے اٹھے ہی کرے گا تو اس کردار
کے نقطے (حرکتیں) ملاتے ملاتے یہ کارل بن گیا۔ کسی
سے متاثر نہیں تھی۔ کسی کو سامنے نہیں رکھا تھا۔“

”روس کے لوگ اتنے بھی اچھے نہیں ہوتے جتنا
آپ نے ویرا کو دکھایا۔“ ”مثال نورسیا لکوت کا سوال۔
”مثال! لوگ روس کے ہوں یا کسی اور ملک کے
یہ ناممکن ہے کہ بیک وقت سب ہی لوگ صرف
برے“ ہوں یا صرف ”اچھے“۔ ”گراف کم زیادہ ہو سکتا
ہے لیکن صفر نہیں۔ اور دور سے دیکھ کر یا صرف سن کر
کسی بھی قوم کو اچھا یا برا کہنا مناسب نہیں۔“

(ہماری قارئین نے بہت سارے سوالات کیے ہیں۔
باقی سوالات کے جوابات ان شاء اللہ آئندہ ماہ“

طرف سے میں نے پوری کوشش کی کہ کوئی غلطی نہ رہ
جائے اور مانچسٹر والوں کو یہ شکایت نہ رہ جائے کہ میں
نے ان کے شہر اور یونی کو بیان کرنے میں اچھی قابلیت
نہیں دکھائی۔“

”لارڈ میسر عالیان آپ کو کہاں ملے؟“ ”سدرہ
الطاف جہلم سے پوچھ رہی ہیں۔“

”لارڈ میسر عالیان نام مجھے پسند تھا جو میں نے
عالیان کو دے دیا اور یارم کو لارڈ میسر عالیان مل گیا۔
ویسے لارڈ میسر مجھے مشاہدے کے بل بوتے پر ملے۔“

ہاشم و سیم لاہور کا سوال ہے کہ ”این اون سال میں
ایک بار بولنے والوں جیسی کیوں تھی؟“

”اگر وہ بھی بولتی تو باقی کے کردار کب بولتے۔ ویسے
جاپانی کم گو ہی ہوتے ہیں اگر نہیں بھی ہوتے تو میں نے
این اون کے ذریعے انہیں بنا دیا اور اس کے ساتھ ہی
میں یہاں وضاحت کرنا چاہوں گی کہ کہانی میں لکھا
جانے والا کوئی ایک بھی کردار غیر اہم نہیں ہوتا قاری
کی ہمدردی یا محبتیں ایک یا چند ایک کے ساتھ منسلک
ہوتی ہیں۔ لیکن لکھاری سب کے ساتھ منسلک ہوتا
ہے خاص کر وہ کہانی میں ہر کردار کی اہمیت کو جانتا
ہے۔ اس لیے تو وہ کردار کو کہانی میں جگہ دیتا ہے اور
کوئی کردار ثانوی یا مرکزی ”اہم یا غیر اہم نہیں ہوتا جو
کردار کہانی کا حصہ ہے بس وہ کہانی میں اپنے حصے کا
سلطان ہے۔“

”اصل زندگی میں امرہ جیسی آگ لگانے والی لڑکی

سے نفرت کی جاتی ہے یا اس سے دور رہا جاتا ہے پھر
آپ نے ناول میں ایسی لڑکی کو ہیروئن کیوں بنا دیا؟“
و قاریوزدار کراچی کا سوال ہے۔

”جو توہمات پالتے ہیں یا ایسے لوگوں سے ڈرتے ہیں،
وہ بے وقوف اور جاہل ہوتے ہیں۔ امرہ ایک اچھی
شاگرد ہے اور اس نے آہستہ آہستہ وہ سب سیکھا جو
زندگی نے استاد بن کر اسے سکھانا چاہا۔ ایک ایسی ہی
شاگرد کو اس ناول کی ہیروئن ہونا تھا۔“

وجیہہ انور ہاشمی کراچی اور عندلیب رحیم یار خان

تمہاری اپنی لکھی ہو

فرحت اشتیاق

قیمت - 300 روپے



دستک دستک

شاہین رشید



سائرہ یوسف

سائرہ یوسف شادی کے بعد اور پھر بیٹی کی پیدائش کے بعد کافی مصروف ہو گئی ہیں، فیلڈ میں بھی کم نظر آتی ہیں اور پریس میڈیا میں بھی۔ دل چاہا کہ بندھن میں ان کا انٹرویو کریں، مگر ٹائم ہی نہیں ہے، خیر۔

”سائرہ کیا حال ہیں، کیا ہو رہا ہے؟“

”جی! اللہ کا شکر ہے اور بیٹی کو سلانے کی کوشش کر رہی تھی۔“

”اچھا۔ تنگ کرتی ہے؟“

”نہیں، نہیں۔ بالکل نہیں۔ سب کی لاڈلی ہے، اس لیے بالکل بھی تنگ نہیں کرتی۔“

”اؤٹ آف فیلڈ ہو؟“

”نہیں، تھوڑا بہت تو کر ہی لیتی ہوں، کوئی اچھا کمرشل مل جائے یا کوئی اچھا سیریل۔“

”اپنے کام میں بہت سلیکٹو ہو؟“

”جی، بالکل۔ بہت سکون کے ساتھ، بہت سوچ و بچار کے ساتھ اور پوری توجہ کے ساتھ کام کرتی ہوں، اس لیے وہ ہی کردار لیتی ہوں جن کے ساتھ میں انصاف کر سکتی ہوں۔“

”مگر تم ایک کامیاب فنکارہ ہو، ہر ڈرامے میں کام کر سکتی ہو، کیونکہ لوگ تمہیں دیکھنا چاہتے ہیں؟“

”اگر ہر وقت اسکرین پر آؤں گی تو لوگ نہیں دیکھیں گے، لیکن اگر کبھی کبھار آؤں گی تو لوگ ضرور دیکھیں گے، اداکاری بہت توجہ مانگتی ہے۔ اس میں ڈوب کر کام کرنا پڑتا ہے، تب ہی اچھا رزلٹ آتا ہے، ورنہ آپ یقین کریں کہ آفرز تو بہت ہوتی ہیں، مگر سب کو ”ہاں“ نہیں کیا جاسکتا۔“

”تو پھر کیا مخصوص نہیں ہو گئیں آپ؟“

”نہیں، نہیں۔ ان ہی کو ترجیح دیتی ہوں جن کا اسکرپٹ بہت جان دار ہوتا ہے اور اچھے پروڈکشن ہاؤسز کو ہی اہمیت دیتی ہوں۔“

”کہیں پڑھا تھا کہ آپ کو ”تنہائیاں“ کا سیکوئل کر کے بہت مزہ آیا تھا، کیوں؟“

”اس لیے کہ ایک تو یہ مشہور سیریل کا سیکوئل تھا، پھر ماحول بہت اچھا تھا، فنکار بہت اچھے تھے اور اس سیریل میں شہروز سے بچی دوستی ہوئی اور وہ میرے جیون ساتھی بنے۔ تو اس لحاظ سے یہ میرے لیے ایک یادگار سیریل ہے۔“

”اب تو آپ فیملی والی ہو گئی ہیں، پھر بھی کبھی فلم میں کام کرنے کی آفر ہو تو کریں گی؟“

”بہت ہی اچھی آفر ہوئی تو کروں گی، ورنہ آپ کو پتا ہے کہ ڈراموں کے لیے جلدی ”ہاں“ نہیں کرتی، جب تک مطمئن نہ ہو جاؤں تو بھلا فلم کے لیے کیسے



کر سکتی ہوں۔ مجھے ”بول“ اور ”خدا کے لیے“ پسند ہیں اور یہ ہی میری خواہش ہے۔“
”اور کیا خواہش ہے؟“

”اور یہ کہ ماڈلنگ میں بھی بین الاقوامی شہرت حاصل کروں اور بہت اچھے کمرشلز اور بہت ہی معیاری میگزین کے لیے ماڈلنگ کروں۔“
”عموماً لڑکیاں شادی کے بعد اور پھر ماں بننے کے عمل سے گزرنے کے بعد موٹی ہو جاتی ہیں، جبکہ آپ پہلے کی طرح اسماٹ ہیں؟“

”سب لڑکیاں اسماٹ رہ سکتی ہیں، اگر وہ اپنے آپ پر توجہ دیں، میں اپنی فٹنس کا بہت خیال رکھتی ہوں۔ اس سے میرا اپنا دل بھی خوش ہوتا ہے اور پھر مجھے اس فیلڈ میں بھی رہنا ہے۔“

”شادی اور شوہر۔ زندگی چینیج ہوئی؟“

”بالکل۔۔۔ ہر انسان کی زندگی میں چینیج آتا ہے اور مجھ میں بھی آیا ہے۔۔۔ شادی تو انسان کی زندگی میں بہت بڑی تبدیلی لاتی ہے، آپ کو جیون ساٹھی مل جاتا ہے۔ اولاد جیسی نعمت مل جاتی ہے اور جب میں شوہر میں آئی تب بھی میں نے اس فیلڈ میں بہت کچھ سیکھا اور اگر انسان چاہے تو اپنے اندر مثبت تبدیلی لاسکتا ہے۔ آپ پوزیٹو رہیں تو سب پوزیٹو رہتے ہیں۔“

”یعنی بگڑنا اور سدھرنا اپنے اختیار میں ہوتا ہے؟“
”جی بالکل۔۔۔ اپنے اختیار میں ہوتا ہے، پوزیٹو سوچ اور پوزیٹو رویہ اور بی ہیوری ہو تو سب آپ کے

اے ہوتے ہیں۔ پھر کوئی آپ کو مس گائیڈ نہیں کر سکتا، نہ ہی آپ کے ساتھ نکمٹو ہو سکتا ہے۔“
”سیرو تفریح کرنا کیسا لگتا ہے؟“

”ارے یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے، بھلا سیرو تفریح کرنا کسے برا لگتا ہوگا۔ اپنا ملک ہو یا دوسرا گھومنے پھرنے کا بہت مزہ آتا ہے اور ملک سے باہر تو میں کئی ممالک گھوم چکی ہوں اور بہت انجوائے کرتی ہوں۔“

”کوئی ایسا ملک جہاں آپ بار بار جانا چاہتی ہیں؟“

”ایسے تو کئی ممالک ہیں، لیکن ”ترکی“ مجھے بہت

پسند آیا۔ کچھ عرصہ پہلے ہی میں وہاں سے آئی ہوں اور میرا دل بار بار جانے کو چاہتا ہے اور ان شاء اللہ ایک بار تو ضرور جاؤں گی۔“

”اور کوئنگ چل رہی ہے؟“

”جی بالکل چل رہی ہے اور میں نے آپ کو بتایا تھا کہ اگر میں آرٹسٹ نہ ہوتی تو ایک اچھی شیفت ضرور ہوتی۔۔۔ خیر۔۔۔ میں اپنی فیلڈ میں بہت خوش ہوں اور اپنی فیملی میں اور کوئنگ میں نئے نئے ذائقوں کی تلاش میں رہتی ہوں۔“

”آج کل ”سسرال“ کے موضوع پر بہت ڈرامے بن رہے ہیں، آپ کو سسرال کیسا ملا؟“

”بہت اچھا۔۔۔ بہت ہی اچھا۔۔۔ اگر میں کہوں کہ مجھے آئیڈیل ”سسرال“ ملا ہے تو غلط نہ ہوگا، سب لوگ بے حد محبت کرنے والے ہیں، میں بہت خوش نصیب ہوں کہ مجھے ایسا اچھا سسرال ملا۔“

ارتجح فاطمہ

”کیسی ہوا رتج؟“

”اللہ کا شکر ہے۔“

”مصروف ہو؟“

”اک پل“ اور ”زندگی تم ہو“ کس کا کردار اچھا لگ رہا ہے۔

”دونوں میں اچھے ہیں۔ ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔“ ”اک پل“ میں ذرا تیز لڑکی کا کردار ہے اور اس کے کئی شیڈز ہیں۔ دکھ اور خوشی والا کردار ہے اور ”زندگی تم ہو“ میں ڈاکٹر کارول بھی ہے اور محبت کرنے والی لڑکی کا بھی۔ پونہ پورول ہے اور خاصا اچھا ہے۔“ ”اب تک کے ڈراموں میں بہتر کس کو کہو گی؟“

”میرے شروع کے سارے ہی ڈرامے بہت اچھے ہیں۔ آپ نے نوٹ کیا ہو گا کہ میرے شروع کے ڈراموں میں میرے کردار رونے دھونے اور کم بولنے والے ہوتے تھے۔ سچ بتاؤں۔ اس وقت میری اردو اتنی اچھی نہیں تھی اور اب تو ماشاء اللہ مجھے خود اپنے پر فخر سا ہوتا ہے کہ میں نے اچھی اردو سیکھ لی ہے اور ہاں آپ نے پوچھا کہ کون سا کردار بہتر لگا تو ”اک پل“ کی لڑکی میں میرا کردار خاصا اچھا اور مختلف تھا۔ اور اسے کر کے مجھے مزہ بھی آیا تھا“ اور اس میں بہترین اداکارہ کا ایوارڈ بھی حاصل کر چکی ہوں۔“

”اداکاری کے علاوہ کیا مشاغل ہیں؟“

”مجھے فوٹو گرافی کا بھی بہت شوق ہے اور جب کہیں جاتی ہوں تو حسین مقامات کو ضرور کمرے میں محفوظ کرتی ہوں۔ اور گھر پہ ہوٹی ہوں تو کچھ نہ کچھ ضرور بڑھتی ہوں کہ مجھے مطالعے کی عادت بھی ہے اور جب کچھ کرنے کو نہیں ہوتا تو پھر نیند کو ترجیح دیتی ہوں۔“

”اللہ نے کم عمری میں دولت اور عزت سے نوازا ہے۔ اپنی کمائی کس پہ خرچ کرتی ہیں؟“

”اپنی کمائی زیادہ تر اپنے ہی اوپر خرچ کرتی ہوں، مگر مجھے سب کا خیال رہتا ہے اور جہاں مجھتی ہوں کہ مجھے خرچ کرنا چاہیے وہاں ضرور خرچ کرتی ہوں۔“

”کس معاملے میں زیادہ فضول خرچ ہیں اور لباس میں کیا پسند ہے؟“

”جی شوٹ پہ ہوں، لیکن ابھی لنگ ٹائم ہے، آپ بات کر سکتی ہیں۔“

”لوکے۔ شکریہ۔ اب تم خاصی اچھی اردو بولنے لگی ہو، سیکھی یا خود بخود آئی؟“

”کوئی بھی زبان ہو، وہ سیکھنے سے نہیں بولنے سے آتی ہے اور مجھے بھی بولنے سے آئی۔ مجھے اردو ایک تو مسلسل ڈراموں میں کام کرنے سے آئی اور دوسرے میں اپنی دادی کی مشکور ہوں جنہوں نے میری بہت مدد کی۔“

”آج کل جو آن ایر ہیں، وہ تو ہم دیکھ ہی رہے ہیں، انڈر پروڈکشن کیا ہیں؟“

”ہاں جی۔۔۔ آن ایر تو زیادہ نہیں، بس ایک دو ہی ہیں۔ جیسے ”اک پل“ ”زندگی تم ہو“ اور دونوں میں ہی میرے کردار بہت اچھے اور مختلف ہیں۔ جہاں تک انڈر پروڈکشن کی بات ہے تو کچھ ہیں ریکارڈنگ چل رہی ہے۔ اب پتا نہیں کب آن ایر ہوں گے، تو قبل از وقت بتانا فضول ہے۔“

احوال و افکار ابن انشاء



قیمت
/- 1200 روپے

فون نمبر:
32735021

مکتبہ عمران ڈائجسٹ
37، اند ہاؤس، کراچی

بقیہ صفحہ نمبر 285

شعلے کے ساتھ ساتھ

ادارہ

طلعت شناع۔ سیال شریف

1۔ آج جب میں شعلے سے وابستگی کو سوچنے بیٹھی ہوں تو یادوں کے درتے کھل گئے اور بچپن کے وہ دن کتنے اچھے تھے ان کو سوچتے ہوئے میں کہاں سے کہاں جا پہنچی۔ یہ ایسا دور ہوتا ہے کہ آپ عمر کے کسی حصے میں بھی پہنچ جائیں، آپ کو اس دور کی یاد ستاتی ہے تو پھر آپ خود کو اسی دور میں محسوس کرتے ہیں، آہ۔ لیکن وہ دور واپس نہیں آتا۔ وہ ماں باپ کی شفقت، وہ بہن بھائیوں کا ساتھ، وہ بے فکری کے دن، کچھ بھی نہیں۔

اک بار جو مل جائیں وہ گزرے ہوئے لمحے سو بار مجھے سننے لگتی ہیں ایام گوارا شعلے سے وابستگی کو تو ایک عرصہ بیت گیا۔ بچپن میں جب لفظوں کی پہچان ہوئی تو شعلے کو اپنے ساتھ لایا۔ چھوٹے ہوتے اپنی چھوٹی سسٹرز کو دوڑاتی۔ کبھی کسی کے گھر کبھی کسی کے گھر۔ پھر کچھ عقل آئی اور باقاعدہ اپنا رسالہ خریدنا شروع کیا۔ یہ میٹرک کی بات ہے اور اب ماشاء اللہ سے میرا بیٹا میٹرک میں ہے تو اب خود اندازہ لگائیں اس ساتھ کا۔

شعلے کے حوالے سے ایک خوش گوار واقعہ ہے۔ میرا رسالہ میرے میاں جی 28 کو ہی لے آتے ہیں، لیکن اگست میں میرے بے حد اصرار پر بھی ٹال مٹول کر گئے، میں بہت حیران کہ ان کو کیا ہوا۔ بہر حال، گھر کی مصروفیات میں بھی شعلے کی یاد ستاتی رہی اور جب بھی یہ گھر آتے تو میں پہلے ان کے ہاتھوں کو دیکھتی، لیکن نہیں، کچھ دکھائی نہ دیتا۔ اس دوران خواتین اور کرن کی ڈیٹ بھی آگئی، لیکن میرے گھر نہ آئے۔ یہ راز تو اس وقت کھلا جب اگست کی شام کو بچوں اور میاں جی نے میرے لیے سربراہی رنگ برتھ ڈے کا اہتمام کر رکھا تھا اور یہی برتھ ڈے کہتے ہوئے

جب بچوں اور میاں صاحب نے مجھے شعلے، کرن اور خواتین اکٹھے دیے تو میری خوشی کی انتہا نہ رہی اتنی اپنائیت پر۔ میرے میاں صاحب کا یہ کہنا ہے کہ میں اتنی خوش تو گولڈ کی چیز گفٹ لینے پر بھی نہیں ہوتی، جتنی ڈائجسٹ کے تحفوں پر ہوتی۔

2۔ میری آنکھ صبح میاں جی کے جگانے پر کھلتی ہے، جی ہاں میں جاگنے کے معاملے میں بہت سست ہوں۔ کیونکہ رات کے علاوہ دن میں کبھی نہیں سوتی۔ بہر حال صبح کی نماز پڑھ کر دن کا آغاز کرتی ہوں۔ ناشتا بناتی ہوں، پھر بچوں اور ان کے ابا کے کپڑے پر لیں کر کے ان کو اسکول بھیجتی ہوں۔ اس کے بعد اپنا ناشتا ٹرے میں سجا کر لاتی ہوں، اور مارننگ شو دیکھتے ہوئے ناشتا انجوائے کرتی ہوں۔ معذرت کے ساتھ، مجھے وہ عورتیں زہر لگتی ہیں جو گھر کی ذمہ داریوں میں اپنے آپ کو بھول جاتی ہیں اور کبھی بچوں کے بچے ہوئے سلاکس، روٹی اور کبھی خاوند کے بچے نوالے ٹھنڈے سالن سے ناشتا کرتی ہیں۔ کیوں؟ جب سب کے لیے ناشتا بنا سکتی ہیں تو اپنے لیے کیوں نہیں۔ خدا را میری بہنوں! اپنے آپ کو یوں ملیا میٹ مت کرو، گھر کے کاموں میں اپنی ذات کو بھی اہمیت دو۔ تم لوگ یہ کیوں نہیں سمجھتی ہو۔

جو ہم نہ ہوں تو زمانے کی سانس رک جائیں قلیل وقت کے سنے میں ہم دھڑکتے ہیں یہ شعر ہم عورتوں کے لیے ہے۔ سوری میں پھر پشیمانی سے اتر گئی۔ بہر حال ناشتے سے فارغ ہو کر صفائی برتن اور پھر کوکنگ کرتی ہوں اور اپنی طرف بھی بھرپور توجہ دیتی ہوں۔ کپڑے وغیرہ بدل کے، کنگھا کر کے ایسے بیٹھ جاتی ہوں کہ آنے والا یہ سمجھتا ہے کہ یہ کام کسی اور نے کیے ہیں۔ بچوں کی واپسی کے بعد انہیں

کھانا کھلانے کے بعد اگر کہیں جانا یا کسی نے آنا نہ ہو تو پھر میں فارغ ہوتی ہوں اور۔

یہ وقت میرا شعاع کے لیے ہوتا ہے۔ عصر سے مغرب تک، بیٹی مجھے چائے کا کپ بھی پکڑا جاتی ہے۔ مغرب پڑھنے کے بعد بچوں کو ہوم ورک کروا کے شام کے چھوٹے موٹے کام نپٹاتی ہوں اور پھر عشاء کے بعد بھی کچھ ٹائم شعاع کے لیے ہوتا ہے، کیونکہ مجھے مطالعہ کے بغیر نیند نہیں آتی، لیکن جن دنوں شعاع نیا آتا ہے۔ اس دن رو میں چینیج ہوتی ہے کہاں کے

مارننگ شو۔ سالن پکاتے کام کرتے شعاع میرے ساتھ ہوتا ہے۔

3۔ کسی ایک کہانی میں اور کردار میں جھلک نظر آتا تو مشکل ہے، مجھے بہت سی کہانیوں میں اپنی جھلک نظر آتی ہے، جب انسان مکمل نہیں ہے اس میں بہت سی خوبیاں اور خامیاں ہیں تو پھر ایک کردار کیسے مکمل ہو سکتا ہے۔ اس لیے مختلف جگہ پر اپنا آپ نظر آتا ہے۔

جہاں تک بات تحریروں کی ہے تو بہت سی پسندیدہ ترین تحریروں میں بہت سی ایسی یادگار تحریروں ہیں جن کے نقش آج بھی دلوں میں تازہ ہیں۔ رائٹرز میں مجھے نگہت سیمائی، نمرہ احمد، عمیدہ احمد، سائرہ رضا، سمیرا حمید یہ تو آج کل ٹاپ لسٹ پر ہیں، جبیں سسٹرز تو شادی کے بعد غائب ہی ہو گئی ہیں۔ اس کے علاوہ بہت پہلے میں نے ماہا ملک کی کہانی میرے خواب ریزہ ریزہ پڑھی تھیں وہ پڑھ کر ڈپریشن کا شکار ہو جاتی ہوں اور زہن کو کوستی ہوں کہ کیسے تم اپنی جنت سے نکل گئیں اور زہن کی حالت پر کڑھتی ہوں۔ ماہاجی آپ کہاں غائب ہیں۔

4۔ خوبیاں اور خامیاں تو ہر ایک کے اندر ہوتی ہیں، کوئی بھی پرفیکٹ نہیں۔ لیکن اب اپنے منہ میاں مٹھو کیسے بنیں۔ تو میاں صاب سے پوچھا، کیونکہ وہی صحیح بتا سکتے ہیں، کیونکہ ہر مرد کے اندر ایک ساس چھپی ہوئی ہے، تو انہوں نے کہ ”تم بالکل فضول خرچ نہیں

ہو، مخلص ہو“ اور جناب ایک دفعہ ایف اے میں کلج میں مجھے پیسٹ گرل کا انعام ملا تھا اور مس راحیلہ کا یہ کہتے ہوئے انعام و ناکہ تم نہ صرف کلج کی بلکہ میری بھی پسندیدہ لڑکی ہو، تو کوئی تو خوبی ہوگی تب ہی نا۔ ”اب کہاں تک سنیں گے کہاں تک سناؤں۔“

خامیاں بتاتے ہوئے بھی نہیں جھجکتا چاہیے میرے اندر بھی بہت سی خامیاں ہیں۔ پہلے تو بیچ جاگنے میں سست ہوں۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کی ٹینشن لے کر اپنا پی پی ہائی کر بیٹھتی ہوں۔ ہائی بلڈ پریشر کی مریض ہوں اس لیے غصہ بھی جلدی آ جاتا ہے۔

5۔ برسات مجھے بہت پسند ہے۔ بچپن میں تو برسات کا بہت مزا آتا تھا۔ بارش میں نہانا، بھاگنا اور بھاگتے ہوئے کچھڑ میں گر جانا، پر اب وہ مزا کہاں۔

یہ سچ ہے کہ مجھ کو عقل نے کچھ پختگی تو دی پر وہ مزا کہاں جو نادانیوں میں تھا برسات کے حوالے سے واقعہ ہے۔ عید کی چھٹیوں میں میں۔ اپنی فیملی کے ساتھ لاہور گئی سیر کرنے، وہاں ہم مینار پاکستان کے پاس بیٹھے تھے کہ ایک دم آسمان پر کالی گھٹائیں چھا گئیں اور دیکھتے ہی دیکھتے بارش شروع ہو گئی۔ ہم اس بارش میں کہاں جاتے۔ ویسے بھی گرمیوں کی بارش تھی، وہاں عید کی وجہ سے کافی رش تھا۔ گرمیوں کی بارش میں سب بھیگ گئے۔ ہم بھی وہیں بیٹھے رہے۔ بچوں نے خوب انجوائے کیا لاہوریوں کے ساتھ۔ اس بارش کے بعد جو ہم نے تصویریں کھینچی تھیں انہیں دیکھ کر آج بھی ہنسی آتی ہے۔

6۔ شعر تو بہت پسند ہیں، کن میں موسٹ فیورٹ۔ چار راتیں ہیں ہزار باتیں ہیں اس سے کیا، کیا کہو گے خاور

وہ چہرہ پڑھ پڑھ یاد کرلو وہ جاچکے تو کتاب لکھنا مجھے نقص الانبیاء کتاب بہت پسند ہے جس نے

نہیں پڑھی ضرور پڑھیں۔
خط میں ضرورتاً میں کہ میرا انتخاب کیسا لگا۔
مشعل فیاض۔۔۔ گوجرانوالہ

1۔ شعاع سے وابستگی ساڑھے تین سال پہلے ہوئی
اور یہ ہر لحاظ سے پرفیکٹ ہے۔ شعاع سے نانا ایک
دکان میں ہوا۔ میں لینے تو ”بچوں کا باغ“ گئی تھی پر
دکان دار نے شعاع پیک کر دیا۔ میں نے کچھ اور بھی
چیزیں لی تھیں۔ تو ایک ساتھ ہی قیمت دی۔ گھر آئی تو
اتنے بڑے بچوں کے باغ میں ماڈل دیکھ کر حیران رہ گئی
اچھا نہیں لگا۔ پر مانا نے پڑھ لیا۔ جب رسالے کے

صفحے دیکھنے لگی تو اداکاروں کے انٹرویو تھے۔ بہت شوق
ہے مجھے انٹرویوز پڑھنے کا۔ پھر آہستہ آہستہ رسالہ بھی
پڑھ لیا۔ پھر دو تین ماہ بعد میں سیالکوٹ گئی تو خالہ
توصیفہ کے گھر شعاع ملا پھر تو گہری دوستی ہو گئی شعاع
سے ہماری ساری فیملی مثلاً ”خالہ توصیفہ“ خالہ انعم
اور اب میں شعاع کو بہت پسند کرتی ہیں اور خواتین کو
بھی۔

2۔ صبح کا آغاز اذانوں سے ہوتا ہے۔ میری نیند بہت
کچی ہے تو اٹھ کر نماز پڑھ لیتی ہوں۔ پھر نیند نہیں
آتی۔ تھوڑی دیر لیٹ کر سارے گھر کے کام کرتی
ہوں۔ ساڑھے سات بجے تک تیار ہو کر کالج جاتی
ہوں۔ واپسی ڈیڑھ بجے تک ہو جاتی ہے۔ میں سیکنڈ ایر
کی طالبہ ہوں۔ گھر آکر کچھ نہیں کرتی، کیونکہ میں
سارے کام صبح ہی کر جاتی ہوں، اکلوتی ہوں، گھر کے
کام ہی اتنے نہیں ہوتے، پھر پڑھائی تین گھنٹے کے
لیے، پھر ٹی وی، پھر پڑھائی، پھر رات کا ڈراما۔ اس میں
شعاع کے لیے ٹائم نکالنا مشکل نہیں۔ رات کو گیارہ
بجے سو جانا اور ہاں میں سو جاتی بھی بڑا ہوں۔

3۔ شعاع کی ہر تحریر بہت اچھی ہوتی ہے، خاص کر
”جنت کے تے“ نبیلہ عزیز بہت اچھا لکھتی ہیں، ان
کی تحریر ”درد دل“ نے واقعی درد دل کر دیا تھا۔ عمیرہ
احمد کا امرتیل اتنا پسند ہے مجھے جس کی کوئی حد نہیں۔

باقی رائےز بھی بہت اچھا لکھتی ہیں۔

4۔ میری خوبیوں کے بارے میں تو مجھے خود نہیں
پتا، خیر کوشش کر لیتی ہوں، حساس دل ہوں، کوئی روتا
بعد میں ہے، پہلے میں رونے بیٹھ جاتی ہوں۔ اپنی خالہ
توصیفہ کا بہت خیال رکھتی ہوں اور یہ ہی میری بڑی
خوبی ہے۔ خامیاں بے شمار ہیں۔ کام چور، سست، غصہ
ور بہت زیادہ ہوں، غصے میں تو دل کرنا دوسروں کا گلاب
دل۔ خیر اتنی بھی خوف ناک نہیں ہوں، بس ٹھیک
ہے۔

5۔ بارش مجھے کبھی اچھی نہیں لگتی۔ الجھن ہوتی
ہے بارش کو دیکھ کر اور جو مسلسل بارش ہو تو چڑ جاتی
ہوں اور بند ہونے کی دعا کرتی ہوں۔

6۔ پسندیدہ شعر کوئی خاص نہیں، لطیفے مجھے یاد نہیں
رہتے۔

راستوں کے درمیان چھپی ہوئی ہیں دوریاں
سہمی سی یہ رات ہے روشنی کے درمیان



ہیولیٹن سکس کا تھار کردہ

Herbal

سوہنی شیمپو

SOHNI SHAMPOO

➤ اس کے استعمال سے چند دنوں میں خشکی ختم ➤
➤ کرتے ہوئے بالوں کو روکتا ہے ➤
➤ بالوں کو مضبوط اور چمکدار بناتا ہے ➤

قیمت - 90/- روپے

رجسٹری سے منگوانے پر اور سی آر ڈار سے منگوانے والے

دو بوتلیں - 250/- روپے تین بوتلیں - 350/- روپے

اس میں ڈاک خرچ اور ٹیکس چارج شامل ہیں۔

بذریعہ ڈاک سے منگوانے کا پتہ

پوٹی بکس 53 اور گڑھ مارکیٹ، ایم اے جناح روڈ، کراچی۔

دفتری خریدنے کے لیے:

کتبہ عمران ڈائجسٹ 37، مارو بازار کراچی۔ فون نمبر 32216361

رخسانہ نگار عدنان

ایک نئی کہانی

عدیل اور فوزیہ نسیم بیگم کے بچے ہیں۔ بشریٰ ان کی بہو ہے اور ذکیہ بیگم کی بیٹی ہے۔ عمران بشریٰ کا بھائی ہے۔ مثال ذکیہ بیگم کی نواسی اور نسیم بیگم کی پوتی ہے۔ بشریٰ اور نسیم بیگم میں روایتی ساس بہو کا تعلق ہے۔ بائیس سال کی مسلسل کوششوں کے بعد بشریٰ کی نند فوزیہ کا بالآخر ایک جگہ رشتہ طے پا جاتا ہے۔ نکاح والے روز بشریٰ دولہا ظہیر کو دیکھ کر چونک جاتی ہے۔ عدیل سے شادی سے قبل ظہیر کا بشریٰ کے لیے بھی رشتہ آیا تھا مگر بات نہ بن سکی تھی۔ نکاح والے دن فوزیہ کی ساس زائدہ اور ذکیہ بیگم بھی ایک دوسرے کو پہچان لیتی ہیں۔ بعد ازاں عدیل کو بھی پتا چل جاتا ہے۔ وہ ناراض ہوتا ہے مگر فوزیہ اور نسیم بیگم کو بتانے سے منع کر دیتا ہے۔ بشریٰ اور عدیل ایک ہفتے کے لیے اسلام آباد جاتے ہیں۔ وہاں انہیں پتا چلتا ہے کہ بشریٰ کے ہاں سات سال بعد پھر خوش خبری ہے۔

عفان اور عاصمہ اپنے تین بچوں اور والد کے ساتھ کرائے کے گھر میں رہتے ہیں۔ عفان کے والد فاروق صاحب سرکاری نوکری سے ریٹائر ہوئے ہیں۔ گریجویٹ اور گاؤں کی زمین فروخت کر کے وہ اپنا گھر خریدنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ڈیڑھ کروڑ میں زمین کا سودا کر کے وہ عفان کے ساتھ خوشی خوشی شہر آرہے ہوتے ہیں کہ ڈکیتی کی واردات میں قتل ہو جاتے ہیں۔ عفان کے قریبی دوست زبیر کی مدد سے عاصمہ عفان کے آفس سے تین لاکھ روپے اور فاروق صاحب کی گریجویٹ سے سات لاکھ روپے وصول کر پاتی ہے۔ زبیر گھر خریدنے میں بھی عاصمہ کی مدد کر رہا ہے۔

اسلام آباد سے واپسی پر عدیل دونوں مقتولین کو دیکھتا ہے۔ زائدہ، نسیم بیگم سے بیس لاکھ روپے سے مشروط فوزیہ کی رخصتی کی بات کرتی ہیں۔ وہ سب پریشان ہو جاتے ہیں۔ عدیل بشریٰ سے ذکیہ بیگم سے تین لاکھ روپے لانے کو کہتا ہے۔ عاصمہ کی مجبوری ہے کہ گھر میں کوئی مرد نہیں۔ اس کا بیٹا ابھی چھوٹا ہے اور سارے کام اس نے خود کرنے ہیں۔ وہ جلد از جلد اپنا گھر خریدنا چاہتی ہے۔ عاصمہ کے کہنے پر زبیر کسی مفتی سے فتویٰ لے کر آ جاتا ہے کہ دوران عدت انتہائی ضرورت کے پیش نظر گھر سے نکل سکتی ہے بشرطیکہ مغرب سے پہلے واپس گھر آجائے، سو وہ عاصمہ کو مکان دکھانے لے





جاتا ہے۔ اور موقع سے فائدہ اٹھا کر اسے اپنی ہوس کا نشانہ بناتا ہے اور ویرانے میں چھوڑ کر فرار ہو جاتا ہے۔ وہاں سے وہ عدیل کی مدد سے گھر پہنچ جاتی ہے۔

رلم مہمان ہونے کی صورت میں فوزیہ کو طلاق ہو جاتی ہے۔ نسیم بیگم جذباتی ہو کر سوا اور اس کے گھر والوں کو مورد الزام ٹھہرانے لگتی ہیں۔ اسی بات پر عدیل اور بشری کے درمیان خوب جھگڑا ہوتا ہے۔ عدیل طیش میں بشری کو دھکا دیتا ہے۔ اس کا ابارشن ہو جاتا ہے۔ عدیل شرمندہ ہو کر معافی مانگتا ہے مگر وہ ہنوز ناراض رہتی ہے اور اسپتال سے اپنی ماں کے گھر چلی جاتی ہے۔ اسی اسپتال میں عدیل عاصمہ کو دیکھتا ہے جسے بے ہوشی کی حالت میں لایا گیا ہوتا ہے۔ عاصمہ اپنے حالات سے تنگ آکر خودکشی کی کوشش کرتی ہے تاہم بچ جاتی ہے۔ نو سال بعد عاصمہ کا بھائی ہاشم پریشان ہو کر پاکستان آ جاتا ہے۔ عاصمہ کے سارے معاملات دیکھتے ہوئے ہاشم کو پتا چلتا ہے کہ زہیر نے ہر جگہ فراڈ کر کے اس کے سارے راستے بند کر دیے ہیں اور اب مفروز ہے۔ بہت کوششوں کے بعد ہاشم عاصمہ کو ایک مکان دلایا جاتا ہے۔

بشری اپنی واپسی الگ گھر سے مشروط کر دیتی ہے۔ دوسری صورت میں وہ علیحدگی کے لیے تیار ہے۔ عدیل مکان کا اوپر والا پورشن بشری کے لیے سیٹ کروا دیتا ہے بشری کے آنے کے بعد بشری کو مجبور کرتا ہے کہ وہ فوزیہ کے لیے عمران کا رشتہ لائے۔ نسیم بیگم اور عمران کسی طور نہیں مانتے۔ عدیل اپنی بات نہ مانے جانے پر بشری سے جھگڑتا ہے۔ بشری بھی ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرتی ہے۔ عدیل طیش میں بشری کو طلاق دے دیتا ہے اور مثال کو پھین لیتا ہے۔ مثال بیمار پڑ جاتی ہے۔ بشری بھی حواس کھو دیتی ہے۔ عمران بسن کی حالت دیکھ کر مثال کو عدیل سے پھین کر لے آتا ہے۔ عدیل عمران پر اغوا کا پرچا کھاتا ہے۔

عاصمہ اسکول میں ملازمت کر لیتی ہے مگر گھریلو مسائل کی وجہ سے آئے دن چھٹیاں کرنے کی وجہ سے ملازمت چلی جاتی ہے۔

انسپکٹر طارق دونوں فریقین کو سمجھا بھجا کر مصالحت پر آمادہ کرتے ہیں۔ ذکیہ بیگم کی خواہش ہے کہ عدیل مثال کو لے جائے، تاکہ وہ بشری کی کہیں اور شادی کر سکیں۔ دوسری طرف نسیم بیگم بھی ایسا ہی سوچے بیٹھی ہیں۔ فوزیہ کی اچانک شادی کے بعد نسیم بیگم کو اپنی جلد بازی پر پچھتاوا ہونے لگتا ہے۔ انسپکٹر طارق ذکیہ بیگم سے بشری کا رشتہ مانگتے ہیں۔ ذکیہ بیگم خوش ہو جاتی ہیں مگر بشری کو یہ بات پسند نہیں آتی۔

وہ گرین کارڈ کے لالچ میں بشری سے منگنی توڑ کر نازیہ بھٹی سے شادی کر لیتا ہے، پھر شادی کے ناکام ہو جانے پر ایک بیٹے سیفی کے ساتھ ایک طویل عرصے بعد دوبارہ اپنی چچی ذکیہ بیگم کے پاس آ جاتا ہے اور ایک بار پھر بشری سے شادی کا خواہش مند ہوتا ہے۔ بشری تذبذب کا شکار ہو جاتی ہے۔

بشری اور احسن کمال کی شادی کے بعد عدیل مستقل طور پر مثال کو اپنے ساتھ رکھنے کا دعوا کرتا ہے مگر بشری اقسعی نہیں مانتی، پھر احسن کمال کے مشورے پر دونوں بمشکل راضی ہو جاتے ہیں کہ مہینے کے ابتدائی پندرہ دنوں میں مثال بشری کے پاس رہے گی اور بقیہ پندرہ دن عدیل کے پاس۔ گھر کے حالات اور نسیم بیگم کے اصرار پر بالآخر عدیل عفت سے شادی کر لیتا ہے۔ والدین کی شادی کے بعد مثال دونوں گھروں کے درمیان گھن چکر بن جاتی ہے۔ بشری کے گھر میں سیفی اور احسن اس کے ساتھ کچھ اچھا برتاؤ نہیں کرتے اور عدیل کے گھر میں اس کی دوسری بیوی عفت۔ مثال کے لیے مزید زمین تنگ بشری اور عدیل کے نئے بچوں کی پیدائش کے بعد پڑ جاتی ہے۔ مثال اپنا اعتماد کھو بیٹھتی ہے۔ احسن کمال اپنی فیملی کو لے کر ملائیشیا چلا جاتا ہے اور مثال کو تاریخ سے پہلے عدیل کے گھر بھجوا دیتا ہے۔ دوسری طرف عدیل اپنی بیوی بچوں کے مجبور کرنے پر مثال کے آنے سے قبل اسلام آباد چلا جاتا ہے۔ مثال مشکل میں گھر جاتی ہے۔ پریشانی کی حالت میں اسے ایک نشی تنگ کرنے لگتا ہے تو عاصمہ آکر اسے بچاتی ہے۔ پھر اپنے گھر لے جاتی ہے۔ جہاں سے مثال اپنے ماموں عمران کو فون کر کے بلواتی ہے اور اس کے گھر چلی جاتی ہے۔

عاصمہ کے حالات بہتر ہو جاتے ہیں۔ وہ نسبتاً پوش ایریا میں گھر لے لیتی ہے۔ اس کا کوچنگ سینٹر خوب ترقی کر جاتا

ہے۔ مثال 'واثق' کی نظروں میں آپکی ہے تاہم دونوں ایک دوسرے سے واقف نہیں ہیں۔
عاصمہ کا بھائی ہاشم ایک طویل عرصے بعد پاکستان لوٹ آتا ہے اور آتے ہی عاصمہ کی بیٹیوں ایشہ اور اربہ کو اپنے بیٹوں وقار و قاص کے لیے مانگ لیتا ہے۔ عاصمہ اور وثاق بہت خوش ہوتے ہیں۔

سیفی 'مثال' پر بری نیت سے حملہ کرتا ہے تاہم مثال کی چیخوں سے سب وہاں پہنچ جاتے ہیں۔ سیفی الٹا مثال پر الزام لگاتا ہے کہ وہ اسے ہمارے ہی تھی۔ احسن کمال بیٹے کی بات پر یقین کر لیتا ہے۔ مثال اور بشری مجبور اور بے بسی سے کچھ کہہ نہیں پاتیں۔ احسن کمال پوری فیملی سمیت دوسرے ملک میں شفٹ ہو جاتا ہے۔ بشری مثال کو مستقل عدیل کے گھر چھوڑ جاتی ہے۔ جہاں عفت اور پریشے اسے خاطر میں نہیں لاتیں۔ وثاق کو بہت اچھی نوکری مل جاتی ہے۔ مثال اور وثاق کے درمیان ان کا سا تعلق بن جاتا ہے۔ مگر مثال کی طرف سے دوستی اور محبت کا کوئی واضح اظہار نہیں ہے۔ وثاق البتہ محل کر اپنے جذبات کا اظہار کر چکا ہے۔ وثاق 'عاصمہ' سے اپنی کیفیت بیان کر دیتا ہے۔ عاصمہ خوش ہو جاتی ہے مگر غائبانہ ذکر پر بھی مثال کو پہچان نہیں پاتی۔ وثاق عاصمہ کو لے کر مثال کے گھر ملنے جاتا ہے۔ مگر دروازے پر عدیل کو دیکھ کر عاصمہ کو برسوں پرانی رات یاد آ جاتی ہے۔ جب زبیر نے عاصمہ کی عصمت دری کر کے اسے ویرانے میں چھوڑ دیا تھا اور عدیل نے عاصمہ کو گھر پہنچایا تھا۔ اگرچہ عدیل نے اس وقت بھی نہیں سمجھا تھا کہ عاصمہ پر کیا ہوتی ہے اور اب بھی اس نے عاصمہ کو نہیں پہچانا تھا مگر عاصمہ کو عدیل بھی یاد تھا اور اپنے ساتھ ہونے والا وہ بھیانک حادثہ بھی۔ شرمندگی اور ذلت کے احساس سے عاصمہ کو انجانا کا اٹیک ہو جاتا ہے۔ وثاق دروازے سے ہی ماں کو اسپتال لے جاتا ہے۔ مثال اس کا انتظار کرتی رہ جاتی ہے۔ پھر بہت سارے دن یوں ہی گزر جاتے ہیں۔ ان ہی دنوں عدیل اپنے دوست کے بیٹے فہد سے مثال کا رشتہ طے کر دیتا ہے۔ عفت 'مثال' کے لیے اتنا بہترین رشتہ دیکھ کر بری طرح مل جاتی ہے۔ اس کی دلی خواہش ہے کہ کسی طرح یہ رشتہ پریشے سے طے ہو جائے۔ مثال بھی اس رشتے پر دل سے خوش نہیں ہے۔ مگر وہ اپنی کیفیت سمجھ نہیں پاتی۔ عاصمہ کی طبیعت ذرا سنبھلتی ہے تو وہ مثال کی طرف جانے کا ارادہ کرتا ہے۔ اتفاق سے اسی دن مثال کی فہد سے منگنی کی تقریب ہو رہی ہوتی ہے۔ وہیں کھڑے کھڑے وثاق کی ملاقات پریشے سے ہو جاتی ہے جو کافی ناز و ادا سے وثاق سے بات کرتی ہے اور اس بات سے بے خبر ہوتی ہے کہ اس کی کلاس فیلو درودہ جو اسے بہت پسند کرتی ہے 'واثق' کی بہن ہے۔ منگنی کے بعد مثال ایک دم شادی سے انکار کر دیتی ہے۔ عفت خوش ہو جاتی ہے۔ عدیل بہت غصہ کرتا ہے اور بشری کو فون کر کے مثال کو بھیجنے کی بات کرتا ہے۔ مگر میں نیشن پھیلی ہے۔ اسی نیشن میں مثال کالج کی لائبریری میں وثاق سے ملتی ہے۔ واپسی میں عفت اسے وثاق کے ساتھ دیکھ لیتی ہے اور عدیل کو بتا دیتی ہے۔ عدیل از حد پریشان ہو جاتا ہے۔ پریشے درودہ سے ملنے اس کے گھر جاتی ہے تو وثاق سے ملاقات ہو جاتی ہے۔

پچیسویں قسط

وہ کچھ لمحے وہیں کھڑی خالی دماغ سی دیکھتی رہی۔
سامنے گاڑی میں بیٹھا عدیل احمد کسی اور ہی طرف ایک ٹکدے دیکھتے ہوئے کسی گہری سوچ میں گم تھا۔
مثال کو ہمیشہ کی طرح اپنے باپ الگ طرح ہی کا پیار آیا تھا۔
”بابا دانی کے واقعے کے بعد کس قدر پریشان ہیں پھر عفت ماما کا رویہ کتنے اکیلے سے ہو گئے ہیں بچارے اور پھر جس طرح میں انہیں پریشان کر رہی ہوں انہیں مجھ سے تو یہ امید نہیں ہوگی۔“
وہ ہمیشہ کی طرح اس بار بھی سارے کردہ ناکردہ جرم اپنے ہی کھاتے میں ڈال کر عدیل کو سرخو کر رہی تھی جب ہارن کی آواز نے اسے چونکایا۔ عدیل ہارن بجا کر اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔
وہ ہنسنے ٹھیک کرتی فائل کو سینے سے لگائے مضبوط قدم اٹھاتی گاڑی کی طرف بڑھی۔

”پتا نہیں وہ آج اسے خود کیوں لینے کے لیے آئے تھے؟ ایسا پہلے تو کبھی نہیں ہوا تھا، کم سے کم بہت سالوں سے تو بالکل بھی نہیں۔“ اسے کچھ عجیب سا لگ رہا تھا۔

”ایسا! پری کو بھی بلا لوں ویسے اس کی ابھی دو کلاسیں رہتی ہیں۔ میں اسے کہہ دوں جا کر۔“ وہ گاڑی کے پاس جا کر شیشے میں جھک کر پوچھنے لگی۔ عدیل نے اسے گہری نظروں سے دیکھا۔

اور نفی میں سر ہلا دیا۔

اس نے گہرا سانس یوں لیا جیسے کہیں بہت دور کا سفر کر کے آیا ہو۔

”تم آ جاؤ۔ پری اپنی دین میں آ جائے گی۔“ وہ اب سامنے دیکھ رہا تھا۔ مثال خاموشی سے دوسری طرف کا دروازہ کھول کر بیٹھ گئی۔

”ایسا!“ اس کی مسلسل خاموشی پر وہ کچھ دیر بعد قدرے محتاط لہجے میں آہستگی سے بولی۔

”گھر میں سب ٹھیک ہے نا!“ اسے کچھ ایسا لگا جیسے کچھ ہوا ہو۔

”پتا نہیں۔“ وہ عجیب لہجے سے بولا۔ ”تو وہ حیران سی رہ گئی۔“

”آپ آس سے آرہے ہیں؟“ وہ پھر رہ نہ سکی تو کچھ توقف سے بولی۔

”ہوں!“ معلوم نہیں وہ بات ہی نہیں کرنا چاہ رہا تھا۔

”آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا!“ وہ اس کے انداز پر رہ نہ سکی تو تھوڑی دیر بعد پھر پوچھنے لگی۔

”اگر گھر میں کچھ ہو گا یا میری طبیعت ٹھیک نہیں ہوگی تو ہی میں آپ کو پک کرنے آ سکتا ہوں، تمہارے پوچھنے کا یہ مطلب ہے کیا؟“ وہ لہجے میں بہت کچھ جتاتے ہوئے بولا۔ ”تو وہ کچھ شرمندہ سی ہو گئی۔“

”نہیں بیبا سوری!“ وہ واقعی میں شرمندہ ہو گئی تھی۔

”سوری۔ فارواث؟“ وہ پھر سے الٹا پوچھنے لگا۔

وہ کچھ بول ہی نہ سکی گو وہ میں رکھی فائل پر اپنی نم انگلیاں یوں ہی پھیرتی رہی۔

اگر باپ اور بیٹی کے بیچ میں ماں نہ رہے تو بیٹی کو باپ کو سمجھنا اس سے بات کرنا کتنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ماں ان دونوں کے درمیان پل ہوتی ہے اور بہت سال ہوئے مثال اور عدیل کے تعلق کے بیچ کا یہ پل کہیں کھو گیا تھا۔ مگر گیا تھا۔ دونوں کے درمیان اب خلا سا تھا اس پل کے کھو جانے کے بعد۔

اور وہ خلا اتنے سالوں کی مدت بھی اس کو نہیں بھر سکی تھی، بلکہ عفت اور اس کے دونوں بچوں کے آجانے کے بعد یہ خلا کچھ اور بڑھ گیا تھا۔

کاش میں اسی آسانی کے ساتھ بیبا سے بات کر سکتی جتنی آسانی اور بے تکلفی سے میں ماما کی موجودگی میں کر لیا کرتی تھی۔

”پتا نہیں بیبا مجھے کیوں خود سے اتنی دور دور محسوس ہوتے ہیں؟ ایک عجیب سا خوف، عجیب سا رعب۔ میں ڈر گئی ہوں ان سے کبھی بھی کھل کر بات نہیں کر پاتی اور اب تو یہ خوف اور بڑھ گیا ہے کہ کہیں بیبا مجھے ماما کے پاس نہ بھجوا دیں۔“

وہ کن اکھیوں سے باپ کو دیکھتے ہوئے افسردہ سی بیٹھی کچھ سوچے جا رہی تھی۔

عدیل کیا سوچ رہا تھا۔ اسے معلوم نہیں تھا، کیونکہ اس کا چہرہ بظاہر سپاٹ تھا، لیکن سامنے سیدھی سڑک پر جی اس کی نظروں میں بہت کچھ تھا۔

گہری سوچ، فکر اور دکھ۔ یہ تینوں چیزیں مثال کو اپنے باپ کے ساتھ جڑی بالکل اچھی نہیں لگتی تھیں۔

”دادو کی زندگی میں تو پایا پھر بھی کبھی کبھار ہنس پڑتے تھے، بے ساختہ مسکرا لیتے تھے، مگر اب تو جیسے وہ مسکراتا بھول گئے ہیں۔ اس کا دل پھر باپ کے لیے پگھلا جا رہا تھا۔
 وہ گہرا سانس لے کر باہر کی طرف دیکھتے ہوئے چونک سی گئی۔
 ”پاپا، ہم گھر نہیں جا رہے کیا؟“ کچھ دیر تک وہ نہ سکی تو پھر پوچھنے لگی۔
 ”جا رہے ہیں گھر میں۔“ بڑا مبہم سا جواب تھا جبکہ وہ جانتی تھی یہ رستہ کم از کم گھر نہیں جا رہا۔
 عدیل کا دھیان بھی اس کی طرف نہیں تھا۔ خدا جانے وہ کس بات کو اتنی توجہ سے سوچے جا رہا تھا۔ اب مثال کو کچھ پریشانی ہونے لگی۔



”پاکٹ منی۔“ وہ شفر سے ہنکارا۔
 ”دانی!“ عفت اس کے انداز سے گنگ سی تھی۔
 ”آپ کے نزدیک سو دو سو روپیہ پاکٹ منی ہے۔ مائی فٹ اتنے میں آپ ایک ڈھنگ کا پیزا برگر کچھ بھی تو نہیں کھا سکتے۔ ایک اچھا ڈرنک بھی نہیں لے سکتے اور آپ کہتی ہیں۔ مجھے پاکٹ منی ملتی تو ہے۔“ وہ غصے میں بھرا ہوا تھا آج عفت نے اسے اسکول نہیں بھیجا تھا۔
 وہ اس سے بات کرنا چاہتی تھی، اسے سمجھانا چاہتی تھی، لیکن وہ کسی بھی بات کو سننے سمجھنے کے لیے تیار ہی نہیں تھا۔

اس کی اپنی ہی دنیا تھی، جس میں ہر بات کی الگ ہی لاجک تھی۔
 ”میرے فرینڈز کے پاس ان کی پاکٹ میں ان کے والٹ میں ففٹی تھاؤنڈز سے کم پیسے نہیں ہوتے۔ میں تو اپنے فرینڈز میں ڈھنگ سے بات بھی نہیں کر سکتا۔ میرا والٹ ہمیشہ خالی ہوتا ہے اور مٹھی میں آپ کے شوہر سو دو سو روپے دے کر سمجھتے ہیں، وہ اپنی ذمہ داری بڑے شان دار طریقے سے نبھا رہے ہیں۔“ غصہ، نفرت، طیش، ہزاری کیا کچھ نہیں تھا اس کے لہجے میں؟
 عفت جب بھی دانی سے اس طرح کھل کر بات کرنا چاہتی، کسی نئی دنیا کی حیرت میں گم ہو جاتی تھی۔ وہ ہر بار ایک بدلا ہوا دانی ہوتا تھا۔ معلوم نہیں وہ ایسا کیوں تھا۔

لاکھ سرچنے پر بھی عفت کو معقول وجہ سمجھ میں نہیں آتی تھی۔
 ”تمہارا باپ اتنا امیر آدمی نہیں ہے دانی!“ وہ بے بسی بے چارگی کی تصویر بن کر بولی۔
 ”تو پھر وہ مجھ سے کس طرح (توقع) Expect کرتے ہیں کہ میں محنت کروں گا، میں بہت کچھ بنوں گا۔ وہ خود کیوں نہیں محنت کرتے۔ کیوں دو سروں کے قادر ز کی طرح آگے بڑھتے ان کی طرح پیسہ نہیں کماتے۔ وہ جس

جاب پر پہلے دن لگے تھے، آج تک وہیں خود کو کھپا رہے ہیں۔ ہر سال دو تین ہزار روپے کی انکم منٹ سے وہ خوش ہو جاتے ہیں، پراؤڈ فیل کرتے ہیں کہ وہ کتنا ارن کر رہے ہیں۔“
 وہ سولہ ساڑھے سولہ سال کا دانی تو کہیں سے بھی نہیں لگ رہا تھا۔

”میرے پاس نہ برانڈڈ کپڑے ہوتے ہیں، نہ اس اسٹینڈرڈ کی ڈریسنگ ہوتی ہے میری، جس طرح کی میرے فرینڈز کرتے ہیں۔ میں کس طرح ان کے درمیان سو کروں، مجھے خود سے Irritation (جھنجلاہٹ) ہوتی ہے۔ میں خود کو بونگا فیل کرتا ہوں۔ ایک سیلف میڈ، غریب باپ کا بیٹا۔ ایک بیٹا ہی ہوں میں پاپا کا، انہوں نے کبھی

میرے ساتھ کچھ اسپتال نہیں کیا۔ ان کا رویہ ”ان کی سوچ میرے لیے ہمیشہ فارگرائیڈ ہوتی ہے۔“ وہ حیرت انگیز انکشاف کر رہا تھا۔
 ”ایسے نہیں سوچتے دانی! وہ تم سے سب سے زیادہ محبت کرتے ہیں۔“ عفت نے بات کو سلجھانے کی طرف پیش قدمی کی۔

”مجھے ان کی محبت کی ضرورت نہیں، مجھے وہ جو کچھ پرووائیڈ کرتے ہیں اس میں ان کی محبت نظر آنی چاہیے“ ان کی پروا میرے لیے ان کا خیال۔ کچھ بھی تو نہیں۔ النامیں اپنے دوستوں میں بیٹھ کر شرمندہ ہوتا ہوں کہ میں اپنے پیرئس کا ایک ہی بیٹا ہوں۔ کوئی بھی۔ کوئی بھی میری تکلیف کو نہیں سمجھ سکتا آپ بھی نہیں۔ پایا بھی نہیں۔“ اس کا غصہ بڑھتا جا رہا تھا اور عفت کی حیرت!

”اسی لیے۔ اسی لیے میں یہاں اس گھر میں کسی سے بات نہیں کرتا کیونکہ کوئی بھی مجھے نہیں سمجھتا۔ سمجھنا چاہتا بھی نہیں، جب کسی کو بھی میری پروا نہیں تو مجھے بھی کسی کی فکر نہیں۔ آپ لوگ اپنی مرضی سے زندگی جنیں مجھے میری مرضی سے جینے دیں، مت انٹرفیر کریں جو کچھ میں کر رہا ہوں۔“ وہ کھڑے ہو کر زور زور سے بول رہا تھا۔ اور عفت کو جیسے خود پر قابو پانا محال ہو گیا۔ اس نے ایک دم سے اس کے منہ پر تھپڑ جڑ دیا۔ وہ ششدر سا گال پر ہاتھ رکھے ماں کو دیکھتا رہا۔

اس ماں کو جس نے کبھی آج تک اس سے سخت لہجے میں بات نہیں کی تھی، تھپڑ تو بہت دور کی بات تھی۔ ”تمہیں اگر اتنی سمجھ ہے اپنی ضرورتوں کی، اپنی تکلیفوں کی، اپنی سب باتوں کی تو پھر تمہارے اندر اتنی عقل بھی ہونی چاہیے کہ تم اپنے ماں باپ کو بھی سمجھنے کی، ان کو سننے کی کوشش کرو، جنہوں نے تمہیں پیدا کیا پالا پوسا تمہاری ہر ضرورت کو من کر پورا کیا۔“

”کوئی احسان نہیں کیا آپ نے مجھ پر۔ ساری دنیا کے والدین ایسے ہی کرتے ہیں۔“ وہ ہر لحاظ اٹھا کر چل دیا تھا۔

”میں اپنی مرضی سے۔ اس گھر میں کبھی پیدا نہیں ہوتا اگر مجھ سے پوچھا جاتا، جہاں کسی کو میری ضرورت تھی ہی نہیں اور سن گیں آپ بھی بے شک بتا دیں بابا کو بھی، مجھے یہاں رہنا بھی نہیں جہاں رہتے ہوئے مجھے اپنے ہونے پر شرمندگی ہو۔ میں چلا جاؤں گا یہاں سے بہت جلد۔ پھر روٹی رہنا مجھے یاد کر کے۔“ وہ چیخا ہوا چلا گیا عفت پتھر کی طرح بیٹھی رہ گئی۔



شفاف پانیوں کی نیلی جھیل میں تیرتی چھوٹی چھوٹی مختلف رنگوں کی مچھلیاں ایک دوسرے سے ٹکراتی رزق کے چھوٹے چھوٹے ذروں کے پیچھے بھاگ رہی تھیں وہ کن اکھیوں سے ان خوب صورت سنہری رنگ والی مچھلیوں کو دیکھ رہی تھی وہ ٹریٹریل پر پلیٹیں اور چچ چھریاں کانٹے رکھ رہا تھا۔

وہ چلا گیا تو کچھ لحوں کے لیے بالکل خاموشی ہو گئی سارے میں! اس نے جیسے ڈرتے ڈرتے عدیل کی طرف نظریں اٹھا کر دیکھا وہ اس کی طرف منتظر نظروں سے دیکھ رہے تھے۔
 ”نہیں۔۔۔ نہیں بابا۔“ بہت آہستہ مگر دو ٹوک لہجے میں اس نے کہا تھا۔ کہہ کر اس نے فوراً ”عدیل کے چہرے کی طرف دیکھا۔

اس کے باپ کی تھکی ہوئی پڑمرہ آنکھوں میں کیسی زندگی سے بھرپور چمک کی لہر دوڑی تھی وہ لمحے بھر کو بس انہیں دیکھتی رہ گئی۔

”کیا پایا کو لگتا تھا انہیں یقین تھا کہ میرا جواب یہ نہیں ہوگا۔“ اس نے دل میں کچھ اور سوچا۔
 ”تمہیں یقین ہے نامثال۔“ وہ اس سے کئی گارنٹی چاہ رہا تھا۔
 اس نے آہستگی سے اثبات میں سر ہلا کر گردن جھکا لی تو اسے لگا واثق ان پچھلیوں کے پاس جھیل کنارے بیٹھا
 اسے بہت شکایتی نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ مگر وہ کیا کرتی؟

اس نے طے کر لیا تھا کہ وہ اب اپنے پایا کو کوئی دکھ نہیں دے گی، مگر اس کا دل۔
 وہ اپنے دل کا کیا کرتی، چونہ چاہتے ہوئے بھی واثق کی طرف کھنچا جا رہا تھا۔
 ”شکر ہے میرے اللہ کا۔“ اس نے عدیل کی تشکر بھری برید ہاٹ سنی تو چونک کر باپ کو دیکھنے لگی۔
 ”مجھے جانے کیوں خوف سا تھا مثال۔ مجھے لگ رہا تھا شاید تم کسی میں۔ حالانکہ میں جانتا ہوں میری بیٹی اس
 ٹائپ کی نہیں ہے، میری بیٹی بہت معصوم سادہ اور ان چیزوں سے دور رہنے والی ہے، وہ اس طرح کی بات نہیں کر
 سکتی مگر۔“ وہ جیسے رک کر مناسب الفاظ سوچنے لگا۔

”مثال! پھر آپ کے پون بار بار انکار کی وجہ۔؟ مجھے پریشان کر رہی تھی بیٹا۔“ وہ کچھ بے بسی سے بولا۔
 ”پاپا میں اتنی جلدی نہیں چاہتی یہ سب میں ابھی اپنی تعلیم مکمل کرنا چاہتی ہوں۔ اپنے پیروں پر کھڑی ہونا
 چاہتی ہوں۔“ اس نے دھیمے مگر فریادی سے لہجے میں کہا۔
 ”میں جانتا ہوں، سمجھتا ہوں آپ کی فہلنگز کو۔ لیکن مثال۔“ وہ پھر رک گیا کوئی سوچ تھی جو اسے روکتی
 تھی۔

”پاپا۔ کیا بات ہے۔“ وہ پریشان ہو کر پوچھنے لگی۔ اسے عدیل کی طبیعت اچھی نہیں لگ رہی تھی۔
 ”پتا نہیں۔ بہت عجیب سافیل ہو رہا ہے، ڈانی والے واقعے نے جیسے مجھے توڑ کر رکھ دیا ہے۔“ وہ ہلکے سے سینہ
 مسل کر بولا۔

اور پہلی بار۔ پہلی بار مثال کو لگا اس کا باپ ایک دم سے بوڑھا ہو گیا ہے۔
 اس کا جی چاہا وہ فوراً اٹھ کر پایا کو اپنے ساتھ لگا کر انہیں دلا سادے، تسلی دے کہ پاپا میں ہوں نا آپ کے ساتھ
 میں آپ کو کبھی ٹوٹنے نہیں دوں گی۔
 مگر صرف اس کی آنکھوں میں کمی اتری، وہ یہ سب کہہ نہیں سکی اپنے باپ سے۔
 ”آپ ٹھیک ہیں پاپا؟“ وہ اٹھ کر پاس آ کر بولی۔

”میں ٹھیک ہوں مثال۔ معلوم نہیں مجھے کیوں لگ رہا ہے، میرے پاس اب زیادہ وقت نہیں ہے۔“ وہ پہلی بار
 بہت بے چینی سے جیسے اسے کچھ الہام ہوا ہو بے بس لہجے میں بولا۔
 ”نہیں پاپا! آپ پلیز ایسی باتیں نہیں کریں۔ آپ کو کچھ نہیں ہوگا اور دانی ابھی نا سمجھ ہے آپ اسے ٹائم دیں،
 توجہ دے وہ ٹھیک ہو جائے گا۔“ وہ ہولے ہولے باپ کا کندھا دبا کر بولی۔
 ”مجھے نہیں لگتا۔ شاید اب اس کا وقت گزر گیا ہے۔“ وہ کراہ کر آہستہ آواز میں بولا۔

”پاپا ایسا نہیں ہے، میں بھی آپ کے ساتھ دانی کو ٹائم دوں گی، ہم مل کر اسے سدھار لیں گے۔“ وہ بڑے عزم
 سے کہہ رہی تھی۔

”اس کی اب ضرورت نہیں“ وہ خود کو سنبھال کر سیدھا ہو کر بولا۔ مثال اسے دیکھ کر رہ گئی۔
 ”مجھے صرف تم سے یہ تسلی چاہیے تھی مثال! کہ تم میرے ساتھ کچھ بھی ایسا ویسا نہیں کرنے والی، جو دانی نے
 کیا ہے، کیوں کہ مثال میں وقار اور فائزہ کو زبان دے چکا ہوں، وہ جلد شادی کا کہہ رہے ہیں اور میں اپنی زبان سے
 پیچھے نہیں ہٹوں گا۔ تم اپنی ایجوکیشن جو بھی تمہارا ارادہ ہے شادی کے بعد اسے پورا کرنے کا سوچنا۔“ وہ رک کر

جیسے سانس لینے لگا۔

”میں سب محاذوں پر نہیں لڑ سکتا، تمہاری طرف سے مجھے اطمینان ہونا چاہیے، وہ اس مہینے میں شادی کی ڈیٹ مانگ رہے ہیں میں انہیں تارخ دے رہا ہوں۔ تم اب مجھے دوبارہ پریشان نہیں کرو گی۔“ وہ اس کے لیے راستے بند کرتے جا رہے تھے۔ اس نے خاموشی سے سر جھکا دیا۔
وہ ٹراب ان کے آگے کھانا سرو کر رہا تھا۔



عفت چہرے پر برسوں کی بیمار صورت سجائے کسی گہری سوچ میں بیٹھی تھی۔ پری دوبار چکر لگا کر جا چکی تھی۔
”مما! یہ مثال آپ کی کدھر رہ گئیں آج، میں کب سے کالج سے آچکی ہوں اور وہ۔“ تیسری بار وہ نہ سکی تو پوچھ بیٹھی۔

”جہنم میں۔“ وہ سخت نفرت بھرے لہجے میں بولی۔

”میں بتا رہی ہوں نا اس کا کہیں نہ کہیں چکر چل رہا ہے۔“ وہاں کے پاس بیٹھ کر رازدارانہ انداز میں بولی۔
”تو بھاگ جائے منحوس جس کے ساتھ چکر چلا رہی ہے، ہماری جان چھوڑے، یہاں کم عذاب ہیں ہمارے لیے ایک سو مزید آئیٹھیں۔“ عفت کو ساری مصیبتوں کی وجہ صرف مثال لگ رہی تھی۔ پری ماں کو دیکھ کر رہ گئی۔
”تمہارے باپ کو جو تھوڑی بہت اس گھر کی فکر ہوتی تھی تم دونوں کی پروا ہوتی تھی، وہ بھی نہ رہی جب سے یہ پچھل پیری اس گھر میں آئی ہے۔“ وہ دانیال کے رویے سے سخت کبیدہ خاطر تھی اور غصہ مثال کی موجودگی پر نکالتی جا رہی تھی۔

”ہو تو رہی ہے دفع، وہ بھی اتنی شاندار جگہ پر۔“ پری حسد بھرے لہجے میں جیسے کلس کر بولی۔
عفت کو جیسے بھولا ہوا ایک اور غم یاد آگیا۔

”یہ بھی صرف تمہارے باپ کی وجہ سے۔“ وہ اس جلے بھنے انداز میں پھر سے کہہ گئی۔
”ہمارے ساتھ یہ نا انصافی کب تک ہوتی رہے۔“ ممّا! پاپا ہمیشہ مثال آپ کی کو ترجیح دیتے ہیں، جیسے وہ سوتیلی نہیں، میں اور دانی سوتیلے ہیں۔ دیکھ رہی ہیں آپ اس کے بعد پاپا نے دانی کو بلایا تک نہیں۔ اسے بالکل سب سے کاٹ کر جیسے الگ کر دیا گیا ہو۔“ وہ جانتی تھی دانی ماں کی کمزوری ہے اس کو ہٹ کرتے ہوئے بولی عفت کی آنکھوں میں مارے دکھ کے آنسو آگئے۔

”کیا کروں میں۔ میرا بچہ کیسا اکیلا سا بڑ گیا، باپ ہوتے ہیں اولاد کے۔ ہمدرد، پھر بیٹا وہ بھی اکیلا۔ کیا کیا نہیں کرتے باپ اکلوتے بیٹے کے لیے۔ ایک یہ ہیں، کیا کر رہا ہے کہاں ہے؟ کیا چاہتا ہے؟ کوئی پروا ہی نہیں۔“ وہ ہاتھ مل کر کہہ رہی تھی۔ پری کسی اور ہی سوچ میں گم تھی۔

”مما! کیا مثال آپ امریکہ چلی جائیں گی شادی کے بعد اس فمد بھائی کے ساتھ۔“ وہ کچھ دیر بعد گہری سوچ سے

نکل کر پوچھ رہی تھی۔

”کالے پانی جائے ہماری بلا سے۔ وہاں بے گی تو پھرناں، اس کی ماں کا گھر کن مشکلوں سے ببا، ساری دنیا جانتی ہے، جیسی ماں تھی ویسی ہی بیٹی ہوتی ہے نا۔“ اور اندر آتی مثال اور اس کے پیچھے کھڑے عدیل کے قدم وہیں رک گئے۔ عفت کی دونوں کی طرف پشت تھی۔

پری ان دونوں کو دیکھ چکی تھی مگر ماں کو روک نہیں سکتی تھی جواب بھی منہ بھر کر بول رہی تھی۔

”دیکھ لینا میری بات لکھ کر رکھ لو، چوتھے دن یہ لڑکھڑکیاں کی طرح نہ طلاق کے کاغذ لے کر واپس آئی تو میرا بھی نام عفت نہیں۔“ وہ جوش بھرے لہجے میں کہتے ہوئے یونہی ذرا سا بیٹھے بیٹھے گھومی اور سامنے کھڑی مثال اور پیچھے کھڑے کینہ توڑ نظروں سے گھورتے عدیل کو دیکھ کر جیسے گنگ سی ہو گئی۔ عدیل اسے دیکھتا جا رہا تھا۔

”آپ آگئے، سخت فکر مند ہو رہی تھی میں بھی اور پری بھی، آپ کو کال کر رہی تھی مگر یہ۔۔۔“ عفت بولتے بولتے خود ہی رک گئی عدیل اسی طرح اسے دیکھے جا رہا تھا۔

مثال سر جھکا کر کسی مجرم کے سے انداز میں کھڑی تھی۔

”اچھا ہی ہوا عفت بیگم! تم نے اپنے دل کی نفرت ظاہر کر دی اگرچہ مجھے پہلے بھی کوئی شک نہیں تھا کہ تم مثال کے بارے میں کیسی سوچ رکھتی ہو۔ اب یقین ہو گیا۔“ وہ سرد لہجے میں اسے گستاہیں جیسے جم کر کھڑا تھا۔

عفت کھڑے کھڑے جیسے زمین کے اندر دو گھنس رہی تھی۔ وہ دو قدم بڑھا کر اس کی طرف آیا۔

”کسی انسان کو بدلنا تو کسی دوسرے انسان کے بس کی بات نہیں، لیکن یہ یاد رکھنا کہ وقت ہمیشہ ایک جیسا نہیں رہتا کبھی بھی۔ تمہاری بری سوچ کے باوجود۔ عفت! پری میری بیٹی ہے میں اس کے لیے ہمیشہ ایک بہت اچھی زندگی کی دعا کرتا رہوں گا کہ اسے تمہاری سوچ کی سزا خدا کبھی نہیں دے۔“

اور عفت کو عدیل سے کم از کم یہ امید تو کبھی بھی نہیں رہی تھی کہ وہ اس طرح دونوں بیٹیوں کے سامنے ایک سگی۔ اور ایک سوئلی دونوں کے سامنے اس طرح اسے پورے قد سمیت چھوٹا کر دے گا کہ وہ کبھی خود کو آئینہ دیکھنے کے قابل نہیں سمجھے گی۔

”کسی دوسرے کے لیے برا سوچنے والے اپنے لیے اچھے ہونے کی امید کیسے رکھ سکتے ہیں یہ مقام حیرت ہے۔“ وہ اسے جتانے والے انداز میں کہہ کر انہیں قدموں پر واپس مڑ کر گھر سے باہر جا چکا تھا۔

اور عفت گھبراہٹ میں یہ بولتے ہوئے بھول گئی کہ ابھی عدیل کے آفس سے واپسی کا وقت کب ہوا تھا جو وہ اسے جتا رہی تھی کہ وہ کہاں رہ گیا تھا وہ پریشان ہو رہی تھی۔

عفت وہیں بندھال سی گر گئی، پری ترس بھری نظروں سے ماں کو دیکھنے لگی مثال بو جھل قدموں سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

دل تو یوں بھی بہت بھاری ہو رہا تھا۔

آج اس کے دل نے پہلی جنم لیتی محبت کو جو ابھی پھوٹ کر کوئل بھی نہیں بنی تھی، بڑی خاموشی سے الوداع کہہ دیا تھا۔ اس کا بھاری پتھر سا وزن کچھ کم نہیں تھا جو عفت کی یہ باتیں! ”کیسے۔۔۔ کیسے اس نے مثال کو ہمیشہ بشری کے ساتھ جوڑ کر یہ طے کر رکھا تھا کہ اگر بشری طلاق لے کر گئی تھی تو مثال کے ساتھ بھی یہی کچھ ہونا تھا۔

وہ زخم جو اتنے سال گزر جانے کے بعد ابھی تک مثال کے دل میں ہر اتھا کہ جیسے یہ اندوہناک واقعہ ابھی کل ہی تو ہوا ہے پھر عفت جیسے لوگ جو اسے مندل ہونے ہی نہیں دیتے تھے اس کا دل بھر بھر آ رہا تھا۔

لیکن اسے رونا نہیں۔ لیکن یہ بھی پتا تھا کہ اگر نہیں روئے گی تو اس کا دل پھٹ جائے گا۔

”کاش یہ دل پھٹ جائے تو سارے عذاب آج ختم ہو جائیں گے، کمرے کا دروازہ بند کرتے ہوئے اس نے دل سے دعا کی، لیکن وہ لمحہ قبولیت کا نہیں تھا۔ وہ بے آواز آنسوؤں سے پکھلتی شمع کی طرح یونہی قطرہ قطرہ سلگنے لگی۔



عفت نے بڑی محنت سے دانی کی پسند کی ساری ڈشز بنائی تھیں وہ صبح سے کمرے میں بند تھا۔ اس کی بد تمیزی اور اتنے برے رویے کے باوجود بھی عفت نے بہت سوچ سوچ کر خود اپنے بیٹے کے لیے محنت

کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ اب خود دانی کو بدلے گی اسے ایک اچھا قابل لڑکا بنائے گی اور عدیل پر ایک دن ثابت کر دے گی کہ وہ ایسی بھی غیر ذمہ دار پھوڑیاں نہیں ہے جس نے صرف بچوں کو پیدا کیا ہے انہیں بنانے سنوارنے کی طرف دھیان نہیں دیا اس کے دل میں عزم تھا وہ ٹھنڈوں بچن میں کھسی اس کے لیے اس کی پسند کے کھانے بناتی رہی۔

”مما! آپ کی طبیعت خراب ہو جائے گی بس کر دیں۔“ پری بے چین ہو کر کئی بار آئی۔

”اور مجھے نہیں لگتا کہ دانی یہ سب کھائے گا اور جس طرح اس نے آپ کے ساتھ بد تمیزی کی آپ کو اس سے ناراض ہونا چاہیے تھا! لٹا آپ اس کی خاطر داریاں کر رہی ہیں۔“ وہ کوفت بھرے لہجے میں کہہ رہی تھی۔

”پری! تمہیں سبھی اس کے ساتھ کچھ دوستی محبت کا برتاؤ کرنا ہو گا۔“ تمہارا اچھوٹا بھائی ہے اسے تمہارا پیار چاہیے تمہاری توجہ۔“ وہ پری کو بھی سمجھانے لگی۔

”تمما! وہ ان سب چیزوں سے دور جا چکا ہے۔“ پری نے دم پر رکھے پلاؤ میں سے ایک بوٹی اٹھا کر کھاتے ہوئے کہا۔

”ایسا نہیں ہے پری! تمہیں بھی میرا ساتھ دینا ہو گا۔“ وہ پوری طرح سے فیصلہ کر چکی تھی کہ اسے دانی کو سدھارنا ہے۔ باہر اسپورٹس بائیک کی تیز آواز آئی۔ اور ماں بیٹی چونک گئیں۔

تاسف بھری نظروں سے پری ماں کی طرف دیکھتے ہوئے فریج سے کولڈ ڈرنک نکال کر پینے لگی۔

”ساری آپ کی محنت بے کار گئی اس کا جگری دوست بولی باہر آ گیا ہے ممما! وہ اب کسی بھی صورت گھر نہیں رکے گا اور رات سے پہلے آئے گا نہیں اور کھانا تو وہ اب گھر میں نہیں کھائے گا۔“

اور عفت کو لگ رہا تھا کھڑے کھڑے اس کی تختہ کمر سے جو درد کی لہریں اٹھ رہی ہیں۔ اس کے پورے جسم کو بے جان کر رہی ہیں وہ خود کو گھسٹتے ہوئے باہر لے گئی۔

”دانی! رکومت جاؤ باہر بیٹا! تمہارے پاپا آنے والے ہیں اچھا بولی کو اندر بلا لو میں نے تمہارے لیے کھانا تیار کیا ہے بہت محنت سے۔ دانی رکو۔“ وہ اسے تیار ہو کر باہر جاتے دیکھ کر پکارتی اس کے پیچھے لپکی تھی مگر وہ ان سنی کر کے جا چکا تھا۔



”نہیں۔“ مثال خود کو سنبھال چکی تھی سو متوازن لہجے میں بولی دوسری طرف واثق کچھ ٹھٹھکا۔

”مثال۔“ وہ بے چینی سے بولا۔

”واثق میں نے آپ کو بتایا تھا کہ میں اب آپ سے کوئی رابطہ نہیں رکھنا چاہتی مجھے اب صرف وہ کرنا ہے جو میرے بابا چاہیں گے۔“ وہ دو ٹوک لہجے میں بولی۔

”تو پھر تمہیں میری کال بھی نہیں لینی چاہیے تھی جبکہ تم مجھے رات میں منع کر چکی تھیں۔“ وہ طنز بھرے لہجے میں بولا۔

مثال ایک دم سے خاموش ہو گئی۔

اس کی آنکھوں میں پھر سے نمی اترنے لگی۔

”تم پلیز اب رونا شروع نہیں کر دینا میں کچھ جتا نہیں صرف مذاق کر رہا ہوں۔“ وہ فوراً سے بولا۔

پتا نہیں اسے کیسے مثال کے آنسوؤں کے بارے میں پتا چل جاتا تھا۔

”میں نہیں رو رہی۔“ وہ آہستگی سے آنکھیں صاف کر کے فوراً بولی۔

”اچھی بات ہے تم نے اپنی آنکھیں صاف کر لیں مثال! میں صرف یہ چاہتا ہوں تم ہنسو مسکراؤ اور دل سے خوش زندگی بسر کرو تم کبھی نہیں روؤ۔“ وہ بہت جذبے سے کہہ رہا تھا۔

ایسی محبت بھری دعا کبھی کسی نے اس کے لیے نہیں چاہی تھی۔ اس کی آنکھیں پھر بھیگنے لگیں۔ وہ کچھ بول ہی نہیں سکی۔ وہ یوں بھی واثق کے سامنے کچھ بول نہیں پاتی تھی۔ آج تو اس نے اتنا کہہ کے جیسے بالکل ہی اسے گنگ کر دیا۔

”مثال! ہم اچھے دوست ہیں اور ہمیشہ رہیں گے، کبھی میری دوستی تمہارے لیے کسی پریشانی کی وجہ بنی تو یقین کرو میں تمہارے منع کرنے سے پہلے خود ہی پیچھے ہٹ جاؤں گا اور تم جانتی ہو میں کم از کم تمہارے دل کا حال تو تھوڑا بہت جان ہی لیتا ہوں۔“ وہ پھٹکی سی ہنسی ہنساتا تھا۔

اور اس کا دل چاہا وہ رو دے۔

”اگر کھل کر رونا چاہتی ہو تو پلیز رو لو تمہارے دل کا بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔“ وہ پھر کچھ دیر بعد اسے مشورہ دیتے ہوئے بولا۔

”یہ بوجھ اب کبھی ہلکا نہیں ہو گا۔“ وہ بھاری آواز میں بولی۔ دونوں طرف چند لمحوں کے لیے خاموشی چھا گئی۔

”مثال۔“ وہ بوجھل آواز میں اس کا نام لے کر بولا تو اس کا دل بہت بری طرح سے دھڑکا۔ اسے یوں لگا جیسے وہ اس کے پہلو میں ہی بہت قریب اس سے جڑ کر بیٹھا ہو، وہ کچھ اور بھی سمٹ کر مختصر سی نظروں سے اپنے دائیں طرف دیکھنے لگی۔

”تم مجھے اتنی اجازت تو دو گی میں کبھی کبھار جب دل کے ہاتھوں بہت مجبور ہو جاؤں تو تم سے بات کر لوں، تمہیں فون کر لوں؟“ وہ بہت مجبور سے لہجے میں کہہ رہا تھا۔

”پتا نہیں ایسا ہو بھی سکے گا یا نہیں۔ میرے ساتھ آگے کیا ہونے والا ہے میں خود بھی نہیں جانتی۔ میں کسی بھی بات کے بارے میں کبھی بھی شیور نہیں رہی۔ مجھے ہونے ہی نہیں دیا گیا ہمیشہ ہر معاملے میں میں ٹٹی رہی۔ تقسیم شدہ۔“ وہ کسی گہرے دکھ کی سوچ میں ڈوب کر دھیرے سے بولی۔

واثق کچھ بول ہی نہیں سکا۔

”ہمیشہ اپنے فیصلوں کے لیے بہت اہم فیصلوں کے لیے مجھے کسی اور کی طرف دیکھنا پڑا۔ جن بچوں کے ماں باپ تقسیم ہو جاتے ہیں نا واثق! وہ زندگی میں بہت بے اعتبار بے بھروسہ رہتے ہیں ہر معاملے ہر کام میں ڈانوا ڈول۔ میں بھی ایسی ہوں۔ آج میں آپ کو اجازت دے دوں اور کل میرے ساتھ کیا ہو میں کچھ بھی نہیں جانتی۔“ وہ رک رک کر بڑے طریقے سے اقرار اور انکار کے بیچ لٹکی۔ جیسے خود بھی اسے اپنی زندگی سے خارج نہ کرنا چاہتی ہو۔ شاید وہ اسے ہمیشہ اجازت اور انکار کے درمیان رکھنا چاہتی تھی اس نے آہستگی سے واثق کا جواب نے بغیر فون کر دیا۔



”کل فائزہ بھابھی اور وقار آرہے ہیں شادی کی ڈیٹ فکس کرنے کے لیے۔“ ناشتے کی میز پر وہ تینوں چونک کر

عدیل کو دیکھنے لگیں۔ عفت کچھ لمبے کچھ بول نہیں سکی۔

کل دونوں کے درمیان جو تلخ کلامی ہوئی تھی اس کے بعد عدیل نے رات اسٹڈی روم میں ہی گزار دی اور

عفت کا حوصلہ ہی نہیں ہو سکا کہ وہ جا کر اسے کمرے میں آنے کے لیے کہے، ساری رات بے چین خالی بیڈ پر کروٹیں لیتی رہی۔

ایک دانی کی پریشانی جو رات بہت دیر میں گھر آیا اور عدیل کو اس کے باہر ہونے کا پتا نہیں چلے وہ خنکی میں گیٹ کے آس پاس اندھیرا کیے شعلتی اس کا انتظار کرتی رہی۔

اس کے گھنٹی بجانے سے پہلے ہی اس نے بہت آہستگی سے بغیر کسی کھٹکے کے گیٹ کھول دیا۔

وہ ماں کو دیکھے بغیر کسی معذرتی رویے کے بغیر اپنے میں مگن اندر چلا گیا۔ اور وہ خود بھی اس وقت دانی سے الجھنا نہیں چاہتی تھی۔ اگر عدیل کو پتا چل گیا تو بہت بڑا ہنگامہ ہو جائے گا۔

اور اب عدیل کی بے اعتنائی۔ اسے رات بھر توڑتی رہی شاید غلطی میری ہے، مجھے مثال کے لیے اتنا بھی برا نہیں سوچنا چاہیے بہر حال میں بھی ایک بیٹی کی ماں تو ہوں۔ وہ آخر میں اس نیچے پر پہنچی تھی۔

وہ عدیل سے معذرت تو نہیں کر سکتی تھی۔

لیکن اس نے خود ہی صبح بیڈنی بنا کر عدیل کو جا کر اسٹڈی میں دے دی جہاں اس نے اپنا سنگل بیڈ بھی بچھا رکھا تھا۔

معلوم نہیں وہ بھی رات بھر سویا یا نہیں، لیکن بستر بے شکن تھا۔

”اور فہم۔ وہ بھی آرہا ہے؟“ بہت دیر بعد عفت کو خیال آیا کہ اسے کچھ بولنا تو چاہیے۔ عدیل کے کرسی چھوڑنے سے پہلے بولی۔

”فہم اس ہفتے آرہا ہے۔“ وہ نے تلے انداز میں بولا۔

”دانی اسکول چلا گیا ہے۔“ وہ کچھ دیر بعد خود ہی بولا۔

”جی۔ چلا گیا ہے۔“ وہ کچھ شرمسار سے لہجے میں بولی۔

”میں ابھی اس کے اسکول جا رہا ہوں“ اس کے پرنسپل نے بلوایا ہے۔ معلوم نہیں وہ اب اسے اسکول میں رکھتے ہیں یا نہیں، پولیس اسٹیشن سے پھر آنا چھوٹی بات نہیں، ان کے اسکول کی رہ پو کا مسئلہ ہے اور میرے خیال میں بھی اس کا اسکول تبدیل کر دینا چاہیے، یہاں کی بری کمپنی نے اسے کہیں کا نہیں چھوڑا شاید اسکول بدلنے سے اس کی سوچ کچھ بستر ہو سکے۔“ وہ خود ہی رک رک کر بول رہا تھا۔

اور عفت کو تو صرف یہ خوشی تھی کہ اس نے خود سے ہی دانی کی بات تو کی۔

”میں خود بھی یہی چاہتی ہوں کہ اس کا اسکول بدل دیا جائے۔“ وہ خوش ہو کر بولی۔

”وہ رات کو دیر سے آیا تھا گھر؟“ وہ کچھ دیر بعد بولا۔ عفت کچھ بول ہی نہ سکی نہ ہاں کر سکی نہ ناں۔

”پاپا! میری وین آگئی ہے“ میں جا رہی ہوں کالج خدا حافظ۔“ مثال وین کا ہارن سن کر اپنا بیگ اٹھا کر جاتے ہوئے بولی۔

”سنو مثال۔“ عدیل نے اسے پکارا۔

بری اور عفت متوجہ ہو گئیں۔

”کچھ نہیں، تم جاؤ واپس آؤ گی تو پھر بات ہو گی۔“ کچھ سوچ کر عدیل نے کچھ ٹالنے والے لہجے میں کہا۔

مثال سر ہلا کر تیزی سے باہر نکل گئی۔

”اب تو میرے خیال میں مثال کو کالج نہیں چاہنا چاہیے۔ اگر کل وہ لوگ ڈیٹ فکس کرنے کے لیے آرہے

ہیں تو۔ یوں بھی کونسا لمبے دنوں کی تاریخ رکھیں گے وہ؟“ عفت کچھ جتا کر بولی۔

”میں بھی مثال سے یہی کہنے والا تھا اب وہ جارہی ہے تو سوچا واپس آئے گی تو بات کر لوں گا۔“ وہ کپ رکھ کر کھڑا ہو گیا۔

”اور عفت! تم مجھے لسٹ بنا دو سامان کی جو مثال کے لیے چاہیے ہو گا میرے خیال میں اب ہمیں تیاریاں شروع کر دینی چاہئیں۔“

”جی بالکل آپ آج کو شش کریں آفس سے اگر جلدی آسکیں تو پھر ہم بیٹھ کر بات کر لیں گے، کچھ لسٹ میں بنالوں کی پھر دیکھ لیں گے یہ سب کیسے ہوتا ہے۔“ وہ بھی ذرا جوش بھرے لہجے میں خوشدلی سے بولی۔

”ٹھیک ہے میں کو شش کرنا ہوں اگرچہ وقار نے تو منع کیا ہے جینز وغیرہ کے لیے، لیکن ظاہر ہے دنیا داری کے لیے سہی ہمیں خالی ہاتھ تو رخصت نہیں کرنا مثال کو۔“

”بالکل انشاء اللہ سب کچھ ہو گا جو ہم کر سکے۔“ عفت بھی اسی کے لہجے میں بولی۔ عدیل شاید خفیف سا مسکرایا تھا عفت کو ایسا ہی لگا۔

”پاپا ہم بھی اس گھر میں رہتے ہیں آپ کبھی میرے متعلق بھی کوئی بات کر لیا کبھی۔“ تو مجھے بھی احساس ہو میں آپ کی بیٹی ہوں۔ ”ایک دم سے پری تلخی سے کہتے ہوئے بیک اٹھا کر تیز چلتی باہر نکل گئی۔

عدیل اور عفت لمحہ بھر کو گم صدم سے رہ گئے، پھر عدیل کچھ کے بغیر خاموشی سے نکل گیا۔

”بالکل احمق ہے یہ پری کیا کروں میں اس کا؟ عفت بریدہ داتے ہوئے برتن اٹھانے لگی۔

”ابھی دانی کی میسجیں کم ہوں تو یہ بچارے کسی اور طرف دھیان کریں۔ عدیل غلط نہیں شاید میں ہی ان دونوں کی تربیت دھنک سے نہیں کر سکی۔“ وہ برتن اٹھا کر کچن میں لے گئی۔



”یہ کیا کہہ رہی ہو پری!“ ”وردہ کو کچھ اور بھی حیرت نے آگھیرا۔ پری نے بات ہی ایسی کی تھی۔“

”یار اگر تم میں حوصلہ نہیں ہے کہ تم میری بات اپنے بھائی تک پہنچاؤ تو یار مجھے اجازت دو میں تمہارے گھر آکر ان سے خود بات کر لوں۔ کر سکتی ہوں نا؟“ ”وہ بے باک سے لہجے میں پوچھ رہی تھی وردہ کچھ بول ہی نہیں سکی۔“

”کیا میں نے تمہارے سر پر کوئی دم پھوڑ دیا ہے؟ اس دن بھی تم نے مجھے کوئی جواب نہیں دیا تھا آج بھی گونگی ہو گئی ہو۔“ وہ سنبھل کر بولی۔

”کسی کو پسند کرنا جرم تو نہیں اور یہ کسی کے اختیار میں بھی نہیں۔ حالانکہ میں یہ فرسٹ سائٹ لوپر یقین نہیں رکھتی لیکن تمہارے بھائی کو دیکھ کر۔“ ”وہ ہونٹ کاٹ کر کچھ اور بولتے بولتے رک سی گئی۔“

”ایک بات کہوں پری۔“ ”وردہ کچھ فیصلہ کن انداز میں بولی۔“

”ہاں یہی تو چاہ رہی ہوں یار تم کچھ بولو کچھ اپنی اوجھن اور میں کیا کروں۔“ ”وہ سخت بے قراری سے بولی۔“

”میں نے خود جب تمہیں پہلی بار آئی میں جب میں پہلی بار تم سے ملی، تمہیں دیکھا تو میرے دل نے بھی بے اختیار یہی خواہش کی تھی۔ کہ کسی طرح تم میری پیاری سی بھابھی بن جاؤ۔“ ”وہ آنکھوں میں چمک لیے رک رک کر بولی۔“

تو پری بے یقین سی اسے دیکھنے لگی۔

”تمہیں یقین نہیں آیا میری بات کا۔“ ”وہ اسے ہلا کر بولی۔ پری نے زور سے نفی میں سر ہلایا۔“

”کیوں میں ایسا کیوں نہیں سوچ سکتی؟“ ”وہ خفگی سے بولی۔“

”اس دن جب میں نے تم سے بات کی تھی یار تمہیں تو سانپ سو گنگھ گیا تھا میں سمجھی شاید تمہیں میری بات بری لگی۔“ پری سر ہلا کر بولی۔

”پھر بتاؤ ناں تم کو گی اس نے بھائی سے بات۔“ وہ خیال آنے پر پھر بے چین ہو کر بولی۔
 ”آں ابھی نہیں کچھ دن ٹھہر جاؤ۔“ ورنہ کچھ سوچ کر بولی ”اب پری کو کیا بتاتی وہ پہلے بات کر کے گھر میں کتنا ذلیل ہوئی ہے واثق اور عاصم سے۔“

”کتنے دن یار۔“ پری کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ ابھی ورنہ کے گھر جا کر خود واثق سے بات کر لے۔
 ”پری! تمہاری وین کتنے بجے آئے گی آج۔“ اسی وقت مثال اس کے پاس آ کر بولی۔
 ”پتا نہیں۔“ وہ فوراً ”لا تعلق ہو کر بولی۔“

”اوہ انکل کا فون آگیا تھا میری وین کے۔“ انہیں کسی ایمر جنسی میں شہر سے باہر جانا پڑ گیا ہے تو وہ ہمیں پک نہیں کر سکیں گے۔“ وہ رک کر بولی۔

”ہمارا تو آج پریکٹیکل بھی ہے تین بج جائیں گے ہمیں تو۔“ وہ اسی لا تعلق سے بولی۔
 ”اوہ پھر تو مجھے دیر ہو جائے گی میری اب کوئی کلاس بھی نہیں۔ ٹھیک ہے میں خود ہی کسی اور کے ساتھ چلی جاتی ہوں شاید فردا جا رہی ہے اس کے ساتھ چلی جاتی ہوں۔“ وہ کہہ کر چلی گئی۔ پری نے یونہی سر جھٹکا۔
 ”ریٹلی یار یہ تمہاری اسٹیمپ سسٹر ہے۔“ ورنہ اسے دور جاتے دیکھ کر کچھ سرگوشی میں بولی۔
 ”ہوں۔“ پری نے فقط ہنکارا بھرا۔

”ویسے یار تم سے بالکل الگ ہے یہ بڑی گریس ہے اس میں۔“
 تمہاری بہن نہیں لگتی یار بالکل بھی۔“ ورنہ کچھ سراپنے والے ڈھکے چھپے انداز میں بولی۔
 ”تو پھر دشمن لگتی ہو گی اگر بہن نہیں لگتی تو۔“ پری خود ہی ٹھٹھا مار کر ہنسی تو ورنہ کچھ بول نہ سکی۔
 ”سنو تمہارا بھائی کہیں اور تو انوالو نہیں؟“ کچھ خیال آنے پر پری رازداری سے پوچھنے لگی۔
 ”ہی تو مجھے معلوم کرنا ہے۔ میں اس لیے چاہ رہی تھی کہ تم ابھی کچھ دن ویٹ کر لو میں خود مناسب موقع دیکھ کر گھر میں بات چلاؤں گی کیا خیال ہے تمہارا۔“
 ”ہوں۔“ پری کسی سوچ میں کم بولی۔

”تمہارے گھر میں آئی مین تمہاری بدر اور بھائی۔“ انہیں یہ بات کیسی لگے گی۔“ وہ کسی خدشے کے تحت بولی۔
 ”آئی ڈونٹ نو یار ابھی مجھے کچھ اندازہ نہیں بٹ میں بہت خوش ہوں! بہت زیادہ میں نے سوچا بھی نہیں تھا جس لڑکی کو میں نے پہلی نظر دیکھتے ہی اپنی بھابی کے روپ میں دیکھنے کی تمنا کی تھی۔ وہ میری بھابی ضرور بنے گی۔ بنو گی ناں۔“ جھک کر اس کی ٹھوڑی کو چھوئی ورنہ نے کہا تھا۔



”کیوں لا بیری کیا کرنے جانا ہے“ تم جانتی ہوناں اب تمہارا کالج جانا بھی ختم ہے۔“ عفت کڑے لہجے میں

اس کو دیکھتے ہوئے بولی۔
 ”ماما کچھ ضروری بکس ایڈو کروار کھی تھیں میں نے ایک تو وہ واپس کرنے ہیں ہفتے سے اوپر ہو چکا ہے تو وہ دے آتی ہوں۔“ وہ کچھ بے چارہ سا منہ بنا کر بولی۔
 ”پری کو دے دو وہ لوٹا آئے گی۔“ عفت کچھ سوچ کر بولی۔

”ماما مجھے ایک دو بکس لینی بھی ہیں پلیز۔“ وہ منت سے بولی۔ عفت تیز ہاتھوں سے سبزی بناتی رک کر اس کا

جائزہ لینے لگی۔
 ”یہ بالک گوشت تمہارے باپ کی کمزوری ہے اور گھر میں ان کے علاوہ صرف تم کھاتی ہو، باقیوں کے لیے کچھ اور بنے گا دانی کو قورمہ چاہیے تو پری کو کچھ اور، تمہیں کیا لگتا ہے میں کوئی مشین ہوں جو یہ سب کچھ ایک ہی وقت میں بنا ڈالوں گی اور تم مزے سے سیرپائے کرتی پھو۔“ وہ چھری پنج کر بولی۔
 ”ماما میں صرف آدھے گھنٹے میں آجاؤں گی پراس پھر میں آکر سب کر لوں گی۔“ وہ لجاجت سے بولی۔
 ”تمہارے ساس سسر نے کل آنا ہے شادی کی تاریخ لینے، کیا یہ بہتر نہیں کہ تم یہ کتابیں و کتابیں چھوڑ کر کچھ گھر داری سیکھو، تمہاری ماں کا طعنہ دوں گی پھر تمہیں بھی خوب برا لگے گا اور تمہارے باپ کو بھی۔“ وہ طعنہ مارنے سے رہ نہ سکی۔ مثال نے سر جھکا لیا۔

”اور آخر میں برا کون بنے گا میں کیونکہ تم اپنی ماں کے پاس نہیں میرے پاس رہ رہی ہو، وہ تو عیاشی کی زندگی گزارتی ہر مذہب داری سے آزاد مزے میں طعنے تر لے ملیں گے کہ سو تیلی ماں نے لڑکی کو کچھ سکھایا نہیں۔“ عجیب ہی رنج اور غصہ تھا جو عفت کچھ اور ہی طرح سے نکال رہی تھی۔

اسے لگتا تھا بشری نے دونوں بار ایک بہت شاندار زندگی گزار دی ہے اسے کبھی کوئی رنج یاد دکھ نہیں ملا، دونوں شوہروں نے اسے ہتھیلی کا پھپھولا بنا کر رکھا ہے اور ایک بد قسمت عفت کہ جس کی تقدیر میں صرف مصیبتیں ہی مصیبتیں ہیں۔ وہ اب زور زور سے پالک کے پتے کترتی جا رہی تھی۔

”جاؤ اب میرے سر پر کیا کھڑی ہو، جو دل کرتا ہے کرو بھلے آدھے گھنٹے میں واپس آنا یا رات گئے میں کون ہوتی ہوں منع کرنے والی۔“ وہ لٹھ مار انداز میں بولی۔

مثال کی آنکھوں میں ڈھیر سارا پانی اتر آیا۔

”ماما! پھپھو کی کال ہے، وہ آپ کو بلا رہی ہیں۔“ اندر سے پری کی آواز آئی تو عفت چھری وہیں پنج کراٹھ کر اندر چلی گئی مثال کچھ دیر متذنب سی کھڑی رہی۔

اگر میں نہیں بھی جاتی یہ سب کام کر دیتی ہوں تو یوں کون سا کوئی گولڈ میڈل مل جائے گا مجھے اور اس گھر کی گھٹی فضا سے نکل کر مجھے تھوڑا سا سانس باہر نکل کر لینا ہے۔ اس نے دل میں سوچا اور آہستگی سے باہر نکل گئی۔



”ٹھیک ہے امی۔ میں لیتا آؤں گا۔“ واثق نے دواؤں کا نسخہ ہاتھ میں لیتے ہوئے سر ہلایا۔

”اور کچھ تو نہیں لے کر آتا۔“ وہ جاتے ہوئے رک کر بولا۔

”نہیں ہے سب کچھ اور سنو بہت دیر نہیں لگانا مجھے تم سے کچھ بات بھی کرنی ہے واثق۔“ عاصمہ کچھ سوچ کر بولی تو واثق کے قدم وہیں رک گئے۔

”آپ ابھی بات کریں کیونکہ میری واپسی تھوڑا لیٹ ہوگی مجھے خواہ مخواہ پریشانی رہے گی کہ آپ کی بات سنے بغیر کیوں آگیا۔“ وہ فوراً ”ماں کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ بٹھاتے ہوئے بولا عاصمہ کو اس پر بہت پیار آیا۔

”نہیں ایسا کچھ نہیں ہے، تم دیر سے آؤ گے تو اس وقت بات کریں گے۔ ابھی تم جاؤ۔“ وہ نرم لہجے میں بولی۔

”نہیں امی! ایسے نہیں پلیز آپ کریں بات۔“ وہ مصر لہجے میں بولا۔ عاصمہ کو ہاتھ اب یہ بات سنے بغیر نہیں جائے گا۔

”تمہیں سعدیہ یاد ہیں نا جو ہمارے پچھلے گھر میں ہمارے ساتھ رہتی تھی، جس کے آئیڈیے پر میں نے اکیڈمی اشارت کی تھی۔“ وہ رک کر بولی۔

”جی امی یاد ہے اور یہ کوئی اتنی پرانی بات نہیں۔“ وہ سر ہلا کر بولا۔

”سعدیہ پیارہ کرا امریکہ چلی گئی تھی وہیں اس کی نند اور جیٹھ بھی رہتے تھے۔ آج کل وہ پاکستان آئی ہوئی ہے۔“

”اوہ یہ تو اچھی بات ہے ملنے آئی تھیں آپ سے۔“ واٹن خوش ہو کر بولا۔

”ہاں آئی تھی۔ بلکہ سمجھو ہماری اتفاقہ ملاقات صبح مارکیٹ میں ہوئی جہاں وہ اپنے جیٹھ کی بیٹی سارہ کے ساتھ تھی جو امریکہ سے اس کے ساتھ آئی تھی۔ ابھی کچھ دیر پہلے سعدیہ خود آئی مجھ سے ملنے۔“ عاصمہ اسے گہری نظروں سے دیکھ کر بولی۔

”کیا کہہ رہی تھیں۔ کچھ خاص بات سے کہا۔“ واٹن ماں کے لہجے سے کچھ نہ کچھ اخذ کر چکا تھا رک کر پوچھنے لگا۔

”میرے لیے تو سمجھو بہت خاص۔“ وہ مسکرائی۔

”کیا مطلب۔“ اب واٹن چونکا کچھ خاص بات تو تھی ضرور۔ عاصمہ لمحہ بھر خاموش رہی۔

”اپنے رب کا میں کس طرح شکر ادا کروں پہلے بیٹیوں کے معاملے میں اور اب بیٹے کے معاملے میں مجھے خود کہیں بھی جا کر لڑکے لڑکیاں نہیں دیکھنی پڑیں میرے اللہ نے خود ہی مہربانی کر دی میرے معاملے آسان ہوتے چلے گئے۔“

”امی اب آپ مجھے کچھ اور بے چین کر رہی ہیں پلینز مجھے دیر ہو رہی ہے۔“ وہ بے چینی سے بولا تو عاصمہ ہنس پڑی۔

”اور میں یہ چاہتی ہوں کہ میرا بیٹا بے چین ہو جائے۔“ وہ اسے جیسے چھیڑ کر بولی۔

”کیا کہنا چاہتی ہیں۔“ وہ بے چینی چھپانے کی کوشش کرنے لگا۔

”سعدیہ نے اپنے جیٹھ کی بیٹی سارہ کا رشتہ تمہارے لیے پیش کیا۔ وہ ایک دودن میں تم سے بھی آکر ملے گی۔ وہ سارہ کا یہاں رشتہ ہی کرنے آئی ہے اور کہہ رہی تھی۔ وہ کہیں اور نہیں واٹن ہی کا کہہ کر اپنے سرال والوں کو آئی ہے اور اسے پورا یقین ہے کہ اسے جواب ہاں میں ملے گا۔ اب بتاؤ کیا جواب دوں اسے۔“ عاصمہ مزے سے بولی۔

”امی فار گاڈ سیک۔“ وہ سر پکڑ کر بولا۔ عاصمہ ہنس پڑی۔

”آپ کو کیا مزہ آرہا ہے۔“ وہ چڑ کر بولا۔

”ہاں تو اور کیا کہوں اور واٹن میں سوچتی ہوں بہت ہی پیاری بہت خوب صورت لڑکی ہے اور امریکہ میں پلنے پڑھنے کے باوجود حیلے سے بھی اتنی سادہ اور اسلامی انداز ہیں اس کے یقین کرو مجھے تو بچی بہت اپنے دل کے قریب تھکی۔“

”امی۔“ وہ جھنجھلا کر کھڑا ہو گیا۔

”اگر تمہارے پوچھنے کا مسئلہ نہیں ہوتا تو میں سعدیہ کو ہاں کہہ چکی ہوتی۔“ وہ اسے دیکھ کر بولی۔

”آپ ایسا کچھ نہیں کرنے والی۔“ وہ زور سے بولا۔

”واٹن! اب تک میرے بیٹے اب تمہاری عمر ہے شادی کی اور یہ میرے دل کی بھی خواہش ہے کہ اب تمہاری زندگی میں بہت سی خوشیاں آئیں اور اس گھر کی اصل مالکین آجائے۔“

”امی پلینز۔“ وہ کوفت سے بولا۔

”واٹن! تم پری کے لیے منع کر چکے ہو۔ اس کا اور تمہارا بیج ڈیفرنس ہے۔ میں مانتی ہوں لیکن سارہ ہر لحاظ سے تمہارے لیے سوٹ ایبل ہے تم ایک دودن میں مل لو اس سے اور کوئی فیصلہ کر لو۔ کیونکہ اب میں سیریس

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہوں، تمہاری شادی کے سلسلے میں۔“ عاصمہ سنجیدگی سے بولی تو واثق ایک دم سے چپ کر گیا۔

”امی ابھی نہیں آپ جانتی ہیں۔“ وہ آہستگی سے بولا۔
”بیٹا ابھی تو وقت ہے، اگر تم انتظار کرو گے کچھ وقت گزرنے کا، جدائی کے زخم بھرنے کا، تو میرے بیٹے یہ زخم کچھ اور گہرا ہو جائے گا اور میں۔ جس نے بس ایک عمر سے خوشیاں نہیں دیکھی ہیں۔ اب اور انتظار نہیں کر سکتی۔ مجھے تمہاری شادی کا فیصلہ اب کرنا ہے اور تمہیں میری یہ خوشی پوری کرنی ہوگی۔“ وہ اٹل لہجے میں بولی۔
واثق بے بس ساماں کو دیکھ کر رہ گیا۔

”امی۔ میرے لیے ابھی یہ ممکن نہیں آپ تو مجھے سمجھتی ہیں نا، پلیز سمجھنے کو شش کریں، میں اتنی جلدی خود کو تیار نہیں کر سکتا کسی اور کے لیے۔“ وہ بے بسی سے بولا۔
”تم مثال کو بھولے نہیں۔“ وہ دکھ سے بولی۔

”امی۔ اتنی جلدی۔ ابھی تو۔ پلیز ابھی آپ اس معاملے میں جلدی نہیں کریں۔ مجھے دو تین سال تک نہیں سوچنا کچھ بھی، میں پہلے بھی آپ سے یہ کہہ چکا ہوں، بار بار مت کریں یہ ذکر۔“ کہہ کر وہ تیزی سے باہر نکل گیا۔ عاصمہ پریشان سی کھڑی رہ گئی۔



”کیا دانی نے تمہیں کال کی تھی؟“ عفت کے لیے فوزیہ کے منہ سے سننے والی یہ شائنگ خبر بہت پریشان کن تھی۔

”میں پہلے تو اس بات پر خوش ہوئی، سچ میں عفت بھابھی۔ لیکن پھر اس کی بات سن کر میں کچھ پریشان ہو گئی۔“ فوزیہ سنجیدگی سے بولی۔

عفت کے ماتھے پر پسینہ آگیا، یقیناً کوئی نامعقول بات کی ہوگی۔ اس دانی کے بچے نے۔
”بھابھی۔ وہ کہہ رہا تھا کہ پھپھو میں آپ کے پاس آنا چاہتا ہوں، آپ پلیز مجھے کینیڈا بلا لیں۔“ اور عفت کو لگا دو تین دن پہلے دانی نے جو دھمکی دی تھی، وہ صرف دھمکی نہیں تھی وہ اس پر عمل کرنے کی پلاننگ بھی شروع کر چکا ہے۔

”کیا۔ اچھا۔“ وہ سنبھل کر بولی۔

”مجھے حیرت سی ہوئی بھابھی۔ یوں تو اس میں کچھ حرج نہیں، میرا بھتیجا ہے، میرا خون ہے اور مجھے سب سے پیارا ہے دنیا میں، لیکن ابھی تو وہ پڑھ رہا ہے نا۔“ وہ کچھ جتانے والے انداز میں بولی۔
”تمہارے بھائی نے ہی ایک دن مذاق میں کہہ دیا تھا کہ تم اسٹڈیز میں سیریس نہیں ہو رہے تو میں تمہیں فوزیہ کے پاس بھجوا دوں گا۔ بس اس بات کو ذہن میں رکھ کر اس نے تم سے کہہ دیا ہوگا۔“ عفت کھسالی سی ہنسی کے ساتھ بولی تو فوزیہ بھی یوں ہی ہنس پڑی۔



”اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے واثق۔“ دونوں اپنی پسندیدہ جگہ پر بیٹھے تھے۔ لائبریری کی سیڑھیوں میں۔
”بلکہ یہ بار بار کا ملنا مجھے کچھ اور ڈسٹرب کر رہا ہے۔“ وہ آہستگی سے اپنے ناخن کھینچ کر بولی۔ وہ اس کو دیکھ کر رہ گیا۔

اس سلونی سی گہری شام میں اس کا حسن کیسا پر سوز لگ رہا تھا۔ وہ اس کے بہت پاس بیٹھی تھی اور جیسے میلوں کے فاصلے پر تھی۔ دونوں کا ملن ندی کے دو کناروں جیسا تھا، وہ شدت سے چاہنے کے باوجود ایک دوسرے کو چھو بھی نہیں سکتے تھے۔

”مثال۔ میں بے بس سا ہو جاتا ہوں تمہارے بارے میں جب سوچتا ہوں۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ میں اس طرف آؤں، میرا ادھر آج کچھ کام بھی نہیں تھا، لیکن پھر ہا ہی نہیں چلا کب میرے قدم اٹھے اور میں یہاں آگیا، تمہارے سامنے۔“ وہ رک رک کر گہری آواز میں بولا۔

دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور نظریں جھکا لیں۔

”تم نے ابھی بھی وہ رنگ نہیں پہنی۔“ وہ اس کی خالی انگلیوں کو دیکھ کر آہستگی سے بولا۔

”پس لوں گی۔ اب تو پہننی ہی ہے۔“ وہ بڑبڑاتے لہجے میں بولی۔

”اس طرح مجھے دل کے ساتھ نئی زندگی کا آغاز کرو گی۔“ وہ اسے جتا کر بولا۔

”کل وہ لوگ شادی کی ڈیٹ فکس کرنے آرہے ہیں۔ آج شاید میں اس طرف آخری بار آئی ہوں۔ کل شاید کلج جانی ہوں یا نہیں۔ پایا نے منع کر دیا ہے۔“ وہ اسے دیکھے بغیر بولی۔

اور وہ جیسے کسی گہرے غم کی تہ میں اتر گیا۔ کچھ بول ہی نہیں سکا۔ ان کے سر پر کھڑے اونچے اونچے درختوں پر بیٹھے پرندے نور نور سے شور مچا رہے تھے۔ شام گہری ہو رہی تھی اور سب پرندے اپنے آشیانوں کو لوٹ آئے تھے۔

وہ دونوں اپنے آشیانوں کی طرف لوٹ کر جانا نہیں چاہتے تھے۔ دونوں کے دل ایک ہی تال پر دھڑک رہے تھے۔ ایک ہی بات سوچ رہے تھے کہ یہ وقت ٹھہر جائے۔ کبھی آگے نہیں بڑھے۔

وہ دونوں اس طرح ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھے رہیں۔ بالکل خاموش کچھ بھی کہے بغیر۔

”مجھے دیر ہو رہی ہے۔“ برندوں کا شور بڑھا تو وہ ایک دم سے کچھ گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔

”کچھ دیر اور تو رکو۔“ وہ ہلچلی لہجے میں بولا۔

”نہیں رک سکتی۔“ وہ نظریں چرا کر غم لہجے میں بولی۔

”پھر کب ملیں گے۔“ وہ اس کے برابر کھڑا ہو گیا۔ اس کے دراز قد کا سایہ مثال کے وجود کو ڈھانپنے لگا۔

”شاید کبھی نہیں۔“ وہ لبوں میں بڑبڑائی۔

”مثال۔“ وہ تڑپ کر رہ گیا۔

”چلتے ہیں۔“ وہ ایک دم سے کہہ کر تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ وہ بھی اس کے پیچھے بوجھل قدموں کے ساتھ چل پڑا۔ دونوں ذرا فاصلے پر چلتے ہوئے اس لائبریری کی عمارت کے باہر نکل آئے۔ جہاں شاید آج ان دونوں کی آخری ملاقات تھی۔ دونوں نے مڑ کر دیکھا اور سر جھکا کر چل پڑے اور سامنے سے آتا عدیل دونوں کو یوں ساتھ ساتھ چلتے دیکھ کر شاکد سا رہ گیا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

کاکی چیر

انہوں نے ہی خراب کیا ہوا ہے۔“
زاہدہ خانم کو مزید ابا ل آیا تھا۔ ٹوسہ ان کی بات پر
مسکرا دی۔ اگر اس حوالے سے امی رکاوٹ تھیں تو ابو
آسانی تھے۔ وہ بہت خوش ہو کر اسے کتابیں دلا دیا
کرتے تھے۔

”یہ مٹھائی کہاں سے آئی ہے؟“

مغرب کی نماز ادا کر کے ٹوسہ کچن میں آئی تھی۔
روا چائے بنا رہی تھی۔ ٹوسہ نے سامنے کاؤنٹر پر موجود
مٹھائی کا ڈبا دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔ ابو حسب معمول
اپنے اسٹور پر تھے رات دس بجے ہی ان کی آمد ہوئی
تھی۔ سلیمان یقیناً اپنی ٹیوشن گیا ہوا تھا۔ نماز ادا کر کے
اس نے امی کے کمرے میں جھانکا تھا۔ وہ اندھیرا کیے
بستر پر پڑی تھیں۔

”ہائے اللہ طبیعت نہ خراب ہو کہیں امی کی۔ لیکن
شاید سو رہی ہیں۔“ وہ سوچتے ہوئے کھٹکا کیے بنا باہر آ
گئی۔

”بتاؤ نا۔“ اس نے دوبارہ پوچھا۔ روا اس کی بات پر
پلٹی اور مٹھائی کے ڈبے کو تاڑ کر رنجیدہ ہو گئی۔ ٹوسہ کو
لگا اس کی آنکھیں نم ہو گئی ہیں۔

”خالہ نے بھجوائی ہے۔ صغیر کی منگنی کر دی ہے
انہوں نے۔“

اداس غمگین لہجے میں بتا کر وہ پھر سے چائے کے
ساتھ الجھنے لگی تھی۔

اس نے ایک نظر مٹھائی کے ڈبے پر ڈالی۔ اسے

”میں اپنا سوٹ تو دیکھوں ذرا دوبارہ گھر آکر شاپنگ
دیکھنے کا مڑا ہی اور ہے۔“ روا نے شاپنگ بیگز الماری
سے نکالتے ہوئے اعلان کیا۔ اب وہ اپنا سوٹ پھیلا کر
دیکھتے ہوئے خوش ہو رہی تھی۔ ٹوسہ اس کا مسخر
اڑاتے ہوئے الماری کھولنے لگی۔

”پاگل اس دنیا سے ختم نہیں ہوئے۔ ہمارے گھر
میں ہے ایک ابھی۔ سوٹ خرید کر خوش ہونے والی
قوم۔“ الماری سے اپنی مطلوبہ شے نکال کر پلٹتے ہوئے
اس نے روا کو دیکھ کر افسوس میں سر ہلایا تھا۔

”ہاں ہمارے گھر ایک پاگل ہے جو سارا پیسہ
کتابوں پر خرچ کرنا ضروری سمجھتا ہے۔ کتابیں خرید
کر رعب جھاڑنے والی قوم۔“ روا برابر کا جواب دیے
بغیر کیسے رہ سکتی تھی۔

زاہدہ خانم نے بیٹیوں کی نوک جھونک سنتے ہوئے
تسبیح بیڈ پر اپنے پاس رکھتے ہوئے ٹوسہ کو مخاطب کیا
تھا۔

”صحیح کہہ رہی ہے روا میں آئندہ تمہیں بازار نہیں
لے کر جاؤں گی۔ جو پیسہ ہے تم کتابوں پر اڑا دیتی ہو
کتنی پار کہا ہے کوئی کام کی چیز لو۔ لیکن شنتی تو ہو ہی
نہیں تم۔“

وہ سنجیدگی سے ٹوسہ کو کہہ رہی تھیں۔ روا نے ان
کی تائید میں پر زور انداز میں سر ہلایا تھا۔ ٹوسہ پیار بھرا
لباسا امی کہہ کر چپ ہو گئی تھی۔ وہ آج نئی لالی جانے
والی کتاب دیکھ رہی تھی۔ جبکہ زاہدہ خانم کو اس کی یہ
عیاشی اچھی نہیں لگی تھی۔

”کیا امی۔ اب باپ کے کندھے سے جا لگے گی۔“



بھی باکسا افسوس ہوا تھا۔ وہ سوچنے لگی۔ مٹھائی کے اس نسخے سے ڈبے نے امی کو کمرے میں محصور ہو جانے پر مجبور کر دیا ہے۔ ذکر نہ اس وقت وہ گھر میں آگے پیچھے سو کام پٹار رہی ہوتی ہیں۔ لیکن یہ بھلا صرف ایک ڈبا بھوڑی ہے۔ یہ ایک توقع تھی جو ٹوٹ گئی۔ (امی کی توقع) اور ایک خوش فہمی تھی جو ختم ہو گئی۔ (ردا کی خوش فہمی)

ردا پر نظر ڈالتے: دئے وہ ایسی ہی باتیں سوچے جا رہی تھی۔ دکھ تو اسے بھی ہوا تھا کہ ایک اچھا رشتہ تھا۔ اگر ہو جاتا تو۔۔۔ لیکن اس سے زیادہ وہ نہیں سوچتی تھی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ جس کی قسمت میں جو ہوتا ہے عمل جاتا ہے۔ سو وہ معاملہ اس کے نزدیک اس قدر اہم نہ تھا لیکن زاہدہ خانم اور ردا کے لیے شاید یہ سب سے اہم معاملہ تھا۔



ردا کے دکھ کا یہ عالم تھا کہ اس کا سوگ پچھلے تین

دن سے جاری تھا۔ اپنی روٹین خراب کر لی تھی۔ مارے باندھے کام کرتی۔ اداس سی شکل بنائے بستر پر بڑی رہتی۔ زاہدہ خانم بھی متفکر سی سپیج کے دانے گراتی لیٹی رہتیں۔ خاور صاحب نے حسب عادت اس خبر کو اتنا اہم نہیں سمجھا تھا۔ ثویبہ اور سلیمان نے بھرپور کوشش کر کے رونق جگانے کی کوشش کی تھی۔ بظاہر سب ٹھیک تھا لیکن بہر حال گھر کے دو لوگ رنجیدہ تھے۔ ایسے میں ثویبہ سوچتی مانا کہ صغیر ردا کا اہم عمر تھا اور امی کا ارمان تھا کہ ان کے ہاں رشتہ ہو جائے۔ لیکن اگر نہیں ہوا تو ایسا سوگ کون مناتا ہے۔

حد ہو گئی۔ یعنی کہ دنیا چاند سے آگے نکل چکی ہے۔ یہاں خالہ کے گھر رشتہ نہ ہونے پر دکھ ہی نہیں ختم ہو رہا۔ وہ چڑ جاتی۔

لاکھ ہنسی مذاق میں ردا کو سمجھانے کی کوشش کی۔ لیکن وہ بی بی ایسی کی مشرقی لڑکی تھی کہ غمگین رہے بغیر اس کا گزارہ ہی نہ تھا جیسے۔ اب بھی ثویبہ کمرے میں آئی تو ردا غم کی تصویر بنے آرام کر رہی تھی۔ وہ اس

کے پاس آکر بیٹھ گئی تھی۔

”دیکھو ردا! ہمیں جذباتی ہو کر ہر چیز کو نہیں دیکھنا چاہیے۔ اپنی خوش فہمی میں ہم اپنا ہی نقصان کرتے ہیں۔ تم کیوں اس طرح غم زدہ ہو کر بیٹھی ہو۔ آج تیسرا دن ہے۔ تم نے خود پر سوگ طاری کیا ہوا ہے۔“

”ہاں تو۔۔۔ تباہ ہو گئی ہوں۔ میرا دل ٹوٹ گیا ہے۔“

اتنے سارے آنسوؤں کا سیلاب اس کی آنکھوں سے بھل بھل کر کے بہنے لگا تھا۔ اپنے دل کے ٹوٹنے کا غم اندر تک توڑ گیا تھا اسے۔

”ایک منٹ ایک منٹ۔۔۔ کیسے تباہ ہو گئی ہو تم۔“

ذرا پلیز اس کی وضاحت کرو گی۔ ”ثویبہ نے سختی سے

پوچھا۔ ردا نے شکوہ بھری نگاہوں سے اسے دیکھا تھا۔

اس کا ٹوٹا ہوا اتنا دل مزید بکھر گیا تھا۔ ایک تو محبت کا غم

اور سے یہ سوال۔ کیسی بہن ہے یہ غم گسار بھی نہیں

بن سکتی۔ وہ اور سکھنے لگی۔ ثویبہ سٹیٹا گئی۔

”دیکھو ردا! یہ رونا دھونا چھوڑو صاف بتاؤ تم کیسے

تباہ ہو گئی ہو۔ کس طرح دل ٹوٹا ہے تمہارا۔ بتاؤ کیا ہوا

ہے۔ ”ٹوبہ اپنی جرح شروع کر چکی تھی۔
”سب کچھ بتا تو ہے تمہیں۔“ آنکھوں کو رگڑتے
ہوئے ردا نے پھر سسکی بھری تھی۔

”مجھے کچھ بتا نہیں ہے۔ تم۔ بتاؤ۔“ ٹوبہ نے سر کو
نفی میں جنبش دی تھی۔

”صغیر کی منگنی ہو گئی ہے۔ خالہ نے اس کا رشتہ
اپنی سسرال میں طے کر دیا ہے۔ میں نے صغیر کے
حوالے سے بہت کچھ سوچ رکھا تھا اور اب۔۔“

اس کے آنسو پھر رواں ہو گئے۔ مزید شدت کے
ساتھ۔۔ ٹوبہ کے تاثرات جاہد تھے۔

”اچھا تو تمہاری یہ محبت یک طرفہ تھی کہ دو طرفہ

ایسا کڑا سوال سن کر ردا کا دل ڈوب کر ابھرا تھا۔

اسے وہ سب لمحات یاد آئے، جب جب اسے صغیر کی
آنکھوں میں اپنا عکس نظر آیا تھا۔ وہ سوچتے ہوئے بولی
تھی۔

”اس کا اتفاق میں نے ہمیشہ محسوس کیا ہے۔
نظریں انداز، لہجہ سب مل کر مجھے یہی احساس دلاتے
تھے کہ محبت کے اس سفر میں میں اکیلی نہیں ہوں۔“
اس نے اداسی سے بات مکمل کی تھی۔

ٹوبہ نے اسے غور سے دیکھا۔ ”یہ سب تمہاری
اپنی سوچ ہے۔ تم اس کا کوئی ثبوت دے سکتی ہو کہ وہ
بھی تمہیں پسند کرتا تھا۔ یا محبت کرتا تھا یا شادی کرنا
چاہتا تھا جیسے کہ تم دعو کر رہی ہو۔“

ٹوبہ کے اس سوال پر ردا اس کی شکل دیکھ کر رہ
گئی۔

”ثبوت کیسا۔ کسی کی نظروں کا، لہجے کا، لہجے میں
چھپی محبت کا کیا ثبوت لاؤں میں۔ یہ تو محبت کرنے والا
دل ہی سمجھ سکتا ہے۔“ وہ بے ساختہ بولی تھی۔

”مجھے محبت کرنے والے دل اس کی سمجھ یا سوچ

سے کوئی مطلب نہیں۔ ثبوت مطلب کوئی تحریری

زبانی ثبوت ہے تمہارے پاس۔ اس کی محبت کے

اظہار کا یا۔ بس اس کو دیکھ دیکھ کر خود ہی اندازے لگا
لیے تھے کہ یہ محبت ہے۔“ ٹوبہ نے سخت لہجے میں کہا

تھا۔

”وہ محبت ہی تھی۔ اس کی آنکھوں کی نرمی۔ وہ
مسکان۔“ ردا نے کہیں کھو کر کہا تھا۔ ٹوبہ نے سختی
سے اسے ٹوکا تھا۔

”ثبوت! کوئی تحریری زبانی ثبوت۔ کوئی مکالمہ کوئی

خط کوئی ٹیکسٹ میسج۔ اظہار کی کوئی بھی صورت۔

واضح صورت۔ حقیقی زندگی میں نظر آنے والا کوئی
عمل جس سے عیاں ہو کہ اس نے ایسا کہا تھا، یہ کیا تھا؛

ٹوبہ کے اتنی بلند آواز میں کی گئی جرح پر ردا ہتھرائی
تھی۔

”نہیں ایسا کچھ بھی نہیں تھا۔“

”تو پھر یہ تمہیں لگتا تھا۔ ایسا تھا نہیں تم نے اپنے

جذبات کو حقیقت سمجھ لیا۔ اپنا وقت ضائع کیا، جذبات

ضائع کیے اور اب پریشان ہو اگر اس نے اظہار کیا ہوتا۔

یہ سب حقیقت ہوتی۔ تو میں کہتی تھی تم نے اس شخص

سے دھوکا کھایا ہے۔ لیکن تم نے اپنے نفس سے دھوکا

کھایا ہے۔ تم فریب میں مبتلا رہیں۔ اپنی زندگی کو سوچو

سمجھو اور عمل کرو۔ ہمارا ہر خیال اور خواہش درست

نہیں ہوتی۔ زندگی کو حقیقت کی بنیاد پر گزارنا چاہیے۔

تمہیں اس حوالے سے پیچور ہو جانا چاہیے۔“

بات کے اختتام پر ٹوبہ نے اس کے ہاتھوں پر اپنا

ہاتھ رکھ دیا تھا۔ اس کس میں ڈھارس تھی۔ ”نہمت

کرو“ کی پکار تھی۔ ردا ابھی چیرائی کی منازل طے کر رہی

تھی۔ سوٹوٹ پھوٹ کا شکار تھی۔ لیکن ٹوبہ جانتی تھی

کہ اگر بات اس تک پہنچ گئی ہے تو وہ سمجھ بھی جائے گی۔

بس تھوڑا وقت لگے گا۔ لیکن ابھی زاہدہ خانم تک یہی

بات پہنچانا باقی تھی۔



وہ ان کے کمرے میں آئی تھی۔ زاہدہ خانم بیڈ پر لیٹی
تھی ہاتھ میں پکڑے جانے کہاں کھوئی ہوئی تھیں۔
چہرے پر تفکرات کا جال بچھا تھا۔ وہ ان کے نزدیک بیٹھ
گئی تھی۔

”امی! میری پیاری امی!“ کہتے ہوئے ان سے لیٹ گئی۔ انہوں نے اداسی سے مسکراتے ہوئے اس کی جانب دیکھا تھا۔

”امی! آپ ایسے افسردہ ہیں جیسے خدا نخواستہ یہ ہماری ردا کے لیے آخری رشتہ تھا۔ اس کے بعد کوئی اچھا پروپوزل نہیں آئے گا۔ ایسا نہیں ہوتا امی! اللہ پر بھروسہ رکھیں۔ جو ردا کا نصیب ہو گا اسے مل کر رہے گا۔“

ان کے بازو دباتے ہوئے وہ خود بخود ہی بات شروع کر چکی تھی۔ زاہدہ خانم نے اداسی سے اسے دیکھا تھا۔ تسلی دینے والا اور کوئی نہیں تھا۔ اپنی بیٹی ہی پاس آئی تھی۔ اکیلی بڑی بہن ماں جیسی بہن نے آج راہ جدا کر لی۔ ان کی سوچ پھر ادھر ہی مر گئی تھی۔ آنکھیں نم ہو گئیں۔ ثوبیہ پریشان ہو گئی۔

”اوہو امی پلیز حوصلہ کریں۔ ایسے رویے تو نہیں۔“ اس نے ان کے آنسو پونچھے اور پھر بات شروع کر دی۔

”آپ کو ہر پہلو سے غور کرنا چاہیے۔ خالہ کی بھی کوئی مجبوری ہو سکتی ہے۔ اپنے سسرال والوں کی مرضی کے بغیر تو وہ اکیلے رشتہ نہیں کر سکتیں تو جیسے انہیں صحیح لگا۔ جہاں مناسب لگا۔ انہوں نے رشتہ طے کر لیا۔ ہم دوسروں سے تعلقات باندھ لیتے ہیں اور پھر افسردہ ہوتے ہیں۔ بدگمان ہو جاتے ہیں۔ ناراض ہو جاتے ہیں یہ بری بات ہوتی ہے آپ نے خالہ کو مبارکباد کا فون بھی نہیں کیا۔ کیا سوچیں گی وہ کہ ان کی خوشی میں آپ غم زدہ ہیں۔“

زاہدہ خانم ثوبیہ کو دیکھ کر رہ گئی تھیں۔ ایسی بڑی بڑی باتیں اور گہری گہری باتیں کہاں سے آگئی تھیں اسے۔ ثوبیہ کی باتیں ان کے دل پہ لگی تھیں۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ لیکن طبیعت کی اداسی انہیں چھوڑ نہیں رہی تھی۔

”تپانے کیوں سوچنا ہے میرے بارے میں۔ وہ اپنی خوشیوں میں خوش ہوں گی۔“ کہتے کہتے ان کی آنکھیں پھر نم ہو گئی تھیں۔

”آپ پھر ایسے سوچ رہی ہیں۔ اچھا آپ بتائیں

خالہ نے آپ سے کوئی کمنٹ کی تھی اس رشتے کے حوالے سے۔ کوئی قول زبان وعدہ امید کچھ بھی؟“

ثوبیہ نے نرمی سے سوال کیا تھا۔

”نہیں۔ کبھی بات نہیں ہوئی تھی۔ لیکن مجھے یقین تھا کہ ایسا ہو گا۔ ہمارا آپس کا پیار ہی اتنا تھا تو اچھا تھا کہ ہماری اولادیں آپس میں مل جائیں۔“

ماضی کے لمحات کو پھر دہلاتے ہوئے زاہدہ خانم نے بیٹی کو اپنے اندر کی بات بتائی تھی۔

”ثوبیہ آپ کی خواہش تھی لیکن اگر یہ پوری نہیں ہو سکی تو آپ اپنی توقع کی خاطر خالہ کی خوشی کو ذرا کم نہ کریں۔ ردا کا نصیب اسے مل جائے گا۔ نیا رشتہ نہیں بن سکا تو کوئی بات نہیں بہن کا رشتہ تو اچھی طرح نبھا میں۔“

ان کے کندھے دباتے ہوئے ثوبیہ نرمی سے ان کی منفی سوچوں کا خاتمہ کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

زاہدہ بیگم سوچ میں گم ہو گئیں۔

”کہہ تو تم بھی تھیک رہی ہو لیکن یہ دل سے نا تو قعات باندھ لیتا ہے۔ تھوڑا اسے سمجھا کے رکھنا چاہیے۔“ وہ اداسی سے مسکرا کر بولیں۔

”یہ کی نامیری سمجھ دار امی والی بات۔“ وہ شرارت سے مسکراتے ہوئے ان کی گردن میں ہاتھیں ڈال رہی تھی۔

”سمجھ دار امی کی بیٹی بھی بہت سمجھ دار ہو گئی ہے۔ اتنی بڑی بڑی دلیلیں کہاں سے آگئیں میری بیٹی کو جو مجھے سمجھانے لگ گئی ہے اب۔ وہ بھی اتنا اچھا۔“ وہ مسکراتے ہوئے پوچھنے لگی تھیں۔

”ان ہی کتابوں سے دلیلیں ملی ہیں۔ کتابیں ہی کام آتی ہیں۔ وہ سوٹ نہیں جو آپ کی لاڈلی خرید خرید کر الماریاں بھر دیتی ہے۔ وہ سوٹ وہیں کے وہیں بڑے ہیں۔ آج آپ کو ماننا پڑے گا کہ کتابیں ہی دراصل کام کی چیز ہوتی ہیں۔“ وہ آنکھوں میں چمک لیے مسکراتے ہوئے انہیں یاد دل رہی تھی۔

زاہدہ خانم دل سے مسکرا دیں اور اسے گلے لگالیا۔

بات یقیناً ”سوفیہ بیج“ تھی۔





پر بس کرتی رہی۔ صفحے دوبارہ ترتیب دے کر الماری میں رکھنے لگی تو اس کے ہاتھ علی کی طرف سے بھیجی جانے والی طلاق کے کاغذات سے ٹکرا گئے اور اس پر ٹھیس ازبر ٹکراؤ نے زینب کو باور کروادیا کہ آج کا دن واقعی منحوس ہے۔

ویسے تو اس کی زندگی کے اوپر تلے کے تقریباً سارے ہی سال غموں سے بھرے اور شکایتوں سے اٹے پڑے تھے۔ ایسے کہ خوش گوار دن پتے صحرا میں جھاڑیوں کی مانند خال خال ہی نظر آتے۔ اور ذہن میں تو آتے ہی نہ۔ لیکن آج کا دن ”اعلا منحوس“ تھا۔ اس بات کا زینب کو یقین ہو گیا۔

پہلے تو صبح جب وہ کبھی ہلکی کبھی تیز ہوتی پھوار میں ترتر ہوتی بس اسٹاپ تک پہنچی تو اسٹاف کی بس اس کا انتظار کیے بنا ہی جا چکی تھی۔ بارش کی وجہ سے دوسری گاڑیاں بھی قدرے کم تھیں۔ بڑی خواری سے وہ اپنے آفس تک پہنچ پائی۔

دوپہر میں مسٹر اکرام سے اس کی فون پر لمبی بحث ہوئی۔ کچھ اس کی بھی پریشانی شام تک لگی رہی۔ پھر گھر واپسی کا سفر شروع ہوا ہی تھا کہ بارش نے طوفانی صورت اختیار کر لی۔ یہاں تک بھی معاملہ برداشت اور ہمت کے اندر تھا۔ لیکن دن کا سب سے بڑا جھٹکا اسے گھر کے برآمدے میں ملا۔ جہاں نیمپاگل پھوپھی اس کے مکمل ہو چکے اسکرپٹ کی چھوٹی بڑی ٹکونی نجانے کتنی ہی کشتیاں بنا کر کھیل رہی تھیں۔ (حسب عادت سوراخ زدہ کشتیاں) صد شکر کے پھوپھی نے وہ کشتیاں پانی میں نہیں تیرادی تھیں۔ ورنہ زینب تو وہیں اپنی زندگی کی آخری سانس لے ڈالتی۔ رات کو آنسوؤں کے ساتھ وہ زندگی کی ایک ایک تلخی کو بھلانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے ساری کشتیوں کو پیدائشی صبر اور جبر سے کھولتی رہی اور ہاتھوں سے

دوپہر میں پروڈکشن ہاؤس کے کاتینٹ ہیڈ مسٹر اکرام سے ہوئی لمبی بحث بھی اس کی زندگی کی طرح بے نتیجہ ہی ختم ہو گئی تھی۔ زینب کو آج کل پیسوں کی اشد ضرورت تھی۔ ویسے پیسوں کی ضرورت اسے

کب نہیں رہی تھی۔ پیسہ اس کی زندگی میں سانس کی طرح بڑا ضروری اور ہنسی کی طرح نجانے کہاں گم رہا تھا۔ ایک ہی تو وہ کمانے والی تھی اور تین جانیں کھانے والے اس لیے اسے اپنی لکھی ٹیلی فلم کے بیچے گئے دن لائنو (خلاصے) سے بڑی امیدیں وابستہ تھیں۔ یہ ٹیلی فلم اس نے بہت محنت سے لکھی تھی۔ لیکن بعض اوقات ایسا ہوتا ہے تاکہ گرم رست میں مکی زیادہ بھن جائے تو پھر کھانے کے قابل نہیں رہتی۔ اس کی ٹیلی فلم کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔ مسٹر اکرام نے بے شک اس کی ساری امیدوں پر پانی نہیں پھیرا تھا، لیکن بھروسے کے چونے کی لیپا پوتی بھی نہ کی تھی۔

”کہانی بہت اچھی ہے آپ کی۔ لیکن اختتام پر تھوڑی تبدیلی کرنی ہوگی۔ اتنی ڈارک (دکھی) کہانی۔“



اکیلے گھر میں لڑکی کی خودکشی۔ اور ہفتہ مرہہ حالت میں پڑے رہنا۔ نہیں، نہیں مس زینب! آپ کو اختتام بدلنا ہوگا۔ پلیز کچھ اور سوچیے۔ مانا کہ آج کل عورت بیس ڈراے قلعہ بن رہی ہیں۔ مگر اتنا بھی تو جذباتی نہ ہوں نا آپ، سمجھنے کی کوشش کریں۔ رینٹنگ کا مسئلہ پڑ جاتا ہے۔ پھر چینل والے بھی اعتراض کرتے ہیں۔ پروڈکشن ہاؤس کی ساکھ بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ بھئی۔ انسان دن بھر کے کاموں سے تھک ہار کر جب لی وی لگاتا ہے تو ہلکا پھلکا کھنا پسند کرتا ہے۔ کہ نہیں؟

اور حوصلے کے چھینٹے مار مار کر دگائے ہوئے تھی کہ اسی لیے گھر داخل ہوتے۔ برآمدے میں بیٹھی پھوپھی کے کھیل تماشے کو سمجھتے ساتھ ہی وہ امی پر چیخ پڑی۔

”سارا دن مری ہوں میں۔ ادھر سے ادھر۔ ادھر سے ادھر۔ صرف احساس کی آکسیجن نے ہی زندہ رکھا ہوا ہے مجھ کو۔ اور آپ ان کاغذات کی حفاظت نہ کر سکیں اور کام ہی کیا ہوتا ہے آپ کو سارا دن گھر میں۔ کھانا بھی ایک دن کا پکا۔ دو تین دن چلانا پڑتا ہے اور گھر میں گند ڈالنے کو جگہ ہی کہاں ہے۔“

امی چپ کر کے سنتی رہیں۔ وہ بھلا آگے سے کیا جواب دیتیں۔ وہ ان عورتوں میں سے تھیں بچن کی ازل سے جنت و دہشت کی چار دیواری کے اندر ہی کہیں بستی ہے اور عورت اس چار دیواری کے اندر کہیں نہیں بستی۔ بڑی چھینا جھینٹ کے بعد انہوں نے پھوپھی سے ساری کشتیاں حاصل کی تھیں۔ اس

اکیلے گھر میں لڑکی کی خودکشی۔ اور ہفتہ مرہہ حالت میں پڑے رہنا۔ نہیں، نہیں مس زینب! آپ کو اختتام بدلنا ہوگا۔ پلیز کچھ اور سوچیے۔ مانا کہ آج کل عورت بیس ڈراے قلعہ بن رہی ہیں۔ مگر اتنا بھی تو جذباتی نہ ہوں نا آپ، سمجھنے کی کوشش کریں۔ رینٹنگ کا مسئلہ پڑ جاتا ہے۔ پھر چینل والے بھی اعتراض کرتے ہیں۔ پروڈکشن ہاؤس کی ساکھ بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ بھئی۔ انسان دن بھر کے کاموں سے تھک ہار کر جب لی وی لگاتا ہے تو ہلکا پھلکا کھنا پسند کرتا ہے۔ کہ نہیں؟

زینب نے بڑی مایوسی اور بے دلی سے یہ کہہ کر فون بند کر دیا تھا کہ وہ جلد ہی اختتام تبدیل کر کے انہیں دوبارہ دن لائن (خلاصہ) بھیجے گی۔ کچھ اس بات کا بھی دکھ اور غصہ تھا شاید۔ اور کچھ ویسے بھی وہ اپنی سالوں کی جواب دے چکی ہمت کو بڑے جتنوں سے دلا سے

”تمہارے میاں کا گھر ہی اب تمہارا اصل گھر ہے“
گزارہ کر دی۔
پھوپھی نے روتے پٹتے بڑا لمبا عرصہ گزارا کر لیا
تھا۔ پھر جب جب وہ آنے لگیں بڑی چپ چپ رہنے
لگیں۔

وجہ۔

جس درخت کی جڑوں میں مٹھ باسیوں کی رو میں
قابض ہو جائیں، اس کا کھوکھلا ہونا پھر سورج چاند کے
ہیر پھیر کی طرح یقینی ہو جاتا ہے۔ ای۔ کبھی ان کے ہاتھ،
بازو، گھٹنے کی ٹی کرتی نظر آتیں، کبھی پھوپھی کو ڈاکٹر کے
پاس لے جا کر باقاعدہ ٹانگے لگوائے جاتے۔ کبھی
زیب اپنی امی کو پھوپھی کے جسم کے کسی حصے، سر یا
کمر کی تیل سے مالش کرتے دیکھتی تو ساتھ پھوپھی کی
بے انتہا درد سے کراہتی دیواریں، کھڑکیاں ہلا دینے والی
چنجیں بھی سنتی۔

ایک دفعہ زیب نے دروازے کی جھری سے
پھوپھی کی کمر پر تین انگارے کی طرح گہری سرخ
لائینیں دیکھ لی بغض اور اگلے دو دنوں تک وہ خوف کے
مارے سو نہیں سکی تھی۔ نیند تو شاید امی، ابو کی
آنکھوں سے بھی کوسوں دور تھی۔ سفید پوشی کے بھرم
تلے۔ اسی لیے شاید بڑے بڑے اجتماع والے اجلاس
بھی بارہا بلائے گئے۔ ہنگامی اور فیصلہ کن۔ مردوں،
عورتوں کی الگ الگ مجلسیں بھی لگیں اس گھر میں۔
لیکن ہر دفعہ کا فیصلہ بند رہا نہٹ کا شکار ہو جاتا اور پھوپھی
دوپانوں میں اپنے پھر اپنے میاں کے گھر۔ اپنے اصلی
گھر چلی جاتیں۔

پھر ایک دن جب پھوپھی گھر آئیں تو امی، ابو دونوں
کو یقین ہو گیا کہ اب یہ مرکز بھی واپس نہ جائیں گی،
جانتی آنکھوں کی لو بجھ چکی تھی اور جسم پر جیسے سینگی
لگا کر کسی نے سارا خون ہی چوس ڈالا تھا۔ پر پھوپھی کی
حالت ایسی بھی تو نہ تھی کہ ابو ان کو گھر پر ہی رکھ سکتے۔
اس لیے پورے ایک سال وہ پاگل خانے رہی تھیں اور
اب اس بات کو بیس سال کا عرصہ گزر جانے کے باوجود
بھی وہ ہر روز اپنی کسی حرکت سے اس بات کا تیا ضرور

احتیاط سے کہ کہیں کاغذ پھٹ ہی نہ جائے۔ پھر ان
مڑی مڑی کشتیوں کو وہ زیب کے کمرے میں چھوڑ کر
دروازہ بھڑک کر خود اپنی جنت برابر دوزخ میں ڈوکی کھمانے
چلی گئی تھیں۔

زیب اپنے روپے کی بے احتیاطی اور جابرین کے
باعث برآمدے میں گھڑی گھڑی ہی احساس جرم میں
جتلا ہو گئی۔ یہ احساس جرم اب اس کے اندر اس قدر
مضبوط ہو چکا تھا کہ وہ زلزلہ سیلاب کی تباہ کاریوں کا ذمہ
دار بھی خود کو ٹھہرانے لگی تھی۔

”ٹک ٹک۔ پھر پھر۔“ پھوپھی نے حسب
عادت اپنے منہ سے عجیب و غریب آوازیں نکال کر
اسے چونکا دیا۔ پھوپھی کی آوازیں بھی نجانے کیسی
تھیں۔ کسی انسانی مخلوق، چرند پرند سے ان آوازوں کی
مماثلت نہ ہو سکتی تھی اور دنیا کی کوئی ڈکٹری ان کے
مطلب نہ بتا سکتی تھی۔ اب زیب ایسی پھوپھی سے
بھی کیا کہتی جو اپنی ذات میں پیدائشی روکی تھیں۔
درختوں، پودوں، دیواروں، پتنگوں، کرسیوں اور آئینے
تک سے من من آواز میں پیروں باتیں کرتی رہتی
تھیں، لیکن انسانوں سے ہم کلام ہونے میں عشروں کی
بے زاری تھی۔ چڑیا سے ذرا زیادہ ان کی خوراک بھی
اور مرغی سے تھوڑی آگے کی ان کی جسامت۔ نہیں
مکمل پاگل نہیں تھیں۔ بس انسانوں کے بنائے
زاویوں میں موجود ایک ہوش مند اور صحت مند آدمی
کے خاکے سے وہ کوسوں دور تھیں۔ لیکن کیا پتا ان کی
اپنی ذہنی حالت کے مطابق باقی سب پاگل ہوں اور وہ
خود کوئی دانائے کے خبر۔ خدا جانے بس۔

ان کی زندگی کے اہم دور کی کہانی اگرچہ زیب کے
بچپن میں ہی مکمل ہو گئی تھی۔ لیکن پھر بھی دھندلے
نقوش کی طرح زیب کو اس کہانی کے بہت سے سنے
یاد تھے۔ کوئل کی کوک بنا وجہ کے توہین میں نہیں
بدلتی تھی۔ پھوپھی جب بھی اپنے میاں کے گھر سے
واپس آتیں ہمیشہ روتی ہوئی آتیں۔ ابو تو آگے سے
ایک ہی بات کہہ دیتے تھے۔ سو باتوں کی ایک بات۔
ہزاروں مسئلوں کا واحد انہی اور نکما حل۔

دیتی تھیں کہ وہ ابھی پاگل خانے میں سہا قیام کر کے آچکی ہیں۔

نہیں ویسے پھوپھی بے ضرر تھیں۔ نہ کسی کے نفع میں نہ نقصان میں۔ نہ تین میں نہ تیرہ میں۔ لیکن جانے انجانے میں وہ کسی چھوٹی موٹی مشکل یا پریشانی کا باعث ضرور بن جاتی تھیں۔

دراصل پاگل خانے میں ہی ان پر پروانہ آزادی (طلاق) نے کچھ عجیب اور نئے ہی طور پر اثر ڈالا تھا۔ غموں پہ لگام کچھ کس کے پڑی تھی یا وہ اپنی خوشی میں دیوانی ہو گئی تھیں۔ کچھ سمجھ میں نہ آسکی۔ گھر واپس آکر انہوں نے ابو کی بجری (آسٹریلیین چڑیوں) کو دروازہ کھول کر آنا "قانا" آزاد کروا دیا تھا۔ ہر پر کی پھر پھر ہاٹ پر وہ خود ہی چیخنے لگتیں۔

"پھرنے۔ پھرنے۔ آزاد ہو جاؤں تک۔ تک۔" چیختی رہیں اور گھومتی بھی رہیں۔ کسی چھوٹے گندے جوڑ کی طرح جو اپنے اندر بس غیر مٹی سی لہریں ہی پیدا کر سکتا ہے۔ بات کچھ یہیں تک رہتی تو بھی برا نہ تھا۔ لیکن ذہن پر وہ اثر جو پروانہ آزادی نے انوکھے ڈھب سے ڈالا تھا، بڑھتے بڑھتے کرب کی شکل اختیار کر گیا۔ کوئی نئی پرانی تسبیح سستی، مہنگی موتیوں کی مالا ان کے ہاتھ لگ جاتی تو اس کا دھاگہ بھی توڑ ڈالیں تو سارے دانے موتی گھن میں باجرے کی طرح بکھیر دیتیں۔ ماچس کی تیلیوں کے ساتھ بھی یہ ہی عمل ہوتا۔ پتا نہیں یہ بندھن یا بندھ جانے سے نفرت کا

اظہار تھا یا آزاد کر دیے جانے کی لگن۔

امی، ابو دونوں مجرموں کی طرح گھروں میں رہتے۔ اوھر پھوپھی کے ہاتھ کوئی کپڑا، صانی، دوپٹا، شال، پردہ یا جانا مال لگ جاتی تو اسے اوھڑنے بیٹھ جاتیں۔ ایک ایک دھاگہ الگ الگ کر کے آزاد کرتی جاتیں۔ مکمل ایمان داری سے۔ بڑی جان لگا کر۔ اور کچھ نہ ملتا تو اپنی ہی قمیص کا دامن اوھڑنا شروع کر دیتیں۔ اسی لیے پھوپھی کی زیادہ تر قمیص پیٹ سے نیچے تار تار نظر آتی تھیں۔ دامن کے دھاگے تو دن بھر میں آزاد ہو جاتے، لیکن اپنے داخلی کرب سے وہ سالوں رہائی نہ پاسکی تھیں۔ یہ

وہ سزا تھی جس پر قدرت کی عدالت نے ہزاروں سال کی قید بامشقت لوح ازل پہ لکھ کر قلم توڑ ڈالا۔ کانڈ کے مختلف کھلونے، پھول، کشتی، چاقو، گڈی اور گھڑیانے کی بھی ماہر تھیں۔

زمینب نے اپنی پہلی کہانی پھوپھی پر ہی لکھی تھی۔ بڑی محنت سے اور بڑے دن لگا کر۔ اسے یقین تھا کہ کہانی بہت پسند کی جائے گی۔ چھ مہینے تک وہ کہانی کے شائع ہو جانے کا انتظار کرتی رہی تھی۔ ساتویں مہینے تک اس نے خود ہی فون کر لیا تھا۔ رسالے کی ایڈیٹر کو۔

"آپ نے کانڈیکٹ نمبر ہی نہیں لکھا تھا ورنہ میں خود آپ کو فون کرتی۔" نفیس بارعب آواز نے کہا تھا۔

"آپ کی کہانی بہت اچھی ہے۔ لفظ لفظ بہت محنت سے لکھا گیا ہے، لیکن۔"

زمینب خوف سے کانپنے لگی۔ "دراصل آپ کی کہانی بہت زیادہ ڈارک ہے۔ بہت زیادہ سیڈ۔ ایک عورت کا پاگل ہو جانا۔ اور پھر کپڑے اوھڑنا، موتی بکھیرنا، کانڈ کے کھلونے بنانا۔ بہت دکھی اسٹوری ہے۔ ہمارے ڈائجسٹ کی پالیسی کے بالکل الٹ۔"

"لیکن میڈم! یہ تو ایک سچی کہانی ہے۔" زمینب نے ٹھوس موقف غیر اعتماد لہجے میں ادا کیا تھا۔ "ہوگی۔ ہم کوئی تین عورتیں، تین کہانیاں نہیں

چھاپ رہے۔ لڑکیاں اپنا موڈ ریلیکس کرنے کے لیے ڈائجسٹ پڑھتی ہیں۔ ایسی کہانیاں بڑا برا اثر ڈالتی ہیں جن میں خود کسی یا پاگل ہو جانے کے قصے ہوں۔ ذرا لائٹ بلکا پھلکا لکھیے۔ روانہ تک سارے شائع ہو گا۔ ضرور شائع ہو گا۔"

فون بند ہو گیا اور زمینب مہینوں افسردہ رہی۔ پھر جب اس نے دوبارہ قلم اٹھایا تو اپنی کہانیوں کو کھوکھلے چٹکوں سے سجایا۔ خلاف توقع کہانی اگلے ہی ماہ شائع ہو گئی۔ لیکن ابھی اس کی بمشکل ڈیڑھ درجن کہانیاں ہی شائع ہو پائی تھیں اور اس کا نام جانا جانے

”تمہاری نظر میں سرفہرست میں اور میرا گھر ہونا چاہیے نہ کہ اب شادی کے بعد بھی اپنے باپ کا گھر۔“

علی نے ایک دن بڑے ملکہ انداز میں بات کی تھی، لیکن جب زینب اپنی اگلے ماہ کی تنخواہ بھی امی کے ہاتھ پر دھر آئی تو ملکہ اعتراض نے باقاعدہ لڑائی کی صورت حال اختیار کر لی تھی۔

”تم اپنی تنخواہ مجھے دیا کرو اب۔“ علی نے دو ٹوک کہہ دیا اور زینب نے امی سے کچھ بھی نہ چھپایا۔ ابا دوبارہ سبزی منڈی جانے لگے۔ دونوں بوڑھے ہوتے ماں باپ کسی صورت اپنی بیٹی کا گھر داؤ پر نہ لگانا چاہتے تھے۔ لیکن گھر جو گھر نہ بن سکا۔ پہلے دن سے ہی داؤ پر لگا ہوا تھا۔ زینب ہی بے خبر تھی۔

”علی! میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔ میں ریزائن دے رہی ہوں۔ مجھ سے اس حالت میں ویکنوں بمبوں کے سفر نہیں ہوتے۔“

”یار! میں چھوڑ آیا کروں گا تمہیں۔ بائیک پر اپنے آفس جانے سے پہلے۔ صبح جلدی اٹھ جایا کروں گا۔“ علی عاجز آیا ہوا تھا۔

”بات صرف اتنی نہیں ہے علی۔ دراصل۔۔۔ دراصل ڈیوری میں دو ہی ماہ رہ گئے ہیں، آفس میں مرد بھی کام کرتے ہیں، مجھے بالکل اچھا نہیں لگتا۔“ بے چینی سے کمرے میں ٹھٹھکا علی یک دم ساکت ہو گیا۔

”دراصل بات یہ ہے مسز زینب علی کہ آپ کامیاب مستقبل کو بنانے میں اپنے شوہر کی جدوجہد میں اس کا ساتھ دینا ہی نہیں چاہتی ہیں۔ آپ بھی ان روایتی عورتوں کی طرح گھر میں ٹھاٹھ سے رہ کر مردوں کی باہری دنیا کی سر توڑ کوششوں پر یہ کہتے ہوئے لعنت بھیجتی ہیں کہ مرد تو بنے ہی کمانے کے لیے ہیں۔“

بھنویں سیکڑ کر زینب نے علی کو اجنبی نظروں سے دیکھا تھا۔ دنوں وہ علی کی بات کے اصل مفہوم کو نہ سمجھ سکی اور مہینوں اسے اپنا موقف نہ سمجھا سکی۔ پھر اس کی زندگی کی کہانی میں حنا آگئی۔ نجانے کہاں

ہی لگا تھا کہ علی کے ساتھ اس کی شادی ہو گئی اور یوں ادبی سفر آدھے راستے میں ہی تعطل کا شکار ہو گیا۔ آج پھوپھی کی نوازش سے جو اس کی ٹیلی فلم کے اسکرپٹ کے کاغذات سوراخ زدہ ہو گئے تھے تو ان کاغذات کو پرانی کتابوں اور پرانے ڈائجسٹوں کے ریک میں رکھتے وقت۔ طلاق کے کاغذات اس کی انگلیوں سے ٹکرا کر نیچے فرش پر گر گئے تھے اور دکھ کا ایک پورا موسم اس پر آکر ٹھہر گیا تھا۔ طلاق کے کاغذات اس نے رے رے ہونے کے باوجود دوبارہ پڑھنے شروع کر دیے۔ زندگی بھر کی نامحرومیوں کو ایک رات میں تھوڑی نہ بھلایا جاسکتا ہے۔

”علی حماد ولد حماد ذوالفقار۔“ زینب استہزائیہ انداز میں ہنسی اور غم کی ندی میں غوطہ لگا کر سانس لیتا بھول گئی۔

”کیا کمینہ شخص تھا علی بھی۔ ناپال کی طرح دو رنگی۔ اندر سے کچھ باہر سے کچھ اور۔ اونٹ کی کھال سے بنے لیمپ کی طرح پہلے تو بڑی مدھم اور آنکھوں کو بھلی لگنے والی روشنی دیتا رہا۔ لیکن جوں ہی کھال پھٹی تو بڑی بھیا تک لشک باہر کو پکی تھی۔“

”میں علی حماد ولد حماد ذوالفقار سات براعظموں کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ زینب حیات تم سے ساری زندگی محبت کروں گا۔“

کہتے ہوئے علی کا دمکتا چہرہ سیدھا زینب کے دل میں اتر گیا تھا۔ اس نے علی کی قسم کا یقین کر لیا اور اس سے

شادی کر لی۔ تب وہ اور علی دونوں ایک ہی کوچنگ سینٹر میں جاب کرتے تھے۔ زینب نے بڑی کم عمری میں ہی ایسی چھوٹی موٹی جابز کرنا شروع کر دی تھیں۔ جب ایک رات اس نے ابا کو امی سے شکوہ کرتے سن لیا تھا۔ ”بیٹا ہوتا تو اس گھر کو چلانے کے لیے بڑھاپے میں اپنی ہڈیاں نہ گلانی پڑتیں مجھے۔“

اس نے ابا کو سبزی منڈی جانے سے منع کر دیا تھا اور گھر کو چلانے کے لیے اپنی ہڈیاں آگے کر دی تھیں۔ علی کو شادی کے بعد پہلا اعتراض اسی جاب کے تو ہوا تھا۔ نہیں جاب پر نہیں، بلکہ جاب سے آنے والی کمائی پر۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو پیسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریزیوم ایبل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✧ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

چھوٹا بہانہ ڈھونڈنے لگا۔ زینب کے دل کی بارہ دری میں ابھی بھی کہیں پرانا کوچنگ سینٹر والا ٹکٹ کھٹ سا علی ہی بسرام کیے بیٹھا تھا۔ جس نے سات براعظموں کی قسم کھا کر ساری زندگی کی محبت نبھانے کا عہد دیا تھا۔ اس نئے پر آسائش زندگی کی ہوس کے مارے علی کو وہ بلکان ہوتا ہوا نہ دیکھ سکی اور چپ چاپ اپنے گھر چلی آئی۔

چند دنوں بعد ہی اسے طلاق کے کاغذات مل گئے تھے۔ جسے اس نے پرانی کتابوں اور ڈائجسٹوں کے ریک میں دفن کر دیا تھا اور ان کاغذات کے ساتھ وہ کہیں خود بھی دفن ہو کر رہ گئی تھی۔

”پھاڑ کے پھینک دے اسے۔ یا جلا دے۔ کس لیے سنبھال کر رکھا ہوا ہے اس پرانے زخم کو۔ بار بار کریدنے کے لیے یا تڑپنے کے لیے۔“

امی نے وہاں کی صفائی کرتے ہوئے کتنی ہی بار اسے کہا تھا اور پھوپھی کتنی ہی دفعہ ان کاغذات کا گھر بنا چکی تھیں۔ وہ ہر دفعہ انہیں پھینکنے یا جلانے کے پختہ خیال کو ٹال جاتی تھی۔ شاید طلاق ہونے کے باوجود بھی وہ ابھی تک علی کی محبت کو اپنے دل سے نکال نہ پائی تھی یا شاید اس نے کوشش ہی نہ کی تھی۔

”میں علی حماد ولد ذوالفقار۔“ وہ استہزائیہ ہنسی اور غم کی ندی میں ڈوب کر سانس لینا بھول گئی۔ ڈھائی سال کے اندر اندر یہ فقرہ دوبار اس کے دل میں اترا تھا۔ ایک دفعہ اس کی زندگی کو محبت سے بخش دیا گیا تھا اور دوسری مرتبہ برباد کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی گئی تھی۔



کمرے میں بڑے مدھم انداز سے سرگرم کی آواز گونجی تو اس نے چونک کر اپنے بیک میں سے موبائل فون نکالا۔

بروڈکشن ہاؤس سے مسٹر اکرام کا فون تھا۔ ”مجھے لگا میری دوپہر کی گفتگو سے آپ کچھ زیادہ ہی ان ٹینس نہ ہو گئی ہوں۔ دیکھیے پوائنٹ بہت چھوٹے چھوٹے لیکن بہت اہم ہیں۔ پہلے تو ہمیں ٹیلی فلم کا

سے ریک کی طرح ایک دفعہ آکر دوبارہ نہ جانے والی۔ چلو آجاتی۔ زینب ایسی بھی تنگ نظر نہ تھی کہ محض شوہر کی دیدہ بازی پر دل تنگ کر کے ناراض ہو، ہو کر گھر آجایا کرتی۔ لیکن مسئلہ تو الجبرا کی طرح تب پیچیدہ ہوا جب ان کی زندگیوں میں داخل ہو کر حنائی واپس نہ جانے کا عزم ہی کر لیا اور علی آئے دن نت نئی شرٹس پر ہنسنے ہنسنے پر فوم چھڑکنے لگا۔ اس کے جوتے بھی ایسے ہی بے بہا قیمتی ہونے لگے کہ زینب کے ہاتھ ان پر پالش کرتے ہوئے کانپ کانپ جاتے۔ ایک دن اس نے کانپتے دل کے ساتھ علی سے کہا۔

”تمہیں حنا اس لیے اچھی لگتی ہے کہ وہ خوب صورت ہے یا اس لیے کہ وہ دولت مند ہے؟“ حالانکہ زینب کے لیے تو دونوں ہی باتیں ناقابل قبول تھیں۔ یہ لفظی کھینچ تھا جو علی کے گل پر لگا اور جسے وہ اپنے دل تک لے گیا۔ لیکن چونکہ مرد تھا اس لیے جواب اس نے دل غ سے دیا۔ بڑے تحمل سے۔

”دولت پر ہر خوبی حاوی ہوتی ہے مسز زینب علی! درحقیقت یہ ہی سب سے بڑی خوبی ہے۔“

”تم یہ اس لیے کہہ رہے ہو کہ تم خود ایک مایا داس ہو۔ دولت کے پجاری۔“

”اپنی ادلی گفتگو اپنے پاس رکھو۔ میں ریک ریک کر سسک سسک کر زندگی نہیں گزارنا چاہتا۔ اگر تمہیں کوئی اعتراض ہو تو بتاؤ، تمہارا سارا حساب کتاب میں اسی وقت بے باق کر دوں گا۔“

زینب جانتی تھی کہ سارا حساب کتاب بے باق کرنے میں تین سیکنڈ اور تین لفظ درکار ہیں۔ اس لیے وہ بڑی دیر خاموشی سے اپنے کھاتے کا گھانا دیکھتی رہی اور برداشت کرتی رہی۔

لیکن حنائی نے محرومیوں میں زندگی نہیں گزاری تھی اور نہ ہی اسے کسی سفید پوشی کا بھرم درکار تھا۔ اپنی خود کی ترتیب شدہ زندگی میں وہ علی کی پہلی بیوی جیسے بھونچال کو اپنے گھر کے کونے کے ساتھ لگا ہوا بھی نہ دیکھنا چاہتی تھی۔

اس لیے علی زینب سے لڑنے کا ہر چھوٹے سے

نام تبدیل کرنا ہو گا۔ کیا ٹائٹل ہے آپ کی فلم کا۔
ساڑھ ستی؟“

”جی سو۔ ساڑھ ستی۔“

”عنوان بہت مشکل ہے۔ اور کیا مطلب بتایا تھا
آپ نے اس کا۔“

”زحل کا منحوس دوں۔ جو ساڑھ سات برس کا
ہوتا ہے۔ نحوست کا لہذا وقت۔“

”اوہ نو۔ نو۔ یہ کائناتی راز فاش کرنے والے نام
ٹیلی فلمز کے ٹائٹل نہیں ہو سکتے۔ کوئی پارا سائنس نام
رکھیے۔ محبتوں کے گیت۔ ساحلوں کے رپ
جیسا۔ لڑکیاں تو ایسے عنوان پر ہی مرثیٰ ہیں۔ اور
آخری سین تو بالکل ہی بدل ڈالیے۔ ہیروئن کو اپنے
بچے کے ساتھ مسکراتا ہوا دکھائیے۔ شوہر کے چھوڑ
جانے سے کوئی زندگی ختم تھوڑی ہو جاتی ہے یا ساحل
سمندر پر چل قدمی کرتے دکھائیے۔ ایک نئے عزم
کے ساتھ۔ ایک سبق ہو جائے گا سب کے لیے
اختتام۔ ٹھیک ہے۔ سمجھ گئییں نا آپ؟“

”جی بالکل۔“ فون بند کر کے وہ خلاؤں میں
گھورنے لگی تھی۔

”ساحلوں کے رپ۔ محبتوں کے گیت؟“

عورت پر ساڑھ ستی کا ستارہ تو پچھلے سات قرون
سے چمک رہا ہے۔ پھر وہ ساحلوں کے رپ کیسے دیکھ
سکتی ہے اور محبتوں کے گیت کیسے سن سکتی ہے؟
”ہیروئن کو اپنے بچے کے ساتھ مسکراتا ہوا
دکھائیں۔“

طنز بھری مسکراہٹ کے ساتھ اس نے مسٹر اکرام
کی بات کو یاد کیا تھا۔ خود اسے اپنے بچے کی کسٹڈی کا
کیس لڑتے سال گزر گیا تھا۔ عدالتوں کے چکر لگانا کر
وہ ادھ موٹی ہو گئی تھی اور جس دن فیصلہ زینب کے حق
میں ہوا۔ علی نے اسے ایک الگ ہی وار سے ہرا دیا
تھا۔ وہ وار جو عرصے سے انسانیت کی معراج بنا ہوا
ہے۔

”تم چاہتی ہو کہ وہ بھی تمہاری طرح ترس ترس کر
زندگی گزارے؟ میں اس کا باپ ہوں۔ سگا باپ۔
حناسے ماں جیسا پیار نہ بھی دے سکی تو اس کا حق تو
ضرور دے دے گی۔“

علی کچھ حقیقت اور کچھ حربے سے زینب کو رام
کر کے بچے کو اپنے ساتھ دینی لے گیا تھا۔ نہیں صرف
بچے کو نہیں بلکہ زینب کے جسم کے کسی حصے کو کاٹ
کر بھی۔ جب کبھی ممتا کا سیلاب اس کی آنکھوں میں
اٹ کر دھمکی سی دینے لگتا تو وہ یہ سوچ کر دل پر پتھر رکھ
لیتی کہ چلو اس کا بیٹا تو دینی میں پرورش پا رہا ہے۔ دینی
جو پارس پتھر ہے۔ شاید اس کا بیٹا اسے چھو کر کندن ہی
بن جائے۔

علی نے ٹھیک ہی تو کہا تھا اس سے کہ وہ ترس ترس
کر زندگی گزار رہی ہے۔ واقعی ان دنوں کتنی ضرورت
تھی اسے پیسے کی۔ ابا کی وفات کے بعد سارا گھر ہی تو
اس کے کندھوں پر آن گرا تھا اور ایک یہ ٹیلی فلم بھی
جس کی نیا پار ہی نہیں لگ پار ہی تھی اور بے پتواری کی
کشتی کی طرح بس ادھر ادھر ڈول رہی تھی۔

”اینڈ بھی (خوش گوار) کریں۔ مسکراتا ہوا
دکھائیے۔ ایک عزم سا اٹھے سینے میں۔“ کہانیوں
کے بارے میں بھی اسے یہ ہی کہا جاتا تھا۔

”فرضی کہانیوں کے اینڈ تو بھی ہو جائیں گے۔
لیکن اصل زندگی ویسی ہی دکھی رہے گی۔“ بڑے درد
سے اس نے سوچا تھا۔

اور دھاڑ سے کسی نے اس کے کمرے کے
دروازے کے ایک پٹ کو تھام لیا تھا۔ گرنے سے
بچنے کے لیے۔ زینب نے سر اٹھا کر دیکھا۔ یہ

حرکت پھوپھی نے کی تھی۔ جواب بھونچکے انداز
میں اسے زینب کو ہی دیکھ رہی تھیں۔ ایسے جیسے ان
کا سارا جسم خاردار جھاڑیوں پر گھسٹا جا رہا ہو جاگتی
روح سمیت۔ زینب ان کے ایسے دیکھنے کے انداز کو
نہ سمجھ سکی۔

لیکن پھر چند لمحوں بعد۔

اس پر ایک کرب ناک حقیقت آشکار ہوئی۔
اپنی ہی سوچوں میں غلطیاں۔ وہ نجانے کب

اپنی ہی قیص کے دامن کے دھاگے ایک ایک
کھوکھلے نکال رہی تھی اور اپنا دامن تار تار کر رہی تھی۔

نازیہ کنول نازی



ہم تو بس خواب ہیں کچھ پل میں بکھرنے والے
پھر کسی آنکھ کسی نیند میں آئیں گے نہیں
پھر کسی راہ کسی موڑ پہ ہم ہوں گے نہیں
ہم تو بس گرد ہیں کچھ در میں چھٹ جائیں گے
ہم تو خوشبو ہیں ہمیں رنگ نہ دینا کوئی
صرف احساس کو چھو کر گزر جاتا ہے ہمیں
ہم تو آنسو ہیں بس گے تو نہ لوئیں گے کبھی

ناؤلیٹ

ہم تو بس زخم ہیں سینے کا ہمیں بھرنا ہے
ہم وہ احساس کی بلیں ہیں جو چھاؤں چاہیں
درد کی دھوپ جو چھو لیں تو ہمیں مرنا ہے
ہم تو بس خواب ہیں کچھ پل میں بکھرنے والے!
موسم اچانک خراب ہوا تھا۔ تیز آندھی کے بعد
موسلا دھار بارش اور اس پر زور و شور سے چمکتی گر جتی
بجلی نے اس کا ننھا سادل سہا کر رکھ دیا۔ احزار ابھی گھر
نہیں آیا تھا جبکہ باقی نوجوان پارٹی اسی کے کمرے میں
تھکی فلم دیکھ رہی تھی۔

علیٰ نے جائے نماز سمیٹ کر رکھنے کے بعد ایک
نظر باہر صحن میں اوپر آسمان کی طرف دیکھا، پھر درود
شریف کا ورد کرتی کچن کی طرف چلی آئی۔
سنگ میں شام کی چائے اور رات کے کھانے کے
برتن پڑے، ابھی تک اس کی نگاہ التفات کے منتظر
تھے وہ خاموشی سے برتن دھونے میں مصروف ہو گئی،
تقریباً پچیس منٹ کے بعد احزار بارش میں بھگا گھر
واپس آیا تھا۔

”ایکسکیوز می۔ کوئی ہے؟“

وہ جانتا تھا کہ علیٰ کچن میں ہوگی، تبھی گھر میں
داخل ہوتے ہی کچن کی طرف چلا آیا تھا۔ علیٰ نے ذرا
سی گردن ترچھی کر کے اسے دیکھا پھر دوپٹے سے ہاتھ
خشک کر لیے۔

”جی ہاں، سب ہی لوگ موجود ہیں، الحمد للہ بھرپور
گھر ہے۔“

”اچھا۔۔۔ مگر تمہارے سوا کوئی نظر تو نہیں آ رہا۔“
لیڈر کی جیکٹ سے پانی کی بوندیں جھاڑتے ہوئے وہ
اس کے قریب آیا تھا۔





زندگی کا پہلا خواب تھا۔



احزار اپنے کمرے میں آیا تو علیزہ کی اطلاع کے عین مطابق سب کزنز اس کے کمرے میں دھاوا بولے، تقریباً وہاں موجود ہر چیز کا حشرنگاڑ چکے تھے۔ قالین پر چیونٹیاں، چپس اور مختلف بسکٹس کے رسیپر اسے غصہ دلا گئے۔

جانے کون سی مووی تھی۔

آزر جو اس سے چھوٹا تھا۔ اس کے کمرے میں آتے ہی فوراً "نیند کا بہانہ کرتے اٹھ کھڑا ہوا، تاہم لڑکیاں ابھی بھی سوئی جاگی سی کیفیت میں کمپیوٹر کے سامنے براجمان، فلم ختم ہونے کا انتظار کر رہی تھیں وہ اسے آتے دیکھ کر چلی گئی تھیں۔

وہ غصہ ضبط کرتا، فریض ہونے کے بعد وہیں بیڈ پر ٹپک گیا، تقریباً "بندرہ منٹ کے بعد علیزہ چائے لے کر آئی تو وہ بھی قلم دیکھنے میں مگن ہو چکا تھا۔ علیزہ نے ایک نظر ان سب پر ڈالنے کے بعد چائے کا کپ احزار کے بیڈ کے پاس تپائی پر دھریا۔ کپ رکھ کر وہ جانے کے لیے پلٹ ہی رہی تھی کہ احزار نے اسے پکار لیا۔

"علیزہ۔"

"ہوں۔"

"تم مووی نہیں دیکھتیں؟"

"نہیں۔"

"کیوں؟"

"مجھے پسند نہیں، ویسے بھی باہر اتنا خراب موسم ہے، بجائے اللہ رب العزت کی پاک ذات سے ڈرنے کے ہم یہ گناہ کا کام کیوں کریں۔"

"اچھا پلیز فوراً لیکچر نہ شروع کر دیا کرو، ابھی بیٹھو پلیز، مجھے اچھا لگے گا۔"

"نہیں، تمہیں دیکھنی ہے تو تم دیکھو، مجھے نیند آ رہی ہے۔"

"صرف پانچ منٹ بیٹھ جاؤ، پلیز۔"

علیزہ مسکرا دی۔

"نظر کیسے آئے گا کوئی؟ سب رات کے کھانے کے بعد اپنے اپنے کمروں میں جا چکے ہیں ہاں جو کزنز پارٹی ہے وہ آپ کے کمرے میں آپ کے پیارے کمپیوٹر پر دھاوا بولے جانے کون کون سی مووی دیکھنے میں مصروف ہیں۔"

"اچھا۔ اور آپ جناب یقیناً میرے سلامتی سے گھر واپس آنے کی دعائیں مانگ رہی ہوں گی ہیں ناں؟" روشن نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا وہ تھوڑا قریب ہوا تھا۔ علیزہ جلدی سے پیچھے کھسک گئی۔

"جی ہاں، لیکن کل سے اگر اتنی لیٹ گھر آئے تو میں بھی بالکل نہیں جاگوں گی۔"

"روز کی دھمکی دیتی ہو، مگر عمل نہیں کرتیں؟"

"کیا کروں، مجازی خدا جو ہوئے۔"

"اچھا پھر کیا خیال ہے تالی اماں سے کہہ کر رخصتی نہ کروالوں۔" شرارت سے لب دباتے ہوئے وہ پھر اس کی طرف تھوڑا سا جھکا تھا، تبھی علیزہ نے گھبرا کر فوراً اس کی طرف دیکھا۔

"خبردار، اگر یہ بے ایمانی کی تو بہت بری طرح پیش آؤں گی۔"

"اچھا اچھا بابا ٹھیک ہے۔ میں کمرے میں جا رہا ہوں۔ ابھی ایک کپ گرم چائے بنا کر لے آؤ، کھانا میں کھا کر آیا ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔"

"گڈ گرل!" محبت سے اس کے گال تھپتھپاتا ہوا اگلے ہی پل وہ کچن سے نکل گیا تھا۔ علیزہ نے اس کے جانے کے بعد بے ساختہ کھل کر سانس لی۔

کتنے سال ہو گئے تھے اس شخص کے نکاح میں آئے مگر آج بھی اس کی قربت اسے بوکھلا دیتی تھی۔ اور اس وقت بھی ایسا ہی ہوا تھا۔

اس نے سن رکھا تھا کہ اللہ انسان کی شہ رگ سے بھی زیادہ اس کے قریب ہوتا ہے، مگر علیزہ حسین کو اس سچ کا یقین احزار عبد الہادی کو پانے کے بعد ہوا تھا، وہ احزار عبد الہادی جو اس کا فرسٹ کزن اور اس کی

اس بار علیزہ کا بازو تھامتے ہوئے احزار کا لہجہ ملتتی ہو گیا تھا۔ اسے نہ چاہتے ہوئے بھی بیٹھنا پڑا۔ 'سیری' نمل اور کوئل جو اس کے چھوٹے چچا کی بیٹیاں تھیں۔ تینوں فلموں کی شدید انی تھیں اور یقیناً "ان ہی کی ضد پر آزر نے احزار کا کمپیوٹر استعمال کرنے کی جرات کی تھی۔ کیونکہ احزار خود کو ان تینوں بہنوں کا اکلوتا بھائی سمجھتا تھا اور اس کے دربار میں ان تینوں کے سارے قصور قطعی معاف تھے۔ اب تک جانے کتنی فلمیں دیکھی جا چکی تھیں۔

احزار ایک نظر اسکرین پر ڈال لیتا پھر موبائل کے ساتھ مصروف ہو جاتا۔ علیزہ نے دیکھا سامنے اسکرین پر اس وقت نہایت بولڈ سین چل رہا تھا۔ اس کا دل بے ساختہ دھڑک اٹھا، موبائل کے ساتھ مصروف احزار عبد الہادی سے نگاہ چراتی، وہ ایک منٹ سے پہلے اس کے پہلو سے کھڑی ہوئی تھی۔

"کمپیوٹر آف کرو احزار! وہ سب جا چکے ہیں مجھے بھی بہت ٹوٹ کر نیند آرہی ہے۔"

"بات سنو۔" اس کے فرار پر ایک نظر سامنے اسکرین پر ڈالتے ہوئے احزار نے فوراً "اسے روک لیا تھا۔ وہ دھڑکتے دل کے ساتھ نہ چاہتے ہوئے بھی رک گئی تھی۔

"ہوں۔"

"یہاں بیٹھو پلیز۔"

"احزار! مجھے نیند آرہی ہے۔"

"میری بات سمجھ میں نہیں آرہی تمہیں؟" علیزہ کے فرار پر وہ خفا ہوا تھا۔ اسے نہ چاہتے ہوئے بھی بیٹھنا پڑا۔

"علیزہ۔!"

صرف ایک لمحے کے بعد اس نے قدرے سرگوشی میں اسے پکارا تھا، علیزہ کے ہاتھوں میں کپکپاہٹ در آئی احزار اس لمحے اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

اک سال ہونے کو آیا تھا ان کے نکاح کو، مگر آج تک احزار نے کبھی کسی کمزور لمحے سے فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ دونوں کے درمیان بے تکلفی

کے باوجود ایک فاصلہ رہا تھا۔ مگر اس وقت جانے کیا ہوا تھا کہ اس جیسا مضبوط اعصاب کا شخص بھی خود پر کنٹرول نہیں رکھ پایا تھا۔

اپنے اعصاب پر قابو پاتی علیزہ بھاگ کر احزار کے کمرے سے نکل آئی تھی، وہ اسے پکارتا ہی رہ گیا تھا مگر اس نے پروا نہیں کی۔

انے کمرے میں پہنچ کر ابھی وہ اپنی منتشر سانسوں کو سنبھال بھی نہ پائی تھی کہ احزار اس کے کمرے میں آگیا۔

"علیزہ! میری بات سنو پلیز۔" بے بس سا وہ اس کی طرف برہم تھا۔

"تم میری بیوی ہو، میں کچھ غلط نہیں چاہ رہا پلیز مجھے سمجھنے کی کوشش کرو پلیز۔"

"نہیں۔ تم ابھی اور اسی وقت یہاں سے چلے جاؤ پلیز۔"

"میں نہیں جاؤں گا، تم جانتی ہو میں تم پر پورا پورا حق رکھتا ہوں، پھر کیا فرق پڑتا ہے اگر میں رخصتی سے قبل۔"

"چپ کر جاؤ احزار پلیز۔" علیزہ کی آواز بھرائی تھی۔

"تمہیں اس بات سے فرق پڑتا ہو یا نہ پڑتا ہو، مگر مجھے فرق پڑتا ہے، کیونکہ میں سمجھتی ہوں ہم جس معاشرے میں رہتے ہیں وہاں کی روایات کا خیال رکھنا بھی ہمارا فرض ہے۔"

"میں کچھ نہیں جانتا بس، تم میری منکوحہ ہو اور تمہیں میری زندگی کا حصہ بننا ہے۔" اس نے پھر اسے بے بس کرنے کی کوشش کی تھی وہ بے اختیار رو پڑی۔

"احزار! یہ غلط ہے۔"

مگر احزار نے نہیں سنا، وہ جنونی ہو رہا تھا۔ علیزہ کے احتجاج اور گریز کی اس کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں تھی۔ کوئی راستہ نہ پا کر علیزہ اپنے کمرے کے ہاتھ روم میں جا چھپی۔ اس وقت وہی اس کی بہترین پناہ گاہ تھی۔ لرزتے ہوئے ہاتھوں سے اس نے ہاتھ روم لاک کیا تھا۔ احزار اس کی اس حرکت پر جیسے پاگل سا ہو

اٹھا۔
 ”دروازہ کھولو علیزہ! نہیں تو میں کبھی تم سے بات نہیں کروں گا۔“
 ”مت کرنا میں خود آج کے بعد تمہاری شکل دیکھنا پسند نہیں کروں گی۔“
 ”علیزہ! میں کہہ رہا ہوں دروازہ کھولو، نہیں تو اچھا نہیں ہو گا۔“

”آئی ڈونٹ کیئر تم جاؤ یہاں سے پلیز۔“
 ”تو ٹھیک ہے اب اس کا رزلٹ بھی دیکھ لینا۔“
 وہ غصے میں تھا، علیزہ گھٹنوں میں منہ چھپا کر بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ احزار عبد الہادی اس کے ساتھ کبھی ایسا بھی کر سکتا ہے اسے گمان تک نہیں تھا۔

اکلی صبح ناشتے کی میز پر احزار کی آنکھیں سرخ تھیں۔

جبکہ اپنے کمرے میں مقید علیزہ حسین کا وجود بخار میں جل رہا تھا۔ کل پوری رات شدت سے رونے کے سبب اس کی آنکھیں سرخ اور بو جھل ہو رہی تھیں، جبکہ سر میں شدید درد تھا۔ اس کا بس نہ چلتا تھا کہ وہ احزار عبد الہادی کو گریبان سے پکڑ کر اس کے چہرے پر دو تھپڑ تو ضرور جڑ دیتی۔ باہر لاؤنج سے گاہے بگا ہے سب کی آوازیں آرہی تھیں اس کی غیر حاضری پر شاید اس کی ماں نے سب کے لیے ناشتہ بنانے کے فرائض سرانجام دے دیے تھے وہاں ناشتے کی ٹیبل پر اس کی ماں کے سوا شاید کسی کو بھی اس کی کمی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ تبھی وہ بے جان سی بستر میں دبکی پڑی رہی۔ وہاں اس کی فکر کرنے اور اس کا چال پوچھنے کی فرصت کسی کے پاس بھی نہیں تھی، تبھی اس نے محسن صاحب کی آواز سنی تھی۔

”تمہاری کینیڈا جانے کی بات کہاں تک مکمل ہوئی احزار؟“

”کوشش کر رہا ہوں بڑے ابو اللہ نے چاہا تو جلد بات فائنل ہو جائے گی۔“ احزار کا لہجہ اسے بے حد بھاری محسوس ہوا تھا۔

”ہوں، سیری کے لیے ایک لڑکا دیکھا ہے میں نے“
 ویل آف فیملی سے تعلق رکھنے والا اکلوتا لڑکا ہے، تم ذرا چھان بین کر لو۔“
 ”ٹھیک ہے کر لوں گا۔“
 ”طبیعت بہتر نہیں لگ رہی تمہاری، سب ٹھیک تو ہے؟“

”جی سب ٹھیک ہے، مجھے کچھ بات کرنی تھی آپ لوگوں سے۔“

قدرے اکھڑے لمحے میں اس نے کہا تھا اور علیزہ کا دل جیسے اچھل کر حلق میں آ گیا۔ شدید بخار کے باوجود وہ گرم کمرے سے نکل کر چمن میں آئی تھی تاکہ احزار کی آواز کو صاف سن سکے۔

”ہوں کہو۔“ احزار کے سنجیدہ انداز پر جہاں سب اس کی طرف متوجہ ہوئے تھے وہیں حسن صاحب نے بھی ہاتھ میں پکڑا اخبار سائیڈ پر رکھ دیا۔ احزار نے صرف ایک نظر چمن کی طرف دیکھا پھر لب بھیج کر نگاہ پھیر لی۔

”پاپا! میں کینیڈا جانے سے پہلے شادی کرنا چاہتا ہوں، تاکہ میں یہاں ہر معاملے سے قطعی بے فکر ہو کر وہاں مکمل توجہ کے ساتھ اپنی پڑھائی مکمل کر سکوں، میں درمیان میں لٹک کر نہیں جانا چاہتا۔“
 وہی ہوا تھا جس کا علیزہ کو ڈر تھا۔

ناشتے کی ٹیبل کے گرد بیٹھے سب افراد کو احزار کی اس اچانک فرمائش پر حیرانی ہوئی تھی۔ مگر اسے کسی کی پروا نہیں تھی۔

حسن صاحب اب اخبار ایک طرف رکھ کر اس سے کہہ رہے تھے۔

”میں بھی یہی سوچ رہا تھا احزار کہ اباجی کی طبیعت سنبھل کر نہیں دے رہی، ان کی زندگی میں ہی یہ کار خیر انجام پا جائے تو بھلا اس سے اچھی اور کیا بات ہو سکتی ہے، مگر علیزہ ابھی اس کے لیے تیار نہیں ہے، وہ پڑھ رہی ہے، ابھی امتحان بھی نہیں ہوئے اس کے، وہ ڈسٹرب ہو کر رہ جائے گی۔“

”پاپا! میں کچھ نہیں جانتا، آپ تائی اماں سے بات

بیوٹی بکس کا تیار کردہ

سوہنی ہیرائل

SOHNI HAIR OIL

- ✽ کرتے ہوئے بالوں کو روکتا ہے
- ✽ نئے بال اگاتا ہے۔
- ✽ بالوں کو مضبوط اور چمکدار بناتا ہے۔
- ✽ مردوں، عورتوں اور بچوں کے لئے
- ✽ یکساں مفید
- ✽ ہر موسم میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔



قیمت = 120/- روپے

سوہنی ہیرائل 12 جزی بوتلوں کا مرکب ہے اور اس کی تیاری کے مراحل بہت مشکل ہیں لہذا یہ تھوڑی مقدار میں تیار ہوتا ہے۔ یہ بازار میں یا کسی دوسرے شہر میں دستیاب نہیں، کراچی میں دستی خرید جاسکتا ہے، ایک بوتل کی قیمت صرف = 120/- روپے ہے، دوسرے شہروں کے لئے منی آرڈر بھیج کر رجسٹرڈ پارسل سے منگوائیں، رجسٹری سے منگوانے والے منی آرڈر اس حساب سے بھجوائیں۔

- 2 بوتلوں کے لئے ----- 300/- روپے
- 3 بوتلوں کے لئے ----- 400/- روپے
- 6 بوتلوں کے لئے ----- 800/- روپے

نوٹ: اس میں ڈاک خرچ اور پیکنگ چارجز شامل ہیں۔

منی آرڈر بھیجنے کے لئے ہمارا پتہ:

بیوٹی بکس، 53- اورنگزیب مارکیٹ، سیکٹر فلور، ایم اے جناح روڈ، کراچی

دستی خریدنے والے حضرات سوہنی ہیرائل ان جگہوں

سے حاصل کریں

بیوٹی بکس، 53- اورنگزیب مارکیٹ، سیکٹر فلور، ایم اے جناح روڈ، کراچی

مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37- اردو بازار، کراچی۔

فون نمبر: 32735021

کریں اگر وہ شادی کے لیے تیار ہیں تو ٹھیک ہے، نہیں تو میری طرف سے یہ رشتہ ختم سمجھیں۔“

قطعی دو ٹوک انداز میں اپنی بات مکمل کرتے ہی وہ وہاں ایک پل نہیں ٹھہرا تھا۔ جبکہ حسن صاحب اور باقی سب افراد ہکا بکا سے اس کامنہ دیکھتے رہ گئے تھے۔

علیہ کو لگا جیسے کسی نے اس کے پاؤں تلے سے زمین کھینچ لی ہو، احزار عبد البہادی کے لیے یہ رشتہ اتنا کمزور ہو گا وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ تب ہی وہیں کچن میں کرسی گھسیٹ کر بیٹھتے ہوئے اس نے اپنے آنسوؤں کو کھل کر بہنے دیا تھا۔



احزار عبد البہادی علیہ حسین کے دل کی پہلی خواہش اور اس کا اولین خواب تھا۔

دونوں ایک ہی گھر میں پل کر جوان ہوئے تھے، بچپن میں وہ اس کے معاملے میں اتنی حساس تھی کہ اگر وہ اسے چھوڑ کر کسی اور بچے کے ساتھ کھیل میں مصروف ہو جاتا، یا گھر میں اس کے سوا کسی اور کو اپنی کوئی چیز دے دیتا تو وہ فوراً ”منہ بسور کر بیٹھ جاتی تھی“ جب کوئی احزار کو اپنے ساتھ کھیلنے کی آفر کرتا تو وہ فوراً ”اپنے سارے کام چھوڑ کر آتی اور احزار کا ہاتھ پکڑ کر“ میلا اے“ کہتے ہوئے اپنی طرف کھینچ لیتی۔

بچپن سے سب احزار کے لیے اس کی حرکتوں کو خوب انجوائے کرتے تھے۔ اسی چیز کو مد نظر رکھتے ہوئے منیر احمد صاحب (دادا جی) نے بچپن میں ہی ان دونوں کو نکاح جیسے مضبوط بندھن میں باندھ دیا۔ یہ فیصلہ اس لیے بھی جلد ہو گیا تھا کیونکہ علیہ کے والد حسین احمد صاحب حیات نہیں تھے اور خود منیر احمد کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں رہتی تھی۔

علیہ کی ماں اور احزار کے گھر والے دونوں ہی اس رشتے پر خوش تھے۔ مگر منیر صاحب کے بٹھلے بیٹے محسن اور ان کی بیوی کامنہ بن گیا تھا۔ ان کی تین بیٹیاں تھیں، اور وہ دونوں احزار کو اپنا داماد بنانے کا خواب دیکھ رہے تھے۔ تاہم منیر احمد صاحب نے ان سے مشورہ

کرنے کے بجائے اپنا فیصلہ سنا دیا تھا جس پہ وہ دونوں خوش نہیں تھے۔

احزار اپنا ایم لی اے مکمل کر چکا تھا اور اب اس کا ارادہ کینیڈا جانے کا تھا۔ تاکہ مزید تعلیم کے ساتھ ساتھ وہ اپنے زور بازو پر اپنے لیے روزگار کے بہترین مواقع حاصل کر سکے۔ علیزہ اپنے ماں باپ کی اکلوتی اولاد تھی، اس کے والد حسین احمد صاحب کی شادی اپنے دونوں چھوٹے بھائیوں کے بعد ہوئی تھی، وجہ ان کی ضرورت سے زیادہ بزنس میں توجہ تھی جس کے سبب وہ شادی کرنے میں دلچسپی نہیں لیتے۔

جس وقت علیزہ کی پیدائش ہوئی، محسن صاحب دو بیٹیوں اور حسن صاحب دو چاند سے بیٹوں کے باپ بن چکے تھے، بعد ازاں علیزہ کی پیدائش کے پانچ ماہ بعد محسن صاحب کے ہاں ان کی تیسری بیٹی کو ملنے جنم لیا، جبکہ حسن صاحب کی بیگم نے آزر کی صورت ایک اور خوب صورت بیٹے کو جنم دے کر اس گھر کی خوشیوں کو دو بالا کر دیا۔

شمینہ بیگم البتہ اس گھرانے کو ایسی کوئی خوشی نہیں دے سکی تھیں، علیزہ کے بعد انہوں نے ایک مردہ بیٹے کو جنم دیا اور پھر کبھی ماں نہ بن سکیں۔ حسین صاحب دل کے مریض تھے، علیزہ جب سات سال کی تھی وہ دنیا سے منہ موڑ گئے۔ تب سے منیر صاحب ہی اس کو باپ کا پیار دیتے آئے تھے، اب بھی انہوں نے ہی اس کے باپ کی حیثیت سے اس کی زندگی کا فیصلہ کیا تھا جس پر وہ خود بھی بے حد خوش تھی۔

محسن صاحب کو منیر صاحب سے گلہ تھا کہ ان کی بیٹیاں زیادہ تھیں، پھر علیزہ سے بڑی بھی تھیں منیر صاحب کو پہلے ان کے بارے میں سوچنا چاہیے تھا۔ مگر انہوں نے ان کی بیٹیوں کے بارے میں سوچنے کے بجائے علیزہ حسین احمد کے بارے میں سوچا تھا اور یہ صریحاً "زیادتی" تھی۔

مگر منیر صاحب نے اس کی پروا نہیں کی تھی۔ احزار اور علیزہ کو نکاح جیسے مضبوط بندھن میں باندھنے کے بعد وہ جیسے بہت پرسکون سے ہو گئے تھے۔

گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ جہاں علیزہ اور احزار میں محبت بڑھی تھی وہیں منیر احمد صاحب کی صحت تیزی سے گرنا شروع ہو گئی، علیزہ کا زیادہ وقت انہی کے کمرے میں گزرتا تھا، مگر پھر بھی وہ مسلسل بیماری کی زد میں تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ وہ اپنی زندگی میں ہی علیزہ کی رخصتی کے فرض سے بھی سبکدوش ہو جائیں۔ مگر علیزہ اس کے لیے تیار نہیں تھی۔ وہ جانتی تھی کہ شادی کے بعد اس کے لیے اپنی تعلیم پر توجہ دینا بہت مشکل ہو جائے گا۔ لہذا وہ اس مسئلے کو ٹالتی آرہی تھی، تاہم اس کی اس ضد کے سبب تادیر حسن کی محبت اس کے لیے پہلے جیسی نہیں رہی تھی۔ کچھ محسن صاحب کی بیگم زینہ ہر وقت ان کے کانوں میں عجیب عجیب سی باتیں ڈالتی رہتی تھیں، ان کی تینوں بیٹیاں بھی ان کے آگے پیچھے پھرتی رہتی تھیں، ابھی انہیں اپنے لائق فائق سے بیٹے کے لیے علیزہ جیسی اپنے آپ میں مکن رہنے والی کم گوڑکی قطعی غلط انتخاب لگنا شروع ہو گئی تھی۔ وہ اب اس وقت کو اکثر کوسنی نظر آتی تھیں، جب انہوں نے اپنے سر کے فیصلے پر ان کا ساتھ دیا تھا۔

سوئے پر سنا کہ احزار کی علیزہ کے لیے بے تحاشا محبت اور ناز برداریوں نے ان کا دل مزید تنگ کیا تھا وہ اب دل سے اس بندھن کے لیے خوش نہیں تھیں۔ اس روز کے بعد سے احزار کے معمولات بدل گئے تھے۔

وہ صبح دس بجے بیدار ہوتا تھا۔ پھر آفس چلا جاتا، آفس سے واپسی پر کسی دوست کی طرف نکل جاتا پھر معمول کے مطابق رات گئے تک گھر واپسی کی راہ لیتا، اس کے سارے کام جو علیزہ اپنے ہاتھوں سے سر انجام دیتی تھی، اب مکمل نے چپ چاپ اپنے ذمے لے لیے تھے، اس کا کمر صاف کرنا اس کے کپڑے پرل کرنا، اسے چائے بنا کر دینا، اس کے لیے کھانا لگانا بڑی خوشی خوشی وہ یہ سارے کام سر انجام دے رہی تھی، علیزہ جلتے سلگتے دل کے ساتھ سب دیکھتی رہتی اور روتی رہتی۔

میں کھٹنے لگا ہو۔
 ”دور کے ڈھول سہانے ہوتے ہیں‘ قریب آؤ تو
 کان پھاڑتے ہیں۔“
 قدرے خشک لہجے میں کہنے کے بعد وہ وہاں رکی
 نہیں تھی، نمل لاپرواہی سے کندھے اچکا کر رہ گئی۔
 علیزہ کمرے میں آنے کے بعد خوب روئی، ایک ماں
 کیا ٹوٹا تھا اسے لگا جیسے وہ خود بھی اندر سے ٹوٹ پھوٹ
 کر رہ گئی ہو۔

وہاں میں نہیں تھی۔
 فقط خالی پنجرہ بدن کاڑھا تھا۔
 اور نیم والاں کو اڑوں کی ہرچہراہٹ میں
 حیرانیاں بولتی تھیں
 زمیں کی فضا سے کسی نے مجھے باہر دھکیلا
 فلک تک میری دسترس کیوں نہیں تھی
 نہ جانے میں کب تک خلا میں بھٹکتی رہی تھی!
 اس روز بہت دنوں کے بعد وہ کلج آئی بھی احزار
 نے جب سے اپنا فیصلہ سنایا تھا۔ گھر میں عجیب سی چہ
 میگوئیوں نے جنم لینا شروع کر دیا تھا۔ خود اس کی اپنی
 ماں بھی اسے عجیب ابھی ابھی سی نگاہوں سے دیکھ
 رہی تھیں، جیسے احزار کے اس فیصلے کے پیچھے کہیں نہ
 کہیں اس کا کوئی قصور ہو۔

بند کمرے میں رو رو کر تھکنے کے بعد اس روز بالا خر
 وہ کلج چلی آئی تھی۔ جہاں اس کی عزیزاں جان دوست
 مدد کے جیسے اسی کی منتظر تھیں۔ بریک کے بعد موقع ملے
 ہی وہ مدد کے گلے لگ کر رو پڑی۔

”تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا علیزہ!“

اس کی پوری روداد، آنسوؤں کے ساتھ سننے کے
 بعد اس نے کہا تھا۔ علیزہ نے آنسو پونچھ لیے۔

”تو کیا کرتی میں اسے اپنا آپ پیش کر دیتی؟“

”نہیں۔ میں یہ نہیں کہہ رہی، بے شک احزار

بھائی نے جو کیا وہ صحیح نہیں تھا، مگر تم نے بھی جو کیا۔

وہ بھی ٹھیک نہیں ہے، تمہیں ان کو بعد میں نرمی سے

سمجھانا چاہیے تھا یار، آخر کو نکاح ہوا ہے تمہارا، وہ

تمہارے شوہر ہیں اور سب سے بڑی بات کہ تم ان

اس روز وہ کچن میں رات کا کھانا تیار کر رہی تھی
 جب مکمل نے اچانک اس سے پوچھ لیا۔

”ایک بات پوچھوں علیزہ، ماسٹڈ تو نہیں کرو گی؟“
 وہ تھکی تھی اور قدرے حیرانی سے اس نے مکمل کی
 طرف دیکھا تھا۔ مگر وہ اپنے کام میں مگن تھی۔ علیزہ
 نے چپ چاپ برتن خشک کرنے کے بعد کپڑا سائیڈ پر
 رکھ دیا۔

”پوچھو!“

”ہوں۔۔۔ اس رات جب ہم احزار بھائی کے
 کمرے میں سووی دیکھ رہے تھے، تمہارے اور ان
 کے بیچ کیا ہوا تھا؟“

علیزہ کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ اس سے
 ایسا کوئی سوال کرے گی۔ تب ہی اس کے ہاتھ سے
 کپ چھوٹا تھا اور نیچے زمین پر گر کر کچی ہو گیا۔
 ”کہ۔۔۔ کچھ نہیں، کیوں تم ایسا کیوں پوچھ رہی ہو؟“

”بس یونہی، تم تو خواہ مخواہ پریشان ہو گئی ہو، اصل
 میں اسی رات کے بعد تمہارے اور احزار بھائی کے
 درمیان بول چال بند ہے، گھر میں طرح طرح کی چہ
 میگوئیاں جنم لے رہی ہیں، امی اور چچی سارا دن سر
 جوڑے پتا نہیں کیا کیا پلان بناتی رہتی ہیں، ادھر احزار
 بھائی تو ایک دن ناراض نہیں رہ سکتے تھے تم سے۔ اب
 دیکھو کتنے دن ہو گئے ہیں مگر انہیں کوئی پرواہی نہیں، وہ
 شادی پر اڑے ہیں اور تم اپنی ضد پر پہلے تو ایسا بھی
 نہیں ہوا تھا۔“

”ضروری تو نہیں جو پہلے کبھی نہ ہوا ہو، وہ آئندہ
 بھی کبھی نہ ہو، زندگی میں ہر سانحہ پہلے کبھی نہیں ہوا
 ہوتا۔“

”وہ تو ٹھیک ہے، مگر تم اس بات کو زیادہ لائنٹ مت
 لو، احزار بھائی جیسے مرد ہر لڑکی کا نصیب نہیں ہوتے، تم
 بہت خوش نصیب ہو، مگر نہ میری ماما تو انہیں اپنا داماد
 بنانے کے لیے، جانے کتنے پیروں، فقیروں کے پاس
 دھکے کھاتی رہی ہیں۔“

ایک اور چوٹ۔۔۔ علیزہ کو لگا جیسے اس کا دم سینے

دونوں کے اسی جھگڑے کے سبب جہاں گھر کا ماحول کشیدہ ہو رہا تھا وہیں منیر صاحب کی طبیعت بھی بگڑتی جا رہی تھی۔

ایک چھوٹی سی بات نے نہایت بڑا طوفان کھڑا کر دیا تھا۔ اس کی اپنی ماں احزار کے ساتھ تھیں ان کا کہنا تھا کہ احزار کا مطالبہ ناجائز نہیں ہے، اور اسی بات کی اسے سب سے زیادہ تکلیف تھی۔ عجیب سی الجھن کا شکار ہو کر رہ گئی تھی وہ، کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے؟ پہلی بار اسے دکھ دے کر اس نے اس سے معذرت کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ اور یہ بات کتنی زیادہ تکلیف دہ تھی کوئی علیزہ حسین سے پوچھتا!

موسم میں خنکی مزید بڑھ گئی تھی۔ وہ گھٹنوں کے گرد پاؤں لپیٹے خاموش بیٹھی رہی تھی۔ کہاں غلطی ہوئی تھی اس سے کہ گھر میں سب نے اسے مجرم قرار دے دیا تھا۔ اس نے اپنی ماں کو ساری بات بتادی تھی، مگر پھر بھی وہ اس سے ناراض تھیں، کوئی بھی اس سے ڈھنگ سے بات نہیں کر رہا تھا۔ حسن چچا کی بیٹی سیری نے احزار اور اس کی ناراضی سے فائدہ اٹھانے میں قطعی تاخیر نہیں کی تھی، احزار تو قابو نہیں آیا تھا لیکن نادیر بیگم اپنی سادگی کے باعث بہت جلد زینہ بیگم اور سیری کے جال میں پھنس گئی تھیں، سبھی انہوں نے احزار پر دباؤ ڈالنا شروع کر دیا کہ اگر علیزہ رخصتی کے لیے نہیں مان رہی تو وہ اسے طلاق دے کر سیری سے شادی کر لے مگر احزار نے سختی سے ان کی بات کو رد کر دیا تھا وہ کسی صورت علیزہ حسین کو آزاد کرنے کے حق میں نہیں تھا۔



اس شام اس نے لان میں نمل اور احزار کو دیکھا تھا۔ نمل پودوں کو پانی دے رہی تھی، جب باہر سے آتے احزار نے اس کے ہاتھوں سے پائپ چھین کر اس پر پانی ڈالنا شروع کر دیا، وہ احتجاج کرتے ہوئے اسے روک رہی تھی، پائپ اس سے واپس لینے کی کوشش

سے پیار کرتی ہو۔ کیا اس بات سے فرار ممکن ہے؟
”نہیں“ مگر پیار کا یہ مطلب تو نہیں کہ میں اپنی عزت اور وقار اس شخص کے پاؤں تلے روند کر رکھ دوں کوئی اپنی ہی چیز پر ڈاکہ ڈالتا ہے بھلا؟ مجھے اس کے کردار سے محبت تھی، اس کی شخصیت اور دولت سے نہیں۔“

”ٹھیک ہے، میں مانتی ہوں ان سے غلطی ہوئی ہے۔ مگر تم اس غلطی کو ایشومت بناؤ، اگر وہ شادی کرنا چاہ رہے ہیں تو ہو جانے دو شادی، سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

”ہرگز نہیں وہ شخص اس طرح سے میری خواہشات کا خون نہیں کر سکتا۔“

”علیزہ پلیز۔ تم سمجھتی کیوں نہیں ہو؟“

”کیا سمجھوں میں؟ میری عزت میری حرمت، خاندانی وقار، کسی کی بھی تو لاج نہیں رکھی اس نے اور تم کہتی ہو میں سمجھوں؟ اس نے ایک پل میں مجھے عرش سے فرش پر لا پٹھا ہے مدیجہ، یوں جیسے میری کوئی عزت ہی نہ ہو۔ اس پر ہٹ دھرمی دیکھو اس کی کہ اسے کوئی شرمندگی ہی نہیں ہے، معافی تلافی نام کی کوئی چیز بھی نہیں۔“ وہ جذباتی ہو رہی تھی۔

مدیجہ نے کچھ اور لڑکیوں کے قریب چلے آنے پر اسے تسلی دے کر چپ کر دیا۔

”اوکے۔ تم پریشان مت ہو۔ اللہ سب ٹھیک کرنے والا ہے، چلو ابھی کچھ پیٹ پوجا کرتے ہیں۔“

”میرا دل نہیں چاہ رہا۔“

”تم اٹھو تو دل بھی چاہ جائے گا۔“

وہ بضد تھی اسے بھلانا چاہتی تھی۔ علیزہ دل نہ چاہتے ہوئے اٹھ کر اس کے ساتھ چل پڑی۔



منیر صاحب کی طبیعت سنبھل کر نہیں دے رہی تھی۔ علیزہ نے کالج سے چھٹیاں لے لیں۔ ایک طرف احزار فوری رخصتی پر اڑا تھا، دوسری طرف علیزہ فوری رخصتی کے لیے تیار نہیں تھی۔ ان

کر رہی تھی، مگر وہ قابو نہیں آ رہا تھا، بے تحاشا ہنستے ہوئے وہ شاید اس بات کو بہت انجوائے کر رہا تھا۔
علیٰ زہ کھڑکی سے پلٹ آئی۔

کمرے میں ٹھنڈک تھی مگر اس کے اندر ایک دم سے جس بڑھ گیا تھا۔ اگلے روز شام میں وہ تیز بخار کی لپیٹ میں تھی۔ صبح سے پانی کا ایک گھونٹ بھی حلق سے نہیں اتارا تھا نہ ہی وہ کمرے سے باہر نکلی تھی۔ مگر شام میں اپنے اندر کی ٹھن سے تنگ آ کر وہ باہر لاؤنج میں بیٹھی لی وی دیکھ رہی تھی تب ہی اس نے کومل کو نمل کے پاس پکچن میں جاتے ہوئے دیکھا تھا۔

”نمل! احزار بھائی کہہ رہے ہیں اگر تم پانچ منٹ کے اندر اندر تیار نہ ہو میں تو وہ آئس کریم کا پروگرام کینسل کر دیں گے۔“

”اف نہیں۔۔۔ میں بس ابھی دو منٹ میں آرہی ہوں۔“

نمل کی خوشی دیدنی تھی۔ علیٰ زہ نے اپنے گھٹنے سمیٹ لیے۔ اس کا بدن بہت بری طرح سے ٹوٹ رہا تھا۔

”علیٰ زہ۔ آئس کریم کھانے چلو گی؟“

کومل نے پاس سے گزرتے ہوئے یونہی اس سے پوچھ لیا۔ وہ چپ چاپ نفی میں سر ہلا گئی اگلے پانچ منٹ میں نمل کمرے سے نکل آئی تھی۔ احزار اپنا چارج پر لگا موبائل لینے اندر آیا تو ٹیمینہ نے اسے پکار لیا۔

”احزار۔“

بنا علیٰ زہ پر نظر ڈالے وہ انہی قدموں پر پلٹا تھا۔ ”جی بڑی امی۔“

”علیٰ زہ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، بہت تیز بخار ہے، آزر جانے کب گھر آئے۔ تم باہر جا رہے ہو تو اسے بھی ڈاکٹر کے پاس لیتے جانا۔“

”نہیں امی، مجھے کہیں نہیں جانا، میں ٹھیک ہوں۔“ احزار کے کچھ کہنے سے پہلے ہی علیٰ زہ بول اٹھی تھی۔ احزار نے لب بھینچ لیے۔

”آج نمل کا برتھ ڈے ہے بڑی امی! میں پہلے ہی

آفس سے لیٹ آیا ہوں۔ اب اگر ڈاکٹروں کے انتظار میں لگ گیا تو یہ چیزیں ناراض ہو جائے گی، آپ فکر نہ کریں میں آزر کو کال کر کے گھر بلواتا ہوں، وہ لے جائے گا، کوکے۔“

وہ اپنی توہین کہاں نظر انداز کر سکتا تھا۔ ٹیمینہ اس کا منہ دیکھتی رہ گئیں، جبکہ وہ انہیں تسلی دیتا، جلدی جلدی قدم اٹھاتا۔ باہر نکل گیا تھا۔

علیٰ زہ کی آنکھ سے آنسو پھسل کر اس کے ہاتھ کی پشت پر گر رہا تھا۔ بہت پرانی بات نہیں تھی جب اس روز وہ لان کی سیڑھیوں پر بیٹھی ٹھنڈ میں پڑھ رہی تھی اور وہ آفس سے آیا تھا۔

”یہاں کیوں بیٹھی ہو؟“

”بس یونہی، کیوں کیا ہوا؟“ اس کے لہجے کی خفگی محسوس کر کے وہ مسکرائی تھی۔ جب وہ اس کے مقابل ٹک گیا۔

”تمہیں پتا ہے اس وقت اوس کرنی شروع ہو جاتی ہے، اور تم۔۔۔ تم ذرا سی ٹھنڈ بھی برداشت نہیں کر پائیں، ابھی بیمار پڑ جاؤ گی اور پھر۔۔۔ خوب جان نکالو گی میری۔“

”ڈانٹا لگ تھوڑے جھاڑا کرو۔“

مزے سے اس کی ناک دبا کر وہ پھر مسکرائی تھی۔ جواب میں احزار نے اس کے ہاتھ تھام لیے۔

”جان سے چلا جاؤں گا ناں پھر یقین کرنا میری محبت کا۔“ کہنے کے ساتھ ہی اس نے خوشبوؤں میں بسا اپنا کوٹ بھی اس پر ڈال دیا تھا۔

”میرے لیے جان سے جانے والے نہیں ہوتے۔“

”جا بھی سکتا ہوں، قسم سے۔“

فورا ”ہی گبیہر لہجے میں کہتے ہوئے وہ بے اختیار ہوا تھا اور پھر زبردستی اسے اپنے ساتھ اٹھا کر اندر لایا تھا۔

اس سے ناراض ہونے کے باوجود اماں نے اسے آزر کے ساتھ ڈاکٹر کے پاس بھیج کر دم لیا تھا، مگر ڈاکٹرز کے پاس بھی ہر مرض کی شفا کہاں ہوتی ہے؟

کچھ مرض بہت گہرے ہوتے ہیں جنہیں اللہ رب

العزت کی پاک ذات کے سوا اور کوئی شفا نہیں دے سکتا۔

بڑا دشوار ہوتا ہے ذرا سا فیصلہ کرنا
کہ جیون کی کہانی کو زبان کی بے زبانی کو
کہاں سے یاد رکھنا ہے کہاں پر بھول جانا ہے
اسے کتنا بتانا ہے اسے کتنا چھپانا ہے
کہاں رو رو کے ہنسنا ہے کہاں ہنس ہنس کے رونا

کہاں آواز دینی ہے کہاں خاموش رہنا ہے
کہاں رستہ بدلنا ہے کہاں سے لوٹ آنا ہے
بڑا دشوار ہوتا ہے ذرا سا فیصلہ کرنا!
اس روز وہ مارکیٹ سے گھر آئی تو اس نے احزار کو
نر جس چچی کے پورشن میں دیکھا تھا۔ اسے یسریٰ سے
تھوڑا کام تھا وہ اسی سے ملنے کی غرض سے اس طرف
آئی تھی جب اس نے نر جس چچی کو کہتے سنا۔
”علیہ کے لیے کیا سوچا ہے تم نے؟“
”کچھ نہیں کیوں؟ کچھ سوچنا تھا کیا؟“
احزار کے لہجے میں بے پردائی تھی۔ چچی بے مزہ ہو

گئیں۔
”تم بھی پاگل ہو احزار کب سے رخصتی کے لیے
تر لے کر رہے ہو مگر وہ لڑکی ہے کہ مان کر نہیں دے
رہی پھر بھی تم اس کے انکار کو اہمیت نہیں دے رہے،
بھئی مانو یا نہ مانو مجھے تو یہ لڑکی کسی اور میں انٹر سٹڈ لگتی
ہے ورنہ تعلیم کوئی ایسا بہانہ نہیں ہے کہ جس کی آڑ
لے کر انکار کیا جائے تم میں کس چیز کی کمی ہے بھلا
میں تو کہتی ہوں طلاق دے کر فارغ کرو پھر پڑھتی رہے
بیٹھ کر ساری عمر۔“

”نہیں بڑی امی یہ فیصلہ اتنا آسان نہیں ہے۔“
”اتنا مشکل بھی نہیں ہے بس تمہیں اپنا دل ذرا
سامنبھوٹ کرنے کی ضرورت ہے لازمی نہیں ہے کہ
بڑوں کا کیا فیصلہ تم ساری عمر نبھاؤ تمہارے بڑے ابا کو
بڑی خواہش تھی تمہیں اپنا بیٹا بنانے کی۔“ رشتوں

کے کچھ روپ بہت بھیانک ہوتے ہیں ڈراؤنے
خوابوں سے بھی زیادہ بھیانک علیہ حسین کے
سامنے بھی اس وقت ایسا ہی ایک روپ آیا تھا۔ احزار
کہہ رہا تھا۔

”میں اب بھی آپ کا بیٹا ہی ہوں بڑی امی پلیز
آپ ایسا نہ سوچا کریں۔“ احزار کے لہجے میں پھر
لا پرواہی تھی۔ چچی ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گئیں۔
”ہاں بیٹے تو ہو مگر بیٹی سے منسوب ہو جاتے تو اور
بات تھی۔“

”علیہ بھی آپ کی بیٹی ہی ہے بڑی امی ایویں دل
نہ خراب کیا کریں اپنا اچھا یہ بتائیں کمال کہاں ہے
اس سے آج شام ڈنر کا وعدہ کیا تھا میں نے۔“ وہ اٹھ
کھڑا ہوا تھا۔ علیہ کے قدم من من کے ہو گئے۔
تب ہی چچی بولی تھیں۔

”اپنے کمرے میں ہو گی اور کہاں ہونا ہے اس
نے۔“
”ٹھیک ہے میں دیکھتا ہوں آپ کو امی بلا رہی
تھیں۔“

جیسے ہی اس نے کہا تھا علیہ فوراً لٹے پاؤں وہاں
سے واپس چلی آئی تھی اسے لگا جیسے کوئی اس کا دل
نوج رہا ہو۔ اس روز ایک مرتبہ پھر اپنے کمرے میں آکر
اس نے اپنے آنسوؤں کو کھل کر بنے دیا تھا۔
”علیہ۔ کیوں کر رہی ہو تم یہ سب؟“

وہ کچن میں تھی جب شینہ فریج کا دروازہ کھول کر
کچھ تلاش کرتے ہوئے سنجیدہ لہجے میں بولیں۔ علیہ
نے ہاتھ دھو کر گندھا ہوا آٹا سائڈ پر رکھ دیا۔
”میں نے کیا کیا ہے امی؟“

”یہ بھی میں بتاؤں کہ تم نے کیا کیا ہے؟ گھر بھر میں
ذیل کر کے رکھ دیا ہے تم نے مجھے کسی کے سامنے سر
اٹھانے کے قابل نہیں چھوڑا بیٹیاں رحمت ہوتی
ہیں۔ لیکن نافرمان اور سرکش ہو جاتیں تو رحمت بن
جاتی ہیں فضول کی ضد لگا کر خوب صلواتیں وصول کر
رہی ہو گھر کے بڑوں سے مرے ہوئے رشتوں کی
حرمت کا احساس بھی نہیں ہے تمہیں۔“ اس کی ماں

بہت نرم طبیعت کی حامل خاتون تھیں اس نے انہیں کبھی اتنے غصہ میں نہیں دیکھا تھا۔
علیٰ زہ کی آنکھیں پھر بھر آئیں۔
”میں نے ایسا کچھ بھی نہیں کیا ہے ای“ میں بس ابھی ذہنی طور پر اس شادی کے لیے تیار نہیں ہوں۔“
”مگر کیوں؟ جب تم اور احزار ایک دوسرے پر جان دیتے ہو تو پھر اس پر یہ ضد کیوں؟“
”ضد وہ کر رہا ہے ای! میں نہیں۔“
”وہ ضد کیوں کر رہا ہے؟“

”وہ مجھے جھکانا چاہتا ہے“ میری حیثیت دکھانا چاہتا ہے، صرف اپنی بات منوانا چاہتا ہے بس۔“
”کیسی بات؟“

اس بار ثمنہ نے قدرے حیرانی سے اسے دیکھا تھا
جواباً ”علیٰ زہ نے نہ چاہتے ہوئے بھی انہیں ساری بات بتادی۔“
”تمہیں یہ بات پہلے ہی بتا دینا چاہیے تھی۔“
”مجھ میں ہمت نہیں تھی ای!“

”بہر حال وہ تمہارا شوہر ہے، تمہیں خواہ مخواہ اس بات کو طول نہیں دینا چاہیے تھا، وہ لڑکا ہے سو گناہ معاف ہیں اسے، مگر تمہارے ساتھ ایسا معاملہ نہیں ہے، میں اب ایک دن کے لیے بھی اس بات کو ٹالنے کے حق میں نہیں ہوں۔“
”مگر ای!“

”کوئی اگر مگر نہیں، تم جانتی ہو جو کچھ اس گھر میں ہو رہا ہے، اوپر سے باپ بھی سر پر نہیں ہے تمہارے جو تمہارے حق میں آواز اٹھائے، دادا کی حالت سے بھی انجان نہیں ہو تم، میں رخصتی کی تاریخ طے کر رہی ہوں، تمہیں جو کرنا ہے کر لو۔“

حتیٰ انداز میں بات مکمل کرتے ہوئے وہ پھر کچن میں ٹھہری نہیں تھیں۔ علیٰ زہ بے بس سی گہری سانس بھر کر رہ گئی!

احزار کے ننھیال میں شادی تھی مگر وہ نہیں گیا تھا۔ سر میں شدید درد اور زکام نے اسے جیسے نڈھال کر دیا تھا، تاہم اس کی باقی فیملی اور نر جس چچی اپنی تینوں

بہنیوں کے ساتھ تقریب میں شرکت کے لیے پہنچ گئی تھیں، نر جس چچی کو تو ویسے بھی تقریبات میں شمولیت کا موقع چاہیے ہوتا تھا تاکہ وہ اپنی بہنیوں کے لیے اچھے گھرانوں کے لڑکے اپنی نظر میں رکھ سکیں۔ منیر صاحب کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی لہذا علیٰ زہ نے بھی جانے سے معذرت کر لی، اس کی وجہ سے منیر حسین بھی گھر پر ہی رک گئی تھیں۔

وہ اپنے کمرے میں تھیں جب علیٰ زہ ولیہ بنا کر اپنے دادا جی کے کمرے میں چلی آئی، ان کے چہرے پر اس وقت عجیب سی تکلیف کے آثار تھے۔ وہ دیے کا پیالہ سائیڈ ٹیبل پر رکھ کر ان کے قریب چلی آئی تھی۔
”دادا جی۔۔۔ آپ ٹھیک تو ہیں ناں؟“

”ہوں۔۔۔“ ایک پل کے لیے آنکھیں کھول کر انہوں نے اسے دیکھا تھا۔ اور پھر پلکیں موند لیں۔
”احزار کہاں ہے؟“ کچھ دیر بعد قدرے دھیمے لہجے میں انہوں نے پوچھا تھا۔

”وہ۔۔۔ وہ اپنے کمرے میں ہے دادا جی، ابھی گھر آیا ہے۔“

”اسے میرے پاس بلا کر لاؤ، کہو دادا جی بلا رہے ہیں۔“ پلکیں موندے انہوں نے حکم جاری کیا تھا۔
علیٰ زہ مشکل میں پڑ گئی۔

”دادا جی، وہ شاید سو رہا ہے، آپ مجھے بتادیں کیا کام ہے؟“

”تم نہیں۔ اسے بلا کر لاؤ ابھی۔“

اسے لگا جیسے وہ بہت مشکل سے بول رہا ہے ہوں۔
علیٰ زہ عجیب سی کشمکش کی شکار سر ہلا کر کمرے سے نکل آئی۔

احزار حسن کے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے اس کا ایک ایک قدم من من بھر کا ہو رہا تھا۔ وہ اس شخص کی شکل دیکھنے کی روادار نہیں تھی، تاکہ اسے مخاطب کرنا، مگر دادا جی کی طبیعت کے پیش نظر وہ مجبور ہو گئی تھی۔

احزار کا کمرالاک نہیں تھا، دروازے کے ہینڈل پر ذرا سا دباؤ ڈالنے کے بعد وہ کمرے میں داخل ہو گئی تھی

’سامنے ہی وہ کبل میں لپٹا سو رہا تھا۔ سامنے ٹیلی وژن کی اسکرین پر کوئی انگلیش مودی لگی تھی۔ وہ اس کے بیڈ کے قریب چلی آئی تھی۔“

”احزار۔“ وہ جو تکہ بانہوں میں دبائے، بائیں کروٹ پر بے خبر سو رہا تھا۔ کس سے کس تک نہ ہوا، تب دوسری اور تیسری بار بھی بلند آواز سے پکار کر دیکھ لیا، مگر اس نے آنکھیں نہیں کھولیں، ہلکی سی بڑھی ہوئی شیو کے ساتھ اس کا مرجھایا مرجھایا سا چہرہ اس کے اندر کی بے سکونی کا پتہ دے رہا تھا۔

”احزار۔؟“ تیسری اور چوتھی بار پکارنے کے بعد بالا خر مجبور ہو کر اس نے اس کا بازو ہلایا تھا اور یہی وہ لمحہ تھا جب اس نے پٹ سے آنکھیں کھولتے ہوئے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

”ہوں بولو۔ کیا بات ہے؟“

وہ بیدار کر پیچھے ہٹی تھی۔

”تم بہت فضول شخص ہو احزار، مجھ سے غلطی ہوئی جو دادا جی کے حکم پر تم جیسے اسٹوپڈ انسان کو بلانے چلی آئی۔“

”بکو اس بند کرو، بیوی ہو تم میری، یہ میرا حق ہے۔“

ایک دم سے گرفت ڈھیلی کر کے وہ خود بھی بستر سے نکل آیا۔ علیزہ معطل حواس کے ساتھ فوراً ”سے“ پیشتر اس کے کمرے سے نکلی تھی۔ وہ دادا جی کے کمرے میں آئی تو احزار بھی اس کے پیچھے ہی چلا آیا۔ تب ہی وہ وہاں سے بھی نکل آئی تھی، مگر کمرے کی کھڑکی سے اس نے دیکھا تھا کہ دادا جی احزار کا ہاتھ تھامے بہت مشکل سے اسے کچھ کہہ رہے تھے اور وہ اثبات میں سر ہلاتا بار بار ان کے ہاتھ تھپتھپاتا ہوا جیسے انہیں کچھ یقین دلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ پھر اس نے جھک کر دادا جی کے ہاتھ کو بوسہ بھی دیا۔ علیزہ کھڑکی سے پلٹ کر کچن میں آگئی۔

جانے دادا جی اتنی خراب طبیعت کے باوجود اس شخص سے کون سے راز و نیاز کر رہے تھے۔ اس نے

فریج سے سبزی نکالی اور کالٹے بیٹھ گئی، تبھی وہ کچن میں آیا تھا۔

”تمہارے اور میری لوگ نظر نہیں آرہے، کیا وہ بھی تائی ماں کے ساتھ گئی ہیں۔“ اس کے کندھے سے کندھا ملا کر وہ عین برابر میں آ بیٹھا تھا۔ علیزہ خاموش رہی۔

”کچھ پوچھا ہے میں نے؟“

”مجھے تمہیں پتا، میں تمہارے کسی سوال کا جواب دینے کی پابند نہیں ہوں؟“

”کیوں؟“

”یہ تمہیں پتا ہو گا کہ کیوں؟“

اس کی آنکھوں میں غصہ تھا، احزار دیکھتا رہا۔

”کیوں کر رہی ہو ایسا؟“

”میں کچھ نہیں کر رہی، تم جاؤ یہاں سے۔“

”تم پہلے ایسی نہیں تھیں علیزہ؟“

”تم بھی ایسے نہیں تھے پہلے۔“

”کیوں کون سی تبدیلی دیکھ لی ہے تم نے مجھ میں؟“

وہ بات سے بات نکال رہا تھا۔ علیزہ جھنجھلا گئی۔

”احزار پلینز، تم جاؤ یہاں سے، مجھے تم سے کوئی بات نہیں کرنی۔“

”مگر کیوں، ایسا کیا جرم کر دیا ہے میں نے، جو ابھی تک تمہارا دل صاف نہیں ہوا۔ میرے دوست کی صرف منگنی ہوئی ہے مگر اس کی منگیتر خود کال کر کے اسے بلاتی ہے۔ اور ایک میں ہوں جس کی شرعی اور قانونی بیوی اسے قریب نہیں پھٹکنے دیتی۔“

وہ اسی بات پر اڑا تھا۔ علیزہ جو اس سے احساس ندامت کی توقع کر رہی تھی مزید تپانھی۔

”بڑا خیر ہے تمہیں اپنے دوست اور اس کی منگیتر پر؟ جنم کی آگ بھڑک رہی ہے اپنے دامن میں، خود اپنے آپ کو دھوکا دے رہے ہیں وہ اپنے ماں باپ کو نہیں، مگر میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں، کیونکہ میرا ایمان اور ضمیر ابھی مردہ نہیں ہوا ہے۔ یہ سچ ہے کہ میں نے تم سے محبت کی ہے، بے حد بے تحاشا، یہ بھی سچ ہے کہ تم میرے وجود پر پورا پورا حق رکھتے ہو۔“

کیونکہ میں تمہارے نکاح میں ہوں، مگر یہ حق ابھی میری ماں نے تمہارے سپرد نہیں کیا ہے، میں نہیں چاہتی کہ کل کو میری ماں جب مجھے تمہارے ساتھ رخصت کرے تو اس کے پیچھے ان کی کوئی مجبوری ہو ان کی نظریں ندامت اور شرم سے جھکی ہوئی ہوں اور تم۔ تم تمہارے دل میں میرے لیے کوئی شوق نہ ہو۔“

چائے بنا کر میرے کمرے میں بھیج دیے۔“
علیہ کے رخ پھیرنے پر لب بکھینچتے ہوئے اس نے کہا تھا اور اگلے ہی پل کچن سے نکل گیا۔ علیہ کتنی ہی دیر جاید داغ اور گھٹی ہوئی سوچوں کے ساتھ وہیں بیٹھی رہی تھی۔



احزار کے شکوے پر وہ اچھی خاصی جذباتی ہو گئی تھی۔ وہ چپ چاپ اسے دیکھتا رہا۔
”ایم سوری احزار! میں کوئی مین ایجر نہیں ہوں بلکہ میں تمہاری زندگی میں پوری روایتوں اور بزرگوں کی دعاؤں کے ساتھ آنا چاہتی ہوں۔“
”تو ٹھیک ہے، پھر رخصتی کروا لیتے ہیں کیوں نہیں مان رہی ہو تم۔“

احزار کانڈا کے لیے ویزہ اوکے ہو گیا تھا، نہ صرف ویزہ آگیا تھا بلکہ اس کی سیٹ بھی کنفرم ہو گئی تھی۔
موسم بدل رہا تھا۔ گھر میں سری کے رشتے کی بات چل رہی تھی۔ احزار کے ننھیال سے ہی اس کے لیے رشتہ آگیا تھا اور مسز محسن کے پاؤں جیسے زمین پر نہیں لگ رہے تھے۔ خود سری بھی سارے دن ہواؤں میں اڑتی محسوس ہوتی تھی۔

”صرف چند ماہ کی مہلت مانگی ہے میں نے۔“

”میں چند ماہ انتظار نہیں کر سکتا۔“

”مجھے تم پر بہت مان تھا احزار۔“

”مجھے بھی بہت مان تھا تم پر، تم نے لاج رکھی میرے مان کی؟ جب سے وہ بات ہوئی ہے پاس بیٹھنا تک چھوڑ دیا ہے تم نے، کہاں وہ آگے پیچھے پھرنا، میری ہر ضرورت کا خیال رکھنا، ذرا سی طبیعت خراب ہونے پر رات رات بھر جاگنا، میں نے سفر کر جانا تو نوافل پڑھ پڑھ کر میری سلامتی کی دعا میں مانگنا، گھر واپسی پر لیٹ ہو جانا تو نیند کو پس پشت ڈال کر صرف میرے لیے جاگنا کیا تھا وہ سب؟“

علیہ کے پیپرز قریب تھے مگر اس کے باوجود مسز حسین نے اس کی رخصتی طے کر دی تھی۔ اپنے کمرے سے احزار عبدالبادی کے کمرے تک کا سفر اس کے لیے کسی پل صراط سے کم نہیں تھا، منیر صاحب، حسن صاحب، اس کی ماں سب خوش تھے مگر وہ چپ تھی، احزار عبدالبادی کی ضد نے جیسے اسے اندر سے تکلیف پہنچائی تھی، مگر اس تکلیف سے بھی زیادہ تکلیف اسے اس وقت ہوئی، جب وہ کمرے میں آیا، چپ چپ سا بے حد نڈھال، وہ کمرالاک کرنے کے بعد بہت خاموشی سے اس کے پاس آ بیٹھا تھا۔

”کیسی ہو؟“ کافی دیر کی خاموشی کے بعد بہت بوجھل سے لہجے میں اس نے پوچھا تھا۔ جب علیہ نے خود ہی گھونگھٹ اٹھا دیا۔

”ایک ہار اہوا انسان کیسا ہو سکتا ہے؟“

”تم ہاری نہیں ہو، ہار وہ ہوتی ہے جب کسی چاہنے والے کو دھتکار دیا جائے، دیکھو کتنی خوب صورت لگ رہی ہو تم اس وقت۔۔۔ یہ چوڑیاں، یہ سنگھار، یہ سب میرے لیے ہے ہے ناں؟“

علیہ کی چوڑیوں سے کھیلتے ہوئے وہ جس انداز میں بات کر رہا تھا، علیہ کا دل ایک انجانے سے خوف

وہ جذباتی ہوا تھا۔ علیہ کے آنکھوں سے دو آنسو ایک ساتھ ٹپک پڑے۔

”مجت! بہت ٹھہرے ہوئے لہجے میں سر جھکا کر جواب دیا تھا اس نے۔“

”کیا اب مجت نہیں رہی؟“
”نہیں۔“

”سچ کہہ رہی ہو؟“

”ہاں!“

”ٹھیک ہے، نمل آئے تو اسے کہنا، ایک کپ

سے دھڑک اٹھا۔

”پتا نہیں تم واقعی اتنی خوب صورت ہو یا صرف مجھے لگتی ہو، مگر یہ سچ ہے علیزہ! میں نے تمہارے سوا کسی کو اپنے دل کا پتا نہیں دیا۔“

کچھ لمحوں کی خاموشی کے بعد پھر اس کی آواز گونجی تھی۔

”دیکھ لو، تمہاری ماں نے آج تمہیں پورے فخر اور مان سے رخصت کر کے میرے حوالے کیا ہے، اور میں تمہیں پوری روایتوں کے ساتھ دنیا کے سامنے اپنا بنا کر لایا ہوں مگر۔“

بہت بو جھل لہجے میں بولتے بولتے ایک دم سے وہ رکا تھا جب علیزہ نے فوراً ”سراٹھا کر اسے دیکھا۔“

”مگر۔۔۔؟“

”مگر اب وہ دل رہا ہے نہ دل کی خواہش۔“

وہ سنجیدہ تھا۔ علیزہ کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں بھینچ ڈالا۔ اس کی آنکھیں ساکت رہ گئی تھیں، مگر احزار نے پروا نہیں کی، بنا اس کے حسن کو خراج تحسین پیش کیے، وہ کپڑے تبدیل کرنے کے بعد سو گیا تھا۔ علیزہ پتھر کا بت بنی بیٹھی رہی۔

اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ کبھی احزار اور اس کے بیچ اتنے فاصلے بھی بڑھ جائیں گے کہ دونوں ایک ہی بستر پر ہوتے ہوئے ایک دوسرے سے صدیوں کی مسافت پر ملیں گے۔

اگلے روز رات دوبارے احزار کی فلائیٹ تھی۔

علیزہ کمرے سے ہی نہیں نکلی، اس کا دل جیسے پھٹ رہا تھا، اس وقت اس میں کسی کا بھی سامنا کرنے کی ہمت نہیں تھی، نہ دادا جی کا، نہ اپنی ماں کا، نہ نر جس چچی اور ان کی بیٹیوں کا، سردی کی بڑھتی ہوئی شدت نے جیسے اس کے احساسات منجمد کر دیے تھے۔

احزار عبد الہادی جیسے شخص کو سمجھنا بھلا اتنا آسان کہاں تھا؟

کوئی فریاد تیرے دل میں دبی ہو جیسے تو نے چپکے سے کوئی بات کہی ہو جیسے

ایک لمحے میں سمٹ آیا ہے صدیوں کا سفر زندگی تیز۔۔۔ بہت تیز چلی ہو جیسے۔

یسری کے رشتے کی بات فائنل ہو گئی تھی اور اب زرینہ بیگم کی خواہش تھی کہ منیر صاحب کی زندگی میں ہی یسری بھی اپنے گھر رخصت ہو جائے، تاکہ دادا کی طرف سے جو کچھ علیزہ کو ملا وہ یسری کو بھی ملے۔

احزار کو کینڈا گئے چار ماہ ہونے کو آئے تھے اور ان چار ماہ میں ایک بار بھی اس نے علیزہ سے کھل کر بات نہیں کی تھی۔ سیل فون اور اسکا پ دو دنوں پر وہ صرف اپنی ماں، دادا یا یسری نمل لوگوں سے زیادہ بات کرتا تھا، علیزہ پاس بیٹھی منتظر رہتی کہ وہ اسے بلائے گا۔ مگر ہر بار اس کا یہ گمان دکھ میں بدل جاتا تھا۔

اس کی چپ اور اداسی کو دیکھتے ہوئے مسز حسین نے اسے دوبارہ کالج جوائن کرنے کی اجازت دی تھی۔ مگر عجیب بے کلی تھی کہ اب کالج میں بھی دل نہیں لگتا تھا، جتنا وہ احزار کو ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کرتی تھی، اتنا ہی وہ اور اس کی یادیں اس کی سوچ کے دریچوں میں در آتی تھیں۔ اوپر سے آج کل یہ سنے میں آرہا تھا کہ احزار نے کینیڈا میں کسی انڈین مسلمان لڑکی سے فرینڈ شپ کر لی ہے اور دونوں بہت تیزی سے ایک دوسرے کے قریب ہو رہے ہیں، گھر بھر میں یہ خبر پھیلانے والی نمل تھی، جبکہ اسے ہنسی میں اڑا کر مشکوک کرنے والا خود احزار حسن تھا۔

علیزہ حسن کے اندر جیسے کوئی لاؤڈ بکنے لگا، جس میں اس کی ایک ایک سانس جل رہی تھی۔ بے گناہ ہوتے ہوئے بھی اس شخص نے اسے سولی پر لٹکا دیا تھا۔ مگر وہاں اس کا درد سمجھنے والا کوئی نہیں تھا۔

نمل نے احزار کے بعد اب آزر میں دل چسپی لینی شروع کر دی تھی، اور یہاں اسے ناکامی کا منہ نہیں دیکھنا پڑا تھا۔ آزر نے نہ صرف اس کی محبت کا جواب محبت سے دیا تھا، بلکہ اپنی ماں سے کہہ کر بات بھی پکی کروالی تھی۔ جس پر زرینہ بیگم کا سالوں پرانا غصہ قدرے کم ہوا تھا۔

علیزہ کی رخصتی کی طرح یسری کی شادی کا معاملہ

بھی چٹ منگنی پٹ بیاہ کے مصداق طے ہو گیا تھا۔
یسری کا میاں کافی سال دوہنی میں رہنے کے بعد اب
پاکستان میں سیٹل ہو گیا تھا۔ بسن بھائی سب شادی
شدہ تھے اور ماں باپ کی رحلت ہو چکی تھی۔ نر جس بیگم
کو وہی یسری کے قابل لگا تھا کیونکہ یسری کے مزاج میں
بہت ترشی تھی۔

علیہ کو یسری کا شوہر زیادہ اچھا نہیں لگا تھا۔ احزار
نے بھی اس شادی میں شرکت سے معذرت کر لی
تھی۔ تاہم اس نے کینیڈا سے اسے بہت قیمتی تحائف
بھجوا دیے تھے۔ ایک بات جو علیہ نے محسوس کی
تھی۔ وہ یسری کے شوہر کاشف کے کردار کی کمزوری
تھی۔ یسری سے زیادہ وہ نمل اور کومل کی کمپنی کو
انجوائے کرتا تھا۔ علیہ کے ساتھ بھی اس نے ایک
دوبار ضرورت سے زیادہ فری ہونے کی کوشش کی
تھی۔ مگر علیہ نے اس کی کوشش کو کامیاب نہیں
ہونے دیا۔ وہ جتنا خوش شکل تھا اتنا ہی عاشق مزاج اور
رومیٹک تھا۔

یسری شادی کے بعد تقریباً "روزہ" اور ہر پڑاؤ ڈالے
رکھتی تھی، تبھی اس کا شوہر علیہ کے ارد گرد منڈلاتا
رہتا تھا، کبھی کچن میں، کبھی چھت پر، کبھی کمرے میں،
جہاں اکیلا پاتا گھیر لیتا، وہ اس کی حرکتوں سے سخت عاجز
تھی۔ مگر دادا جی کے علاوہ اور کسی سے اس کے بارے
میں کچھ بھی نہیں کہہ سکتی تھی۔ کیونکہ وہ جانتی تھی
اگر اس نے اس بارے میں کسی سے کچھ کہا تو کوئی اس کی
بات پر یقین نہیں کرے گا، سب اسے ہی مورد الزام
تھرا میں گئے۔

اس روز وہ کلج سے گھر آئی تو سب لاؤنج میں ہی
پڑاؤ ڈالے بیٹھے تھے۔ کاشف بھی وہیں موجود تھا۔ وہ
سب کو سلام کرتی اپنے کمرے میں چلی آئی، تبھی اس
نے کاشف کی آواز سنی تھی۔

"یسری یار، تم لوگ اس لڑکی کو اس کے شوہر کے
پاس کیوں نہیں بھجوا دیتے؟ آج کل زمانہ نہیں ہے،
یوں شادی شدہ جوان لڑکیوں کو اکیلے گھر سے باہر بھیجنے
کا۔"

"کیوں کیا ہوا؟ یہ تو ہمیشہ سے اکیلی ہی جاتی ہے
کلج۔" یسری کی آواز آئی تھی۔ علیہ کے ہاتھ دوپٹہ
اتارتے اتارتے رک گئے۔
"ہوں، پھر تو یقیناً" خوب آگے چلی گئی ہوگی کہانی
۔"

"کیسی کہانی؟"

"بھئی، یہ تو تم اپنی کزن سے ہی پوچھو، آج مارکیٹ
میں کسی لڑکے کے ساتھ دیکھا تھا میں نے اسے۔"

"کیا؟"

"جی ہاں، میری بات کا یقین نہیں تو بے شک بلا کر
پوچھ لیں، اس نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا۔" وہ جتنی
ڈھٹائی اور اعتماد سے بات کر رہا تھا۔ شینہ کے دل پر
جیسے بجلیاں سی گر پڑی تھیں۔ تب ہی علیہ شدید
غصے میں اپنے کمرے سے باہر آئی تھی۔

"کاشف بھائی! خدا کا خوف کریں میں وہاں اکیلی
نہیں تھی میری دوست بھی ساتھ تھی۔"

"میں نے کسی لڑکی کو نہیں دیکھا۔"

"آپ جھوٹ بول رہے ہیں۔"

"بکو اس بند کرو اپنی، میرے داماد کو کیا ضرورت ہے
جھوٹ بولنے کی؟ اس نے جو دیکھا بتادیا، پہلے کبھی نہیں
بولایا جھوٹ، بتاؤ۔"

"صحیح کہہ رہی ہیں امی، ایک تو چوری اور سے سینہ
زوری۔" ماں کے چمک کر بولنے پر یسری کا پارہ بھی ہائی
ہوا تھا۔ علیہ کٹ کر رہ گئی۔

"یہ جھوٹ بول رہے ہیں میں وہاں اپنی دوست کے
ساتھ گئی تھی کیونکہ ہمیں اپنی ایک دوست کے لیے
گفٹ خریدنا تھا اور میری دوست کے بھائی نے ہمیں
کلج سے پک کر کے بازار ڈراپ کر دیا۔"

"تمہیں ضرورت کیا تھی کلج سے بازار جانے کی؟
وہ بھی گھر والوں کو بتائے بغیر۔" یہ سوال شینہ کی طرف
سے تھا۔ علیہ کی آنکھیں پھر آئیں۔

"دوست اصرار کر رہی تھی امی، اچانک پروگرام بن
گیا تھا۔"

"شریف گھرانوں کی لڑکیاں یوں دوستوں کے

مانند ہوتے ہیں جن سے امن کی فاختاؤں کی وابستگی ہمیشہ رہتی ہے، یہ پیڑ جب کٹ جاتے ہیں تو امن کی فاختائیں بھی اڑ جاتی ہیں اس کے گھر میں بھی یہی ہو رہا تھا۔

اس وقت وہ کسی گناہ گار مجرم کی طرح ہر الزام پر خاموش سر جھکائے اپنے کمرے میں واپس چلی آئی تھی۔ ساس کو ماں کے برابر درجہ دیا جاتا ہے۔ مگر اس وقت اس ماں نے اس کا نازک سادل ادھیڑ ڈالا تھا۔ ان دو عورتوں کے بیچ اس کی اپنی ماں سر جھکائے خاموش کھڑی رہی تھی۔ اس ماں کے پاس شاید اس وقت اپنی پارسا بیٹی کے حق میں کچھ کہنے کے لیے تھا بھی نہیں۔ جبکہ اپنے کمرے میں چیت لئیے منیر صاحب نے اپنی آنکھیں ازیت سے بند کر لی تھیں۔



اس روز موسم بہت سرد تھا، لوہے سے بارش کا بھی امکان تھا۔

دیر تک کچن میں رات کا کھانا تیار کرنے کے سبب وہ اوپر چھت پر پھیلائے کپڑوں کو بھول ہی گئی۔ مسز حسین پچھلے تین روز سے تیز بخار میں پھنک رہی تھیں، جبکہ دادا جی کی طبیعت بھی خطرناک حد تک خراب تھی۔ اتنی زیادہ ٹینشن میں علیزہ کو کسی چیز کا ہوش ہی نہیں تھا۔

کھانا لگ گیا تھا اور سب نے کھا بھی لیا تھا، تبھی بارش شروع ہو گئی تو وہ کچن سمیٹنے کے بعد اوپر چھت پر چلی آئی، اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہاں کاشف ہو گا۔ کیونکہ یسری کے مطابق وہ واک کے لیے گھر سے باہر نکلا تھا تبھی وہ بے خوف اوپر چلی آئی تھی، مگر اوپر پہنچ کر جیسے ہی اس نے جلدی جلدی کپڑے تار سے اتارنے کی کوشش کی، وہ ٹیرس کی طرف سے نکل کر اس کے عین پیچھے آکھڑا ہوا۔

”کپڑوں کی اتنی فکر، اور انسانوں کا کوئی خیال ہی نہیں، واہ۔“

وہ پلٹی تھی اور اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ کاشف

اصرار پر اچانک پروگرام بنا کر کہیں بھی نہیں نکل جاتیں، خدا نخواستہ کچھ بھی ہو سکتا تھا، ہم تو کسی کو منہ دکھانے لائق نہ رہتے۔“

زرینہ بیگم پھر چمکی تھیں۔ مسز حسین نے دکھ سے منہ پھیر لیا۔

”میں کسی کے ساتھ گھر سے بھاگی نہیں تھی چچی، جو آپ کسی کو منہ دکھانے لائق نہ رہتیں۔“

”یہی حالات رہے تو بھاگ بھی جاؤ گی ایک دن، ہونہ یہ تم جیسی لڑکیاں ہی ہوتی ہیں جو ماؤں کی آنکھوں میں دھول جھونک کر ان کی بے خبری کا فائدہ اٹھا کر روزے چاند سورج چڑھاتی ہیں اور ان کی بے خبر ماؤں کو پتا تک نہیں چلتا، شوہر تو جان چھڑا کر بھاگ گیا۔ آج گھر کے داماد نے دیکھا ہے، کل کو لوگ دیکھ کر باتیں کریں گے پھر کیا جواب دیں گے انہیں بتاؤ۔“

علیہ کا دل کٹ کر رہ گیا۔

”جن کے اپنے آگے بیٹیاں ہوں، وہ کسی کی بیٹیوں کے بارے میں ایسی بات نہیں کرتے چچی۔“

”بکو اس بند کرو، تم جیسی بیٹیاں پیدا کرنے سے بہتر ہے بندہ ساری عمر بوجھ رہے۔“ ان کی زبان کے آگے خندق تھی۔ کاشف سر جھکائے زیر لب مسکراتا رہا۔

”ابا جی کو بھی جانے کیا ہو گیا تھا لے کر ضد ہی پکڑ لی، ورنہ اللہ جانتا ہے میں ایک فیصد بھی اس شادی کے حق میں نہیں تھی، باپ کا سایہ سر پر نہ ہو تو اولاد بونسی خود سر ہو کر رہ جاتی ہے، ماشاء اللہ پڑھا لکھا خوب صورت بیٹا ہے میرا، کس چیز کی کمی تھی اس میں جو مجھے اس کے لیے کوئی اچھے خاندان کی مال دار لڑکی نہ ملتی، اللہ معاف کرے بہت بڑی زیادتی کی ہے ابا جی نے ہمارے ساتھ۔“

نادرہ جواب تک خاموش بیٹھی تھیں اس بار سنگ باری میں انہوں نے بھی اپنا حصہ ڈالا تھا۔ علیزہ کو لگا جیسے کسی نے ڈھیر سارے کانچ اس کے اندر اتار دیے ہوں۔ لفظوں کے دانت کتنے نوکیلے ہوتے ہیں یہ علیزہ حسین نے اس وقت جانا تھا۔ اسی روز اسے یہ پتا چلا تھا کہ گھر میں بزرگ، بوڑھے سایہ دار درخت کی

اس کے عین پیچھے کھڑا مسکرا رہا تھا۔ وہ باقی کے کپڑے تار رہی چھوڑ کر تیزی سے پلٹی تھی مگر اس نے آگے بڑھ کر اس کا راستہ روک لیا۔

”اتنی جلدی کس بات کی ہے، میں کوئی کھانا تو نہیں رہا تمہیں۔ دیکھو کتنی اچھی بارش ہو رہی ہے۔ چلو نیرس پر چلتے ہیں، تھوڑی سی انجوائے منٹ ہو جائے گی۔“

”سٹاپ!“ علیزہ کا چہرہ سرخ ہوا تھا مگر کاشف نے پروا نہیں کی۔

”تم غلط کیوں سمجھتی ہو مجھے، قسم سے میں تمہیں پسند کرتا ہوں علیزہ، دل سے قدر کرتا ہوں تمہاری، کیوں بندھی ہو اس شخص کے نام کے ساتھ، جو تم جیسی پیاری، حسین و جمیل لڑکی کے قابل ہی نہیں ہے۔“ لگاوٹ سے کہنے کے ساتھ ہی اس نے علیزہ کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنی طرف کھینچنے کی کوشش کی تھی۔ جب بے ساختگی میں اس نے فوراً اس کے گال پر زور دار تھپڑ جڑ دیا۔

”چھوڑو میرا ہاتھ۔“

”چھوڑ دوں گا، مگر اس تھپڑ کا بدلہ چکانے کے بعد۔“

وہ مرد تھا اور اب اسے اپنی اصلیت دکھا رہا تھا۔ علیزہ نے بات بگڑنے کے ڈر سے چیخنا مناسب نہیں سمجھا۔ وہ صرف اس سے بچنے اور خود کو چھڑا کر بھاگنے کی کوشش کر رہی تھی۔ جب یسری نے سیڑھیوں کے دبانے پر کھڑے اسے کاشف کے اوپر جھکے دیکھ کر چیخنا شروع کر دیا۔ پل کی پل میں سارا گھر وہاں چھت پر جمع ہو گیا تھا، کسی کو بھی جیسے اپنے بھگنے کی پروا نہیں تھی۔ کاشف نے جو یسری کو چیختے ہوئے دیکھا تو فوراً علیزہ کو چھوڑ کر اس کے قریب چلا آیا۔

”میں یہاں اس گھر میں اب ایک پل بھی نہیں رہ سکتا یسری! یہ لڑکی شوہر کی جدائی میں پاگل ہو رہی ہے۔“

”کمال ہو شیاری سے کام لیتے ہوئے بجائے شرمندہ ہونے یا گھبرانے کے وہ الٹا یسری پر چڑھ دوڑا تھا۔“

جواب میں وہ علیزہ پر ٹوٹ پڑی۔

”گھٹیا، بے غیرت، ذلیل، لڑکی، کوئی حیا نام کی چیز ہے تم میں کہ نہیں۔“

”گھٹیا، بے غیرت، ذلیل تمہارا شوہر ہے، میں نہیں۔ اسے کیوں نکیل ڈال کر نہیں رکھتیں تم۔“ یسری کے تھپڑ کے جواب میں وہ چلائی تھی جب کاشف نے آگے بڑھ کر اسے تھپڑ رسید کر دیا۔

”حد ہوتی ہے بے غیرتی اور ڈھٹائی کی، اس سے پوچھو یسری، جب اسے پتا تھا کہ میں اوپر نیرس پر ٹھلنے کے لیے آیا ہوں تو یہ اتنی بارش میں یہاں میرے پیچھے کیوں آئی؟ کیوں زبردستی روکا ہوا تھا اس نے مجھے؟ اس سے پوچھو اس نے مجھے کیوں کہا کہ میں تمہیں طلاق دے کر اس سے شادی کر لوں، کیوں کہا اس نے مجھ سے کہ میں اسے اچھا لگتا ہوں، احزار سے زیادہ خوب صورت لگتا ہوں۔“

وہ کتنا بڑا مکار اداکار تھا۔ علیزہ کو حقیقتاً اس وقت اندازہ ہوا تھا۔ تبھی وہ گھبرا گئی تھی۔

”یہ جھوٹ بول رہا ہے یسری! مجھے قطعی خبر نہیں تھی کہ یہ اوپر چھت پر موجود ہے۔ میں تو صرف یہ کپڑے اتارنے آئی تھی۔“

”ہاں کپڑے ہی تو اتارنے آئی تھیں تم، مگر میں نے تمہیں کامیاب نہیں ہونے دیا، دادا جی کے بار بار بلانے پر یہاں تمہیں دیکھنے اوپر چھت پر چلی آئی۔“

جتنا زہرا اس کے شوہر کے جھوٹ میں تھا اس سے کہیں زیادہ خاردار اس کے اپنے الفاظ تھے۔ نرجس چچی نے جو یہ تماشہ دیکھا تو آگے بڑھ کر پے درپے کئی تھپڑ اسے رسید کر دیے۔

علیزہ بچ بتانا چاہتی تھی مگر منہ پر پڑنے والے پے درپے تھپڑوں نے اسے کچھ کہنے کا موقع ہی نہیں دیا، وہ اسی وقت اسے اس کے لمبے بالوں سے کھینچتی چھت سے نیچے لائی تھیں۔ کاشف کے بیان میں کوئی جھول نہیں تھا، علیزہ پر فرد جرم عائد ہو گئی۔

محسن کے ٹھنڈے فرش پر بے حس و حرکت وہ اکیلی بیٹھی سب کے کونے بھی سن رہی تھی اور مار بھی لگھا

رہی تھی۔ اس کا سرا ایک مرتبہ پھر قلعی بے گناہ ہوتے ہوئے مجرم کی طرح جھکا ہوا تھا جبکہ اس کے ارد گرد کھڑے لوگ اس پر لفظوں کی جوتیاں برسا رہے تھے۔
”ایک نمبر کی بے غیرت لڑکی ہے یہ امی! اتنا بھی خیال نہیں کہ کاشف اس کا بہنوئی ہے۔“

سرخ آنکھوں کے ساتھ روتے ہوئے یسری اس پر چلا رہی تھی اور وہ پتھر پتھر بیٹھی تھی۔

”میں بھی کہوں میرا بچہ کیوں رخصتی کی ضد کر رہا تھا اب سمجھ میں آ رہا ہے کہ وہ گھر کی عزت بچانا چاہتا تھا، مگر کامیاب نہیں ہوا اسی لیے چھوڑ کر چلا گیا اسے، بائے حسن، کیسے ابا جی نے میرے چاند سے بیٹے کی زندگی برباد کر دی، آپ ابھی فون کریں اسے اور کہیں کہ وہ ابھی فون پر طلاق دے اسے۔“

زرینہ بھی پیچھے نہیں رہی تھیں، جبکہ محسن صاحب اور حسن صاحب سر جھکائے کھڑے تھے۔ تیز بخار میں جلتی شینہ نے سب کے تبصرے سنے تھے اور پھر خوب مارا تھا اسے۔

اسے لگا وہ اب زندگی میں کبھی سرائٹھا کر نہیں دیکھ سکے گی۔ اس کی گردن ایک انجانے سے بوجھ کے احساس سے جیسے ٹوٹی جا رہی تھی۔

آزرا اس کی ماں کی طبیعت کے پیش نظر انہیں کندھوں سے پکڑ کر کمرے میں لے گیا تھا۔ کاشف یسری کو لے کر اپنے گھر چلا گیا۔ محسن صاحب اور حسن صاحب بھی اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔ کشادہ صحن کے بیچ وہ اکیلی بے حس و حرکت بیٹھی رہ گئی تھی۔ تیز بارش نے بھی اسے وہاں سے اٹھنے پر مجبور نہیں کیا تھا۔

اس کے ذہن میں اس وقت جیسے جھکڑ چل رہے تھے۔

”ایک نمبر کی بے غیرت لڑکی ہے یہ امی! اس نے یہ بھی نہیں سوچا کاشف اس کا بہنوئی ہے۔“ یہ یسری کی آواز اور لفظوں کے کوڑے تھے جو اس کی روح پر پڑے تھے فوراً ہی ان کوڑوں کا انداز بدلا تھا۔

”میں بتاؤں کہ تم نے کیا کیا ہے، گھر بھر میں ذلیل و

رسوا کر کے رکھ دیا ہے تم نے مجھے، کسی کے سامنے سر اٹھانے کے قابل نہیں چھوڑا، بیٹی رحمت ہوتی ہے لیکن تم زحمت بن گئی ہو میرے لیے۔“

اس کی روح پر یہ کوڑے برسائے والی اس کی اپنی ماں تھی، اس نے اپنا سر گھٹنوں میں چھپا لیا۔

”علیٰ زہ میں جانتا ہوں، تمہیں اب مجھ سے محبت نہیں رہی ہے، وہ بچپن تھا جس میں میرے کسی اور کے ساتھ کھیلنے پر تم بھاگی ہوئی آتی تھیں اور میرا ہاتھ پکڑ کر کہتی تھیں ”میلہ اے“ اب شاید ایسا نہیں ہے۔“

یہ آواز احزار عبدالہادی کی تھی، اس کے احتزار کی جسے اس نے دل کی گہرائیوں سے ٹوٹ کر چاہا تھا، جو اس کے دل کی اولین خواہش اور اس کا پہلا خواب تھا، مگر اس کے کردار اور ایمان کی مضبوطی نے اس شخص کو بھی اس سے دور کر دیا تھا اور اب اسے وہ گری تھی تو ایک ایسے شخص کی وجہ سے، جسے وہ اپنی نفرت کے قابل بھی نہیں سمجھتی تھی۔

بارش تھمی تھی جب وہ اٹھ کر منیر صاحب کے کمرے میں آئی تھی، تھر تھر سردی سے کانپتی، وہ سو رہے تھے، علیٰ زہ تھال سی ان کے بیڈ پر بیٹھ گئی۔

”میں نے کچھ نہیں کیا دادا جی، خدا کی قسم یہ لوگ جھوٹ بول رہے ہیں۔ میں نے کچھ نہیں کیا۔“ مگر وہاں اس کی پکار اور اس کا رونا سننے والا کوئی نہیں تھا۔ اس کے پرہیزگار، مشفق، جان لٹانے والے دادا جی، ہارٹ اٹیک کا شکار ہو کر کب کی پلکیں موند چکے تھے، شاید وہ اتنا ہی برداشت کر سکتے تھے۔ علیٰ زہ کا دل بہت زور سے دھڑکا تھا۔

”دادا جی!“

اس نے آواز دی مگر منیر صاحب نے آنکھیں نہیں کھولی تھیں۔ اس کے ہر دکھ پر تڑپ جانے والی وہ ہستی پہلی بار بے سدھ گہری نیند سوئی رہی تھی۔ تبھی وہ چلا اٹھی۔

”دادا جی، پلیز آنکھیں کھولیں۔“

اور آزر جو ابھی ابھی مسز حسین کے کمرے سے نکلا تھا، ٹپک کر فوراً وہاں چلا آیا۔

بولی تھیں مگر زجر جس نے پروا نہیں کی۔
 ”کیوں ہوش سے کام لوں، دنیا کو پتا تو چلے اس کے
 کرتوتوں کا، صرف اسی کی وجہ سے اباجی کی جان گئی
 ہے۔“

”پھر بھی ہمارے گھر کی عزت کا معاملہ ہے۔“
 ”آپ رکھیں اسے عزت بنا کر، ہم تو اب اس گھر
 میں ایک پل بھی نہیں رہیں گے، ہونہ آئی بڑی گھر کی
 عزت۔“

ان کا غصہ ابھی تک کم نہیں ہوا تھا۔ علیزہ پتھر کے
 بت کی طرح خاموش بیٹھی رہی۔ وہ جانتی تھی اب
 اسے اس گھر کی عزت نہیں رہنے دیا جائے گا۔ وہ ایک
 شخص جو اس کے دل کی اولین خواہش اور اس کا پہلا
 خواب تھا، اس شخص کو اب اس کے سکھ اور دکھ کا
 ساتھ بھی نہیں رہنے دیا جائے گا۔

ابھی تک اس نے احزار حسن کا سامنا نہیں کیا تھا
 مگر پھر بھی وہ جانتی تھی کہ وہ شخص اب اس کے ساتھ
 نہیں رہے گا۔ اسے اپنی عزت اور اپنے رشتے علیزہ
 حسین سے زیادہ پیارے تھے اور ایسا ہی ہوا تھا۔ یہ اس
 سے اگلے روز کی بات تھی جب شام میں سب احزار کو
 گھر کر گویا عدالت لگا کر بیٹھے تھے۔ زرینہ اور زجر جس
 چچی نے ایک ایک بات خوب برہا چڑھا کر پیش کی تھی،
 جبکہ اس کی اپنی ماں تاحال خاموش کھڑی تھیں، شاید
 انہیں اس گھر میں رہنا تھا، شوہر اور سر کے بعد بیٹی کی
 حمایت میں بول کر وہ اس گھر سے ہمیشہ کے لیے در بدر
 ہونا نہیں چاہتی تھیں تب ہی خاموش تھیں۔ مگر سری
 ، نمل اور باقی لوگ خاموش نہیں تھے۔ احزار سر
 جھکائے سب کی باتیں سن رہا تھا جب زرینہ نے اس
 سے کہا۔

”علیزہ اب ہماری بہورہنے کے قابل نہیں ہے
 احزار، بہتر ہے تم اسے ابھی طلاق دے کر فارغ کر دو،
 میں اب مزید کوئی تماشا دیکھنے کی پوزیشن میں نہیں
 ہوں۔“

علیزہ کی آنکھوں سے آنسو موتی کی لڑیوں کی طرح
 ٹوٹ کر گر رہے تھے۔

”کیا ہوا؟“
 ”پتا نہیں، پلیز دادا جی کو دکھو، یہ آنکھیں نہیں
 کھول رہے ہیں۔“

”تم ہٹو پیچھے، میں دیکھتا ہوں۔“
 وہ بھی پریشان ہو گیا تھا۔ اگلے پانچ منٹ میں وہ
 دونوں انہیں ہسپتال لے آئے تھے۔ پیچھے حسن
 صاحب اور حسن صاحب بھی آگئے، عجیب قیامت کی
 رات تھی کہ اس سے رویا بھی نہیں جا رہا تھا۔ بھلے
 کپڑوں کے ساتھ، ہسپتال کے ٹھنڈے فرش پر، بنا
 کسی گرم شال کے سودائیوں کی طرح بیٹھی وہ روئے جا
 رہی تھی، پچھلے چند دنوں میں اس نے اتنا کچھ کھویا تھا
 کہ اس میں اب مزید کچھ کھونے کی ہمت ہی نہیں
 رہی تھی۔

صرف ایک رشتہ ہی تو باقی بچا تھا اس کے پاس جینے
 کے لیے اور اب وہ رشتہ بھی ہاتھ سے چھوٹا دکھائی
 دے رہا تھا۔

اگلی صبح اپنے ساتھ نئے طوفان لے کر حاضر ہوئی
 تھی۔

گزشتہ رات علیزہ حسین کی زندگی کے سب سے
 پیارے رشتے نے اسے ہمیشہ تیار ہونے کے لیے اکیلا
 چھوڑ دیا تھا۔ گھر میں سب لوگ رو رہے تھے۔ منیر
 صاحب سے اپنی اپنی محبت اور تعلق کا اظہار کر رہے
 تھے مگر وہ خاموش تھی۔ یوں جیسے اس کی خوب صورت
 آنکھوں کی جھیلیں خشک ہو گئی ہوں۔

تدفین سے قبل احزار حسن بھی پاکستان پہنچ گیا۔
 گھر کی خواتین میں ایک طرف سر جھکائے بیٹھی علیزہ
 حسین کو اس کی آمد کی خبر ہی نہیں ہو سکی تھی، سوئم
 والے روز جب وہ تیز بخار میں سو گوار سی صوفے پر
 پاؤں سیٹے بیٹھی تھی اس نے زجر جس چچی کو کہتے ہوئے
 سنا تھا۔

”اب تو ٹھنڈ پڑ گئی تمہارے سینے میں۔ لے لی اباجی
 کی جان۔ اب کر لینا عیاشی جی بھر کر۔“

”ہوش سے کام لیں بھابھی، یہ وقت ایسی باتوں کا
 نہیں ہے۔“ زرینہ جو قریب ہی بیٹھی تھیں۔ فوراً

”علیٰ علیہ السلام جیسی لڑکیاں کسی ایک کی ہو کر رہ ہی نہیں سکتیں۔ یہ کبھی بھی تمہاری وفادار نہیں ہو سکتی۔“
نرجس نے نفرت سے کہا تو وہ بھڑک اٹھا۔

”بس بڑی امی بس۔ بہت کچھ اچھا لیا آپ نے اس کی ذات پر اور بہت صبر سے کام لے لیا میں نے۔“
”احزار! تم پائل ہو گئے ہو بھلا اس لمحے میں بات کرتے ہیں بیٹوں سے؟ یہاں کوئی کسی پر کچھ نہیں اچھا رہا ہے، تم سے جو کہا ہے وہ کرو، یوں سمجھ لو کہ ایک طرف تمہاری ماں کھڑی ہے اور دوسری طرف یہ لڑکی اب فیصلہ تمہیں کرنا ہے کہ کس کو چھتے ہو کے چھوڑتے ہو“ اس کے بھڑک اٹھنے پر زینہ نے اسے ڈپٹا لیا۔ جب وہ ان کی طرف پلٹ آیا۔

”میں اپنی ماں کو چنوں گا امی، باوجود اس کے کہ میری ماں نے حق اور سچ کا ساتھ نہیں دیا، باوجود اس کے کہ میری ماں نے کسی بے قصور بے گناہ کا دل دکھایا ہے، میں اپنی ماں کو ہی چنوں گا کیونکہ بیٹا جو ہوں آپ کا۔“

”میں نے کسی کا دل نہیں دکھایا، جو حقیقت تھی وہ سب جانتے ہیں۔“

”سب وہ نہیں جانتے جو حقیقت ہے۔“
”کیا مطلب ہے تمہارا، ہم جھوٹ بول رہے ہیں۔“

”میں آپ کو جھوٹا نہیں کہہ رہا، مگر سچائی وہ نہیں ہے امی! جو آپ جانتی ہیں۔ سچائی وہ ہے جو میں جانتا ہوں، آپ کیا سمجھتی ہیں کسی بھی لڑکی کی پاکدامنی بس یہیں تک ہے کہ کوئی بھی اس پر جھوٹا الزام لگا دے تو وہ گنہگار ثابت ہو جائے۔ مجھے دیکھیے، میں کاشف بھائی سے زیادہ خوب صورت اور آسارٹ ہوں، کس چیز کی کمی ہے مجھ میں، جائز رشتہ بھی ہے میرا اس کے ساتھ اس کے باوجود میں اس کی بار سائی کو چیلنج نہیں کر سکا، کبھی بتایا اس لڑکی نے آپ کو کہ کیوں اسے سولی پر لٹکا کر چلا گیا تھا میں؟ نہیں بتایا ہو گا اس نے، میں بتانا ہوں۔ میں اپنے نفس کے بہکاوے میں آ گیا تھا۔ رخصتی سے قبل ہی اسے اپنی خواہش کے تابع کرنا

چاہا تھا۔ مگر اس نے میری خواہش کے سامنے سر نہیں جھکایا، جانتی ہیں کیوں؟ کیونکہ اسے اپنی ماں کا مان عزیز تھا، اپنی حیا اور اپنا کردار عزیز تھا۔ تو پھر میں کیسے ماں لوں کہ یہ لڑکی ایسے کمزور کردار کی ہوگی۔“

علیہ کے آنسوؤں میں مزید شدت آ گئی!
”آپ لوگوں کو شاید پتا ہی نہیں ہے کہ اللہ نے ایک مومن عورت پر بہتان لگانے والوں کی سزا کیا رکھی ہے، یہ چاہتی تو میری خوشی کے لیے میری خواہش پوری کر سکتی تھی، میں اس کا قانونی اور شرعی شوہر تھا، مگر اس نے میری خواہش کے سامنے سر نہیں جھکایا۔ اس نے مجھے بتایا کہ اس کا کردار کتنا مضبوط ہے، اسی نے مجھے بتایا عورت کی اصل خوب صورتی کیا ہے، ایک عورت محبت کے بغیر سو سال گزار سکتی ہے، مگر عزت کے بغیر ایک لمحہ نہیں۔“

وہ جذباتی ہوا تھا۔ علیہ رو رہی۔
”احزار تم بیوقوف بن رہے ہو، کاشف نے خود اسے۔“

”کیا کاشف نے خود اسے۔؟ کاشف اس گھر کا داماد ہے تو اس کی ہر بات معتبر ہے اور یہ بیٹی ہے تو اس کی کسی بات کی کوئی اہمیت نہیں، آپ کو مل سے پوچھیں، اس کے ساتھ کیا کیا تھا کاشف بھائی نے۔“

وہ بھڑکا تھا اور وہاں موجود سب لوگوں کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ خود کاشف بھی کب وہاں سے کھسکا، کسی کو پتا بھی نہ چل سکا۔ نمل سے چھوٹی کوئل نے سب کے بیچ کاشف کے کردار کا بھانڈا پھوڑا تھا۔ جب ایک روز اسے کمرے میں تنہا پا کر وہ اس کے ساتھ بدتمیزی پر اتر آیا تھا مگر کوئل نے عزت کے ڈر سے اور کچھ اپنی بسن کا گھر بچانے کے لیے اس بات کا تذکرہ سوائے احزار کے اور کسی سے نہیں کیا۔

”سارا گھر بھی آج اگر اس کے خلاف ہو جائے،“

تب بھی میں علیہ کا ساتھ دوں گا امی، کیونکہ یہ میری عزت ہے۔ آج اگر یہ بے عزت ہے تو اس میں میرا قصور ہے، میں اس کی عزت نہیں کروا سکا، حالانکہ میں نے اپنے دادا جی سے اس کا وعدہ کیا تھا کہ اسے عزت

میں غلط نہیں تھا لیکن تم بھی اپنی جگہ صحیح تھیں۔ جس معاشرے میں ہم رہتے ہیں اس کی روایات کا احترام کرنا بھی ضروری ہے۔ میں یہ بھول گیا تھا کہ میری اس لمحاتی لغزش کے ایسے نتائج بھی نکل سکتے تھے جو ہم دونوں کے لیے شرمندگی کا باعث ہوتے۔ مجھے معاف کر دو۔“

علیہ کے دونوں ہاتھ تھامے وہ اسے اپنے غلط عمل کی وضاحت دے رہا تھا۔ وہ اس کے کندھے سے ٹیک لگائے بیٹھی چپ چاپ سنتی رہی۔

”تم میرا مان ہو علیہ“ میں اپنے اللہ کا جتنا بھی شکر ادا کروں کم ہے کہ اس نے میری تقدیر میں تم جیسی صابر اور پاکر دار بیوی لکھی۔“

”تم نے مجھے بہت ہرٹ کیا تھا احزار، مگر آج سب کے درمیان جیسے تم نے مجھے معتر کیا ہے“ اس احسان کے لیے میں نے تمہارے سارے قصور معاف کیے۔“

”اچھا جی ملکہ عالیہ بہت بہت مہربانی“ اب پلیز بڑی امی اور میری ماما کو بھی معاف کر دینا وہ دونوں تم سے بہت شرمندہ ہیں۔“

”نہیں“ مجھے تمہاری ماں سے کوئی شکایت نہیں ہے احزار، انہوں نے دوسروں کی آنکھوں اور کانوں سے دیکھا سنا، مگر میری ماں وہ تو میرا حوالہ تھیں احزار، میں نے ان کی کوکھ سے جنم لیا تھا، وہ تو جانتی تھیں کہ میں ایسی نہیں ہوں، پھر بھی انہوں نے میرا ساتھ نہیں دیا، اس روز جب سب مجھ پر لفظوں کے پتھر برس رہے تھے، وہ خاموش کھڑی میرا تماشا دیکھتی رہیں، انہوں نے ایک بار بھی یہ نہیں کہا کہ میں ایسی نہیں ہوں وہ تو میری ماں تھیں احزار! ماں سے برہ کر اولاد کو کون جان سکتا ہے؟“

”وہ مجبور تھیں علیہ، پلیز معاف کر دو انہیں پلیز۔“

اب وہ اس کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔ علیہ نے آہستہ سے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے پلکیں موند لیں۔ بہت دنوں کی تھکن کے بعد اس رات اسے

اور تحفظ فراہم کروں گا، مگر اپنی بھوئی انا کو قائم رکھنے کے لیے میں اپنے فرض سے غافل ہو گیا اور دوسروں کو موقع مل گیا۔“ سب کی زبانوں کو تالا لگ گیا تھا۔ علیہ کے آنسو تھم چکے تھے۔ اس کا صبر رائیگاں نہیں گیا تھا، اس کے ایمان اور کردار کی مضبوطی نے اسے سرخروئی نصیب کر دی تھی۔

پہلی بار اسے جہنم دینے والی ماں کا سر، سب کے درمیان فخر سے بلند ہوا تھا۔ پیار بھری ایک نظر علیہ پر ڈالنے کے بعد انہوں نے روتے ہوئے احزار کو گلے لگایا تھا۔



رات میں جب وہ اپنے کمرے میں آیا تو علیہ اسی کے کمرے میں بیڈ کی پٹی سے ٹیک لگائے بیٹھی اسی کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ دروازہ لاک کرنے کے بعد اس کے مقابل آ بیٹھا۔

”اسلام علیکم!“

”وعلیکم اسلام۔!“ بخار کی حدت سے دہکتے چہرے کے ساتھ اس نے سر اٹھا کر احزار کو دیکھا تھا۔ وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

”میرا خیال تھا تم پر صرف بلیک اور سرخ کلر ہی بچتا ہے، مگر یہ تو آج پتا چلا کہ تم سفید کپڑوں میں سب سے زیادہ پیاری لگتی ہو۔“

اس کا وہی نارمل انداز تھا، علیہ کے دل میں جانے کیا آئی کہ وہ اس کے گلے لگ کر بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

”اوئے پاگل۔۔۔ خبردار اب اگر مزید ایک آنسو بھی بہایا تو۔۔۔ تمہارا بدھولوٹ کر گھر کو آگیا ہے ناں، پھر اب رونے کی کیا ضرورت ہے؟“

اسے پیار سے خود سے الگ کرنے کے بعد اپنے ہاتھوں سے اس کے آنسو پونچھتے ہوئے گلے ہی پل اس نے اپنا بازو اس کے کندھوں کے گرد پھیلا دیا تھا۔

”دیکھو علیہ! جب انسان پر نفس غالب آتا ہے تو وہ اچھے برے، جائز ناجائز کی تمیز کرنا بھی بھول جاتا ہے“



منیر صاحب کے چالیسویں کے بعد احزار اور علیزہ کا دلیمہ منعقد کیا گیا تھا۔

یسری اس تقریب میں شرکت کے لیے نہیں آئی تھی، مگر مکمل اور کومل نے علیزہ کو پوری پوری پہن دی تھی۔ بلکہ ڈنر سوٹ میں احزار بے حد خوب صورت دکھائی دیے رہا تھا، جبکہ علیزہ نے بھاری کام والی فرائڈ پہنی تھی۔ احزار بیٹا ہر اسے نہیں دیکھ رہا تھا مگر اس کی ساری توجہ اسی پر تھی۔

رات تقریباً گیارہ بجے وہ دونوں کمرے میں آئے تو علیزہ کا موڈ بے حد آف تھا۔ احزار کی اتنے دن کی بے نیازی نے اسے بہت ہرٹ کیا تھا، کہاں تو ایک دن صبر نہیں ہو رہا تھا اور کہاں اب ساری بے قراری ہی سرد پڑ گئی تھی۔

وہ بیڈ پر آکر بیٹھی تو احزار نے اسے پھر تادیا۔
”تم تھک گئی ہو گی علیزہ! یہ بھاری ڈریس اتار کر ریسٹ کر لو۔“

”کیوں، میں کبھی باڑی کر کے آئی ہوں جو تھک گئی ہوں گی۔“ اس کے خفا خفا سے لہجے پر چونک کر پلٹتے ہوئے وہ مسکرایا تھا۔

”نہیں پار۔ باہر اتنی دیر تک ایک ہی پوزیشن میں سر جھکا کر بیٹھی رہی ہو۔ اسی لیے کہہ رہا تھا۔“
”بہت شکریہ، میرا احساس کرنے کے لیے، تمہیں تھکن محسوس ہو رہی ہے تو سو جاؤ، مجھے جب محسوس ہوگی میں سو جاؤں گی۔“

وہ خفا بھی تھی اور اس کی آنکھوں میں آنسو بھی تھے۔ احزار کا دل چل اٹھا۔

”ٹھیک ہے، مگر وہ کیوں رہی ہو؟“ اس کے مقابل بیٹھتے ہوئے وہ اسے تنگ کرنے سے باز نہیں آیا تھا۔ علیزہ نے آنکھیں صاف کر لیں۔

”میری مرضی میں روؤں یا ہنسون، تمہیں کیا فرق پڑتا ہے۔“

”فرق تو پڑتا ہے یا۔۔!“ مسکرا کر کہتے ہوئے اس نے اپنے بازو علیزہ کے گلے میں ڈال لیے تھے۔

”صاف صاف کیوں نہیں کہتیں کہ۔۔“ نچلا لب دبا کر مسکراتے ہوئے اس نے شرارت سے اسے دیکھا تھا۔ جواب میں علیزہ نے ایک نظر اسے دیکھتے ہوئے سر جھکا لیا۔

”اگر تم اسی میں خوش ہو تو مجھے تم سے کوئی گلہ نہیں ہے احزار، شاید میں اس قابل بھی نہیں ہوں کہ۔۔“

”اوئے۔۔ جان لے لوں گا تمہاری اگر کوئی غلط بات زبان سے نکالی تو پاگل لڑکی، سچ میں پگلی لڑکی ہو تم، قسم سے، ایویں تنگ کر رہا تھا تمہیں اتنے دنوں سے تم بھی ناں۔“ وہ تادم بھی تھا اور مسکرا بھی رہا تھا۔ علیزہ کی پلکوں سے آنسو ٹوٹ کر گریبان میں جذب ہو گیا۔

”اور وہ جو رخصتی والے دن کہا تھا کہ تمہاری خواہش مر گئی ہے وہ۔۔؟“

”بابا بابا۔۔ وہ بھی تنگ ہی کر رہا تھا تمہیں، مگر تم ہوئیں ہی نہیں تنگ، خیر اب کیا ارادہ ہے؟“

شرارتی لہجے والے اس شخص کی روشن نگاہوں میں خوشی اور مسرت کے ہزاروں جگنو دمک رہے تھے۔ علیزہ آنسو پونچھتے ہوئے مسکرا دی۔

”نہیں۔“

”کیا نہیں، بہت پتھر رکھ لیے دل پر اب ایک لمحے کی رعایت بھی نہیں دینی تمہیں، ایسی کی نیسی تمہاری نہیں کی۔۔“

اس بار مسکرا کر کہتے ہوئے احزار نے اسے اپنی گرفت میں لے لیا۔ علیزہ کی روح سرشار ہو گئی۔ اپنے اپنے جذباتوں میں ثابت قدم ان دونوں محبت کرنے والوں کے لیے، خوشبو لٹاتی اس رات کا ایک ایک پل مک رہا تھا۔



آنکھیں چلا کر دیکھا

میں نہیں جانا کھیریاں دے تل
دل سوچ رہا تھا خیال
میں نہیں جانا کھیریاں دے تل
را بھاتاں میرا سب تو سوتا
کوئی بھی ہیریاں

میں نہیں...
میں نہیں...

نظر سے ہوتی ہوئیں جھریوں اور انگوٹھیوں سے بھرے
سانولے ہاتھوں پہ ٹک گئیں۔ کھانے کو دیکھ کر بھوک
کی انتہا بڑھی۔ اس نے صبح سے ایک بوند پانی تک
حلق سے نہ اتارا تھا۔ اس کی نگاہیں اس کھانے پر ہی
لگی رہیں۔ اس مہواں چہرے تک نہ گئیں۔

”لے لے۔ تیرے ہی لیے لائی ہوں۔“ وہ
بوڑھی فقیر سی عورت مہوا سے ہی مخاطب تھی۔
”ڈر نہیں۔ صبح سے دیکھ رہی ہوں مجھے۔ اسی

کونے میں دبی بیٹھی ہے، لے کھالے۔“ کہتے ہوئے
اس کے ساتھ ہی بیٹھ گئی۔

مہوا جو اس دیوانی عورت سے ہراساں تھی مگر انکار
نہ کر سکی۔ مہوا نے وہ تھیلی تھامی۔ وہ عورت مہوا کو
من و سلویٰ تھما کر پھر خود میں منہمک ہو گئی۔

مائیں نی میں کنوں آکھان

درو وچھوڑے دا حال نی

مہوا کے حلق میں نوالہ اٹک گیا اور آنسو بھل بھل
بنے لگے۔ نہ جانے کیوں کبھی کبھی انسان اس قدر
حساس ہو جاتا ہے کہ اسے کائنات کا ہر غم اپنی ذات،
اپنے ہی غم میں مدغم ہوتا نظر آتا ہے اور اس کا غم جو
انفرادی حیثیت سے اسے محسوس ہوتا ہے تمام غموں
کا اجتماع سا بن کے اس کے وجود میں سمٹ آتا ہے۔
دکھ کی ہر آواز، ہر لفظ اسے اپنی ہی روح کا حصہ لگنے لگتا
ہے۔ آج مہوا بھی یہی محسوس کر رہی تھی۔

اس نے کچھ حیرانی سے اس دیوانی کو دیکھا۔ جس کی
آواز میں انتہا کا سوز تھا۔ مہوا یک ٹک اسے دیکھے گئی۔

لوگوں کے اس قدر ہجوم میں نجانے کون تھا جو ایسی
رُسوز آواز اور الفاظ کا ربط قائم کیے ہوئے تھا اور وہ جو
محسن کے ایک کونے میں دبی ہراساں بیٹھی تھی کسی
ایسے پرندے کی مانند جو پرواز کے پہلے دن ہی اپنا
آشیانہ بھول جائے، یہ آواز سن کر مزید زور و شور سے
رونے لگی۔ بھانت بھانت کے لوگ شور بچتے دھول
کی تھاپ نے اسے بتا دیا کہ گھر بیٹھ کر سوچنا ہے اور،
جبکہ اس سوچ پر عمل کر کے بے سائین ہونا بالکل
الگ ہے۔ سیاہ چادر سے منہ چھپاتی ہوئی مہوا آنکھوں
میں بسا خوف و اضطراب بھی نہ چھپا پارہی تھی۔ نکلتے
وقت وہ بھلا کب جانتی تھی کہ وہ خالی ذہن اور
لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ کہاں پہنچ جائے گی اور اب
پہنچ گئی ہے تو کیا کرے۔ آگے کدھر جائے؟

مٹی کے پیالے میں پانی اور نمکین و میٹھے چاول جو
اکٹھے ہو کر عجیب رنگ کے نظر آ رہے تھے کاشا پر کسی
نے اس کی طرف برہمایا۔ سانولے جھریوں بھرے
پاؤں جن کی ایریاں پھٹی تھیں۔ ان سے مہوا کی



دکھاں دی روٹی، سولاں واساں

آہیں داباں بلانی

ماتیں نی میں کنوں آکھاں

وہ جو آنکھیں بند کیے مگن سی تھی، اچانک بولی۔

”حیران ہو رہی ہے نا؟ ہاہاہاہ۔ خیال رکھیو! ایک دن

لوگ تجھ پہ بھی حیران ہوں گے۔“ وہ کچھ معنی خیزی

سے بولی۔

”نہیں سمجھی نہیں۔“ مہواہ اس عجیب عورت کو دیکھ

کر واقعی حیران ہو رہی تھی۔

”P کیس سال کی تھی میں، جب اس دربار پہ آئی

تھی۔ اب پچپن برس سے اوپر ہو گئی ہوں، ادھر ہی

ہوں۔ جانتی ہوں تیرا یہاں آنا۔ میری جگہ یہاں تو

بیٹھے گی اور تیری جگہ پھر کوئی اور بیٹھی ہوگی۔ تو نادان

کڑیے سن! ادھر میری جگہ بیٹھنا آسان نہیں ہے۔“

ہاہاہاہ۔ وہ پھر بے ڈھنگا ہسی۔

”آپ۔ آپ۔ آپ کتنا کیا چاہتی ہیں؟“ اب تک مہواہ

جان چکی تھی کہ یہ عورت پاگل نہیں ہے۔

”گھر سے بھاگی ہے؟“ اب کے اس عورت کا لہجہ

نرم اور آنکھوں میں اپنائیت تھی۔

”بول۔“ اسے مہواہ کے چہرے پر حال دل سنانے

کی آمادگی نظر آئی تو مزید اصرار کرنے لگی۔

”جی۔“ مہواہ اتنا ہی کہہ سکی اور نظریں جھکا گئی۔

آنسو ایک دفعہ پھر رواں تھے۔

”کیوں؟“ اب کے مہواہ چپ رہی۔
”عشق کا چکر ہے کوئی؟“ مہراہ اب بھی کچھ نہ

بولی۔
”مگر عشق ہے معبود والا تو نیا پار سمجھ۔ پر۔ اگر
عشق ہے عبد والا تو۔ دل جائے گی“ ناصحانہ انداز سے
کہا گیا۔

”صبح نکاح ہے میرا مگر میں یہ کرنا نہیں چاہتی۔“
اب کے مہواہ کھل کے روئی۔ ”میں یہ زبردستی کا رشتہ
نہیں نبھا سکتی۔ میرا دل۔ میرا دل کہیں اور اٹکا ہے۔
میری روح کسی اور میں ضم ہے تو۔ میں یہ خالی جسم کا
نو تھڑا لپے کسی اور کے ساتھ کیسے جاسکتی ہوں۔“ مہواہ
اب آنسوؤں اور ہچکیوں کے درمیان اٹک اٹک کر
بول رہی تھی ”پھر گھٹنوں پہ سر رکھے رونے لگی۔

”پازیب پننے کی یا بیڑی؟“ مہواہ کے سر پہ ہولے
سے ہاتھ رکھ کر بوچھا بڑے عجیب انداز سے مہواہ اس
بے تکے سوال پر جھنجھلا گئی۔

”میں گھر سے بھاگی ہوں، یہاں پناہ لینے آئی ہوں کچھ
پہننے نہیں۔“ اب کے وہ کچھ کرخت لہجے میں بولی۔
”جھلی ہے کیا؟ پناہ لینے ادھر آگئی جدھر نری بے
امانی ہے۔ امان کی جگہ تو بس گھر کی چھت ہی ہے۔“ وہ
بھی کچھ لٹھ مار کر بولی۔

”یہاں بے امانی ہے تو میں کیسے اور رہ لوں گی مگر
واپس گھر نہیں جاؤں گی۔“ مہواہ کا انداز ضدی تھا۔

”تو یوں بول نا پازیب پننے کی۔“ مہواہ خاموشی سے
اس کا جھریوں بھرا ساناٹا چہرہ دیکھے گئی، جس کی ایک
ایک سلوٹ میں کرب رقم تھا۔

”دیکھ کٹیرے! دو راستے ہیں، ایک ان چاہا اور ایک
من چاہا۔ یہاں کروٹوں لوگ ہیں جنہیں ان چاہے

راستے پہ چلنا پڑتا ہے، زمانہ ان کے پاؤں میں بیڑیاں
ڈال دیتا ہے، ریت و رواج کی بیڑیاں، انا، عزتوں کی
بیڑیاں اور ان بیڑیوں کے قفل کی چابی زمانے کی جیب
میں ہوتی ہے۔ وہ تالا قبر تک ساتھ جاتا ہے، پھر زندگی

سے موت تک کے سفر میں کیسے بھی نشیب و فراز
آئیں۔ ان بیڑیوں کو ڈالے چلنا ہی پڑتا ہے، پاؤں لہو
رنگ ہو جائیں یا آبلوں سے بھر جائیں، ان بیڑیوں کی
کرسہ آوازیں کالوں میں زہر گھولتی ہی رہتی ہیں۔
جس نے یہ پہنی ہوں وہ مر جاتا ہے۔“ وہ درخلاؤں
میں دیکھتے ہوئے بول رہی تھی، مہر لکھنکی ہاندھے اسے
دیکھ رہی تھی۔

”پھر معاشرے کے گدھ اس مودار کو نوچتے رہتے
ہیں اور اس پہ شرمندگی بھی محسوس نہیں کرتے۔“
اب وہ آنکھوں میں انجالی سی نفرت لیے مہواہ کو دیکھ
رہی تھی، لیکن یہ نفرت مہواہ کے لیے نہ تھی۔

”اگر تو پازیب پننے کی، خوب صورت چمکتی ہوئی،
چمن چمن کرتی تو اس کی چمن چمن بھی چمے کی جے،
کیونکہ۔۔۔ کیونکہ اس کی چمن چمن کے پیچھے بھی بہت
آئیں گے، تب بھی یہ گدھ تجھ پر پل پڑیں گے۔ گھر
چلی جا واپس۔ ابھی وقت ہے۔“ اب وہ حیران و
پریشان، سوچوں میں گھری مہواہ کو باقاعدہ دھکے دے
رہی تھی۔

”جا، جا، توچ لینے کو آرہے ہیں تجھے سب، جا بیڑی
پہن لے۔“ اس کی آواز بلند ہوتی جا رہی تھی۔ وہ پاگل
دکھ رہی تھی۔ لوگ اکٹھے ہو رہے تھے اور وہ بے
قابو۔ دو لوگوں نے اسے بازوؤں سے تھاما۔

”بے چاری کئی سالوں سے یہاں پڑی ہے، سنا ہے
محبت کے لیے گھر سے بھاگی تھی، پر گھر سے باہر عورت
کی کیا عزت ہے۔“ ہجوم میں سے کوئی کہہ رہا تھا۔

مہواہ نڈھال قدموں سے چلتی ہجوم کو۔ چیرتی اٹھ
کھڑی ہوئی۔ واپسی کا سفر کٹھن ضرور ہوا کرتا تھا مگر غلط
نہیں۔ یہ مہراہ نے اس بوڑھی دیوانی غصینی کی باتوں
سے جان لیا تھا۔



نگہت سیمّا

ولایت گلشن





مکمل ناول

”نہیں۔“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔
 ”تم دراصل۔۔۔“ مار تھانے ایک انگلی اٹھا کر اس کی
 طرف اشارہ کیا اور پھر ہنسنے لگی۔ وہ سوالیہ نظروں سے
 اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ جوتے پہن کر سیدھی ہوئی اور
 پھر دائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی اٹھا کر اس کی طرف
 اشارہ کیا۔
 اس کی آنکھوں میں چمک تھی۔ وہ یقیناً ”نشے میں
 تھی۔ صبح سے لے کر اب تک اس نے اسے دو تین بار
 اپنے لیے ڈرنک بناتے اور پیتے دیکھا تھا۔ وہ انگلی اس
 کی طرف کیے ہنس رہی تھی جب پال نے لاؤنج میں
 قدم رکھا۔ وہ شاید ابھی باہر سے آیا تھا۔ اس کے کوٹ
 پر کہیں کہیں برف تھی۔
 ”اتنا ہنس کیوں رہی ہو میری ڈارلنگ!“ وہ جب موڑ
 میں ہوتا تو اسے میری کہہ کر بلاتا تھا۔
 ”یہ تمہاری بیٹی!“ مار تھانے اپنی جگہ سے اٹھی اور اس
 کے قریب آ کر اس کے کوٹ کی آستینوں سے برف
 جھاڑی۔ پال کی سوالیہ نظریں اس کی طرف اٹھیں اور

وہ کمرس کی رات تھی۔ لندن میں برف گر رہی
 تھی۔ چھتیں برف سے ڈھک گئی تھیں۔ گلیوں میں
 برسکون ٹھنڈک اتر آئی تھی۔ گھروں میں پکوانوں کی
 خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ وہ کھڑکی کے شیشے سے چہرہ
 نکائے لان میں موجود کمرس ٹری کو دیکھ رہی تھی۔
 جسے پال نے ایلن کے ساتھ مل کر سجایا تھا۔ اس نے
 کچھ دیر شیشے سے دیکھنے کے بعد کھڑکی کا پٹ کھول دیا
 یک دم ہوا کا جھونکا اس کے چہرے سے ٹکرایا۔ ہوا
 جس میں برف کی خنکی تھی۔
 ”ہے۔۔۔ جوتی! تم تیار نہیں ہوئیں۔ کیا تمہیں
 ایلن کی پارٹی میں نہیں جانا۔“ مار تھانے لاؤنج میں جھانکا
 اور پھر اندر آگئی۔
 اس نے کھڑکی بند کرتے ہوئے پیچھے مڑ کر دیکھا۔
 مار تھانے تقریباً ”تیار تھی۔ منی اسکرٹ اور بہت نیچے گلے
 والا بغیر آستین کا بلاؤز۔ ہاتھ میں چھ انچ کی ہیل والے
 باریک اسٹرپ والے جوتے پکڑے ہوئے وہ صوفے پر
 آکر بیٹھ گئی اور جھک کر جوتے پہننے لگی۔

پھر قریبی صوفے پر بیٹھ کر اپنے جوتے اتارنے لگا۔
 ”یہ اس پارٹی میں نہیں جانا چاہتی حالانکہ ایلن نے
 بہت تاکید کی تھی کہ اسے پارٹی میں ضرور لاؤں اور
 ۔“ اس نے پھر پال کے کندھے پر پڑی ناؤیدہ برف
 جھاڑی۔

”یہ صبح کرسمس کی تقریبات میں شرکت کے لیے
 بھی میرے ساتھ چرچ نہیں گئی۔“
 ”اچھا!“ پال نے اس کی طرف دیکھا جواب کھڑکی
 کے پاس سے ہٹ کر صوفے کی پشت پر ہاتھ رکھے
 کھڑی تھی۔

”وہ۔۔۔ میں۔۔۔“ اس نے بے چینی سے اپنے ہاتھوں
 اور انگلیوں کو مسلا۔ وہ جب اپ سیٹ ہوتی تھی یوں
 ہی اپنے ہاتھ مسلنے اور رگڑنے لگتی تھی۔
 ”میری طبیعت۔۔۔ ڈیڈ! میری طبیعت ٹھیک نہیں
 تھی۔“ پال کے چہرے سے نظریں ہٹا کر اس نے جملہ
 مکمل کیا۔

”کچھ نہیں ہوا اس کی طبیعت کو پال! دراصل یہ جو
 چار سال اپنے سوتیلے باپ کے گھر رہی ہے تو اس نے
 اس کا دماغ خراب کر دیا ہے۔“

”لیکن میری ڈیر! جب میں اسے لایا تھا تو یہ دس
 سال کی تھی۔ بالکل بچی اور اب یہ آٹھ سال سے
 تمہارے ساتھ ہے۔ اگر اس نے سوتیلے باپ کے گھر
 اپنے مذہب کے متعلق کچھ نہیں جانا تو کیا یہ تمہارا
 فرض نہیں تھا کہ تم اسے اپنے مذہب سے آگاہی
 دو۔“ پال کا آج خلاف معمول موڈ اچھا تھا اور وہ بہت
 نرمی سے بات کر رہا تھا۔

”میں تو اس کا دماغ ٹھکانے لگا دیتی لیکن صرف
 تمہاری وجہ سے۔۔۔ پھر تم کہتے کہ میں تمہاری بیٹی پر
 سختی کرتی ہوں۔ یہ کام تو تمہیں خود کرنا چاہیے تھا۔“
 مار تھا لہراتی ہوئی پھر اپنی جگہ پر آکر بیٹھ گئی تو پال نے
 اس کی طرف دیکھا جو ہونٹ پیچھے صوفے کی پشت پر
 ہاتھ رکھے کھڑی تھی۔

”تم جانتی ہو جوزی! تمہارا دادا پادری تھا ایک سچا
 عیسائی اور تم۔۔۔“

”میں بھی ایک سچی عیسائی ہوں ڈیڈ!“ اس نے
 فوراً اپنے سینے پر صلیب بنائی اور صوفے کے پیچھے
 سے نکل آئی۔

”خداوند یسوع مسیح مجھے معاف کرے۔ میری
 طبیعت واقعی خراب ہے، لگتا ہے۔ مجھے ٹیسر پکڑ ہے۔“
 پال نے ایک جتنائی نظر مارا تھا رڈالی اور سوچا۔ ”یہ
 مار تھا ہمیشہ ہی مجھے جوزی سے بدظن کرنے کی کوشش
 کرتی رہتی ہے۔“

مار تھا نے ایک تیز نظر اس پر ڈالی۔ ایسی نظر جو اسے
 اندر تک سہاوتی تھی اور پال کی طرف دیکھا۔
 ”تم لہجہ پر کہاں تھے؟“

”دوستوں کے ساتھ تھا۔ تم نے کیا بنایا تھا؟“
 ”رُکی ریوسٹ کیا تھا اور تمہاری لاڈلی نے ایک
 پڈنگ بنائی تھی جبکہ ایلن چاکلیٹ کیک لایا تھا۔“ مار تھا
 نے جواب دیا۔

”میں نے لہجہ نہیں کیا۔“

”میں کچھ لائی ہوں ڈیڈ!“

وہ فوراً ہی لاؤنج سے نکل گئی۔ مار تھا نے اسے
 جاتے دیکھا اور پال کی طرف جھکتے ہوئے سرگوشی کی۔
 ”تم جانتے ہو پال! ایلن تمہاری بیٹی میں انٹرسٹڈ
 ہے۔“

”اچھا!“ پال نے اب ٹانگیں دراز کر لی تھیں اور
 مطمئن نظر آ رہا تھا۔

”تو اور کیا۔ وہ یوں ہی مہمان نہیں ہے۔ اس کا دل
 آگیا ہے اس پر۔“ وہ تھوڑا سا اور جھکی اور اس کا لہجہ
 مزید دھیمہ ہوا۔

”اس نے نیا اپارٹمنٹ لیا ہے۔ پہلے سے بڑا اور وہ
 چاہتا ہے کہ جوزی اس کے ساتھ اس کی پارٹنر بن کر
 اس کا اپارٹمنٹ شیئر کر لے۔“

”کیا مطلب! شادی کرنا چاہتا ہے وہ؟“ پال ایک دم
 خوش ہوا تھا۔

”شادی!“ مار تھا ایک دم منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنسنے لگی
 اور ہنستے ہنستے دہری ہو گئی۔ پال حیرت سے اسے ہنستے
 ہوئے دیکھ رہا تھا۔

”تم پاکستان میں نہیں ہو پال! یہاں ارد گرد جتنے گھر ہیں ان میں کتنے شادی شدہ جوڑے ہیں؟ ایک بھی نہیں پال! یہ سب ایک دوسرے کے ساتھ اپارٹمنٹ شیئر کرتے ہیں اور جب دل بھر جائے تو۔“ وہ پھر ہنسنے لگی۔

”تمہارا مطلب ہے بغیر شادی کے۔ ایلن چاہتا ہے کہ جوڑی بغیر شادی کے اس کے ساتھ رہے؟“ پال کی آنکھوں کی حیرت دوچند ہوئی تھی۔ ”نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔“

”کیوں نہیں ہو سکتا؟“ مار تھا چلائی۔ ”تم۔۔۔ پال تم! اس نے دایاں ہاتھ قدرے بلند کر کے شہادت کی انگلی سے اس کی طرف اشارہ کیا۔ یہ اس کی عادت تھی۔“ اندر سے وہی دقینوسی پاکستانی ہو۔ دسی عیسائی۔“ اس نے زمین پر تھوک دیا۔

”یہ یورپ ہے پال! یہاں ایسے ہی چلتا ہے۔ سب ایسے ہی رہتے ہیں۔ ایلن کہتا ہے۔ یہاں ہم شادی افورڈ نہیں کر سکتے۔ ڈائورس کی صورت میں بہت نقصان ہوتا ہے۔ کیا پتا کب چھوڑنا پڑ جائے۔“

پال نے سر جھکا لیا تھا۔ وہ ہمیشہ خود کو دسی عیسائی کہلوانے پر شرمندہ ہوتا تھا لیکن مار تھا کے سامنے نہیں۔ اس لیے وہ فوراً ”ہی اس شرمندگی سے باہر نکل آیا تھا۔“

”اور تم کون سی ولایتی میم ہو۔ تمہارا ماموں تو آج بھی گوجرانوالہ میں میونسپلٹی میں کام کرتا ہے جبکہ میرا باپ پادری ہے۔ ایک معزز شہری اور میرا دادا ہالینڈ سے آیا تھا۔ اعلا خاندان سے تعلق تھا اس کا۔“

”اور تمہارے دادا نے ایک اینگلو انڈین نرس سے شادی کی تھی۔ تو تمہارا باپ بھی پھر دسی عیسائی ہوا نا۔ اور تمہاری ماں۔۔۔ کہنے کو تو نیچر تھی پر انگریز اسکول کی ہنجر تھی تو وہی میونسپلٹی میں کام کرنے والے خاندان کی۔“

مار تھا اپنے اوپر تو بات کبھی آنے ہی نہیں دیا کرتی

پیارے بچوں کے لئے

قصص الانبیاء



تمام انبیاء علیہ السلام کے بارے میں مشتمل ایک ایسی خوبصورت کتاب جسے آپ اپنے بچوں کو پڑھانا چاہیں گے۔

ہر کتاب کے ساتھ حضرت محمد ﷺ کا شجرہ نسب حاصل کریں۔

قیمت 300/- روپے

بذریعہ ڈاک منگوانے پر ڈاک خرچ 50/- روپے

بذریعہ ڈاک منگوانے کے لئے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37 اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

تھی اور پال کی باتوں کو تو چٹکیوں میں اڑا دیا کرتی تھی۔ جب پال نے اس سے شادی کی تھی تب بھی اس کی ماں اور — باپ کا رپوریشن کے ملازم تھے، لیکن وہ ہمیشہ پال پر احسان دھرا کرتی تھی جیسے اس نے پال سے شادی کر کے اس پر بڑا احسان کیا۔ ہو۔

جب پال سے اس کی ملاقات ہوئی تھی تو وہ بی۔ ایڈ کرنے لاہور آئی ہوئی تھی اور ایجوکیشن کلج فار ویمن میں پڑھتی تھی۔ پال کی چھوٹی بہن مارگریٹ زریں اس کی روم میٹ تھی۔ مارگریٹ یون جس کے ماں باپ دونوں ہی گوجرانوالہ کی میونسپل کمیٹی کے ملازم تھے، چاہتے تھے کہ وہ پڑھ لکھ کر ٹیچر بن جائے۔ جبکہ اس کے چاروں بھائیوں نے بھی زیادہ تعلیم حاصل نہیں کی تھی۔

وہ اپنے سات بہن بھائیوں میں سب سے مختلف تھی۔ گوری چٹی، بھوری آنکھیں، بھورے بال۔ اس کی دونوں چھوٹی بہنیں بھی شکل و صورت میں بالکل اپنی ماں پر تھیں لیکن وہ تو — اگر وہ پال پر احسان دھرتی تھی تو اس کے نزدیک کچھ غلط نہ تھا، کیونکہ پال تو شادی شدہ اور ایک بچی کا باپ تھا۔ بے شک ان کی علیحدگی ہو چکی تھی تو وہ جو ان دونوں ایک گلوکار پر دل ہی دل میں مرنے لگی تھی اس نے پال سے شادی کا فیصلہ کر لیا تھا۔ صرف مارگریٹ سے پال کے متعلق سن کر اسے دیکھے بغیر۔ بہر حال پال کا سماجی رتبہ اس سے بہتر تھا۔ پال کا باپ ایک چھوٹے شہر کے گرجے میں پادری تھا۔ شہر بہت چھوٹا بھی نہ تھا۔ اسے ضلع کا درجہ حاصل تھا۔ پال کے تین بڑے بہن بھائی اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے اور اچھی پوسٹوں پر تھے، جب کہ پال بھی گریجویٹ تھا اور اس کی چھوٹی بہن بی ایس سی کے بعد ایل ایڈ کر رہی تھی۔ سو مارگریٹ ہر وقت مارگریٹ کے ساتھ رہتی تھی۔ حتیٰ کہ اس وقت بھی جب پال مارگریٹ سے ملنے آتا تھا۔ بلکہ ایک بار تو وہ مارگریٹ کے ساتھ اس کے گھر سے بھی ہو آئی تھی۔

مارگریٹ کے ماں باپ اس سے بہت محبت سے ملے تھے۔ گرجے کے ساتھ منسلک ایک چھوٹا سا

انگلش میڈیم اسکول تھا جسے پال چلاتا تھا۔ ان دنوں جب وہ مارگریٹ کے ساتھ اس کے گھر گئی تھی تو پال بیوی کی بے وفائی اور بچی کی جدائی سے زخم خوردہ تھا۔ مارگریٹ کو پال کا چھوٹا سا بھائی جو گرجے کے ساتھ ہی تھا۔ اور گرجے کی طرح سرخ اینٹوں سے بنا ہوا تھا بہت پسند آیا تھا۔ سو اس نے پال کی دل جوئی شروع کر دی تھی کیونکہ وہ پال سے شادی کا فیصلہ کر چکی تھی۔

”پھر بھی میرا خاندان ایک معزز خاندان تھا جبکہ تمہارا خاندان — اور تم نے شادی سے پہلے ایک دن بھی ذکر نہیں کیا تھا کہ تمہارے خاندان کے لوگ وہاں گوجرانوالہ میں —“ پال کو بھی یاد آ گیا تھا کہ مارگریٹ کیسے اپنے خاندان کے متعلق چھپایا تھا۔

”اور تم!“ مارگریٹ پر ٹانگ رہ کر ہنسنے لگی تھی۔

دونوں میں لڑائی شروع ہو گئی تھی اور کچن میں ٹرائی پر سالن سجائے کھڑی جوڑی بے چینی سے اپنے ہاتھ مسل رہی تھی اور انگلیاں موڑ رہی تھی اور پال اور مارگریٹ لڑ رہے تھے۔ ایک دوسرے پر چلا رہے تھے۔ یقیناً ”کرسمس کی رات برباد ہو چکی تھی۔“

دونوں لڑھکھڑ کر سو جائیں گے اور ایلن کی پارٹی میں جانا نہیں پڑے گا۔ وہ برا نہیں تھا۔ اچھا لڑکا تھا۔ لیکن اسے اچھا نہیں لگتا تھا۔ جب وہ اپنی نیلی کنجیوں جیسی آنکھیں اس پر گاڑتا تو ہنسنے کیوں دوسیا۔ بھنورا جیسی آنکھیں اس کے تصور میں آ جاتیں۔ اسے ایلن کی بے تکلفی بھی اچھی نہیں لگتی تھی۔

اس نے اطمینان بھرا سانس لے کر ٹرائی کا جائزہ لیا۔ سب چیزیں موجود تھیں۔ اس نے پال کی پسند کی سائز ٹرائی میں رکھیں۔ اسے پال سے بہت محبت تھی۔ وہ ممی کے مقابلے میں پال سے زیادہ قریب تھی، اس لیے۔ جب ممی اور پال کے درمیان علیحدگی ہوئی تھی تو وہ بہت ڈسٹرب ہوئی تھی حالانکہ وہ صرف پانچ سیل کی تھی، لیکن وہ ہر وقت سیل کو یاد کر کے روئی رہتی تھی اور بہت ضدی ہو گئی تھی کہ اسے ڈیڈی کے پاس جانا ہے۔ لیکن پھر جب ممی نے شادی کر لی تو انہوں نے پال کو پیغام بھیجا تھا کہ وہ چاہے تو اپنی بیٹی کو لے جائے

لیکن پال کو اس کا پیغام نہیں ملا تھا یا پھر وہ اسے جان بوجھ کر لینے نہیں آیا تھا کیونکہ اس کی زندگی میں مار تھا آچکی تھی لیکن پھر چار سال بعد وہ اسے لینے آیا تھا۔
”ہے جوڑی! کہاں مر گئی ہو؟“

یہ مار تھا بھی جو لاؤنج سے اسے پکار رہی تھی۔ شاید اس کے پاس پال سے لڑنے کے لیے اسلحہ بارود ختم ہو چکا تھا۔ یقیناً باقی کا غصہ اس نے جوڑی پر نکالنا تھا۔ جوڑی نے رُابی کے ہینڈل پر ہاتھ رکھا اور اسے دھکیلتی ہوئی لاؤنج کی طرف جانے لگی۔
”ہینو!“ اندر سے پال کی آواز آئی تو وہ ٹھٹھک کر رک گئی۔

یعنی ابھی میدان کارزار گرم تھا۔ پال کو جب بہت غصہ آتا تھا تو وہ اسے چڑانے کے لیے اس نام سے پکارتا تھا جس نام سے اس کے گھر والے بلاتے تھے۔ یہ نام پروین کی بگڑی ہوئی شکل تھی۔ لیکن پال اور مار گریٹ سے ملنے کے بعد وہ صرف مار تھا ہی رہ گئی تھی۔

”ادھر دو مجھے اور برو کیس دفعہ ہو جاؤ میری نظروں سے دور۔“ مار تھا لاؤنج سے نکلی تھی اور رُابی اس کے ہاتھوں سے جھپٹی تھی۔ وہ حیرت سے مار تھا کو دیکھتی رہ گئی جو رُابی دھکیلتی لاؤنج میں چلی گئی تھی۔ مار تھا کے متعلق قبل از وقت کچھ بھی کہنا ممکن نہ تھا۔
اسے کبھی بھی اندازہ نہیں ہوا تھا کہ اگلے لمحے وہ کیا کرنے والی ہے۔

کچھ دیر وہ بونہی کھڑی رہی اور پھر آہستگی سے بیرونی دروازہ کھول کر گھر سے باہر نکل آئی۔ کچھ دیر یونہی گھر کی بیرونی دیوار سے ٹیک لگائے کھڑی رہی۔ وہ اس وقت گھر سے باہر کیوں آئی تھی وہ خود نہیں جانتی تھی۔ باہر اب بھی ہلکی برف باری کا سلسلہ جاری تھی۔ برف اس کے کندھوں پر بانوؤں پر اور سر پر گر رہی تھی۔ دراصل وہ مار تھا اور پال کی لڑائی سے خوفزدہ ہو جاتی تھی۔ ہمیشہ ہی۔ اور اب بھی وہ ارد گرد سے بے نیاز سوچ رہی تھی کہ پال اور مار تھا اب بھی جھگڑ رہے ہوں گے اور پتا نہیں کب تک جھگڑتے رہیں گے۔ تب ہی سامنے والے گھر کا دروازہ کھول کر کوئی باہر نکلا۔

اور اس کے قریب آکر رکھا تھا۔
”ہیلو مس! اپنی رابلم؟“ اس کی آواز بے حد خوب صورت تھی، کبیر دل میں اترتی ہوئی سی۔ اس نے اپنے کوٹ کے کالر کھڑے کر رکھے تھے۔

”نو۔“ اس نے سر اٹھا کر اسے دیکھا اور اس کی آنکھیں ان سیاہ بھنورا سی آنکھوں سے ٹکرائیں جو اس پر جمی تھیں۔

”ہم نے تمہیں اپنے کمرے کی کھڑکی سے دیکھا تھا۔ سوچا شاید کوئی رابلم ہو۔“ اب اس کے پیچھے کھڑی لڑکی نے دائیں طرف ہو کر کہا تو وہ چونکی۔ اور پھر نفی میں سر ہلایا۔

”یہ لڑکی ہمیشہ اس کے ساتھ ہی ہوتی تھی۔ یہ فیملی جو چار افراد پر مشتمل تھی۔ ماں، باپ اور یہ دو۔ اب پتا نہیں یہ لڑکی اس کی بہن تھی یا پوی۔ یہ فیملی ہفتہ بھر پہلے ہی اس گھر میں منتقل ہوئی تھی اور ہفتہ بھر پہلے ہی اس نے اسے دیکھا تھا اور تب سے یہ سیاہ بھنورا سی آنکھیں اسے ڈسٹرب کر رہی تھیں۔ ان آنکھوں میں کیا تھا ایسا۔ اس نے نظریں اٹھائیں۔

”ابھی کر مس!“ لڑکی مسکرائی۔
”ابھی کر مس!“ اس نے بہت آہستگی سے کہتے ہوئے نظریں جھکا لیں۔

”آپ کا کر مس ٹری بہت خوب صورت ہے۔“
سیاہ بھنورا آنکھوں والا ان کے لان کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”تھینک یو!“

”میں خوش جمال ہوں۔“ لڑکی مسکرا رہی تھی۔
اور ہم پاکستانی ہیں۔ مسلم اور تم؟“ لڑکی نے ہاتھ آگے بڑھایا تھا۔

”میں۔!“ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ دروازہ بند تھا، لیکن مار تھا کسی بھی لمحے باہر آسکتی تھی اور۔
”تم کسی مسلم سے بات نہیں کرو گی اور کسی مسلمان سے دوستی نہیں کرو گی۔ سمجھیں!“ اس کے کانوں میں مار تھا کی آواز آئی۔

جب چار سال بعد پال اسے می کے پاس سے لے

کر آیا تھا تو مار تھانے پہلی بات یہی سمجھائی تھی کیونکہ
میں نے جس شخص سے شادی کی تھی وہ مسلمان تھا۔
اس نے لڑکی کی بات کا جواب نہیں دیا تھا اور ایک
دم پلٹ کر اپنے گھر کا دروازہ دھکیلتی اندر چلی گئی تھی۔
”عجیب لڑکی ہے“ خوش جمال نے کندھے
اُچکائے تھے۔

”خوشی! یہ لوگ پسند نہیں کرتے کہ لوگ بلا وجہ
انٹرفیر کریں۔“

”میرا خیال تھا کہ یہ پاکستانی یا انڈین فیملی ہے۔ ماں
مے بی یہاں کی ہو لیکن باپ اور بیٹی کی رنگت ظاہر
کرتی ہے کہ ان کا تعلق برصغیر سے ہے۔“

خوش جمال نے اپنا خیال ظاہر کیا اور اپنے بازوؤں
سے برف جھاڑتے ہوئے اپنا اسکارف درست کیا۔

وہ دونوں اب واپس گھر کی طرف جا رہے تھے اور وہ
لاؤنج کی کھڑکی کے شیشوں سے انہیں جاتے دیکھ رہی
تھی۔

”یہ لوگ پاکستان سے آئے تھے۔ یہ مسلمان
تھے۔ وہ لڑکا پتا نہیں اس کا نام کیا تھا۔ اور اس کی
آنکھیں۔ اس کی آنکھیں کتنی سیاہ تھیں بالکل۔
بالکل۔ اس نے کتنے سالوں بعد ایسی کھور سیاہ
آنکھیں دیکھی تھیں۔“

اپنے گھر میں داخل ہونے سے پہلے لڑکے نے پیچھے
مڑ کر دیکھا تھا۔ وہ تیزی سے پیچھے ہٹ گئی۔ مار تھا اور
پال لاؤنج سے جا چکے تھے۔ ٹرائی ایسے ہی بھری پڑی
تھی۔ ایک پلیٹ میں کیک کا چھوٹا سا پیس کٹا ہوا پڑا
تھا۔ یقیناً پال نے کچھ نہیں کھایا ہو گا۔

گویا آج بڑے دنوں بعد دونوں میں زور دار لڑائی
ہوئی تھی۔ تھینک گاڈ! وہ باہر چلی گئی تھی ورنہ وہ
سامنے ہوتی تو مار تھا کی توپوں کا رخ اس کی طرف بھی ہو
جاتا اور وقتاً فوقتاً وہ دونوں طرف گولا باری کرتی
رہتی۔

اس نے زمین پر اونڈھی پڑی پلیٹ اٹھا کر ٹرائی میں
رکھی اور ٹرائی دھکیل کر پکن کی طرف لے جانے لگی۔



وہ فٹ بال گراؤنڈ کے باہر گراؤنڈ کے کنارے ہاتھ
گود میں دھرے زمین پر بیٹھا تھا۔ پچھلے چھ دن سے
یہاں ایگل کلب فٹ بال ٹورنامنٹ ہو رہا تھا اور یہ
ٹورنامنٹ ڈسٹرکٹ فٹ بال ایسوسی ایشن کے تحت ہو
رہے تھے۔

آج لیاقت میموریل اور اقبال میموریل کے
درمیان میچ تھا۔ یہ دونوں ٹیمیں تلہ گنگ کے دو مختلف
وساتوں سے آئی تھیں اور انہوں نے بے حد شان دار
کھیل کا مظاہرہ کیا تھا۔ وہ گراؤنڈ سے باہر مبہوت سا
بیٹھا انہیں دیکھتا رہا تھا۔ گراؤنڈ اب خالی تھا۔ کھلاڑی
جا چکے تھے بلکہ شائقین بھی۔ وہ تنہا خالی میدان کے
باہر بیٹھا گراؤنڈ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ یہ ایک کھلا اور
وسیع میدان تھا گراؤنڈ سے اس طرف سفیدے کے
درختوں کی قطاریں تھیں۔

اس کے پیچھے میدان میں کلب کی عمارت تھی اور
عمارت سے پیچھے حد نظر کھیت ہی کھیت تھی۔ سورج کا
سرخ گولا ہونے ہوئے درختوں کے پیچھے گم ہو گیا تھا۔
اور ملکجا سا اندھیرا دھیرے دھیرے گہرا ہوتا جا رہا تھا۔
درخت اب دور سے سیاہ نظر آ رہے تھے اور پیچھے کلب
کے مین گیٹ پر ایک چھوٹا سا بلب جل اٹھا تھا۔ اس
بلب کی مدھم روشنی گراؤنڈ تک نہیں پہنچ رہی تھی۔
تاہم گیٹ کے آس پاس کا اندھیرا کم ہو گیا تھا۔ اس
نے ایک نظر پیچھے مڑ کر کلب کے گیٹ کی طرف دیکھا۔
اور پھر گراؤنڈ کی طرف دیکھنے لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے
گراؤنڈ کھلاڑیوں سے بھر گیا۔ یکایک اس کے کانوں
میں سمیٹھل شور اور تالیوں کی آوازیں گونجنے لگیں۔
وہ گراؤنڈ کے کنارے زمین پر بیٹھا تھا لیکن گراؤنڈ
کے اندر ہی تھا کھلاڑیوں کے درمیان بال کے پیچھے
بھاگتا ہوا۔ وہ بال کے ساتھ ساتھ بھاگ رہا تھا اور
مختلف کھلاڑیوں کو ڈانچ دیتا گول پوسٹ کے پاس پہنچ گیا
تھا اور پھر اس کی ایک ہی کک نے بال کو گول میں پہنچا
دیا تھا۔ اس کے کانوں میں تالیوں اور سیٹیوں کی
آوازیں آرہی تھیں۔ وہ کھلاڑیوں کے گھیرے میں
گراؤنڈ میں کھڑا تھا۔ درختوں کے جھنڈ سے یک دم

کوئی پرندہ تیز آواز نکالتا ہوا اڑا اور اس کے سر کے اوپر سے اڑتا ہوا کلب کی عمارت کے پیچھے غائب ہو گیا۔ اس نے خوف زدہ ہو کر چاروں طرف دیکھا۔ گراؤنڈ سنسان تھا اور وہ اکیلا گراؤنڈ کے کنارے زمین پر بیٹھا تھا۔ اس کے وجود پر کچھ سی طاری ہو گئی اور خشکی کی ایک لہر اس کی رگوں میں اتر گئی۔ حالانکہ یہ ستمبر کا وسط تھا لیکن رات کو ٹھنڈ ہو جاتی تھی کیونکہ اس چھوٹے سے شہر کے ارد گرد پہاڑی علاقے تھے۔ یہاں سردی جلد پڑتی اور دیر سے جاتی تھی۔ ایگل کلب شہر سے باہر مضافات میں تھا اور اس کا گھر سامنے سفیدے کے درختوں کے پیچھے تھا۔ یہ سفیدے کے سینکڑوں کی تعداد میں لگے ہوئے درخت ان کے تھے۔ یہ زمین ان کی تھی۔

ایگل کلب فٹ بال ٹورنامنٹ شروع ہوئے چھ دن ہو گئے تھے اور وہ چھ دن سے یہاں آ رہا تھا اور سب کے جانے کے بعد بھی بیٹھا رہتا۔ گراؤنڈ کو دیکھتا رہتا اور اس کا الوژن چند لمحوں کے لیے گراؤنڈ کو آباد کر دیتا اور وہ جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھنے لگتا۔

کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ یہاں اس وقت بیٹھا ہے۔ لیکن ایک آنکھ تھی جو چھ دن سے اسے نوٹ کر رہی تھی اور یہ آنکھ کوچ محی الدین کی تھی جو اس وقت کلب کے فرسٹ فلور پر موجود اپنے کمرے کی کھڑکی سے اسے دیکھ رہے تھے۔ پیچھے کھیتوں میں کوئی گیدڑ چبھا تھا۔ وہ ایک دم خوفزدہ ہو کر کھڑا ہو گیا اور اپنے ہاتھوں کو پھیلا یا۔ بند کیا۔ کھولا۔ جھک کر ایک چھوٹے سے پتھر کو اٹھا کر مٹی میں بند کرنے کی کوشش کی لیکن پتھر نیچے گر پڑا۔ اس کے چہرے پر مایوسی سی پھیل گئی۔ وہ سر جھکائے درختوں کی طرف چل پڑا۔ جن کے نیچوں بیچ ایک کچا راستہ اس کے گھر کی طرف جاتا تھا۔ اس راستے سے وہ جلدی گھر پہنچ جاتا تھا ورنہ کلب کے پیچھے سے کسی سڑک بھی تھی۔ وہ بھی اس کے گھر کی طرف جاتی تھی۔

اندھیرے میں دونوں اطراف موجود درختوں کے ہیولے عجیب و غریب شکلیں اختیار کیے ڈراتے تھے۔

لیکن وہ سر جھکائے تیز قدم اٹھاتا گھر کی طرف جا رہا تھا۔ اسے گھر میں داخل ہونے وقت کبھی مسئلہ نہیں ہوا تھا۔ وہ گیٹ پھلانگ کر اندر آ جاتا تھا اور پھر پورج سے گزر کر کھلی میں سے ہوتا پکن کے پچھلے دروازے سے اندر آتا تھا۔ برتن دھونے والی ماسی اور صفائی والی ماسی بھی ادھر سے ہی آتی تھی۔ جب کبھی وہ لیٹ ہو جاتا تھا۔ پکن کا یہ دروازہ اسے اندر سے کھلا ملتا تھا ورنہ رات کو اندر سے بند کر دیا جاتا تھا۔

اور اب تو وہ چھ دن سے لیٹ آ رہا تھا اور دروازہ اسے کھلا ہی مل رہا تھا اور وہ جانتا تھا یہ کام مشاغل کے سوا اور کوئی نہیں کر سکتا تھا وہ دل ہی دل میں اس کا ممنون ضرور ہوتا تھا لیکن اس نے اس کا شکریہ کبھی ادا نہیں کیا تھا لیکن آج پکن کا دروازہ نہ صرف یہ کہ اندر سے بند تھا بلکہ باہر جالی کے دروازے پر بھی تالا لگا ہوا تھا اور اسے تب ہی بند کیا جاتا تھا جب کہیں جانا ہوتا تھا۔ وہ کچھ دیر پریشان سا کھڑا رہا پھر واپس پورج سے ہوتا گیٹ تک آیا۔ باہر سے گیٹ پھلانگنا آسان تھا۔ لیکن اندر سے مشکل۔

”کیا میں باہر جا کر نکل دوں؟“

اس نے سوچا اور پھر واپس برآمدے کی سیڑھیاں چڑھ کر کچھ دیر وہ اندرونی گیٹ کے پاس کھڑا رہا اور پھر دروازے سے کچھ فاصلے پر موجود کھڑکی سے جھانکنے کی کوشش کی لیکن کھڑکی پر بھاری پردے پڑے تھے۔ تب وہ مڑ کر دروازے کے پاس آیا اور لکڑی کے بھاری دروازے پر دستک دی۔ تیسری دستک پر دروازہ کھل گیا۔

دروازے کے اس طرف مینو تھی۔ مینو کا نام تو امینہ تھا لیکن سب اسے مینو کہتے تھے۔ وہ چار سال پہلے ان کے گھر کام کے لیے آئی تھی۔ تب وہ دس سال کی تھی اور کام سے فارغ ہو کر اس کے ساتھ کھیلا کرتی تھی۔

اس نے اندر قدم رکھا۔ مینو نے دروازہ بند کر کے پیچھے مڑ کر لاؤنج کی طرف دیکھا اور پھر واپس مڑی لیکن مڑتے ہوئے اس نے ایک نظر اس پر ڈالی تھی جس

میں ترحم تھا، ترس تھا اور ہمدردی۔ وہ کچھ دیر یونہی سن روم میں کھڑا رہا پھر اس نے سن روم اور بی وی لاؤنج کو علیحدہ کرتے پردوں کی طرف دیکھا۔ لاؤنج سے بی وی کی ہلکی ہلکی آواز آرہی تھی۔ اس طرف کون بیٹھا تھا۔ وہ اندازہ کر سکتا تھا۔ مشاعل کی مٹی ہمیشہ بلند آواز میں بی وی لگاتی تھیں، جبکہ پیپا آہستہ آواز میں۔ تو پیپا۔

اس نے اپنے کپڑوں کی طرف دیکھا۔ وہ میدان میں زمین پر بیٹھا رہا تھا یقیناً کپڑوں پر مٹی لگی ہوگی۔ اس نے غیر ارادی طور پر کپڑوں کو جھاڑا اور لاؤنج کی طرف بڑھا۔ وہ ساری رات یہاں سن روم میں نہیں رہ سکتا تھا اسے بہر حال اپنے کمرے میں جانے کے لیے لاؤنج میں سے گزرنے پڑتا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھا اور پردہ ہٹا کر لاؤنج میں قدم رکھا۔ وہ بالکل سامنے سیڑھیوں کی طرف دیکھ رہا تھا، جو لاؤنج سے اوپر تک جا رہی تھیں۔

اس کے دائیں طرف یقیناً پیپا بیٹھے تھے اور ان کے ساتھ مشاعل کی مٹی، لیکن اس نے دانستہ ان کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ اس کی نظریں سامنے سیڑھیوں کی طرف تھیں، جبکہ صوفے دائیں طرف دیوار کے ساتھ لگے ہوئے تھے۔ چند قدم کا فاصلہ تھا اور پھر سیڑھیاں، لیکن اس کے لیے یہ چند قدم طے کرنا پل صراط طے کرنے کے برابر تھا۔ ناک کی سیدھ میں دیکھتے ہوئے اس نے ایک قدم آگے بڑھایا۔

”کہاں سے آرہے ہو؟“ یہ پیپا کی آواز تھی۔ اب اسے دائیں طرف دیکھنا ہی تھا۔ اس کے بڑھتے قدم رک گئے تھے۔

اس کا ننھا سادل تیزی سے دھڑک رہا تھا اور وہ حبیب الرحمن کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جن کے چہرے پر اس کے لیے کوئی پدرانہ محبت یا شفقت نہ تھی ہاں آنکھوں سے جیسے شعلے نکل رہے تھے۔ اس نے منہ کھولا۔ وہ بتانا چاہتا تھا کہ وہ میچ دیکھنے گیا تھا لیکن اس کی آواز گھٹ گئی۔ حلق میں جیسے گولا سا پھنس گیا۔ پچھلے دو سال سے اس کے ساتھ ایسا ہی ہو رہا تھا۔ وہ اپنی صفائی میں کچھ نہیں کہہ پاتا تھا۔ کوئی انجالی طاقت اس

کا گلا بھینچ لیتی تھی۔ بولنا چاہتا تو ہٹکا کر رہ جاتا۔ عام حالات میں وہ بات کر لیتا تھا اگرچہ کم گو تھا لیکن جب کوئی غصے میں ہوتا، خاص طور پر پیپا تو وہ بول نہ پاتا تھا۔ اس کی نظریں جھک گئی تھیں۔ وہ اپنی پوری توانائی بولنے کے لیے اکٹھی کر رہا تھا لیکن اس کے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکل سکا۔

”یہ وقت ہے تمہارے گھر آنے کا۔ اپنی عمر دیکھو۔ اس عمر میں کن بری صحبتوں میں پڑ گئے ہو تم؟“ اس کی نظریں لمحہ بھر کلاک پر ٹھہریں۔ آٹھ بجنے والے تھے۔ پونے سات بجے مغرب کی اذان ہوتی تھی۔ اور وہ اذان کے بعد اٹھنا چاہتا تھا۔ میچ تو چھ بجے ختم ہو جاتا تھا اور ساڑھے چھ تک گراؤنڈ خالی ہو جاتا تھا۔ لیکن کوئی انجالی طاقت اسے وہاں پاندھ دیتی تھی۔ وہ اٹھ نہ پاتا۔ یہ چھوٹا شہر تھا۔ یہاں لوگ آٹھ بجے تک رات کا کھانا کھا کر نوبے تک سو جاتے تھے۔

”ہاں بولو، کہاں تھے اس وقت تک؟“ سوال پھر دہرایا گیا تھا۔

وہ بتانا چاہتا تھا لیکن پھر کچھ کہنے میں ناکام رہا۔ بس ہونٹ پھڑپھڑا کر رہ گئے تھے۔

”اب منہ میں گھنگھنیاں کیوں ڈال لی ہیں۔ بتاؤ نا اپنے باپ کو، کہاں جاتے ہو؟“ یہ تیز چیختی آواز اس کے اعصاب پر ہتھوڑے کی طرح لگتی تھی اور اعصاب چیخنے لگتے تھے۔

”ایک دن کی تو بات نہیں حبیب! یہ تو ہر روز ہی دیر سے آتا ہے۔ اللہ جانے کہاں آوارہ گردی کرتا رہتا ہے۔“

”ہر روز نہیں، صرف چھ دن سے۔ جب سے ایگل کلب ٹورنامنٹ شروع ہوا ہے تب سے۔“

وہ وضاحت کرنا چاہتا تھا لیکن لفظ اندر ہی کہیں دم توڑ گئے تھے اور اس کے ہونٹ صرف لرز کر رہ گئے اور اس نے پیپا کو صوفے سے اٹھتے اور اپنی طرف آتے دیکھا تو سر مزید جھکا لیا۔

”جواب کیوں نہیں دیتے؟“ انہوں نے اس کے بال مٹھیوں میں جکڑ کر اس کا چہرہ اونچا کیا۔ ”میں کیا

ہوں۔ اس کے منہ سے بے اختیار چیخ نکلی تھی۔ اس کے ساتھ ہی حبیب الرحمن جیسے غصے سے پاگل سے ہو گئے تھے۔ انہوں نے مشاعل کی می کی طرف دیکھا تھا۔

”اس کا ڈھیٹ پن تو میں نکالتا ہوں۔“
مشاعل کی می ہمیشہ جلتی پر تیل کا کام کیا کرتی تھیں۔ سو آج بھی کامیاب رہی تھیں۔ لائیں، مکے، ٹھڈے، ٹھپڑ۔

حبیب الرحمن اس پر پل پڑے تھے۔ وہ نیچے گر گیا تھا۔ کچن کے دروازے پر ہاتھ رکھے رکھے مشاعل نے آنکھیں بند کر کے ہونٹ سختی سے بچھینچ لیے تھے، لیکن پھر چند لمحوں بعد آنکھیں کھول دیں۔ مینو اس کے کندھے پر سے دیکھ رہی تھی اور اس کے منہ سے چیخ چیخ کی آوازیں نکل رہی تھیں۔

”مینو!“ مشاعل نے پیچھے مڑ کر اسے دیکھا۔ ”ہادی کو بہت درد ہو رہا ہوگا۔“
”ہوں!“ مینو کے منہ سے نکلا تھا۔

حبیب الرحمن اندھا دھند مار رہے تھے اور وہ زمین پر گر اپٹ رہا تھا۔ بے اختیار وہ کچن کے دروازے سے باہر نکل کر حبیب الرحمن کے قریب آئی۔
”انکل! یہ چیخ دیکھنے جاتا ہے۔ ادھر ایگل کلب کے گراؤنڈ میں فٹ بال کے میچ ہو رہے ہیں۔“

”رات کے آٹھ بجے اس کا باپ چیخ کھلاتا ہے وہاں؟“
انہوں نے ہاتھ روک کر مشاعل کی طرف دیکھا تھا۔ ”میچ چھ بجے ختم ہو جاتا ہے۔“

”جی!“ وہ حبیب الرحمن سے کبھی خوفزدہ نہیں ہوئی تھی۔ ”یہ صرف چند دنوں سے لیٹ آ رہا ہے ہمیشہ نہیں آتالیٹ اور وہ۔“

مشاعل کی می نے اس کے بازو میں اپنے لمبے ناخن کھبوس دیے۔ اس کے منہ سے سسکاری نکلی اور اس نے بات ادھوری چھوڑ کر می کی طرف دیکھا جو حبیب الرحمن کی طرف متوجہ تھیں۔

”آپ بھی غصے میں کچھ نہیں سوچتے سمجھتے۔ بچہ ہے۔ کیا اب مار ڈالیں گے اسے۔“

بکو اس کر رہا ہوں اتنی دیر سے۔“ اس کے بال ان کی مٹھی میں تھے اور چہرہ اونچا اوپر کو اٹھا ہوا تھا۔ آنکھیں پھیل گئی تھیں۔ لمحہ بھر کے لیے ہی اس کی نظر ان پر پڑی تھی۔ سرخ لپ اسٹک لگے ہونٹوں پر بڑی کرسہ مسکراہٹ تھی۔ وہ اٹھے ہوئے چہرے کے ساتھ انہیں دیکھ رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ان کے کھلے ہونٹوں سے لمبے لمبے دانت جھانکنے لگے اور ایسا پہلی بار نہیں ہوا تھا بلکہ پہلے بھی کئی بار ایسا ہوا تھا۔ وہ جب مشاعل کی می کی طرف دیکھ رہا ہوتا تو اس کے دیکھتے دیکھتے ان کی شکل چڑیلوں جیسی ہو جاتی تھی۔ اس نے جھرجھری لی۔ اس کے بالوں میں تکلیف ہو رہی تھی اور گردن میں بھی۔

”خدا نخواستہ کچھ غلط ہو گیا تو لوگ تو مجھے ہی برا بھلا کہیں گے سوتیلی جو ہوئی۔“

وہ اٹھ کر اس کے قریب آگئی تھیں۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ جیسے ابھی ان کے دانت اس کی گردن پر ہوں گے اور وہ اس کا خون چوس لیں گی۔

”بول کہاں تھارت کے آٹھ بجے تک؟“ انہوں نے ایک جھٹکے سے اس کے بال چھوڑے۔ وہ گرتے گرتے سیدھا ہوا تو ان کا تھپڑ اس کے رخساروں پر پڑا۔

”کن دوستوں کے ساتھ آوارہ گردی کر رہا تھا۔“

اس کا کوئی دوست نہیں تھا۔ وہ کبھی کوئی دوست نہیں بنایا تھا اور اس کی وجہ اس کی شخصیت میں موجود اس کی جسمانی کمزوریاں تھیں یا نفسیاتی، لیکن وہ کبھی کسی کلاس فیلو سے بھی بے تکلف نہیں ہو سکا تھا۔ حالانکہ کچھ عرصہ پہلے تک جب اس کی ماما کلثوم زندہ تھیں تو وہ بہت خوش اخلاق اور ہنس مکھ بچہ تھا اور پوری کلاس اس کی دوست تھی، لیکن پھر وہ ہولے ہولے اپنی ذات میں سمٹ گیا تھا۔

”توبہ کس قدر ڈھیٹ لڑکا ہے۔ باپ پوچھ رہا ہے

اور یہ ہونٹ سیسے بیٹھا ہے۔“

یہ آواز مشاعل کی می کی تھی اور اسے لگا جیسے ان کے لمبے لمبے دانت اس کی گردن میں دھنس گئے

وہ زمین پر گھٹنوں کے بل گرا ہوا تھا اور اس نے ہاتھ زمین پر ٹیک رکھے تھے۔
”چلیں حبیب! کمرے میں، خوا مخواہ بی بی ہائی ہو جائے گا۔“

مشاعل کی می نے حبیب الرحمن کے بازو پر ہاتھ رکھا تھا۔ انہوں نے ایک غصیلی نظر اس پر ڈالی اور آگے بڑھ گئے۔ ان کے بالکل پیچھے مشاعل کی می تھیں۔ انہوں نے اس کے نیچے ٹیکے ہوئے ہاتھ پر اپنا پاؤں رکھا اور حبیب الرحمن کے ساتھ کمرے کی طرف بڑھیں۔ اب انہوں نے جان بوجھ کر پاؤں رکھا تھا یا انجانے میں اس نے یک دم ہاتھ کھینچا تھا اور اس کے لبوں سے کھٹی کھٹی سی چیخ نکل گئی تھی۔ لیکن حبیب الرحمن نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ وہ دروازہ کھول کر اپنے بیڈ روم میں چلے گئے۔ مشاعل کی می نے پیچھے مڑ کر مشاعل کی طرف دیکھا جو ترحم بھری نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں نم تھیں۔

”اپنے کمرے میں جاؤ۔“ انہوں نے غصے سے مشاعل کی طرف دیکھا اور دروازے کو زور سے بند کرتی بیڈ روم میں چلی گئیں۔

وہ سیدھا ہوا۔ پورا جسم درد سے دکھ رہا تھا لیکن ہاتھ میں شدید تکلیف تھی۔ انگلیوں پر سے تھوڑی سی جلد چھل گئی تھی اور خون رس رہا تھا۔ وہ ہولے ہولے اٹھا اور سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر وہ بغیر لاسٹ جلائے اپنے بیڈ تک آیا۔ کمرے میں ہلکی روشنی تھی۔ جو کھڑکی کے شیشوں سے آرہی تھی۔ وہ بیڈ پر گر پڑا تھا۔

درد، تکلیف، بے وقعتی، ناقدری بہت سارے احساسات تھے جو اسے چیخ چیخ کر رونے پر مجبور کر رہے تھے، لیکن وہ ہونٹوں کو زور سے بھینچے کروٹ کے بل لیٹا تھا۔ وہ رونا نہیں چاہتا تھا۔ رونے سے زندگی آسان نہیں ہوتی مشکل ہو جاتی ہے۔ چند دن پہلے اس نے یہ جملہ کسی کتاب میں پڑھا تھا۔ اس نے اپنی آنکھیں بھی سختی سے بند کر لی تھیں۔ جن کے پیچھے سمندر اٹل

رہے تھے کیونکہ زندگی پہلے بھی آسان نہیں تھی اور وہ اسے مزید مشکل نہیں بنانا چاہتا تھا، سو وہ آنکھیں بند کیے ہونٹ بھینچے تکلیف برداشت کرنے کی اور آنسو پینے کی کوشش کر رہا تھا کہ اسے لگا کہ کوئی آکر اس کے بیڈ پر بیٹھا ہے پھر اس کے بالوں میں کسی نے انگلیاں پھیریں۔

”ہاوی میرے بچے میرے چاند!“ یہ آواز یہ لمس وہ پہچانتا تھا۔

”اما!“ اس کے لبوں سے نکلا۔ اس نے کروٹ بدل کر دیکھا۔ بیڈ پر کوئی نہیں تھا۔ اس کا تصور ہمیشہ اسے یوں ہی طلسم دکھاتا تھا یا پھر شاید لمحہ بھر کے لیے اسے غنودگی آگئی تھی۔

”اما!“ اس کے لبوں سے پھر نکلا تھا اور اس نے دیوار کی طرف کروٹ بدل لی تھی اور ر کے ہوئے آنسو بہہ نکلے تھے۔

”رونے سے اگرچہ زندگی آسان تو نہیں ہوتی لیکن دل پر دھرا بوجھ کم ضرور ہو جاتا ہے۔“ وہ یہ بات نہیں جانتا تھا لیکن اس کا ضبط جواب دے گیا تھا۔ اس کا تکیہ آنسوؤں سے بھیلتا جا رہا تھا اور اب وہ درد کی شدت سے رو رہا تھا جو برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ ہاتھوں کی انگلیوں سے لے کر کندھے تک بے تحاشا درد تھا۔ پتا نہیں کتنی دیر تک وہ روتا رہا۔ لیکن درد بڑھتا جا رہا تھا۔ تب ہی دروازہ کھلا۔ باہر سے روشنی کی ایک مدھم سی لکیر اندر آئی اور اس کے ساتھ کسی کے قدموں کی آہٹ بھی جو اس کے بیڈ کے پاس آکر ٹھہم گئی تھی۔ وہ پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر بھی جانتا تھا کہ اس کے کمرے میں کون آیا تھا۔ کون آسکتا تھا وہی جو ہمیشہ ایسے موقعوں پر آتی تھی۔ کبھی فوراً، کبھی کچھ تاخیر سے۔ اس نے ہونٹ دانتوں تلے دبا کر اپنی سسکی روکی اور اپنا چہرہ گویا دیوار سے چپکا لیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ اس کے آنسو دیکھے۔

”ہاوی!“ وہ مشاعل تھی جو اسے پکار رہی تھی لیکن وہ بے حس و حرکت لیٹا رہا اس نے بیڈ پر گھٹنا ٹیک کر جھک کر اس کا چہرہ دیکھنے کی کوشش کی اور پھر وہ پائنتی کی

وہ کھانا نہیں چاہتا تھا۔ مشاغل سے لے کر تو ہرگز نہیں، لیکن برگر کو دیکھ کر اس کے پیٹ میں اینٹھن ہونے لگی تھی۔ مشاغل برگر کے اوپر سے براؤن کاغذ ہٹا رہی تھی۔

”لو۔“ اس نے تھوڑا سا رہنما کر اس کی طرف برگر بڑھایا۔

بالکل غیر ارادی طور پر اس نے ہاتھ آگے بڑھا کر برگر پکڑ لیا۔ اسے بھوک لگی تھی۔ وہ صبح سے بھوکا تھا۔ اس نے بائیں ہاتھ سے ریپر مزید نیچے کرنا چاہا لیکن درد کی شدید لہریں انکلیوں سے ہونی پورے جسم میں سرایت کر گئی تھیں اور رنگت درد کی شدت سے یوں زرد پڑ گئی جیسے کسی نے خون نچوڑ لیا۔

”تمہارا ہاتھ!“ مشاغل نے اس کا ہاتھ ایک دم پکڑا۔ ”یہ۔۔۔ یہ پھل گیا ہے اور یہ سوج بھی گیا ہے۔ کیسے اتنا زیادہ۔“

”تمہاری می نے اپنا پاؤں رکھا تھا اس پر۔“ اس کا لہجہ سپاٹ تھا۔

یہ اتفاق نہیں تھا۔ وہ جانتا تھا انہوں نے دانستہ پاؤں رکھ کر اس پر دباؤ بھی ڈالا تھا۔

”نہیں۔۔۔ اوہ۔“ مشاغل کی آنکھوں میں جیسے اس کا درد اتر آیا تھا۔ ”یہ اتنی تیزی سے سوج رہا ہے ہادی! مجھے لگتا ہے تمہاری انگلیاں ٹوٹ گئی ہیں۔ میرا مطلب ہے انگلی کے اندر جو ہڈی ہوتی ہے وہ۔۔۔ می کتنی سوٹی ہیں۔ سالی گاؤ!“

وہ ہادی سے صرف ایک سال چھوٹی تھی۔ لیکن پوری دادی اماں تھی۔ می کبھی کبھی اسے ”میری نانی“ کہتی تھیں۔

ہادی نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ یہ مشاغل کی می ہی تھیں نا جنہوں نے اس کا ہاتھ پکڑا تھا۔ لیکن مشاغل تشویش سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”میں مینو کو بتاؤں۔“ اس نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ اسے اس گھر میں مینو کے علاوہ شاید ہادی کا کوئی اور ہمدرد نظر نہیں آیا تھا۔ لیکن ہادی خاموش رہا۔ اس نے دائیں ہاتھ میں پکڑے برگر کا ایک چکھ لیا۔

طرف آئی اور اسے دیکھنا چاہا لیکن وہ جیسے اور زیادہ دیوار سے چپک گیا اور اپنا بازو اس طرح چہرے پر رکھ لیا کہ وہ اسے دیکھ نہ سکے۔

”مجھے پتا ہے تم سو نہیں رہے ہو۔ اتنی تکلیف میں کوئی کیسے سو سکتا ہے۔ تمہیں درد ہو رہا ہے نا اور تمہیں بھوک بھی لگی ہوگی۔“

وہ بھی تو دس سال کی لیکن اس میں بلا کا اعتماد تھا اور وہ بہت ہوشیار تھی۔

”میں تمہارے لیے برگر لائی ہوں۔ انکل ہمارے لیے لائے تھے تمہارے اور میرے لیے۔“

وہ اس سے بات نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ وہ اسی کی می تھیں مجنوں نے پیلا سے اس کی شکایت کی تھی۔ وہ یونہی لیٹا رہا۔ مشاغل کچھ دیر کھڑی رہی اور پھر مڑ کر دروازے کے پاس آئی اور لائیٹ آن کر دی۔ پورا کمرہ ایک دم روشن ہو گیا۔ اس نے بے اختیار ہاتھ اٹھا کر آنکھوں پر رکھا اور ساتھ ہی اس کی سسکی نکل گئی۔ حرکت کرنے سے ہاتھ کے درد میں اضافہ ہوا تھا۔

وہ بیڈ کے قریب آئی۔

”ہادی پلیز۔ اٹھ جاؤ نا۔ برگر ٹھنڈا ہو جائے گا اور یہ چاکلیٹ بھی ہے۔ تم یہ کھاؤ۔ میں مینو سے مانگ کر تمہارے لیے درد والی گولی بھی لے آؤں گی اور گرم دودھ بھی۔“

اس نے آنکھوں سے ہاتھ اٹھایا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہ اس کے بیڈ کے قریب کھڑی تھی۔ لمبی سفید جالی کی فراک پہنے وہ اس وقت اسے کسی فرشتے کی طرح لگی۔ اس کی سانولی رنگت میں اس وقت ہلکی سرخی کی آمیزش تھی اور چہرے سے پریشانی جھلکتی تھی۔ وہ بہت تشویش سے اسے دیکھ رہی تھی جو خالی خالی نظروں سے بیڈ پر بیٹھا اسے دیکھ رہا تھا۔

”تم نے صبح بھی ناشتا نہیں کیا تھا بس چائے پی تھی۔ اور پھر اسکول سے آکر تم سو گئے تھے۔ کھانے کے لیے می نے تمہیں جگانے نہیں دیا اور پھر جاگنے کے بعد تم میچ دیکھنے چلے گئے۔ مجھے پتا ہے تمہیں بھوک لگی ہے۔“ اس نے برگر اٹھا کر اس کی طرف بڑھایا۔

”میں تمہارے لیے پانی اور گولی لاتی ہوں۔ تمہیں
بست درو ہو رہا ہے مجھے پتا ہے۔“

وہ تیزی سے مڑی اور کمرے سے نکل گئی۔ اس
نے اپنے ہاتھ کی طرف دیکھا جو پہلے سے زیادہ سوج گیا
تھا۔ مشاعل کہہ رہی تھی کہ انگلی ٹوٹ گئی ہے۔ اسے
بست رونا آیا۔ اس کے ہاتھ تو پہلے ہی کمزور تھے مگر تو
مشاعل اس سے چھوٹی تھی لیکن وہ اس کے مقابلے
میں بہت ساری چیزوں کے متعلق اس سے زیادہ جانتی
تھی اور شاید زیادہ سمجھ دار تھی۔ وہ دونوں ایک ہی
اسکول میں اور ایک ہی کلاس میں تھے۔ دونوں لفٹ
کلاس میں تھے۔ وہ گیارہ سال کا تھا اور وہ دس سال کی
تھی لیکن وہ اس کے مقابلے میں زیادہ ذہین تھی یا شاید
اس نے دیر سے داخلہ لیا تھا کہ دونوں ایک ہی کلاس
میں تھے۔

وہ مشاعل کی مدد کبھی بھی نہیں لینا چاہتا تھا لیکن
اسے اس کی مدد دینی پڑتی تھی۔ آج بھی وہ مشاعل کا
احسان نہیں اٹھانا چاہتا تھا لیکن خالی پیٹ میں بھوک
سے آنتوں میں بل بڑھ رہے تھے۔ وہ پانی اور ٹبلٹ
لینے چلی گئی تھی۔ وہ منع کرنا چاہتا تھا لیکن کر نہیں سکا
تھا اور اب بیڈ پر بیٹھا برگر کھا رہا تھا لیکن ہاتھ میں درد
انتاشدید تھا کہ اس سے کھایا نہیں جا رہا تھا۔ آدھا برگر
کھا کر اس نے پانی آدھا سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا تھا اور دعا
کرنے لگا تھا کہ مشاعل جلدی سے گولی لے کر
آجائے۔

اسے یقین تھا کہ گولی کھانے سے اس کے ہاتھ کا
درد ٹھیک ہو جائے گا یا کم ہو جائے گا۔ حالانکہ درد ہر
جگہ تھا، پسلیوں میں، کمر میں، رانوں پر، حبیب الرحمن
کے ٹھڈے لائنیں جہاں جہاں لگے تھے سب جگہ،
لیکن ہاتھ کا درد ناقابل برداشت تھا اور مشاعل ابھی
تک واپس نہیں آئی تھی۔ اب وہ گھٹنوں پر سر رکھے
بیٹھا تھا۔ وہ سونا چاہتا تھا لیکن درد انتاشدید تھا کہ سونا
بھی مشکل تھا۔ اس نے چہرہ گھٹنوں میں چھپا لیا تھا اور
ایک بار پھر رو رہا تھا ہولے ہولے۔

مشاعل کچھ دیر بعد آئی تھی۔ آہٹ پر اس نے سر
اٹھایا اور دائیں ہاتھ سے آنسو پونچھے۔ مشاعل نے
تاسف اور دکھ سے اسے دیکھا۔

”مجھے پتا ہے ہادی! تمہیں بہت درد ہو رہا ہے لیکن
وہاں نیچے کچن میں مٹی تھیں۔ مینو سے سنی کی فیڈر
دھلوا رہی تھیں اپنے سامنے۔“

اس نے ہاتھ میں پکڑا ہوا گلاس اور گولی اس کی
طرف بڑھائی۔ اس نے خاموشی سے گلاس پکڑ کر گولی
کھالی تو مشاعل نے گلاس لے کر سائیڈ ٹیبل پر رکھا۔
اور ٹیبل پر پڑا برگر اٹھا کر دراز میں رکھ دیا۔

”جب بھوک لگے تو پھر کھا لینا۔“

وہ سمجھ رہا تھا کہ اس نے برگر کیوں چھپایا ہے کہ

مشاعل تین سال پہلے اپنی مٹی کے ساتھ اس گھر
میں آئی تھی۔ کیونکہ اس کی اپنی ماما کا سال بھر پہلے
انتقال ہو چکا تھا۔ وہ سات سال کا تھا تب جب ماما کا
انتقال ہوا تھا۔ وہ آٹھ سال کا تھا جب حبیب الرحمن
نے مشاعل کی مٹی سے شادی کر لی تھی۔ مشاعل کی مٹی
کی آنکھوں میں پہلے دن ہی اس نے اپنے لیے نا
پسندیدگی محسوس کی تھی لیکن مشاعل اس سے مل کر
بہت خوش ہوئی تھی۔ وہ جب سے آئی تھی اسے اپنا
دوست بنانا چاہتی تھی لیکن وہ کبھی بھی اسے اپنا دوست
نہیں بنانا چاہتا تھا کیونکہ وہ مشاعل تھی۔ ان کی بیٹی جن
کے آنے کے بعد اس کے پیپا اسے نظر انداز کرنے لگے
تھے جو بڑے دھڑلے سے اس کی ماما کے بیڈ روم میں
رہتی تھیں اور ان کی چیزیں استعمال کرتی تھیں اور جو
اس سے نفرت کرتی تھیں لیکن پھر بھی وہ اس کی
ہمدردی اور اس کے تعاون کو قبول کر لیتا تھا کیونکہ اس
کے پاس دوسرا راستہ تھا ہی نہیں۔

ایک بار جب مٹی نے اسے داش روم میں بند کر دیا
تھا تو یہ مشاعل ہی تھی جس نے رات کو جب وہ خوف
اور ڈر سے مرنے والا تھا باہر نکالا تھا۔ اس روز پیپا اپنے
کام کے سلسلے میں کراچی گئے ہوئے تھے اور جب کبھی

کہیں می نہ آجائیں۔ اتنی شدید تکلیف میں بھی وہ مشاغل کی اس حرکت پر مسکرایا۔ اس کی می ٹھیک کہتی تھیں کہ وہ پوری داوی امل ہے۔ مشاغل اب فراک کی جیب سے ایک ٹیوب نکل رہی تھی۔

”ہاتھ مجھے دہادی! مالش کروں۔ می کے گھٹنوں میں جب دروہوتا ہے تو وہ یہ لگاتی ہیں۔“

اس نے خود ہی اس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا لیکن اس کی چیخ نکل گئی اور اس نے ہاتھ پیچھے کھینچ لیا۔

”نہیں بس اب تم جاؤ۔ میں سو جاؤں گا۔“

”اچھا لیکن تم دروازہ اندر سے لاک نہ کرنا۔ مینو جب مجھے دودھ دینے آئے گی تو میں وہ تمہیں دے جاؤں گی۔“

می نے یہ کہہ کر کہ اسے دودھ پسند نہیں ہے مینو کو منع کر دیا تھا کہ رات کو اس کے لیے دودھ نہ لے جایا کرے۔

”نہیں اس کی ضرورت نہیں۔“

اس نے آہستگی سے کہا اور لیٹ گیا اور وہ کمرے سے باہر نکل گئی۔ وہ کچھ دیر یونہی سیدھا لیٹا رہا پھر اس کی آنکھوں کے کونوں سے پھر آنسو بہنے لگے۔ آخر وہ گیارہ سال کا بچہ ہی تو تھا۔



پارٹی عروج پر تھی۔ ایلین کی نظریں بار بار داخلی دروازے کی طرف اٹھ رہی تھیں۔

”کیا کوئی خاص مہمان آ رہا ہے؟“ ڈیوڈ نے اس کے جام کے ساتھ جام لکرایا۔

”میرے لیے خاص ہی ہے۔“ ایلین مسکرایا۔

تب ہی پال اور مار تھا کے ساتھ وہ اندر داخل ہوئی۔ اس نے سرخ لانگ اسکرٹ پر سیاہ بلاؤز پہنا ہوا تھا۔ بلاؤز پر سرخ ستاروں اور سرخ ٹیگمنوں سے دو چھوٹے چھوٹے پھول بنے ہوئے تھے۔ گلے میں ایک نازک سی چین تھی اور نیچل لک دیتے میک اپ کے ساتھ وہ وہاں موجود سب لڑکیوں سے مختلف لگ رہی تھی۔ اس کی سائلی رنگت میں بلا کی ملاحت تھی اور اس کی

سیاہ آنکھوں کا سحر مسحور کرتا تھا۔ اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی تھی اور آنکھوں میں انجانا سا ملال ہلکورے لیتا تھا۔ ڈیوڈ نے ستائشی نظروں سے اسے دیکھا اور ایلین کو کہنی ماری۔

”یہ ہے تمہاری بیوی کوئن ایلین!“

ایلین نے مسکرا کر اسے دیکھا اور ان کے استقبال کے لیے آگے بڑھا۔

”ہیلو مسٹر اینڈ مسز پال۔ آپ بہت دیر سے آئے۔“

”سوری۔ ہم کچھ لیٹ ہو گئے۔“ مار تھا مسکرائی تو اس نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

”ہیلو جوزی! بہت خوب صورت لگ رہی ہو۔ اتنی کہ دل بے قابو ہو رہا ہے۔“

اس نے جھجکتے ہوئے اس کا ہاتھ تھام کر فوراً چھوڑ دیا اور اس کے اگلے جملے پر اس کے رخساروں پر سرخی دوڑ گئی اور آنکھوں سے ناگواری جھلکنے لگی تھی۔ ڈیوڈ نے حیرت سے اس کی ناگواری اور جھجک کو دیکھا۔

”یہ لڑکی!“

”یہ جوزفین ہے مسز پال اور مار تھا کی بیٹی۔“ ایلین نے تعارف کروایا۔

”تم سے مل کر خوشی ہوئی پیاری لڑکی۔“

ڈیوڈ کی نظریں جیسے اس کے وجود کے اندر اتر رہی تھیں۔ اس نے جوزفین سے ہاتھ ملایا تو پھر دیر تک نہ چھوڑا۔ اس سردی میں بھی اس کے ہاتھوں میں پسینہ آ رہا تھا۔ اس نے ہاتھ کھینچا تو ڈیوڈ نے ہلکا سا دیا کر چھوڑ دیا۔ پال اور مار تھا پال میں آگے بڑھ گئے تھے جہاں پال کے کچھ فرینڈز بیٹھے ہوئے تھے۔ ایلین نے اس کا ہاتھ پکڑا۔

”آؤ جوزی! اپنے دوستوں سے ملو اؤں۔“

وہ بنا کچھ کہے اس کے ساتھ چل دی اور کہنے کو اس کے پاس تھا ہی کیا۔ کیا کہتی وہ کہ وہ اس کے دوستوں سے نہیں ملنا چاہتی۔ اور اگر وہ مار تھا کو بتا دیتا کہ اس نے ایسا کیا ہے تو پھر خواہ مخواہ شامت آجاتی اس کی۔

وہ تو ٹرائی کچن میں رکھ کر اور چیزیں سمیٹ کر اپنے کمرے میں آکر کتاب پڑھنے لگی تھی۔ مطمئن تھی کہ اس لڑائی کے بعد پارٹی میں جانا کینسل ہو جائے گا لیکن کچھ ہی دیر بعد مار تھانے آکر اس کا اطمینان غارت کر دیا تھا۔

”پال کہہ رہا ہے۔ میں منٹ میں تیار ہو کر آجاؤ۔“

پتا نہیں مار تھا کیوں چاہتی تھی کہ وہ ایلن کے ساتھ دوستی کرے۔ جانے کیا مفاد تھا اس کا اور پال بھی تو یہی چاہتا تھا لیکن وہ ایسا نہیں چاہتی تھی اور وہ کیا چاہتی تھی۔ اسے خود علم نہیں تھا۔ دو سال پہلے وہ یہاں آئے تھے۔ پال کے بڑے بھائی بہت سال پہلے یہاں آئے تھے اور یہاں ہی سیٹل ہو گئے تھے۔ اور انہوں نے بہت کوششوں سے انہیں بلوایا تھا۔

یہاں آنے سے پہلے وہ کراچی میں تھے۔ کراچی میں وہ بہت خوش نہیں تو ناخوش بھی نہیں تھی۔ پال اس کا بہت خیال رکھتا تھا بلکہ اس سے بہت محبت کرتا تھا اور مار تھا کا رویہ نہ اچھا تھا نہ برا۔ وہ اس کے معاملات میں زیادہ دخل نہ دیتی تھی لیکن یہاں آکر وہ بہت بدل گئی تھی۔ وہاں کراچی میں اس کی پال سے کبھی لڑائی نہیں ہوئی تھی لیکن یہاں وہ اکثر لڑتے رہتے تھے۔ پال کے بھائی نے صرف چند ہفتے انہیں پاس رکھا تھا اور پھر صاف صاف کہہ دیا تھا کہ وہ کہیں اور بندوبست کر لیں کیونکہ اس کی برٹش بیوی کو پسند نہیں تھا سو مار تھا کو بھی جاب کرنا پڑی تھی۔ پال بھی جاب کر رہا تھا۔ صرف وہ تھی جو ابھی تک گھر پر ہی رہتی تھی۔

یہاں آکر اس کا تعلیمی سلسلہ بھی ختم ہو گیا تھا جس کا اسے بہت دکھ تھا لیکن وہ اس کی پردھانی کا خرچ برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ یہاں غیر ملکیتوں کے لیے پردھانی بہت مہنگی تھی۔ ہاں برٹش نیشنلز کے لیے بہت سہولتیں تھیں۔ ہائر ایجوکیشن میں اور پروفیشنلز کالج میں بھی ان کے لیے بہت رعایتیں تھیں۔ اس کی تعلیم صرف اولیول تک تھی۔ وہ اپنا اے لیول مکمل نہیں کر سکی تھی جب انہیں یہاں آنا پڑا تھا۔ پال بھی

چاہتا تھا اور وہ بھی کہ وہ اپنا اے لیول مکمل کر لے، صرف چند ماہ کی بات تھی لیکن یہ مار تھا کی ضد تھی کہ اب اگر مار شل نے انہیں اسپانسر کیا ہے اور انہیں ایک موقع مل رہا ہے باہر جانے کا تو ضائع نہیں کرنا چاہیے۔

تو پچھلے سات سالوں سے وہ مار شل کی منتیں کر رہی تھی کہ وہ انہیں کسی نہ کسی طرح وہاں بلوالے اور اب یوں اس کی تعلیم کا صرف ایک ہی فائدہ تھا کہ اس کی انگلش بہت اچھی تھی جبکہ مار تھا جو گریجویٹ تھی اور اس نے بی ایڈ بھی کر رکھا تھا، روانی سے بات نہیں کر سکتی تھی۔

شروع میں تو اسے خاصی مشکل درپیش ہوئی تھی۔ مار شل کی انگریز بیوی اور اس کے بچے اس کی انگریزی سن کر بہت ہنستے تھے لیکن اب دو سالوں میں وہ روانی سے بولنے لگی تھی۔ دو سال سے وہ ایک اسٹور میں جاب کر رہی تھی اور پال کسی فیکٹری میں کام کرتا تھا اور یہ نوکریاں انہیں مار شل کی وجہ سے فوراً ہی مل گئی تھی۔

مار تھا تو چاہتی تھی کہ جوزفین بھی جاب کر لے لیکن یہ پال تھا جس کی مشرقی روح اور جوزفین سے محبت اسے روکتی تھی اور ابھی تک وہ جوزفین کو جاب کے لیے نہیں کہہ سکا تھا بلکہ اس کی خواہش تھی کہ کسی طرح وہ جوزفین کی ٹوٹی ہوئی تعلیم کا سلسلہ پھر سے جوڑ سکے۔

وہ جوزفین کو ڈاکٹر بنانا چاہتا تھا اور اگر وہ پاکستان میں رہتا تو ایسا کر سکتا تھا۔ وہ بہت لائق تھی۔ اس نے اولیول میں نائن اشارز لیے تھے اور اسے یقین تھا کہ اے لیول میں بھی اس کا رزلٹ شان دار ہوگا۔ لیکن یہ یہاں آکر ممکن نہیں ہو سکا تھا۔ یہاں اخراجات بہت زیادہ تھے۔ وہ جتنا کماتے تھے سب مکان کے کرائے، بلوں اور ٹیکسوں وغیرہ پر خرچ ہو جاتا تھا۔ وہ دو سال میں کچھ بھی بچت نہیں کر سکا تھا۔

ایلن اسے سب سے ملواتا پھر رہا تھا۔

”ہے ایلن! تمہاری گرل فرینڈ تو بڑی زبردست ہے،“

”کیا فکر ہے۔“ وہ شاید ایلن کا کوئی دوست تھا۔ اس نے بمشکل اپنی ناگواری چھپائی۔

”اوہ یاہ!“ ایلن نے محبت پاش نظروں سے اسے دیکھا اور اپنا ایک بازو اس کی کمر کے گرد حائل کیا اور یوں ہی لیے ہوئے ایک ٹیبل پر بیٹھ گیا۔

”تم بیٹھو میں تمہارے لیے ڈرنک لانا ہوں۔“

وہ بے حد گھبرائی ہوئی تھی۔ اس نے پال کو دیکھنے کے لیے چاروں طرف نظروں ڈالی اس سارے ہجوم میں صرف وہی تھا جو اس کی کیفیات سمجھ سکتا تھا کہ وہ بہر حال اس کا باپ تھا اور اس نے بھی اپنی دو سال پہلے تک کی زندگی ایک بالکل مختلف ماحول میں گزاری تھی۔ اور اس نے مار تھا سے بے لفظوں میں کہا بھی تھا کہ اگر جوزی نہیں جانا چاہتی تو نہ جائے۔ لیکن ابھی کچھ دیر پہلے ہونے والی لڑائی کی وجہ سے وہ زیادہ تکرار نہیں کر سکتا تھا۔

ہال میں مختلف میزوں پر لوگ بیٹھے باتوں میں مشغول تھے۔ ایک کونے میں شیشے کی ٹیبل پر چھوٹا سا کرسٹل کا کرسمس ٹری رکھا ہوا تھا۔ جس میں لگے ننھے ننھے رنگین بلبوں سے روشنی نکال رہی تھی۔ وہ بہت خوب صورت تھا۔ اتنا خوب صورت اور اتنا قیمتی کرسمس ٹری اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا شاید اس میں لٹکے یا قوت اصلی تھے۔ وہ حیران سی اسے دیکھ رہی تھی۔ اسے پال کہیں نظر نہیں آیا اور اب اس کی نظریں ٹری پر تھیں۔

کرسمس ٹری والی ٹیبل کے ساتھ ہی کوئی خاموش بیٹھا تھا۔ وہ اکیلا تھا اور وہ ڈرنک بھی نہیں کر رہا تھا۔ جب اس نے اچانک سر اٹھایا تو وہ چونک گئی۔ وہ تو وہی تھا۔ سیاہ گھور سیاہ آنکھوں والا ان کا پڑوسی۔ لیکن اس کے ساتھ وہ لڑکی نہیں تھی۔ کیا نام تھا اس کا۔ اس نے ذہن پر زور دیا۔

”خوش حمال۔“

تب ہی ایلن دو گلاس ہاتھ میں لیے آگیا۔

”یہ۔“ اس نے گلاس کی طرف اشارہ کیا اور نفی

میں سر ہلایا۔

”میں ڈرنک نہیں کرتی۔“

”تمہاری عمر کتنی ہے سوئی۔“ اس نے پوچھا۔

”اٹھارہ سال سات ماہ۔“

”تو تم قانوناً لی سکتی ہو۔“

”نہیں مجھے نہیں پینا۔“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔

”آج کرسمس ہے ڈیر! اس کی خوشی میں۔“

اس نے پھر انکار میں سر ہلادیا۔

”او کے ایز یوش۔“

اس نے ہلکا سا سر خم کیا اور اس کے لیے کولڈ ڈرنک منگوائی اور اس کے گلاس سے ٹکرا کر مسکرایا۔

”اس خوب صورت شام کے نام جب تم میری آنکھوں کے سامنے ہو۔“

وہ شعوری کوشش سے مسکرائی۔ اسے اب یہاں ہی زندگی گزارنی تھی بہت جلد انہیں برٹش پاسپورٹ مل جائے گا۔ پال کا یہی خیال تھا اور پھر شاید۔

وہ زندگی جو وہ چھپے چھوڑ آئی تھی وہ اس زندگی سے بالکل مختلف تھی اور یہ زندگی اور اس کے تقاضے اس

زندگی سے مختلف تھے۔ یہ سب اس کے ہم مذہب تھے، لیکن وہ ان کے ساتھ کھل مل نہیں پارہی تھی۔

وہاں اس کا رہن سہن، رسم و رواج، اقدار سب مختلف تھیں۔ وہاں کے رسم و رواج اور رہن سہن کے

مطابق سب وہی پاکستانیوں کی طرح شادی میں مہندی ماپوں سارے فنکشن ہوتے تھے۔ اسے اپنی پھوپھی

مارگریٹ کی شادی یاد تھی۔ بقول مار تھا کے ”وہ ویسی عیسائی تھے اور سوائے چھٹی والے روز چرچ سروس

کے لیے جانے کرسمس اور ایسٹر منانے عیسوع مسیح اور کنواری مریم کے پیروکار ہونے کے علاوہ ان میں

عیسائیوں والے اور کیا رواج تھے بھلا۔ لیکن اب انہیں پورا عیسائی بننا تھا۔ وہاں وہ اقلیت تھے اور یہاں

اکثریت۔ انہیں اب اکثریت کے ساتھ رہنا تھا لیکن سولہ سالوں تک وہ شیلوار قمیص دوپٹے میں خود کو جتنا

آرام وہ محسوس کرتی تھی، جینز شرٹ اور اسکرٹ وغیرہ میں نہیں۔ اسے لگتا تھا جیسے سب اسے ہی دیکھ رہے

ہوں۔ کبھی وہ سینے پر ہاتھ باندھ لیتی، کبھی گلے میں مفلر

لٹکا لیتی اور کبھی اپنے بال دو حصوں میں تقسیم کر کے آگے ڈال لیتی۔
مارتھا ہستی تھی اس پر۔

”اب تو آدھے پاکستان کی آدمی عورتیں یونہی ننگے سرٹی شرٹس اور جینز پہنے سڑکوں پر دندناتی پھرتی ہیں۔ ٹی وی پر کبھی کسی کو دوپٹا لیے نہیں دیکھا اور یہ 1950ء کی پیداوار۔“

ایلن اسے دیکھ رہا تھا۔ دونوں کہنیاں میز پر نکائے جیسے اس کی خوب صورت آنکھوں میں ڈوب جانا چاہتا تھا۔

”آج رات رک جاؤ جوزی!“
”نہیں میں نہیں رک سکتی سوری!“
وہ گھبرا کر ایک بار پھر پال کو دیکھنے کے لیے ادھر ادھر نظر دوڑانے لگی۔ تب ہی میوزک بجنے لگا۔ جوڑے اٹھ کر تھرکنے لگے۔ آج کرسمس کی رات تھی اور سب ہی خوش تھے۔

اس نے دیکھا مارتھا ایک ادھیڑ عمر مرد کا ہاتھ تھامے فلور کی طرف جارہی تھی۔ وہ یقیناً ”نشے میں تھی۔ پچھلے کرسمس پر مارشل کے ہاں وہ سب کس قدر شرمندہ ہوئے تھے۔ مارشل انجینئر تھا۔ اس کے تعلقات جن لوگوں سے تھے اس کا شرمندہ ہونا بجا تھا۔ اس کی برٹش بیوی جو ڈاکٹر تھی اس نے بعد میں جو کچھ مارشل سے کہا تھا۔ وہ ناقابل بیان تھا شاید اسی لیے اس بار مارشل نے انہیں نہیں بلایا تھا۔ اس نے مارتھا پر سے نظریں ہٹالیں۔

”او۔“ ایلن نے اس کی طرف ہاتھ برہمایا۔
”مجھے ڈانس کرنا نہیں آتا۔“ اس نے شرمندگی سے کہا۔

”کم آن سوئی!“ ایلن نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھالیا تھا۔

”ایلی پلیز۔“ اس نے التجا کی۔
”یہ ادھر میرے کندھے پر ہاتھ رکھو۔“ اس نے اپنا بازو اس کی کمر کے گرد حائل کیا۔ وہ جھجک کر اور ڈر ڈر کر پاؤں اٹھا رہی تھی۔ اس کے قدم میوزک کے

ساتھ ہم آہنگ نہیں تھے۔ اس کی نظروں نے مارتھا کو ڈھونڈا تھا۔ وہ تاج رہی تھی بلکہ بے ڈھنگے انداز میں ادھر سے ادھر لچک رہی تھی۔ اس کے ہاتھ سے کب کا اس بوڑھے شخص کا ہاتھ چھوٹ گیا تھا اور اسے دیکھ کر جوزفین کو پنجالی فلموں کا تصور آ رہا تھا۔ لوگ ہنس رہے تھے بلکہ کھمبے لگانے لگے تھے۔

اس نے شرمندہ ہو کر مارتھا پر سے نظریں ہٹالی تھیں اور چاہتی تھی کہ دوبارہ مارتھا کی طرف نہ دیکھے۔ ایلن کے ہونٹ اس کے گردن کو چھو رہے تھے۔

انجانے میں یا جان بوجھ کر وہ نہیں جانتی تھی۔ اس کی قربت سے سرشار ہو کر اس نے اور بھی اسے قریب کیا تھا لیکن جوزفین نے اس کا پاؤں کچل دیا تھا۔ اس کے قدم صحیح نہیں اٹھ رہے تھے۔ وہ پہلی باریوں کسی کے ساتھ۔۔۔ جب تیسری بار بھی ایسا ہی ہوا تو اس نے ایک دم ایلن کا ہاتھ اپنی کمر سے ہٹایا اور تقریباً ”بھاگتی ہوئی فلور سے اتر کر رکے بغیر ہال سے باہر نکل گئی۔ ایلن نے اسے باہر جاتے دیکھا۔ حیرت سے کندھے اچکائے اور جیننی کی طرف برہا جو کچھ دیر پہلے فلور پر کرشل کے ساتھ تھی اور اب ڈیوڈ کی ٹیبل پر بیٹھی ہوئی تھی۔

”جیننی! کیا تم میرے ساتھ رقص کرنا پسند کرو گی؟“

”وائے ناٹ!“ وہ کھڑی ہو گئی تھی۔ ڈیوڈ نے اپنا گلاس خالی کر کے ٹیبل پر رکھا اور ہال سے باہر نکل آیا۔ کسی نے جوزفین کو ایلن کا ہاتھ ہٹاتے اور باہر جاتے نہیں دیکھا۔ سب مستی میں تھے لیکن ڈیوڈ نے اسے باہر جاتے دیکھا تھا۔

اسے یہ شرماتی جھجکتی لڑکی اچھی لگی تھی۔ اگر وہ ایلی کو پسند نہیں کرتی تو ضروری نہیں مجھے بھی پسند نہ کرے۔ ایلن تو یوں بھی۔

وہ مسکرایا اور کچھ سوچتا ہوا اس کی طرف برہا۔ وہ میڈھیوں پر بیٹھی تھی اس نے گھٹنوں پر سر رکھا ہوا تھا اور غالباً ”رورہی تھی۔ وہ سب اس پر بھی ہنس رہے ہوں گے ایلی سمیت جس طرح وہ مارتھا پر ہنس رہے

تھے اور انہیں ہنسنا چاہیے۔ کاش ہم یہاں نہ آتے، وہاں ہی رہتے وہاں زندگی اچھی تھی۔ میں اب کسی میڈیکل کالج میں ہوتی اور چند سالوں بعد ایک معزز ڈاکٹر۔

ڈیوڈ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو اس نے چونک کر سر اٹھایا۔ ”تم یہاں کیوں آگئی ہو؟“ وہ اس کے پاس ہی سیڑھی پر بیٹھ گیا۔

ایلن کا گھر کا بہت خوب صورت تھا۔ یہاں چار سیڑھیاں تھیں۔ سیڑھیوں کے اطراف دو چھوٹے چھوٹے سبز گھاس والے قطعے تھے بچن پر خوب صورت پھولوں والے گملے رکھے تھے اور کناروں پر درخت تھے۔

”ویسے ہی۔“ اس نے جلدی سے ہاتھوں کی مٹھیوں سے آنسو پونچھے۔

”کیا ایلن سے ناراض ہو گئی ہو؟“

”نہیں تو۔“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔

”پھر کیوں رو رہی ہو؟“

”بس ایسے ہی دل گھبرا رہا تھا۔“

”کیا کوئی یاد آرہا تھا؟“ ڈیوڈ نے پوچھا۔

”ہاں دادا۔ اپنے گرینڈ پاپا آ رہے تھے۔“

”اوہ!“ ڈیوڈ ہاتھ پر ہاتھ مار کر ہنسا۔ ”میں سمجھا کوئی بوائے فرینڈ۔“

”میرا کوئی بوائے فرینڈ نہیں ہے۔“ اس کے لہجے سے خفگی کا اظہار ہوتا تھا۔

”اوہ۔“ ڈیوڈ نے ہونٹ سکپڑے۔ ”ویسے تمہارا

وطن کون سا ہے۔ میرا مطلب ہے تم کہاں سے آئی ہو؟“

”پاکستان سے۔“

”بٹ یو آر کرسچن۔ ایم آئی رائٹ۔“

”یس آف کورس!“ اس کے لہجے میں ایک فخر

جھلک آیا۔ ”میں ایک جی عیسائی ہوں۔ میرے دادا

وہاں پادری ہیں۔ ہمارا گھرانہ بہت مذہبی ہے اور میں

سنڈے مارننگ سروس کے لیے ہمیشہ جاتی تھی۔“

ڈیوڈ دل ہی دل میں مسکرایا۔ اسے یاد نہیں تھا کہ

بچپن سے لے کر اب تک وہ کتنی بار حرج کیا تھا۔

”اوہ۔۔۔ اچھا سمجھا۔ ایلن نے کوئی گستاخی کی ہو

گی۔“ اس کے رخساروں پر سرخی دوڑ گئی۔

”ویسے تم ہو ہی اتنی کیوٹ۔ تمہارا قد تمہارے

بال تمہارا فکرمندی تمہاری آنکھیں۔ اف! سب بہت

اٹریکٹو ہیں۔ کیا تمہیں کبھی کسی نے نہیں بتایا۔“

”میری گرینڈ مام نے۔ کہتی تھیں کہ میں بہت

کیوٹ ہوں۔“

ڈیوڈ کا دل قہقہہ لگانے کو چاہا۔ لیکن وہ تھوڑا سا اس

کی طرف جھکا۔

”وہ صحیح کہتی تھیں، تمہیں دیکھ کر خود کو روکنا بہت

مشکل ہے۔“ وہ اور جھکا۔ وہ گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔

”میں اندر چلتی ہوں“ مئی ڈیڈی پریشان ہو رہے

ہوں گے۔“

ڈیوڈ وہاں ہی سیڑھی پر بیٹھا اسے عجیب نظروں سے

دیکھ رہا تھا جب کہ وہ نروس سی کھڑی ہاتھ رکڑ رہی

تھی۔

تب ہی دروازہ کھلا اور آنے والے کو دیکھ کر وہ حیران

رہ گئی۔ آنے والے نے ڈیوڈ کو مخاطب کرتے ہوئے

ایک اچھتی سی نظر اس پر ڈالی تھی۔

”ڈیوڈ! مجھے اجازت ہے۔ میں کچھ حکمن محسوس

کر رہا ہوں۔“

”اوس! میں تمہارے آنے کا شکریہ۔“

وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا اور بڑی گرم جوشی سے اس کا ہاتھ

پکڑ کر ہلا رہا تھا۔ پھر وہ جوزفین کی طرف مڑا جواب بھی

نروس سی کھڑی تھی۔

”جوزی! یہ میرا دوست ہے۔ غلام مصطفیٰ، ایک

بہترین فٹ بالر۔ ایلن کا کلب کی طرف سے کھیلتا ہے۔

لیکن بہت جلد ماچیسٹریو ٹائیٹنڈ کی سرخ جرسی پہننے والا

ہے۔“

اس کی سیاہ آنکھوں میں یک دم جگنو سے چمکے

تھے۔

”اور تم بھی مجھے بہت جلد سرخ جرسی پہنتے نظر آ

رہے ہو۔“ اس نے مسکرا کر ڈیوڈ کو دیکھا تھا۔

دروازہ کھول کر اندر چلی گئی۔ ڈیوڈ نے اس کے کندھے پر ہاتھ مارا۔
 ”اے تم جانتے ہو پہلے سے۔“
 ”صرف اتنا کہ یہ میرے گھر کے سامنے رہتی ہے۔“

”اوہ۔۔۔ ہو!“ ڈیوڈ نے ہونٹ سکيڑے۔ ”مشرقی حسن!“ وہ برسرِ پایا۔

اس نے ہال میں داخل ہو کر چاروں طرف دیکھا تھا۔ اور پھر اسے پال ایک کونے میں تنہا بیٹھا نظر آگیا۔
 ”پاپا!“ اس نے شکر کیا تھا کہ مار تھا اس کے ساتھ نہیں تھی۔

”پاپا! میں گھر جا رہی ہوں۔ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“

پال جو ٹکے ٹکے سرور میں تھا اس نے سر ہلادیا اور اس نے شکر کیا کہ پاپا نے زیادہ سوال نہیں کیے۔ اگر وہ نارمل حالت میں ہوتا تو ضرور سوال کر ماکہ کیسے کیوں کس کے ساتھ وغیرہ وغیرہ۔

وہ فوراً ”ہی باہر نکل آئی تھی۔ جہاں ڈیوڈ اور وہ لڑکا مصطفیٰ انگلش ریسمینولیک بولٹن کے متعلق باتیں کر رہے تھے جو مائچسٹریوٹائیٹڈ کے ساتھ جلد ہی مقابلے کے لیے میدان میں اترنے والی تھی۔ مصطفیٰ نے اسے آتے دیکھا تو ڈیوڈ سے ہاتھ ملایا۔

”او کے ڈیوڈ پائے۔“

وہ پارکنگ کی طرف بڑھا تو وہ اس کے ساتھ ساتھ تھی اور حیرت کی بات تھی، ہر ایک سے ڈرنے والی جو زفین اس کے ساتھ اکیلے گھر جاتے ہوئے بالکل خوفزدہ نہ تھی۔

”اور ڈیوڈ کا دل تم پر آگیا ہے۔ بیوی کو مین اور جس پر اس کا دل آجائے وہ اسے اپنا بنائے بغیر نہیں چھوڑتا، ڈیوڈ کیمرن مستقبل کا عظیم کھلاڑی۔“

اس نے جاتی ہوئی جو زفین کو دیکھا اور دروازہ کھول کر واپس اندر چلا گیا۔



وہ کچھ دیر ہادی کے کمرے کے باہر دروازے کے

”آپ نے کبھی ڈیوڈ کو کھیتے دیکھا۔“
 وہ پوچھ رہا تھا۔ اور وہ ڈیوڈ کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتی تھی۔ ابھی آج ہی تو پہلی بار وہ ڈیوڈ سے ملی تھی۔ اس نے نفی میں سر ہلایا۔
 ”آپ کو فٹ بال سے دلچسپی نہیں؟“

اسے فٹ بال کے علاوہ اور کسی کھیل سے دلچسپی تھی ہی نہیں۔ وہ بہت شوق سے فٹ بال کے میچز دیکھا کرتی تھی۔ اس نے سرائٹھا کر اس کی طرف دیکھا، وہ اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی سیاہ بھنورا سی آنکھیں۔ اوہ تو شاید تب ہی اس کی آنکھیں اسے جالی پہچانی لگ رہی تھیں۔ اس نے اہلعا فٹ بال کلب کے پچھلے دنوں ہونے والے سارے میچز دیکھے تھے۔

اور اہلعا کے اس سیاہ آنکھوں والے کھلاڑی کو بہت کورینج دی گئی تھی۔ وہ جو پچھلے کئی دنوں سے الجھ رہی تھی اور یہ سیاہ آنکھیں اسے ڈسٹرب کر رہی تھیں کہ بھلا پہلے کب اور کہاں اس نے یہ آنکھیں دیکھی تھیں۔ آج یہ الجھن خود بخود سلجھ گئی تھی۔ بہت مطمئن سا ہو کر اس نے اپنی طرف دیکھتے مصطفیٰ سے کہا۔

”بہت۔۔۔ مجھے فٹ بال کا کھیل بہت پسند ہے اور میں بی بی پر دکھایا جانے والا ہر میچ دیکھتی ہوں۔“
 ”گڈ!“ ڈیوڈ مسکرایا۔ ”تو پھر مجھے ضرور جانتی ہوں گی ڈیوڈ کیمرن۔“

اب کے اس نے چونک کر سر ہلایا تھا۔
 ڈیوڈ کیمرن جس پر سارے یورپ کی نظریں لگی تھی۔

”مجھے ایک بار پھر تم سے مل کر خوشی ہوئی۔“
 ڈیوڈ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر پُر جوش مصافحہ کیا۔ وہ جھینپ کر مصطفیٰ کو دیکھنے لگی اور اس کے لبوں سے بے اختیار نکلا۔

”تم گھر جا رہے ہو تو کیا لفٹ دے سکتے ہو مجھے؟“
 وہ حیران ہوا لیکن اس نے اثبات میں سر ہلادیا۔
 ”میں پاپا کو بتا کر آتی ہوں، دراصل مجھے بھی سسٹم کن ہو رہی ہے۔ پارٹی تو دیر تک چلے گی۔“ وہ تیزی سے

ساتھ لگی کھڑی رہی۔ اندر سے ہادی کی سسکیوں کی آواز آرہی تھی۔ دوبار اس نے باب پر ہاتھ رکھا۔ وہ اندر جا کر اسے تسلی دینا چاہتی تھی۔ اس کے آنسو پونچھنا چاہتی تھی، لیکن اس کے تسلی بھرے الفاظ یا اس کے آنسو پونچھ لینے سے ہادی کا درد کم نہیں ہو سکتا تھا۔

اگر اس کی انگلیاں ٹوٹ گئی ہیں تو اسے کچھ اور کرنا چاہیے۔ کچھ ایسا جس سے اس کا درد کم ہو جائے، لیکن وہ ایسا کیا کرے۔ اس نے کچھ دیر سوچا اور پھر سیڑھیوں کی طرف بڑھی اور بنا آہٹ کیے سیڑھیاں اترنے لگی۔

اس کا بیڈ روم نیچے تھا۔ مئی کے بیڈ روم کے ساتھ پہلے وہ بیڈ روم ہادی کا تھا لیکن جب وہ مئی کے ساتھ اس گھر میں آئی تھی تو مئی نے حبیب الرحمن سے یہ کہہ کر وہ لڑکی ہے اور چھوٹی بھی ہے اسے تنہا اور خوف آئے گا۔ (نیچے وہی بیڈ روم تھے) اور ہادی لڑکا ہے ہادی کا بیڈ روم اسے دے دیا تھا اور ہادی اوپر شفٹ ہو گیا تھا۔ اس نے سیڑھیوں سے اترتے ہوئے دیکھ لیا تھا کہ حبیب الرحمن لاؤنج میں بیٹھے تھے۔ وہ اکثر مئی اور سنی کی نیند خراب ہونے کے ڈر سے اپنا کوئی پسندیدہ ٹاک شو دیکھنے کے لیے لاؤنج میں آ جاتے تھے۔ پہلے وہ ایک دم خوف زدہ ہو گئی تھی کہ کہیں وہ اسے اوپر سے آتے دیکھ کر خفا نہ ہوں۔ مئی ہوتیں تو ضرور ڈانٹتیں لیکن وہ اس پر ایک سرسری سی نظر ڈال کر دوبارہ لیوی کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔

وہ اپنے روم میں جانے کے بجائے چپ چاپ ان کے صوفے کے دائیں طرف کھڑی ہو گئی تھی۔ انہوں نے ذرا سا رخ موڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ ان کی طرف دیکھ رہی تھی۔

”کچھ چاہیے گڑیا! تمہاری مئی تو سو گئی ہیں۔“ اس وقت ان کا لہجہ کچھ دیر پہلے کے حبیب الرحمن سے بالکل مختلف تھا۔ نرم اور شفقت۔

”وہ۔۔۔ وہ انکل۔۔۔ ہادی!“ وہ مئی کے اصرار کے باوجود انہیں ڈیڈی کہنے کے بجائے انکل ہی کہتی تھی۔

جیسے ہادی ہمیشہ اس کی مئی کو مشاغل کی مئی کہتا تھا۔ ان کے چہرے کے نرم تاثرات میں یکدم سختی اتر آئی تھی۔ ہادی انہیں بہت مایوس کر رہا تھا۔ آئے دن اس کی شکایات سن سن کر وہ تھک چکے تھے۔

”وہ۔۔۔“ اس نے ان کے چہرے سے نظریں ہٹالیں اور کچھ خوفزدہ سی ہو گئی۔ تیزی سے بولی۔ ”اس کی انگلیاں ٹوٹ گئی ہیں۔“

”کیا؟“

”ہاں!“ وہ نکاہیں نیچے کیے بولتی چلی گئی۔ ”اس کا ہاتھ بہت سوج گیا ہے۔ اسے بہت تکلیف ہے اور وہ بہت درد رہا ہے۔ اسے ڈاکٹر کی ضرورت ہے۔ آپ پلینر اسے ڈاکٹر کے پاس لے جائیں۔“

اس کی کچھ سمجھ میں نہ آیا تو اس نے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔ انہوں نے اس کے جڑے ہوئے ہاتھوں کو حیرت سے دیکھا اور جیسے خود سے کہا۔

”لیکن اس کی انگلیاں کیسے۔۔۔“

”وہ مئی۔۔۔ مئی نے اس کے ہاتھ پر پاؤں رکھ دیا تھا۔ شاید غلطی ہے۔ میں نے دیکھا تھا تب۔“

وہ ایک دم لیوی بند کر کے کھڑے ہو گئے تھے۔ وہ ان کا بیٹا تھا۔ بہت پیارا تھا وہ انہیں۔ اس کے حوالے سے کبھی انہوں نے کلثوم کے ساتھ مل کر بہت سے خواب دیکھے تھے۔ وہ اسے بہت اونچے مقام پر دیکھنا چاہتے تھے، لیکن وہ انہیں مسلسل مایوس کر رہا تھا جیسا کہ زری انہیں بتاتی رہتی تھی اور اب انہوں نے خود دیکھا تھا اتنی سی عمر میں وہ اتنا لیٹ گھر آ رہا تھا۔ غصے کے وہ ہمیشہ سے تیز تھے اور غصے میں پھر انہیں کچھ نہیں سوچتا تھا۔ وہ ہولے ہولے سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ مشاغل وہاں ہی صوفے کی پشت پر ہاتھ رکھے انہیں دیکھ رہی تھی اور دعا کر رہی تھی کہ مئی کی آنکھ نہ کھلے۔

حبیب الرحمن سیڑھیاں چڑھ کر فرسٹ فلور کے لاؤنج میں پہنچے اور پھر اس کے کمرے کا دروازہ کھولا۔ وہ بیڈ پر بیٹھا تھا، گھٹنوں پر سر رکھے اور اس کا پورا وجود اس کی سسکیوں سے مل رہا تھا۔

دروازہ کھلنے کی آواز پر اس نے گھٹنوں سے سر اٹھایا۔ اس کا خیال تھا مشاعل اس کے منع کرنے کے باوجود اس کے لیے دودھ لائی ہوئی لیکن حبیب الرحمن کو دیکھ کر اس کے لبوں سے بے ساختہ ”نہیں“ نکلا اور اس کے بہتے آنسو رک گئے تھے اور خوب صورت آنکھوں سے خوف جھانکنے لگا۔ آنکھیں جو بالکل ام کلثوم کی آنکھوں کی طرح تھیں۔ گھور سیاہ آنکھیں جن پر گھنی پلکوں کے جنگل تھے اور ان پر آنسو اٹکے ہوئے تھے۔

”ہاوی!“ وہ بے اختیار اس کی طرف بڑھے۔ وہ غیر ارادی طور پر دونوں ہاتھ اٹھا کر پیچھے ہٹا اور بالکل بیڈ کر اوٹن سے چپک گیا۔ اس کا رنگ یک دم سفید پڑ گیا تھا، جیسے کسی نے سارا خون خچوڑ لیا ہو۔ وہ خوف زدہ نظروں سے انہیں دیکھ رہا تھا اور اپنے ہاتھ یوں اوپر کیے ہوئے تھے جیسے ان کی متوقع مار سے بچنا چاہتا ہو۔

اس نے پورے جسم کی توانائی اکٹھی کر کے بولنا چاہا لیکن لفظ اندر ہی اندر چکر اکر رہ گئے۔ بے بسی سے جیسے اس کا دل پھٹنے لگا تھا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ شاید وہ مشاعل کو اوپر اس کے کمرے میں آتے دیکھ کر اسے مارنے آئے ہیں۔ وہ انہیں بتانا چاہتا تھا کہ مشاعل خود اسے برگر دینے آئی تھی اور یہ کہ اس نے بالکل تھوڑا سا برگر کھایا ہے اور باقی کا برگر پڑا ہے۔ وہ چاہیں تو لے جائیں۔ لیکن وہ کہہ نہیں پاتا تھا۔

حبیب الرحمن اس کے بیڈ کے قریب آگئے۔ انہوں نے جھک کر اس کا ہاتھ پکڑا اس نے کبوتر کی طرح آنکھیں موند لیں۔ وہ اس کے بے طرح سوچے ہوئے اور چھلے ہوئے ہاتھ کو دیکھ رہے تھے انہوں نے اسے ہلا جلا کر دیکھا۔ اس کی چیخیں نکل گئیں۔

”اٹھو!“ انہیں پہلی بار زری پر غصہ آیا اور وہ دل ہی دل میں اس سے بدگمان ہوئے۔

وہ سہم کر انہیں دیکھنے لگا۔ اس کی پسلیوں میں درد ہونے لگا بلکہ اس کے پورے وجود سے درد کی لہریں اٹھنے لگیں۔ وہ تصور میں ان کی لاتیں اور کئے اور ٹھڈے اپنے وجود پر پڑتے دیکھ رہا تھا۔ اس نے ماتحتی

نظروں سے انہیں دیکھا۔ اس کے نازک وجود میں مزید مار سہنے کی ہمت نہ تھی۔ وہ کہنا چاہتا تھا کہ وہ اسے معاف کر دیں، آئندہ وہ کبھی دیر سے گھر نہیں آئے گا۔ لیکن وہ کہہ نہیں پاتا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھ اٹھائے اور جوڑ دیے۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں۔ حبیب الرحمن کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں لے لیا۔ ابھی کچھ دیر پہلے مشاعل نے بھی ایسا ہی کیا تھا۔ یہ بچے بھی۔ لیکن مشاعل کی نظروں میں درخواست تھی، التجا تھی لیکن اس کی نظریں۔ وہ آنسو بھری آنکھیں۔ ان میں خوف تھا۔ ڈر تھا۔ انہوں نے بے اختیار اس کے بازو پر ہاتھ رکھا تو وہ خوفزدہ ہو کر پیچھے ہٹا، اور اس کے لبوں سے بمشکل نکلا۔ ”مجھے مت ماریں۔“

حبیب الرحمن کا دل جیسے پھل کر پانی ہوا۔ ”ہاوی بیٹا! تمہارا ہاتھ بہت سوچ گیا ہے۔ ڈاکٹر کو دکھانا پڑے گا۔ فریڈکچونہ ہو گیا ہو۔“

اس کی آنکھوں میں حیرت تھی۔ اسے لگ رہا تھا، جیسے حبیب الرحمن کے منہ سے اس نے صدیوں بعد یہ لفظ سنا ہو۔ اس نے بے یقینی سے انہیں دیکھا اور محسوس انداز میں کھڑا ہو گیا۔ انہوں نے اس کا دایاں ہاتھ پکڑ لیا، کمرے سے باہر آئے مشاعل نے جو ابھی تک لاؤنج میں صوفے پر بیٹھی تھی اسے حبیب الرحمن کے ساتھ سیڑھیاں اترتے دیکھا تو مطمئن سی ہو کر کھڑی ہو گئی حبیب الرحمن اس کے پاس آکر رکے تھے۔

”ہم ڈاکٹر کی طرف جا رہے ہیں شہر واپسی پر شاید ہمیں دیر ہو جائے۔ تم کمرے میں جا کر سو جاؤ۔“

”جی۔ اس کا ہاتھ تو ٹھیک ہو جائے گا۔“

”ان شاء اللہ!“

وہ اسے لے کر گیٹ سے باہر نکلے۔ مینو نے اندرونی دروازہ بند کیا۔ باہر والا گیٹ انہوں نے خود ہی باہر سے مقفل کر دیا تھا اور مینو کو سمجھا دیا تھا کہ اگر بیگم صاحبہ اٹھ جائیں تو انہیں بتا دینا میں شہر گیا ہوں۔ خود سے جگا کرتانے کی ضرورت نہیں۔

اس نے اٹک اٹک کر کہا تو انہیں یاد آیا۔ وہ کتنا بولتا تھا اور کتنے سوال کرتا رہتا تھا۔

”تمہارا بیٹا بہت باتونی ہے ام کلثوم! میرا دماغ کھا جاتا ہے۔“

وہ اُم کلثوم سے کہتے تھے اور اُم کلثوم مسکرا کر اسے چمٹا لیتی تھی۔
 ”یہ تو میرا طوطا ہے“ میرا مٹھو۔ اس کے دم سے
 میرے گھر میں رونق ہے۔“
 وہ اسے چوم لیتی۔

اور اب ہادی بولتا ہی نہیں تھا۔ پتا نہیں کب اس نے بولنا چھوڑا تھا۔ انہیں اندازہ نہیں ہوا تھا۔ ام کلثوم کے بعد وہ کم گو ہو گیا تھا لیکن زری سے شادی کے بعد انہوں نے اسے نظر انداز کر دیا تھا اور اس نے بولنا بالکل چھوڑ دیا تھا اپنی کسی ضرورت کے لیے بھی اس نے ان سے کبھی نہیں کہا تھا۔ پہلے زری نے انہیں اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا پھر سنی نے ان کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی۔ وہ ابھی صرف چند ماہ کا تھا اور بہت پیارا تھا۔ شاید ان کے ذہن میں تھا کہ وہ بڑا ہو گیا ہے اور اپنا خیال خود رکھ سکتا ہے۔ لیکن ابھی وہ اتنا بڑا نہیں ہوا تھا۔ اور اسے ان کی توجہ کی ضرورت تھی۔ انہیں اس طرح اسے مارنے کے بجائے زری اور محبت سے بات کرنا چاہیے تھی۔

وہ کس قدر سہا ہوا لگ رہا تھا بلکہ ابھی بھی سہا ہوا تھا۔ میں اب اس کا خیال رکھوں گا۔ خود میچ دکھانے لے جاؤں گا۔ وہ اپنے کالج کے زمانے میں خود بہت اچھے کھلاڑی تھے۔ اسکول اور کالج کی ٹیم کے ساتھ ہمیشہ کھیلنے جاتے رہے تھے۔ وہ دل ہی دل میں اپنا احتساب کر رہے تھے۔ اگر ارم کلثوم زندہ ہوتی تو اس وقت وہ ان کے ساتھ بیٹھا چمک رہا ہوتا لیکن اس وقت وہ ہاتھ گود میں دھرے خاموش بیٹھا تھا۔ اس وقت اسے ان کے پاس یوں فرنٹ سیٹ پر بیٹھنا اچھا لگ رہا تھا اور ایسا کتنے عرصے بعد ہوا تھا کہ وہ ان کے ساتھ بیٹھا تھا۔ اسے بھی ماما یاد آرہی تھیں جب وہ تھیں تو اکثر رات کو آکس کریم کھانے اور جوس پینے شہر آتے

”وہ بس ایسے ہی۔۔۔ گراؤنڈ میں بیٹھا رہتا ہوں۔
اچھا لگتا ہے مجھے۔ وہیں بیٹھ کر گراؤنڈ کو دیکھنا۔“
یہ ان کے لہجے کی نرمی اور شفقت تھی کہ بمشکل

تھے، کتنا مزا آتا تھا۔ کاش! ملا زندہ ہو جائیں۔ کاش سب کچھ پہلے جیسا ہو جائے۔

سوچتے سوچتے اس نے سیٹ سے سر نکالیا اور سو گیا۔ انجکشن میں غالباً "نیند کا بھی اثر تھا۔ گھر پہنچ کر انہوں نے گاڑی سے اتر کر نیل دی اور گیٹ کھول کر گاڑی اندر لائے۔ مینو نے اندرونی گیٹ کھول دیا تھا۔ "مینو! باہر کا گیٹ لاک کرو۔"

انہوں نے مینو سے کہہ کر اسے دو تین بار آواز دی، لیکن وہ گہری نیند میں تھا۔ انہوں نے اسے اٹھالیا۔ وہ بہت دیر پتلا تھا اور اس کا وزن اپنی عمر کے حساب سے بہت کم تھا۔

"زری سے کہوں گا۔ اس کی خوراک کا خاص خیال رکھا کرے۔ وہ پہلے تو اتنا کمزور نہیں تھا۔" انہوں نے سوچا اور اسے اٹھائے ہوئے لاؤنج سے گزر کر سیڑھیاں چڑھنے لگے اور جب سیڑھیاں چڑھ رہے تھے تو دو آنکھیں بہت تنفر سے انہیں سیڑھیاں چڑھتے دیکھ رہی تھیں اور یہ دو آنکھیں زری کی تھیں جو نیل کی آواز پر نیند سے بیدار ہو کر اپنے کمرے کے دروازے پر آکر کھڑی ہو گئی تھیں اور حبیب الرحمن کے نظروں سے اوچھل ہو جانے کے بعد وہ مینو کی طرف متوجہ ہو گئی تھیں جو نیند کے بوجھ سے بند ہوئی آنکھوں کے ساتھ جھول رہی تھی۔

انہیں مینو سے تفصیل جانتا تھی، وہ باہر نکل کر لاؤنج کے صوفے پر بیٹھ گئیں اور اوپر ہادی کے کمرے میں اسے بیڈ پر لٹانے کے بعد وہ کچھ دیر کھڑے اسے دیکھتے رہے۔ اس کا سرخ و سفید رنگ کتنا کملا گیا تھا۔ سوتے میں بھی تکلیف کے آثار اس کے چہرے پر نظر آ رہے تھے۔ انہوں نے جھک کر اس کی پیشانی پر بوسہ دیا۔

"سوری ہادی بیٹے!" ان کی آنکھوں میں جلن ہو رہی تھی۔ اسے چادر اوڑھا کر آہستگی سے کمرے سے باہر آتے ہوئے انہوں نے دروازہ بند کیا۔ ابھی انہیں زری سے بھی پوچھنا تھا کہ کیا اسے ہادی کا ہاتھ نظر نہیں آیا تھا۔ یقیناً "اس نے جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا

ہو گا، پھر بھی پوچھنا تو تھا نا، اور انہیں آج ہادی کے متعلق زری سے اور بھی بہت سی باتیں کرنا تھیں۔ وہ باتیں جو انہیں بہت پہلے کر لینا چاہیے تھیں، لیکن نہیں جانتے تھے کہ ان کی باتوں کا رد عمل الٹ ہو گا۔ وہ ہادی کا خیال رکھنے کے بجائے اس سے اور زیادہ نفرت کرنے لگیں۔

سیڑھیوں سے اترتے ہوئے انہوں نے ایک لمحہ کے لیے سوچا۔ آج رات وہ ہادی کے پاس اس کے کمرے میں ہی سو جائیں۔

وہ تکلیف میں ہے۔ کیا خبر رات کو زیادہ تکلیف ہو جائے۔ لیکن ڈاکٹر نے کہا تھا صبح تک سو مارے گا۔ وہ کچھ فیصلہ نہ کر سکے اور نیچے اترنے لگے۔ لاؤنج میں ایک طرف بستر بچھائے مینو سو رہی تھی۔ وہ اکثر لاؤنج میں ہی سو جاتی تھی یا پھر مشاعل کے کمرے میں کارپٹ پر بستر بچھا کر سو جاتی تھی۔ زری کمرے میں واپس جا چکی تھیں۔ وہ کمرے میں آئے تو وہ بیڈ پر منہ پھلائے بیٹھی تھیں۔

"کم از کم باہر جانے سے پہلے مجھے بتا کر جاتے۔"

"تم سو رہی تھیں، میں نے بے آرام کرنا مناسب نہیں سمجھا۔"

"اب ایسا بھی آپ نے کیا مار دیا تھا اسے کہ ہڈی ٹوٹ گئی۔ مکر کر رہا ہو گا۔ بڑا ڈرامہ باز ہے۔" وہ مینو سے ساری تفصیل معلوم کر چکی تھیں۔

"ہاں لیکن تم نے اس کے ہاتھ پر اپنا پاؤں رکھا تھا۔ فرہکچو ہوا ہے۔"

"اوہ تو میں نے کوئی جان بوجھ کر تھوڑا ہی رکھا تھا۔ مجھے کیا پتا تھا کہ وہ ہاتھ زمین پر نکالے بیٹھا ہے۔ میں تو اپنے دھیان میں آگے بڑھی تھی۔" جواب ان کے حسب توقع تھا۔

"میں ہادی سے بہت محبت کرتا ہوں۔" انہوں نے وارڈروب سے نائٹ ڈریس نکالتے ہوئے بتایا۔

"اور چاہتا ہوں کہ تم بھی اس سے محبت کرو۔ بے شک اتنی محبت نہ کرو جتنی سنی اور مشاعل سے کرتی ہو، لیکن اتنی محبت ضرور کرو کہ اسے ہاں کی کمی محسوس نہ

ہو۔ زری! وہ اس کی طرف پلٹے۔ ”زری! ام کلثوم اس سے بہت محبت کرتی تھی۔ اکلوتا تھا۔ اس کے بعد وہ بہت خاموش بہت تنہا ہو گیا ہے۔ تم پلیز اسے اپنی مشاغل کی طرح سمجھو۔“

ان کے لہجے میں التجا کا رنگ تھا۔

”مجھے یہ سب کچھ تم سے پہلے کہنا چاہیے تھا۔ لیکن میرا خیال تھا کہ جس طرح میں مشاغل کو اپنی بیٹی سمجھتا ہوں، تم بھی اسے اپنے بیٹے کی طرح سمجھو گی۔ میں نے اس یقین کے ساتھ تم سے شادی کی تھی کہ تم اس کا بہت خیال رکھو گی۔“

”تو کیا میں اس کا خیال نہیں رکھتی؟“ وہ چمک کر بولی تھیں۔ ”میں اس کا مشاغل سے برہ کر خیال رکھتی ہوں حبیب! اگر میں نے اسے جنم دیا ہوتا تب بھی اگر وہ یوں ہر روز لیٹ آتا تو کیا مجھے تشویش نہ ہوتی۔ کیا میں اسے نہ روکتی اور آپ سے ذکر نہ کرتی۔ پہلے میں نے اسے خود سمجھایا تھا لیکن اس نے میری بات کی پروا نہیں کی تو۔“

زری کی آواز میں رقت پیدا ہو گئی تو وہ قائل سے ہو گئے۔

”ہاں ٹھیک ہے۔ تم نے ٹھیک کیا زری! بس مجھے ہی غصہ آگیا تھا لیکن وہ مشاغل کہہ رہی تھی کہ وہ صرف میچ دیکھنے جاتا ہے اور پھر وہیں گراؤنڈ میں بیٹھا رہتا ہے۔ دراصل اسے بچپن سے ہی کھیل سے عشق ہے۔ اس کا ماموں قوی ہاکی ٹیم کے لیے سلیکٹ ہو گیا تھا اور فٹ بال کا تو اسے جنون تھا۔“

وہ کپڑے اٹھا کر وہاں پڑی کرسی پر بیٹھ گئے تھے۔ بہت ساری یادوں نے ایک دم یلغار کر دی تھی۔

ام کلثوم اور عبد الہادی دونوں بہن بھائی تھے اور دونوں میں بے حد پیار تھا۔ عبد الہادی قوی ٹیم کے لیے سلیکٹ ہو کر کیمپ میں چلا گیا تھا ٹریننگ کے لیے، وہاں جانے کے صرف دو ہفتے بعد اس کا

ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا اور وہ بچ نہ سکا تھا۔ ام کلثوم بھائی کے نام پر اس کا نام رکھنا چاہتی تھی لیکن ان کی والدہ جو تب زندہ تھیں۔ وہ اپنے کم عمری میں مرجانے والے

بھائی کے نام پر اس کا نام رکھنا چاہتی تھیں۔ وہ والدہ کی بات ٹال نہیں سکے تھے۔ لیکن ام کلثوم اسے ہادی ہی بلاتی تھی بلکہ ام کلثوم کیا، وہ خود بھی ہادی ہی بلاتے تھے۔ والدہ ہادی کی پیدائش کے چند ماہ بعد ہی وفات پا گئی تھیں سو ہادی بلانے پر اعتراض کرنے والا کوئی نہ تھا۔ اور وہ شکل و صورت میں ہی نہیں، مزاج میں بھی اپنے ماموں کی طرح تھا۔ جب وہ چھ سال کا تھا اور ایک دن کلثوم لان میں اس کے ساتھ کھیل رہی تھی تو اس نے بلند آواز میں اسے بتایا تھا۔

”حبیب! دیکھیں، میرا بیٹا بالکل اپنے ماموں کی طرح ہے۔“

اور انہوں نے دیکھا تھا وہ چھ سالہ بچہ گیند کو ہاکی کے ساتھ لیے لیے دوڑ رہا تھا پھر اس نے زبردست ہٹ لگائی تھی۔ ام کلثوم تالیاں بجا رہی تھی۔

”حبیب! حبیب! میرا بیٹا پیدائشی کھلاڑی ہے۔“

”آپ نے اس کی بات کا یقین کر لیا حبیب! کہ وہ گراؤنڈ میں بیٹھا رہتا ہے۔ آخر آٹھ بجے تک وہ وہاں بیٹھ کر کیا کرتا ہے۔ خدا نخواستہ۔“

وہ لہجے میں تشویش لیے کہہ رہی تھیں۔ انہوں نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔

”اللہ نہ کرے۔ تم پریشان مت ہو۔ میں صبح جاؤں گا خود اور کلب کی انتظامیہ سے پوچھوں گا۔“

وہ کپڑے اٹھا کر واش روم میں چلے گئے۔ جب وہ تبدیل کر کے آئے تو زری سنی کو تھپک رہی تھیں۔

”میں ہادی کے کمرے میں جا رہا ہوں۔ رات میں کسی وقت خدا نخواستہ اس کی طبیعت خراب ہو جائے۔ تم سو جانا۔ میں ادھر ہی سو جاؤں گا۔“

زری نے ایک جھٹکے سے سر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں غصہ حیرت اور تنفر تھا لیکن وہ زری کی طرف دیکھے بغیر کمرے سے باہر نکل گئے۔

ہادی گہری نیند میں تھا۔ وہ اس کے قریب ہی بیڈ پر لیٹ کر ہو لے ہو لے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگے۔ ہادی کو شاید نیند میں کچھ احساس ہوا تھا،

کہ اس نے لمحہ بھر کے لیے آنکھیں کھول کر انہیں

دل، ہر ایک کے لیے اس کے دل میں بے حد گنجائش تھی۔ کسی اجنبی کی بھی معمولی سی تکلیف پر وہ تڑپ اٹھتی تھی اور اسے دور کرنے کی کوشش کرتی تھی اور آج سبہر بھی وہ آرام سے گھر بیٹھا فرانس میں ہونے والے فٹ بال کے عظیم میلے کی سی ڈی دیکھ رہا تھا جب خوش جمال نے آکر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تھا۔

”مصطفیٰ! وہ اس سامنے والے گھر۔ وہی جس کے لان میں موجود کمرس ٹری بہت خوب صورتی سے سجا ہوا ہے۔ اس گھر میں رہنے والی لڑکی اپنے گھر کے باہر کھڑی رہ رہی ہے۔“

”تو؟“ مصطفیٰ نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

”مجھے لگتا ہے اس کے ساتھ کوئی مسئلہ ہے۔ ہو سکتا ہے اسے ہماری مدد کی ضرورت ہو۔“

”یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو کہ اسے ہماری مدد کی ضرورت ہے اور ہم اس کی مدد کر سکتے ہیں۔“

”میرا اندازہ ہے کہ وہ کوئی پاکستانی یا ہندوستانی لڑکی ہے۔ اس کا کمپلیکشن بتاتا ہے کہ وہ۔۔۔ اور پھر ایک دن میں نے گھر میں اسے دوپٹا لیے گھومتے دیکھا۔

ہمارے پاکستانی اور ہندوستانی والدین بعض اوقات یہ دیکھ کر کہ لڑکا باہر ہے اپنی لڑکیاں بیاہ دیتے ہیں۔ لڑکا چاہے یہاں جھاڑو دتا ہو اور ہر طرح کی برائیوں میں ملوث ہو، بے چاری لڑکیاں یہاں آکر مصیبت میں پھنس جاتی ہیں۔ مس یوز ہوتی رہتی ہیں تو ممکن ہے یہ لڑکی۔“

”اوہ مائی گاڈ خوش جمال۔“ وہ کسمپوٹر بند کر کے اس کی طرف مڑا۔ ”تم افسانہ نگار کیوں نہیں بن جاتی ہو۔ خود ہی کہانیاں تخلیق کر لیتی ہو۔ اب کیا خبر اس لڑکی کے سر میں درد ہو یا پھر اس کا بوائے فرینڈ ناراض ہو گیا ہو۔۔۔ اور پھر وہ اتنی چھوٹی بچی بھی نہیں ہے کہ اگر گھر سے باہر نکل آئی ہے تو چند قدم چل کر کسی فون بوتھ سے پولیس کو فون کر کے اپنی مدد کے لیے بلا سکتی ہے۔“

”کہانیاں ہوتی ہیں تو تخلیق ہوتی ہیں۔ اب چاہے

دیکھا۔“ ”پاپا۔۔۔! اور اپنا بازو ان کے گرد جمائے لیا۔ انہوں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر چوم لیا۔ اس نے اپنا گھٹنا موڑ کر ان کے پیٹ پر رکھا۔ تین سال پہلے ام کلثوم کے بعد وہ یونہی ان سے لپٹ کر سوتا تھا اور پھر زری ان کی زندگی میں آگئیں۔

زری ان کے آفس میں جاب کرتی تھیں۔ کلثوم کی وفات کے بعد جب وہ بہت اب سیٹ تھے تو زری نے انہیں بہت سہارا دیا تھا۔ معمولی سی سلام و دعا گہری دوستی میں بدل گئی تھی۔ انہوں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ وہ کلثوم کے بعد کسی اور کو اپنی زندگی میں لے آئیں گے۔ لیکن کلثوم کی وفات کے صرف ایک سال بعد وہ زری سے شادی کر کے انہیں گھر لے آئے تھے کہ گھر بہت ڈسٹرب ہو رہا تھا۔ انہوں نے شادی کر لی تھی یہ غلط نہ تھا لیکن انہوں نے ہادی کو نظر انداز کر دیا تھا یہ غلط تھا۔ زری طلاق یافتہ اور ایک بچی کی ماں تھیں ان کا خیال تھا کہ وہ ان کی بچی کو تحفظ اور محبت دیں گے تو وہ بدلے میں ہادی کو مارا پیار دے گی۔

اور وہ ہادی کے پاس لیٹے اس کے اوپر ہاتھ رکھے دل ہی دل میں عہد کر رہے تھے کہ وہ اب بھی ہادی کی طرف سے غافل نہیں ہوں گے۔ لیکن نہیں جانتے تھے کہ اپنے عہد پر قائم نہیں رہ سکیں گے۔ زری انہیں اپنے عہد پر قائم نہیں رہنے دیں گی۔

☆ ☆ ☆

اس نے ڈرائیو کرتے ہوئے کن اکھیوں سے فرنٹ سیٹ پر بیٹھی جو زری کی طرف دیکھا۔ وہ اس لڑکی کو آج سے پہلے نہیں جانتا تھا۔ ہاں جب سے وہ اس نئے گھر میں شفٹ ہوئے تھے تو اس نے اسے اپنے گھر کی کھڑکی سے جھانکتے دیکھا تھا۔ اس کا گھر بالکل اس کے گھر کے سامنے تھا۔ درمیان میں بس ایک سڑک تھی اور آج پہلی بار خوش جمال کے اصرار پر وہ اس کے ساتھ گھر سے باہر نکلا تھا اور اس روتی ہوئی لڑکی سے بات کی تھی۔ خوش جمال تو ایسی ہی تھی۔ ہمدرد، رحم

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

کچھ بھی ہو پوچھ لینے میں کیا حرج ہے۔ دیکھو لودہ ابھی تک رو رہی ہے۔“

اس نے تھوڑا سا آگے جھک کر کھڑکی کا پردہ ہٹا کر باہر جھانکا اور پھر مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔

”تمہیں تو اپنے کھیل کے سوا کسی چیز کا پتا نہیں کہ ارد گرد کیا ہو رہا ہے۔ یہاں دنیا میں کتنے پر اہل مز اور مسائل ہیں۔“

”یہ دنیا بہت خوب صورت ہے خوش جمل! کیونکہ اس میں تم ہو۔ بیبا ہیں اور امی۔“

خوش جمل مسکرائی۔ ”ٹھیک ہے لیکن اس خوب صورت دنیا کے چہرے پر اگر کوئی آنسو نظر آئے تو ہمیں اسے پونچھنا چاہیے۔“

خوش جمل جب کوئی ارادہ کر لیتی تھی تو اسے روکنا مشکل ہوتا تھا۔ وہ جانتا تھا سوہ افوہ! لگتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ ”چلو۔“

آج سہ پہر وہ لڑکی لن کی بہت کا جواب دے بغیر چلی گئی تھی، لیکن اس وقت اس نے بغیر کسی جھجک کے اس سے لفٹ مانگی لی تھی۔ وہ تو اس کا نام تک نہیں جانتا تھا۔

ڈیوڈ نے اسے جوتی کہہ کر مخاطب کیا تھا جو یقیناً اس کا تک نیم ہو گا۔ ایک بار تو اس نے سوچا انکار کر دے۔ پتا نہیں وہ کس مزاج کی لڑکی ہے اور پھر اس وقت جب وہ ماچسٹریوٹا پیڈ کے لیے ٹرائل دینے جا رہا تھا۔ وہ کسی اسکیڈل کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ بابا نے اسے محتاط رہنے کی تلقین کی تھی بلکہ وہ تو بلاوجہ اسے گھر سے بھی نکلنے نہیں دیتے تھے۔ لیکن وہ ڈیوڈ کو منع نہیں کر سکا تھا کیونکہ ڈیوڈ پہلے ہی ایلن کو بتا چکا تھا کہ وہ غلام مصطفیٰ کے ساتھ آئے گا۔ اور ایلن نے بطور خاص فون کر کے اس کا شکریہ ادا کیا تھا۔ لیکن جب اس نے اس کی طرف دیکھا تو اسے لگا جیسے اس کی پلکیں بھیگی ہوئی ہیں۔ اسے خوش جمل کا خیال آیا تھا۔ وہ بولی تو ضرور اسے ساتھ لے چلنے پر اصرار کرتی۔

کچھ نروس سی ہاتھ مسل رہی تھی۔ وہاں ایلن کے ہاں بھی وہ بہت کھیرائی ہوئی سی لگ رہی تھی۔ جیسے وہ اس ماحول میں ان فٹ ہو۔ نروس سی بار بار انگلیاں مسلتی تھی۔ ہو سکتا ہے خوش جمل کا خیال درست ہو اور یہ لڑکی کسی مشکل میں ہو۔ وہ ایلن کو نہیں جانتا تھا۔ ڈیوڈ اس کا دوست تھا۔ ڈیوڈ سے اس کی دوستی پچھلے چھ سال سے تھی۔ وہ ڈیوڈ کے کسی فرینڈ کو بھی نہیں جانتا تھا۔ اس لیے ایک طرف الگ گوشے میں بیٹھ گیا تھا، کیونکہ ڈیوڈ کو اپنی ایک گرل فرینڈ مل گئی تھی۔

”تم اس وقت رو کیوں رہی تھیں؟“ غلام مصطفیٰ نے اچانک ہی ذرا سا رخ موڑ کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”اس وقت۔“ اسے یاد آیا کہ کچھ دیر پہلے وہ اسے اپنے گھر کے باہر روتے دیکھ چکا تھا۔ ”وہ دراصل اندر میرے مٹی اور ڈیڈی میں لڑائی ہو رہی تھی۔“

”تو تم اس لیے رو رہی تھیں؟“ اس نے حیرت سے اسے دیکھا تو اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

وہ اتنی چھوٹی تو ہر گز نہ تھی کہ مٹی ڈیڈی کی لڑائی پر روتی۔ وہ سولہ سال سے تو زیادہ عمر کی ہی ہو گی۔ ہو سکتا ہے اس کا اندازہ غلط ہو بعض بچے ہوتے ہیں جو اپنی عمر سے بڑے لگتے ہیں۔ اس نے یوٹرن لیتے ہوئے اسے بغور دیکھا۔

”مٹی ڈیڈی میں کبھی کبھار لڑائی ہو جاتی ہے اور جب کبھی تم مٹی کے رتبے پر فائز ہو گی تو ہو سکتا ہے تم بھی اپنی مٹی کی طرح۔“

اس کا رنگ سرخ ہوا اور اس کی پلکیں لرزنے لگیں۔ کچھ دیر وہ یونہی سر جھکائے بیٹھی رہی۔ وہ بے حد محفوظ سا اسے دیکھ رہا تھا۔ پھر جیسے اس نے بمشکل سر اٹھا کر ایک نظر اسے دیکھا تھا اور پھر فوراً ہی اس کی نظریں جھک گئی تھیں۔ لیکن جب وہ بولی تو اس کا لہجہ مضبوط تھا۔

”نہیں۔ میں اپنی مٹی کی طرح نہیں ہوں اور میرے مٹی ڈیڈی میں کبھی کبھار نہیں بلکہ اکثر لڑائی

اس نے پھر کن اکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔



ہوتی ہے اور مجھے اس لیے رونا آتا ہے کہ یہ لڑائی اکثر میری وجہ سے ہوتی ہے۔“
”تمہاری وجہ سے؟“ مصطفیٰ کی آنکھوں میں حیرت تھی۔

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور آنکھوں میں آنی نمی کو پلکیں جھپک کر چھپایا۔
”کیوں تمہاری وجہ سے کیوں؟“
”وہ۔“ آنسو اس کے رخساروں پر ڈھلک آئے۔
”وہ۔“ ممی کو اچھا نہیں لگتا کہ ڈیڈی میری حمایت کریں۔
”در اصل۔“ وہ ہچکچاتی۔

”ممی میری اسٹپنڈر ہیں تا تو زیادہ تر لڑائی اس وجہ سے ہوتی ہے کہ ڈیڈی میری سائیڈ لیتے ہیں اور ممی چاہتی ہیں کہ میں وہ کروں جو وہ کہتی ہیں۔ چاہے میرا اسے کرنے کو دل نہ چاہے تب بھی۔“
اور مصطفیٰ کے دل کو کچھ ہوا۔ اندر کہیں گہرائی میں کسی دے ہوئے درد نے چٹکی بھری۔
”دیے۔“ اس نے جلدی سے ہاتھوں کی پشت سے آنسو پونچھے۔

”میری ممی سنڈر بلا کی ممی کی طرح نہیں ہیں۔ وہ اچھی ہیں لیکن بس کچھ باتیں ایسی ہیں جو مجھے اچھی نہیں لگتیں لیکن انہیں پسند ہیں۔“
اسے لگا جیسے ممی کے متعلق اس طرح کی بات کرنا مناسب نہیں تھا اور اس سے کچھ غلط ہو گیا ہے۔

وہ اب پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہو چکا تھا۔ اس کا پاؤں ایک سیلینڈر پر تھا ہاتھ اسٹیرنگ پر اور وہ اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں اس کے لیے ایک نرم سانسفیق سماجیت بھرا تاثر تھا اور وہ خوش جمال کی طرح اس کے لیے اپنے دل میں بہت گداز بہت ہمدردی محسوس کر رہا تھا۔

”کیا تمہارے ممی ڈیڈی میں بھی لڑائی ہوتی ہے۔“
وہ اس کے اس طرح دیکھنے سے پھر نزوس ہو گئی تھی۔
”نہیں۔“ اس نے اس کے چہرے سے نظریں ہٹالیں اور سامنے دیکھنے لگا۔ آنکھوں کے سامنے امی اور بابا کے چہرے آگئے تھے۔ دونوں ایک دوسرے کا

بے حد خیال رکھتے تھے اور احرام کرتے تھے۔ اس نے انہیں کبھی لڑتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔
”تم کتنے لکی ہو۔“ اس نے رشک سے اس کی طرف دیکھا۔

مصطفیٰ نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ بیٹے ہوئے چند سالوں میں بہت سارے لوگوں نے اسے لکی کہا تھا۔ کیا وہ واقعی لکی تھا۔ اس نے رات کی تنہائیوں میں اکثر خود سے پوچھا تھا اور اگر لکی تھا تو کتنا۔ کیا اتنا ہی جتنا لوگ سمجھتے تھے؟

”تم بہت اچھا کھیتے ہو۔“ جوزی کو یاد آیا کہ اس نے ابھی تک اس کے کھیل کی تعریف نہیں کی۔
”میں نے تمہارا وہ میچ دیکھا تھا جو تم نے بروڈس مار تھ کلب کے خلاف کھیلا تھا لیکن جب ہفتہ بھر پہلے تم ہمارے گھر کے سامنے آ کر رہے تو میں نے بالکل نہیں پہچانا کہ تم غلام مصطفیٰ ہو۔ اہلما کلب کا فخر لیکن تمہاری آنکھیں مجھے ڈسٹرب کر رہی تھیں۔ مجھے لگتا تھا جیسے میں نے تمہیں کہیں دیکھا ہے۔ میرا مطلب ہے تمہاری آنکھیں مجھے بہت جانی پہچانی لگی تھیں۔ لیکن مجھے یاد نہیں آ رہا تھا کہ تمہیں کہاں دیکھا ہے۔ ڈیوڈ نے جب تمہارا تعارف کروایا تو میری الجھن دور ہوئی۔ نہیں تو اور پتا نہیں کتنے دن سوچتی رہتی کہ یہ آنکھیں میں نے کہاں دیکھی تھیں۔“

”چلو اب تمہیں مزید سوچنا نہیں پڑے گا۔“ وہ مسکرایا تو اس کے لبوں پر بھی ایک جھمنی جھمنی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔
”تم پاکستانی ہو یا انڈین؟“ وہ شاید اس کے متعلق سب کچھ جان لینا چاہتی تھی۔
”پاکستانی۔“

”اوہ اچھا!“ اسے لگا جیسے وہ اس کے پاکستانی ہونے کا سن کر خوش ہوئی ہو۔
”تم پاکستان میں کہاں رہتے تھے۔“
”لاہور۔!“ اس کا جواب مختصر تھا۔ وہ یک دم سنجیدہ نظر آنے لگا تھا۔

”لاہور۔“ وہ ایک دم پُر خوش ہوئی تھی۔ میں نے

لاہور کے متعلق بہت سنا ہے اور مجھے لاہور دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ میرے ڈیڈی ہمیشہ لاہور کی تعریف کرتے تھے اور انہوں نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ ایک بار مجھے ضرور لاہور لے کر جائیں گے۔ دراصل انہوں نے بی ایس سی لاہور سے ہی کی تھی اور کچھ عرصہ وہاں سینٹ انتھونی میں پڑھایا تھا۔

اس نے بھی کچھ عرصہ سینٹ انتھونی میں پڑھا تھا۔ وہ چونک کر پھر اسے دیکھنے لگا۔ وہ بہت اشتیاق سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اسے اپنی طرف دیکھتے پا کر اس نے فوراً "نظریں اس کے چہرے سے ہٹالیں اور ونڈ اسکرین سے باہر دیکھنے لگی۔

"تمہارے ڈیڈی کا کیا نام ہے۔ خوشی بھی سینٹ انتھونی میں پڑھتی تھی۔"

"آ۔ نذیر۔" وہ پال کہتے کہتے رک گئی۔ "لیکن ڈیڈی نے صرف چند ماہ ہی پڑھایا تھا۔"

"کون سے سن میں۔"

"پتا نہیں۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔ مارتھا کا حکم تھا کہ یہاں کسی کو نذیر شذیر پٹانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کے ڈیڈی کا پورا نام نذیر پال تھا۔ یہ نہیں تھا کہ اس کی فیملی یا کیونٹی میں سب کے نام ایسے تھے۔ بلکہ زیادہ تر نام تو ایسے ہی تھے جو عام مسلم معاشرے میں رکھے جاتے تھے۔ جیسے اس کے ایک چاچو کا نام عمر خیام تھا اور ایک پھپھو کا نام حمیرا نورین تھا۔ وہاں پاکستان میں سب اس کے ڈیڈی کو نذیر کہہ کر ہی بلاتے تھے۔ ان کے سارے اسٹوڈنٹ انہیں سر نذیر ہی کہتے تھے، لیکن یہاں آکر مارتھا نے انہیں پال کہنا شروع کر دیا تھا۔

"تم لوگ کہاں سے آئے ہو۔ میرا مطلب ہے کس شہر سے۔" اس نے پوچھا۔

"کراچی سے۔ یہاں آنے سے پہلے ہم کراچی میں تھے اور میرے ایک انکل یہاں ہوتے ہیں۔ وہ بہت سالوں سے کوشش کر رہے تھے ہمیں بلانے کی۔ لیکن ہم دو سال پہلے یہاں آئے ہیں اور تم کب آئے۔"

"تقریباً" آٹھ سال ہو گئے ہیں۔"

خوش جمال کو بتانے کے لیے اس کے پاس کافی مواد اکٹھا ہو گیا تھا۔ اور خوش جمال یقیناً "حیران ہو گی کہ اس لڑکی کے متعلق میں نے اتنا کچھ کیسے جانا اور میں بھی اس کو ہرگز نہیں بتاؤں گا کہ میں نے اسے گھر تک لٹھادی ہے۔

وہ دل ہی دل میں سوچ رہا تھا اور اب گاڑی مین روڈ سے اتر کر ان کے گھر کی طرف جا رہی تھی۔ اس نے اس کے گھر کے سامنے بریک لگائے۔

"تم میرا ڈھو۔"

بہت دیر سے جو سوال اس کے ذہن میں چکر رہا تھا، گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے بلا سحر اس نے پوچھ ہی لیا۔ اسے لگا تھا اگر وہ یہ سوال نہ پوچھتی تو شاید اسے رات بھر نیند نہ آتی۔

"نو۔" اس نے بے حد حیرت سے اسے دیکھا۔ ابھی وہ صرف بیس سال کا تھا۔

تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ لڑکی خوش جمال اس کی بیوی نہیں بلکہ بہن ہے۔ اس کے اندر جیسے دور تک اطمینان پھیل گیا۔ پتا نہیں کیوں۔

گاڑی کا دروازہ بند کرتے کرتے اسے یاد آیا کہ اس نے اس کا شکریہ تو ادا ہی نہیں کیا۔

"سنو سنو!" اس نے شیشے پر ہاتھ مارا تو مصطفیٰ نے گاڑی کا شیشہ نیچے کر کے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"سوری! مجھے تھینک یو کہنا یاد نہیں رہا تھا۔ تھینک یو۔"

"ویلم! وہ بے اختیار مسکرایا۔ اسٹریٹ لائٹ کی روشنی سیدھی اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ اس کی خم دار پلکوں والی آنکھوں میں پلا کی چمک تھی اور سانولے رنگ میں بلا کی کشش تھی۔ اس کے نقوش تھیکھے تھے اور قد لمبا تھا۔ اور ہونٹ۔

اس نے بڑی تفصیل سے اس کا جائزہ لیا تھا۔ بلاشبہ وہ ایک پُرکشش لڑکی تھی۔ اس کی پلکیں لرزیں، رخساروں پر سرخی نمودار ہوئی اور جھک گئیں۔

طرف دیکھ رہا تھا۔

”محی الدین صاحب پلیز ایک منٹ!“

کلب کے اندر سے باہر آتے ہوئے لیاقت میموریل فٹ بال ٹیم کے کوچ نے انہیں بلایا تو وہ اس کے ساتھ اندر چلے گئے۔ دو دن بعد ایگل میموریل اور لیاقت میموریل کے درمیان فاسٹ تھا اور وہ اس بات سے بے خبر کہ کسی نے اسے دیکھا تھا اور کوئی اس سے بات کرنا چاہتا تھا۔ گراؤنڈ کے کنارے پر بیٹھا گراؤنڈ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ سورج کا سرخ گولہ درختوں کے پیچھے گم ہو گیا تھا اور گراؤنڈ میں تاریکی چھا چکی تھی۔ لیکن وہ گراؤنڈ میں رونق دیکھ رہا تھا۔ اور وہ خود بال کو لے کر گول پوسٹ کی طرف بڑھ رہا تھا پھر ایک زوردار کلک اور بال گول میں۔۔۔ دور کہیں کتابھونکا تو وہ چونکا۔ گراؤنڈ خالی تھا اور وہ ہاتھ گود میں دھرے خالی خالی نظروں سے گراؤنڈ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ عین اسی لمحے محی الدین صاحب کلب کی عمارت سے باہر نکلے۔ گیٹ پر چلنے والے بلب کی مدھم روشنی میں انہیں اس کا ہیولا نظر آیا۔ تو وہ ابھی تک وہاں بیٹھا ہے۔ وہ تیز تیز چلتے ہوئے اس کے قریب آئے۔ آہٹ پر خوفزدہ ہو کر اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔

”تم آج بہت دنوں بعد آئے ہو؟“ آواز میں بہت نرمی اور شفقت تھی۔

اس نے جواب نہیں دیا اور کھڑا ہو گیا۔

”میں وہاں اپنے کمرے کی کھڑکی سے تمہیں بہت دیر یہاں بیٹھے دیکھتا تھا۔ پھر جب تم اتنے دنوں سے نہیں آئے تو میں نے سوچا شاید تم بیمار ہو۔ کیا تم بیمار تھے۔“

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

تب ہی ان کی نظر اس کے پلاسٹریڈ ہاتھ پر پڑی۔

”اوہ شاید تم گر گئے تھے۔ چوٹ لگی ہے ہاتھ پر۔“

اس نے پھر اثبات میں سر ہلادیا۔

”کیا تمہیں فٹ بال کھیلنا پسند ہے؟“

”ہاں!“ اس نے اس بار جواب دیا۔ ”لیکن شاید

”او کے بائے اینڈ آکین تھینکس۔“

وہ تیزی سے اپنے کمرے کے دروازے کی طرف مڑ گئی، اور ہینڈ بیگ سے چابی نکالی۔ تینوں کے پاس گھر کی چابیاں ہوتی تھیں۔

مصطفیٰ کے پاس خوش جمال کوٹانے کے لیے بہت کچھ تھا۔ اس نے گاڑی آگے بڑھائی۔ اسے اب یو ٹرن سے گاڑی واپس اپنے گھر کی طرف لانی تھی۔ اس نے مڑ کر اس کی گاڑی کو جاتے دیکھا اور لہراتی ہوئی سی گھر میں داخل ہوئی۔ اتنی خوش وہ ان دو سالوں میں کبھی بھی نہ ہوئی تھی۔ لیکن خود وہ اس بات سے بے خبر تھی کہ وہ آج عام دنوں سے زیادہ خوش ہے۔ اس نے لاؤنج میں آکر کھڑکی کا پردہ ہٹایا اس کی گاڑی اپنے گھر کے باہر کھڑی تھی۔

یہ سیاہ گھر دیرسا جاکھو والا لڑکا فٹ بال کا ابھرتا ہوا کھلاڑی غلام مصطفیٰ تھا۔

وہ پال کے واپس آنے پر اسے بتانے والی تھی لیکن نہیں جانتی تھی کہ پال کے آنے پر کتنا بڑا ہنگامہ ہونے والا تھا۔



وہ آج پھر گراؤنڈ کے باہر بیٹھا تھا۔ میچ ختم ہوا تو انہوں نے اسے دیکھا لوگ جا چکے تھے اور خالی گراؤنڈ میں وہ تنہا بیٹھا تھا۔ کلب کے اندر جاتے جاتے وہ واپس مڑے تھے۔ آج وہ چار دنوں بعد آیا تھا اور وہ اس سے پوچھنا چاہتے تھے۔ وہ اتنے دنوں سے کیوں نہیں آیا۔

غیر ارادی طور پر انہوں نے اس کا انتظار کیا تھا اور اپنے کمرے کی کھڑکی میں کھڑے گراؤنڈ کی طرف دیکھتے ہر بار انہوں نے سوچا تھا کہ اگر آج وہ لڑکا وہاں بیٹھا نظر آیا تو وہ ضرور اس سے بات کریں گے۔ ضرور اس لڑکے کو فٹ بال سے محبت ہے۔ انہیں اپنا بچپن یاد آیا تھا جب وہ بھی یونہی آخری شخص کے جانے تک گراؤنڈ میں بیٹھے رہتے تھے لیکن چار دن سے وہ نظر نہیں آیا تھا اور آج وہ پھر بیٹھا ہوا خالی گراؤنڈ کی

”ہاں تم نے اپنا نام نہیں بتایا۔“

”ہادی۔!“

اور انہیں عبد الہادی یاد آگیا تھا۔ ان کا گہرا دوست، حیرت انگیز صلاحیتوں کا مالک تھا وہ۔ ”تمہارا ہم نام میرا دوست ہاکی اور فٹ بال دونوں میں یکساں مہارت تھی اسے۔ لیکن یہاں فٹ بال کا اسکوپ نہیں ہے، اس لیے وہ ہاکی کھیلنے لگا تھا لیکن فٹ بال سے اس کی محبت کم نہیں ہوئی تھی۔“

وہ اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے روشنی میں آگئے تھے۔ بلب کی روشنی اب اس کے چہرے پر بڑی تھی۔ اس کی سیاہ خمدار پلکوں والی آنکھوں میں بلا کا سحر تھا۔ بالکل عبد الہادی کی آنکھوں کی طرح لیکن اس کی آنکھوں میں اداسی اور خوف تھا جبکہ عبد الہادی کی سیاہ آنکھوں سے شوخیاں جھانکتی تھیں۔

”مجھے دیر ہو رہی ہے۔“ اس کی سیاہ آنکھوں کا سہم بڑھ گیا تھا۔ ”میں اب جاؤں۔“

”ہاں اللہ کے حوالے، لیکن اپنے ابو کو لے کر ضرور آنا میں ابھی چند دن یہاں ہوں۔ میرا دل کہہ رہا ہے کہ تم بڑے پلیس بن سکتے ہو۔“

وہ سر ہلا کر تیزی سے سفیدے کے درختوں کی طرف بڑھا بہن کے پیچھے اس کا گھر تھا۔ اس کے پاپا آج کراچی گئے ہوئے تھے اور اس نے مشاغل اور مینو کو بتایا تھا کہ وہ میچ دیکھنے جا رہا ہے اور آج جلدی آجائے گا لیکن دیر ہو گئی تھی۔ وہ ڈیر رہا تھا لیکن کچن کا دروازہ کھلا تھا اور مینوروشاں پکار رہی تھی۔

اس نے جھانک کر دیکھا۔ لاؤنج خالی تھا۔ وہ تیزی سے لاؤنج میں آیا اور سیڑھیاں چڑھ کر اوپر اپنے کمرے میں آگیا اور آنکھیں موند کر اپنے بیڈ پر لیٹ گیا۔ بند آنکھوں میں ایک خواب اتر آیا تھا۔ ایک روز وہ برفاٹ بال رہنے لگا۔

اور اب اسے حبیب الرحمن کا انتظار تھا۔ وہ آجائیں تو وہ انہیں لے کر کلب جائے گا۔ وہ پاپا کو بتائے گا کہ ان صاحب نے اس سے کہا ہے کہ وہ اچھا کھلاڑی بن سکتا ہے اور پاپا ضرور اس کی بات سنیں گے،

میں کبھی نہیں کھیل سکتا۔“

اس کے لہجے سے مایوسی جھلکتی تھی اور ایک گہرا درد جیسے اس کے دل کو چھیلتا تھا۔

”کیوں۔۔ کیوں نہیں کھیل سکتے؟“ انہوں نے اس کا کندھا تھپتھپایا۔

”اگر تمہیں شوق ہے اور سچی لگن ہے تو پھر کوئی چیز تمہیں کھیلنے سے نہیں روک سکتی۔“

”لیکن میں کبھی نہیں کھیل سکتا۔“ وہ بے حد افسردہ نظر آنے لگا تھا۔

”میرے ہاتھ کمزور ہیں۔ میری انگلیاں کسی بھی چیز پر زیادہ دیر کرب نہیں رکھ سکتیں۔ میری ماما کہتی تھیں، مجھے ہاکی کا کھلاڑی بننا ہے لیکن میں ہاکی کو زیادہ دیر ہاتھ میں مضبوطی سے پکڑ نہیں سکتا۔ میں کتنی بھی کوشش کروں۔ تب میں نے سوچا۔ مجھے فٹ بال کھیلنا چاہیے اور مجھے فٹ بال کھیلنا اچھا لگنے لگا۔ میں ٹی وی پر فٹ بال کے میچز جہاں کہیں لگے ہوتے ہیں دیکھتا ہوں۔“

وہ قدرے اندھیرے میں کھڑے تھے اور وہ پہلی بار بلا اگلے ایک اجنبی شخص سے اپنی ذات کے حوالے سے بات کر رہا تھا۔

”تم فٹ بال کھیلو گے؟“ محی الدین نے نرمی سے پوچھا۔

”لیکن وہ متذبذب سا ہو کر ان کی طرف دیکھنے لگا۔“

”میں اسکول میں فٹ بال کھیلتا ہوں۔ میرے پی ٹی سر کہتے ہیں۔ میری کک اچھی ہے اگر مجھے اچھا کوچ مل جائے تو۔“

”تو سمجھو تمہیں اچھا کوچ مل گیا۔“

انہوں نے وہاں کھڑے کھڑے ہی فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ یہاں سے جانے سے پہلے اس بچے کو نور علی کے حوالے کر جائیں گے جو بہت اچھا فٹ بال کا کھلاڑی رہا تھا اور آج کل ایگل میموریل کلب میں فٹ بال کا کوچ تھا۔

”تم کل اپنے ابو کے ساتھ آنا۔“

وہ خاموش رہا۔

اور سمجھیں گے۔ آج کل وہ اس کو وقت دے رہے تھے۔ ان تین دنوں میں ایک بار بھی انہوں نے اسے ڈانٹا نہیں تھا۔ آج بھی کراچی جانے سے پہلے انہوں نے اسے پیار کیا تھا۔

ٹھیک ہے میرے ہاتھ کمزور ہیں۔ ان میں گرپ نہیں ہے لیکن محی الدین صاحب نے کہا تھا کہ وہ سب کچھ کر سکتا ہے۔ اس نے سوچا وہ مشاعل کو محی الدین صاحب کے مشعل بتائے لیکن پھر یہ سوچ کر مشاعل سے ذکر نہیں کیا کہ کہیں وہ مئی کو نہ بتا دے اور مئی پہلے ہی پیپا کو منع کر دیں۔ اسے پہلے سے کسی کو کچھ نہیں بتانا چاہیے۔ بس پیپا کا انتظار کرنا چاہیے۔ وہ دل ہی دل میں دعا مانگتے لگا کہ پیپا سچو ختم ہونے سے پہلے ہی آجائیں۔ آنے والے لمحوں سے بے خبر وہ دعا مانگ رہا تھا لیکن تقدیر کی کتاب میں کچھ اور ہی رقم تھا۔ کچھ ایسا جس نے اس کی زندگی کو یکسر بدل کر رکھ دیا۔



یہ تین دن بعد کی بات تھی۔ مسلسل بارش کی وجہ سے میچ نہیں ہو رہا تھا اور وہ گھر پر ہی تھا۔ اس وقت بھی وہ اپنے کمرے میں آنکھیں موندے لیٹا ہوا تھا جب مینو نے لاؤنج میں آکر اسے آواز دی تھی۔ اس نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔

مینو اسے کھانے کے لیے بلا رہی تھی وہ اٹھا اور کمرے سے باہر آگیا۔ سیڑھیاں اترتے ہوئے اس نے دیکھا کہ سیڑھیوں کے پاس سنی کی کیری کاٹ پڑی تھی اور سنی آواز میں نکال رہا تھا۔ اسے سنی بہت پیارا لگتا تھا۔ وہ اس کے ساتھ کھیلنا چاہتا تھا لیکن اسے مشاعل کی مئی سے ڈر لگتا تھا اس نے سیڑھیوں پر کھڑے کھڑے سنی کی طرف دیکھا۔ یک دم ہی لاؤنج میں رکھے فون کی بیل ہوئی۔

”ضرور پیپا کا ہو گا!“ اس نے سوچا۔

اسے پیپا سے بات کرنا تھی۔ اسے پیپا کو بتانا تھا کہ وہ کھیل سکتا ہے۔

وہ تیزی سے ایک ایک دو سیڑھیاں پھلا نکلتا ہوا

نیچے اترنے لگا۔ کیری کاٹ کو اس کے پاؤں کی ٹھوکر لگی۔ سنی نے رونا شروع کر دیا تھا۔ مشاعل کی مئی یک دم ہی اپنے کمرے سے باہر نکلی تھیں اور باہر نکلتے ہی انہوں نے اسے تھپڑ مارا۔

”اندھے ہو۔ نیچے کو گرا دیا۔“

وہ گرا نہیں۔ وہ ٹوکاٹ میں ہے۔ اور میں نے کچھ نہیں کیا۔ وہ خود ہی رو رہا ہے۔“

سنی دونوں ہاتھ اونچے کیے ماما۔ ماما کر رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ ماما اسے اٹھالیں۔ مینو نے فون اٹھالیا تھا۔ وہ رخسار پر ہاتھ رکھے کبھی مشاعل کی مئی کو اور کبھی مینو کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”جی۔ جی صاحب!“ مینو ماؤتھ پیس میں کہتے ہوئے مشاعل کی مئی کی طرف دیکھ رہی تھی جو چلا رہی تھیں۔

”تم دشمن ہو سنی کے اسے مارنا چاہتے ہو۔“ ایک اور تھپڑ اس کے رخسار پر پڑا تھا۔ ”میں نے خود دیکھا ہے اپنی آنکھوں سے تم نے اسے سیڑھیوں سے لڑھکایا جان بوجھ کر وہ تو اللہ نے رکھ لیا۔“

”صاحب کا فون ہے۔“ مینو نے چلا کر بتایا حالانکہ وہ پہلے ہی جان چکی تھیں۔ وہ یونہی چلائی ہوئی فون تک پہنچی تھیں۔ سنی اپنے نظر انداز ہونے پر اب اونچا اونچا حلق پھاڑ کر رو رہا تھا۔ وہ ساکت کھڑا تھا۔

مشاعل کی مئی رو رو کر کیا کہہ رہی تھیں۔ وہ سن نہیں رہا تھا۔ مینو نے اس کے قریب آکر کہا تھا وہ فون پر اپنے پیپا سے بات کر لے شاید وہ اسے بلا رہے تھے۔ مشاعل کی مئی نے تمسخر اڑاتی نظروں سے اسے دیکھا۔ اور جھک کر کیری کاٹ کے اسٹریپ کھولنے لگیں۔

وہ میکا کی انداز میں آگے بڑھا تھا اور نیچے پڑا ہوا ریسپورا اٹھالیا۔

”جی پیپا!“ اس کے حلق سے پھنسی پھنسی سی آواز نکلی۔

”ہادی تم!“ وہ بہت غصے میں تھے۔

”تم اپنے ہی بھائی کو مارنا چاہتے تھے ذلیل انسان!“ وہ گالیاں دے رہے تھے اور وہ ہمیشہ کی طرح کچھ نہیں

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو پیسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریزیوم ایبل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✧ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

کہہ سکا تھا۔

”کیا کروں میں تمہارا۔۔۔ مرجاتے تم بھی اپنی ماں کے ساتھ۔ بلکہ مر گئے ہو میرے لیے۔“

وہ صفائی میں ہمیشہ کی طرح کچھ نہیں کہہ سکا۔ لفظ انڈائنڈ کرلیوں تک آتے، لیکن پھر لبوں سے باہر نہ نکل پاتے۔ وہ بتانا چاہتا تھا کہ اس نے سنی کے ساتھ کچھ نہیں کیا۔ اس نے سنی کو نہیں گرایا۔ اس نے بے بسی سے مینو کی طرف دیکھا جوں ہی ٹرائی صاف کر رہی تھی۔ لیکن مینو نظریں چرا کر ٹرائی پر زور و شور سے کپڑا رکڑنے لگی اور مشاعل بتا نہیں کہاں تھی۔

اس نے اوہرا دھردیکھا۔ اگر وہ یہاں ہوتی تو می اتنی دیدہ دلیری سے جھوٹ منہ بولتیں۔

”ہر روز تمہاری شکایتیں سن سن کر تھک چکا ہوں۔ ان چند دنوں میں تم نے کیا کیا نہیں کیا۔“

اب وہ اس کے قصور اور غلطیاں گنوارے تھے۔ ”میں۔۔۔ میں آئندہ تمہاری شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتا۔ تم میرے لیے مر گئے ہو ہادی!“

دوسری طرف ریسور زور سے پھینکا گیا تھا۔ اور وہ ریسور تھامے ساکت کھڑا رہ گیا۔ ریسور سے ٹوٹوں کی آواز آرہی تھی۔ ”مینو!“

مشاعل کی می نے سنی مینو کو پکڑا یا اور اس کے ہاتھ سے ریسور چھین کر کریڈل پر ڈالا۔

”اب کھڑے منہ کیا دیکھ رہے ہو۔ دفعہ ہو جاؤ یہاں سے تم۔“

”وہ کہاں جائے گا بھلا۔“

اس نے نم آنکھوں سے مشاعل کی می کو دیکھا تھا۔

”نکلو اس گھر سے۔ یہاں رہو گے تو سنی کو مار ڈالو گے۔“

انہوں نے اس کا بازو پکڑا اور دھکیلتے ہوئے دروازے تک لائیں اور پھر دروازے سے باہر دھکا

دیتے ہوئے دروازہ بند کر دیا اور دروازہ بند ہونے سے پہلے اس نے مشاعل کو دیکھا تھا، جو آنکھیں ملتی ہوئی اپنے کمرے سے باہر آئی تھی اس نے ملتی نظروں سے مشاعل کی طرف دیکھا۔

”کیا ہوا می؟“

”سنی کو مارنے لگا تھا۔ سیڑھیوں سے گرا دیا اسے۔“

اور دروازہ بند ہو گیا۔ بند دروازے کے باہر اس نے مشاعل کی باریک سی آواز سنی۔

”نہیں می! وہ کہاں جائے گا۔“

”میری طرف سے جہنم میں جائے۔“ وہ زور سے چلائی تھیں۔

”یہاں رہا تو کھانا کھوٹ دے گا میرے بچے کا۔“

”نہیں۔۔۔ نہیں پلیز دروازہ کھولیں۔“ وہ دروازہ

کھٹکھٹا رہا تھا۔

اس نے پہلی بار آج مشاعل کو آواز دی تھی۔

”مشی۔۔۔ مشاعل پلیز دروازہ کھولو۔“

اس نے سن روم کی کھڑکی کو بھی بجایا۔ آوازیں دیں۔ پھر وہ کچن کی طرف آیا۔ وہ کہیں جانا نہیں چاہتا تھا۔ وہ بابا کا انتظار کرنا چاہتا تھا۔ وہ انہیں بتانا چاہتا تھا کہ اس نے کچھ نہیں کیا۔ وہ سنی کے ساتھ کیسے کچھ کر سکتا ہے۔ وہ اس کا بھائی ہے اور وہ اس سے بہت پیار کرتا ہے۔ ٹھیک ہے بابا نے اس سے کہا ہے کہ وہ اس کے لیے مر گیا ہے۔ وہ اسے دیکھنا نہیں چاہتے، لیکن وہ ایک بار کوشش کر کے بابا کو بتانا چاہتا تھا۔ وہ لکھ کر بتا دے گا جیسے بھی ممکن ہو، لیکن اسے بابا کو بتانا ہے ہر صورت کہ وہ سنی کا دشمن نہیں ہے۔ وہ وہیں برآمدے میں دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ ایک بار اٹھ کر وہ کچن کی طرف بھی گیا تھا۔ کچن کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ وہ کتنی ہی دیر تک کچن کی کھڑکی کی جالی سے چہرہ چپکائے اندر دیکھنے کی کوشش کرتا رہا کہ شاید مینو کچن میں باپھر

مشاعل کی می ہی آجائیں وہ ان کی منت کر لے، لیکن کچن میں اندھیرا تھا۔ وہ پھر آکر برآمدے میں دروازے کے پاس ہی بیٹھ گیا تھا اور کان لگا کر اندر کی آوازیں سننے

کی کوشش کرتا رہا تھا۔ بہت دیر بعد اندر سے مینو اور می کی مدھم سی آواز آئی تھی۔ اس نے پھر دروازہ کھٹکھٹانا شروع کر دیا اور آوازیں دینے لگا۔ کچھ دیر بعد ہی دروازہ کھلا تھا۔ یہ مشاعل کی می تھیں۔
”تم ابھی تک یہیں مرے ہوئے ہو۔“

انہوں نے اسے پاؤں سے ٹھٹھا مارا تھا اور بازو سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے گیٹ کی طرف لے جانے لگیں تو مشاعل روئی ہوئی ان کے پیچھے آئی۔

”می! ایسا نہ کریں۔ می! ہادی کو نہ ماریں۔“

لیکن انہوں نے اسے گیٹ سے باہر نکال کر گیٹ بند کر دیا۔ کچھ دیر وہ یونہی گیٹ کے پاس کھڑا رہا۔ صبح سے ہونے والی بارش عصر تک ہوتی رہی تھی۔ اس وقت بھی فضا میں خنکی تھی، لیکن اوپر آسمان پر تارے چمک رہے تھے۔ اس نے اپنی پینٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالے۔ اس کے ہاتھ ٹھنڈے ہو رہے تھے۔ اس نے فوراً ہی جیب سے ہاتھ نکالا۔ جیب میں ایک مار کر اور چند سکے تھے۔ یہ مار کر اس کے دوست کا تھا، جو چھٹی کے وقت اس سے پہلے نکل گیا تھا اور اپنا بیگ اٹھاتے ہوئے وہ اسے نظر آگیا تو اس نے اسے جیب میں ڈال لیا تھا کہ وہ باہر ملے گا تو اسے دے دے گا، لیکن وہ اسے نہیں ملا تھا۔ وہ مار کر ہاتھ میں لیے کچھ دیر سوچتا رہا پھر اس نے گیٹ کے ساتھ دیوار پر بڑے بڑے لفظوں میں لکھا۔

”پاپا! میں نے سنی کو نہیں مارا۔ مشاعل کی ماما جھوٹ بولتی ہیں۔“

اس نے اوپر آسمان کی طرف دیکھا۔ اسے پاپا کا انتظار کرنا تھا، لیکن پاپا پتا نہیں کب آتے۔ اسے اس پاس کے اندھیرے سے یکایک خوف محسوس ہونے لگا، اور وہ چلنے لگا۔ بغیر سوچے کہ اسے کہا جانا ہے وہ چل رہا تھا۔ پگڈنڈی پر سفیدے کے درختوں سے ادھر۔ چونکا تو تب جب وہ گراؤنڈ کے پاس تھا۔ اس نے حیرت سے ادھر ادھر دیکھا کلب کی عمارت کے گیٹ پر مدھم روشنی کا پیلا بلب جل رہا تھا۔ وہ وہیں بیٹھ گیا گراؤنڈ کے باہر۔ زمین بارش کی وجہ سے گیلی تھی، لیکن اسے

کچھ بھی محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ وہ بیٹھ گیا تھا اور گراؤنڈ کی طرف دیکھ رہا تھا۔

دیکھتے ہی دیکھتے گراؤنڈ اور میدان بھر گیا تھا۔ اس کے کانوں میں سیٹیوں اور تالیوں کی آوازیں آرہی تھیں اور وہ بال کے پیچھے دوڑ رہا تھا۔ اس کی رفتار چیتے کی سی تھی۔ اس نے جست لگائی، بھکا، پیرا اور اٹھاپا۔ گیند کو ٹھوکر لگی۔ وہ فضا میں بلند ہوئی۔ مخالف ٹیم کے کھلاڑیوں کے سر سے گزرتے ہوئے گیند نے حیران کن موڑ کاٹا اور گیند میٹ میں پہنچ چکی تھی۔ ساٹھی کھلاڑیوں نے اسے کندھوں پر اٹھا لیا تھا۔

یکایک بادل گر جاتا وہ چونکا۔ گراؤنڈ کے کنارے وہ کیلی زمین پر بیٹھا تھا۔

ابھی کچھ دیر پہلے تو آسمان پر سینکڑوں تارے چمک رہے تھے اور اب یک دم ہی تاریکی چھا گئی تھی اور پانی کے ننھے ننھے قطرے گرنے لگے۔ وہ بھیگ رہا تھا۔ بجلی چمکی تو اس نے چند میٹر کے فاصلے پر گول پوسٹ کو دیکھا۔ وہ اٹھا۔

اب وہ ہولے ہولے چلتا ہوا گول پوسٹ کی طرف جا رہا تھا۔ وہ پہلی بار گراؤنڈ کے اندر قدم رکھ رہا تھا اور گول پوسٹ کو دیکھتے ہوئے ایک بار پھر اس کے الوژن نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ بادل چند قطرے برسا کر چلے گئے تھے۔ آسمان پر پھر تارے چمک اٹھے تھے، اور وہ گول پوسٹ کے پاس کھڑا تھا۔ وہ کب بیٹھا۔ کب وہیں بیٹھے بیٹھے کیلی زمین پر سو گیا۔

محی الدین صاحب نے صبح کمرے کی کھڑکی کھولی۔ مطلع صاف تھا۔ ابھی سورج نہیں نکلا تھا، لیکن فضا میں روشنی تھی۔ کل بھی بارش کی وجہ سے فاصلے ملتوی ہو گیا تھا۔ وہ گراؤنڈ کا جائزہ لینے کے لیے کمرے سے باہر نکل کر نیچے اترے۔ اگر گراؤنڈ کی حالت اچھی ہو تو وہ آج ہی فائنل کروادیں اور گھر جا سکیں۔

فاطمہ کا فون آیا تھا کہ گڑیا اپنے پاپا کے لیے بہت اداس ہے۔ وہ خود بھی اداس ہو رہے تھے۔ جب ایگل کلب کی طرف سے انہیں بلوایا گیا تو وہ انکار نہ کر سکے۔ انہیں اپنے اس چھوٹے سے شہر سے جواب ضلع بن

چکا تھا۔ بہت محبت تھی اور ایگل کلب سے تو ان کی بہت سی یادیں وابستہ تھیں۔ انہوں نے اور عبد الہادی نے اس کلب کی طرف سے بہت سے میچ کھیلے تھے اور کلب کے آفس میں آج بھی ان کی جیتی ہوئی ٹرافیاں جچی تھیں۔ وہ اپنی سوچوں میں کم کلب کے صدر گیٹ سے نکل کر میدان سے گزر کر گراؤنڈ میں پہنچے تو ٹھٹھک کر رک گئے۔ گراؤنڈ کے اندر گول پوسٹ کے پاس کوئی تڑا مڑا پڑا تھا۔ وہ تیزی سے اس کی طرف لپکے اور جھک کر اسے سیدھا کیا۔

وہاں تھا۔ وہی بچہ۔

وہ کب یہاں آیا اور یہاں کیوں سوراہا تھا۔ وہ پوچھنا چاہتے تھے، لیکن اس نے ایک بار آنکھیں کھول کر انہیں دیکھا تھا اور پھر آنکھیں بند کر لی تھیں۔ اس کے کپڑے بھیکے ہوئے تھے۔ کیا وہ ساری رات یہاں سوتا رہا ہے۔ رات کو غالباً اس بھی پڑی ہوگی اور زمین بھی گیلی تھی۔ انہوں نے جھک کر اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔ اس کا ہاتھ آگ کی طرح تپ رہا تھا۔

”ہادی۔ ہادی بیٹے!“ لیکن وہ ہوش میں نہیں تھا۔ انہوں نے اسے بازوؤں میں اٹھالیا۔ دس گیارہ سال کے دبے پتلے بچے کا وزن ہی کیا تھا۔ وہ اسے دونوں بازوؤں پر اٹھائے کلب کی عمارت کی طرف جارہے تھے۔



وہ لاؤنج میں اندھیرا کیے کھڑکی کے پاس بیٹھی تھی۔ کھڑکی کے روئے سٹے ہوئے تھے اور شیشوں سے اسٹریٹ لائٹ کی بدھم سی روشنی اندر آرہی تھی۔ کبھی کبھی وہ اٹھ کر شیشے سے ناک چیکائے کھڑکی سے باہر دیکھنے لگتی۔ سامنے غلام مصطفیٰ کے بیڈ روم کی بالکونی تھی جس کا دروازہ بند تھا، لیکن پھر بھی وہ وقفے وقفے سے اوھر دیکھتی تھی، لیکن نہیں جانتی تھی کیوں۔ باہر سرد ہوا میں چل رہی تھیں بجن کی خنکی میں برف کے ذرات اڑتے تھے اور بالکونی ویران پڑی تھی، پھر بھی اسے اوھر دیکھنا اچھا لگ رہا تھا۔ اوھر اس کھڑکی طرف،

جہاں مصطفیٰ رہتا تھا۔ کبھی کبھی وہ کھڑکی کھول دیتی تو ایک دم بخ بستہ ہوا اس کے چہرے سے ٹکراتی تو وہ کھڑکی بند کر کے ناک شیشے سے چکالتی۔ حالانکہ بالکونی ویران پڑی تھی اور سامنے والے کھڑکی لائٹیں بند ہو چکی تھیں، سوائے گیٹ پر جلتے مدھم سے بلب کے اور غلام مصطفیٰ سوچکا ہوگا۔ اور یہ والا کمرہ جس کی بالکونی میں چند بار اس نے غلام مصطفیٰ کو دیکھا تھا، پتا نہیں مصطفیٰ کا بیڈ روم تھا یا اسٹڈی یا پھر۔

وہ یونہی لالچنی سی باتیں سوچتی رہی اور اٹھ اٹھ کر کھڑکی کے شیشوں سے باہر دیکھتی رہی اور پتا نہیں کتنی دیر گزر گئی، جب اس نے گاڑی کی اور پھر دروازہ کھلنے کی آواز سنی تھی اور ساتھ ہی اونچا اونچا بولنے کی آواز سیہ یقیناً ”مارتھا کی آواز تھی۔ مارتھا جو ایسی پارٹیوں کے بعد گھر آ کر یوں ہی چیختی چلاتی تھی، کیوں کہ وہ زیادہ پی جاتی تھی اور آج بھی لاؤنج کی ملکیتی روشنی میں اس نے پال اور مارتھا کو اندر آتے دیکھا۔

پال نے مارتھا کو سہارا دے رکھا تھا جبکہ وہ خود بھی لڑکھڑا رہا تھا۔ وہ لائٹ جلائے بغیر صوفے پر گرنے کے سے انداز میں بیٹھ گیا تھا۔

”تم زندگی بھریوں ہی رہنا احق بے وقوف۔“
مارتھا جو وہاں ہی رک گئی تھی چلائی۔
”چلاؤ مت۔ تمہارے چلانے سے جوزی جاگ جائے گی۔“

”جوزی جاگ جائے گی۔“ مارتھا پہلے زور سے ہنسی، پھر چیخی۔

”کیا وہ دو تین سال کی ننھی بچی ہے جو تمہیں اس کے جاگ جانے کی فکر ہے۔“

اس کی آواز پہلے سے زیادہ بلند تھی اور وہ جہاں کھڑی تھی وہاں سے اسے جوزفین بیٹھی نظر نہیں آرہی تھی۔

”اے بس کرو پال۔! بس کرو۔ اس کے منہ میں لقمے بنانا کرو الٹا۔“

وہ ایک ہاتھ کمر پر رکھے اسے گھور رہی تھی۔
”تمہیں غصہ کس بات پر ہے مارتھا! میں ابھی تک

سمجھ نہیں سکا۔ میں نے تمہیں بتایا تو تھا کہ وہ مجھے بتا کر آئی تھی کہ وہ گھر جا رہی ہے۔“
 ”تمہیں بتا کر کیا تم میزبان تھے۔ اسے ایلین کو بتانا چاہیے تھا۔ اس سے معذرت کرنی چاہیے تھی۔ اگر ایسی ہی اس کی طبیعت خراب ہو گئی تھی تو حالانکہ اس کی طبیعت ہرگز خراب نہیں تھی۔ اس نے بہانہ کیا ہو گا۔“

”بہانہ!“ پال نے سوچا۔ ”اس نے کہا تھا وہ گھر جا رہی ہے بس۔“
 ”اور جانتے ہو مجھے کتنی شرمندگی ہوئی جب ایلین نے مجھ سے پوچھا۔ وہ کہاں ہے اور میرے بجائے اس لیے لڑکے نے جواب دیا کہ وہ اس فٹ بالر غلام مصطفیٰ کے ساتھ چلی گئی۔“

”وہ وہ اسے کہاں سے مل گیا؟“
 پال چونک کر سیدھا ہو گیا۔ اسے غلام مصطفیٰ کا کھیل پسند تھا اور جب وہ اپنے شہر میں رہتا تھا تو وہاں کے ایک فٹ بال کلب کی طرف سے خود بھی کھیلتا تھا۔ اسکول اور کالج کے زمانے میں۔

”وہ لمبا لڑکا ہی اسے اپنے ساتھ پارٹی میں لایا تھا۔ اور وہ تمہاری معصوم بیٹی اس کے ساتھ چلی گئی۔ میں کہہ رہی ہوں پال! تمہاری لڑکی مسلمانوں سے بہت ہمدردی رکھتی ہے۔ سنبھالو اسے۔ وہ چار سال جو اس نے اپنے سوتیلے باپ کے گھر گزارے۔“

”نہیں۔“ پال نے اس کی بات کاٹی۔ ”وہ ایسا آدمی نہیں تھا۔ مجھے خود جوزی نے بتایا تھا کہ وہ اپنی میمی کے ساتھ ہر سنڈے کو سروس کے لیے چرچ جاتی تھی اور اس کے باپ نے کبھی منع نہیں کیا۔“ اس کے لہجے میں یقین تھا۔

”وہ بہت نا اُس آدمی تھا۔“
 ”تب ہی تمہاری سابقہ بیوی مسلمان ہو گئی تھی۔“ مار تھا مسخرے ہنسی۔

”وہ اپنی مرضی سے مسلمان ہوئی تھی۔“
 ”اچھا!“ مار تھا کا اچھا خاصا لمبا تھا، پھر وہ تھوڑا سا آگے بڑھی۔ اس کی آواز سرگوشی میں بدل گئی تھی۔

”سنو پال! آج ایلین نے مجھ سے صاف لفظوں میں کہا۔ وہ جوزی کو اپنے ساتھ رکھنا چاہتا ہے۔ بھلے کل ہی وہ اس کے اپارٹمنٹ میں شفٹ ہو جائے۔“
 ”مار تھا!“ پال کی آنکھیں پھٹ گئیں۔ ”میں تمہیں بتا چکا ہوں میں ایسا نہیں کروں گا۔ میں اپنی بیٹی کی شادی کروں گا۔“

”اچھا! یہاں کون تمہاری بیٹی سے شادی کرے گا؟ تم ویسی عیسائی۔ ہو نہ۔“ مار تھا نے دائیں طرف منہ کر کے تھوکا۔

”میں پاکستان چلا جاؤں گا اور وہاں دھوم دھام سے اپنی بیٹی کی شادی کروں گا۔“

مار تھا لمحہ بھر آنکھیں میچ کر اسے دیکھتی رہی۔ پھر اس نے اپنی پوری آنکھیں کھولیں۔

”تو ایلین بھی کہہ رہا تھا کہ اگر دونوں میں انڈر اسٹینڈنگ ہو گئی تو وہ جلد شادی کر لیں گے، لیکن ابھی نہیں۔“

”ہاں ابھی نہیں جب تین چار بچے ہو جائیں گے تب اور تب تک اگر انڈر اسٹینڈنگ نہ ہوئی تو بچوں سمیت گھر سے باہر نہ ہیں نا۔ ایسا ہی نا۔“

پال کی آواز بلند ہو گئی تھی اور گود میں رکھے جوزفین کے ہاتھ ٹھنڈے رخ ہو رہے تھے۔ ایک بار پھر اس کی وجہ سے دونوں میں لڑائی ہونے جا رہی تھی۔

”چلاؤ مت۔“ مار تھا کی آواز بھی بلند ہوئی۔

”سوچو۔ سوچو ذرا ایک ویسی عیسائی کی ویسی بیٹی کے انگریز بچے۔ تم اقلیت سے اکثریت بن جاؤ گے، تمہارے نواسے اور نواسیاں۔“

وہ لہرائی اور فضا میں دونوں طرف ہاتھ پھیلا کر گھومی۔

”انگریز۔“
 ”چپ کرو۔“ پال اور بھی بلند آواز میں چیخا اور لہراتے ہوئے مار تھا نے یک دم لاسٹ جلا دی۔ جوزفین کی آنکھیں یک دم تیز روشنی نے چندھیادیں۔ اس نے ایک دم آنکھوں پر ہاتھ رکھا اور گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔ مار تھا نے اسے دیکھ لیا۔

”تم یہاں بیٹھی کیا کر رہی ہو؟“ مار تھا اب اس سے مخاطب تھی۔

”میں۔ میں آپ لوگوں کا انتظار کر رہی تھی۔“
مار تھانے اوپر سے نیچے تک مشکوک نظروں سے اسے دیکھا۔ وہ ابھی تک اسی پارٹی ڈریس میں تھی۔

”تم تب سے اب تک یہاں بیٹھی ہو۔“ بایاں ہاتھ کمر پر رکھے مار تھا مسخرے ہنسی۔

”اور وہ تمہارا بوائے فرینڈ۔ کیا وہ تمہارے ساتھ رنگ رلیاں منا کر چلا گیا۔“

”وہ میرا بوائے فرینڈ نہیں، میں نے صرف گھر تک لفٹ لی تھی۔ وہ یہاں ہی رہتا ہے سامنے تو۔“

اور وہ فٹ بال کا کھلاڑی ہے غلام مصطفیٰ۔“ اس نے پال کی طرف دیکھا۔ اس نے اس طرح پال کو مصطفیٰ کے متعلق بتانے کا نہیں سوچا تھا۔

”اچھا۔ ٹھیک ہے۔ تم جاؤ، اپنے کمرے میں جا کر سو جاؤ۔ اور تمہیں ہمارا انتظار کرنے کی کیا ضرورت تھی ہنی!“ پال کا لہجہ نرم تھا۔ اس نے ممنون نظروں سے پال کی طرف دیکھا اور جانے کے لیے قدم بڑھایا۔
”نہیں۔!“ مار تھانے اس کا بازو پکڑ کر اسے جانے سے روک دیا۔ جوزفین کو اس کی انگلیاں اپنے بازو میں چبھتی ہوئی سی محسوس ہوئیں۔

”بات تمہارے متعلق ہو رہی ہے۔ بہتر ہے کہ تم بھی سن لو۔ میں نے ایللی سے کہا ہے کہ تم دو تین روز تک اس کا اپارٹمنٹ۔ شیئر کرو گی اور۔“
”نہیں۔“ اس کے ہونٹوں سے باریک سی آواز نکلی تھی اور پال دھاڑا تھا۔

”نہیں۔ مار تھا! میں کہہ چکا ہوں کہ ہم ایسا نہیں کر سکتے۔ ہمارے پاکستان میں ایسا نہیں ہوتا۔“

”تمہارے پاکستان میں کیا کچھ نہیں ہوتا کیا میں نہیں جانتی؟“

”جو کچھ بھی ہوتا ہے، لیکن یہ نہیں ہوتا۔ میری بہنوں کی اور میرے بھائیوں کی اور میرے دوسرے

رشتہ داروں کی سب بچوں کی شادیاں ہوئیں۔ بیٹیاں رخصت ہو کر گھروں سے گئیں۔ ایسے نہیں۔“

”تو ہم بھی اسے رخصت کر دیں گے، میں اور تم۔ دونوں اسے ایللی کے اپارٹمنٹ میں چھوڑ آئیں گے۔ تمہاری اس چوچی کو۔“

”مار تھا۔ مار تھا خداوند یسوع مسیح کے لیے۔ یہ خناس دماغ سے نکال دو۔ ہم۔“

”باس۔!“ مار تھانے ہاتھ بلند کر کے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور خود صوفے پر دھپ کر کے بیٹھی اور اسے گھورنے لگی۔ وہ پال کے صوفے کے بائیں طرف پشت پر ہاتھ رکھے کھڑی تھی۔ اس کی ٹانگوں میں لرزش تھی۔ اسے لگا جیسے وہ گر جائے گی، اگر اس نے صوفے پر ہاتھ نہ رکھا ہوتا۔

”تم۔!“ اس نے انگلی اٹھا کر جوزفین کی طرف اشارہ کیا۔

”صبح تک فیصلہ کر لو۔ نہیں تو صبح میں تمہارا سامان اٹھا کر باہر پھینک دوں گی۔ یہاں کے لائے کے مطابق اب تم ہماری ذمہ داری نہیں رہی ہو۔ تمہیں ایللی کے پاس نہیں جانا مت جاؤ۔ لیکن یہاں سے دفعہ ہو جاؤ۔ جہاں بھی جانا ہے جاؤ۔ اٹھارہ سال کے بعد سب خود کھاتے ہیں۔ تم انیس سال کی ہونے والی ہو۔ جاب کرو۔ اپنا اپارٹمنٹ لو۔ کسی کے ساتھ شیئر کرو یا جو بھی کرو۔ یہ گھر چھوڑ دو۔ اچھی طرح سن لیا ہے تم نے۔“

اس نے اپنا ہاتھ نیچے کیا۔ پال پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”یہ کیا بکو اس کر رہی ہو۔ ہمیشہ بی کر آؤٹ ہو جاتی ہو۔ منع کر رہا تھا میں زیادہ مت پو، لیکن وہ صحیح ہے نا کہ مال مفت دل بے رحم۔“ وہ ہنسا۔

”وانت اندر کرو۔ یہ بکو اس نہیں ہے۔“

”اگر یہ بکو اس نہیں ہے تو یہ ایللی کیسے رہے گی۔ نہیں رہ سکتی۔ نیا سمسٹر شروع ہونے پر میں اسے کالج میں داخل کروانے والا ہوں۔ میں اپنی کمائی خرچ کروں گا اس پر۔“

”بچھلے دو سال سے تم یہی کہہ رہے ہو اور تمہاری کمائی۔“ مار تھا ایک ہاتھ دوسرے ہاتھ پر مار کر زور سے

”لیکن میں یہاں بہت خوش ہوں۔ یہاں سب مجھے برٹش ہی سمجھتے ہیں۔ خالص انگریز۔“

”ہاں جب تک تم نہ بولو۔ جب تم بولتی ہو تو بھانڈا پھوٹ جاتا ہے۔“

پال نے قہقہہ لگایا اور اٹھ کر دور کھڑا ہو گیا۔ وہ قہقہہ لگا رہا تھا۔

”بکومت۔“ مار تھا کی اتار پر ضرب پڑی تھی کہ اس نے نیبل پر بڑا گلدان اٹھا کر اس کی طرف پھینکا۔ جو اسے نہیں لگا تو مار تھا کے ہاتھ میں جو چیز لگی وہ اٹھا اٹھا کر اس کی طرف پھینکنے لگی۔ کشن، لکڑی اور پیتل کے ڈیکوریٹیشن ہمساز جو وہ پاکستان سے لائے تھے۔ صوفے کے پیچھے دہلی جوزفین نے سوچا شکر ہے کوئی کرشل یا شیشے کی چیز نہیں ہے یہاں۔ پال بندروں کی طرح پورے کمرے میں گھومنا ہوا مار تھا مار تھا کہہ رہا تھا، پھر آخری چیز اس کی طرف پھینک کر مار تھا کھٹ کھٹ کرتی ہوئی لاؤنج سے نکل گئی تو جوزفین نے صوفے کے پیچھے سے نکل کر دیکھا۔ لاؤنج میں سلمان بکھرا پڑا تھا اور پال بیچوں بیچ کھڑا حیران نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

پھر وہ بیٹھ گیا اور یکایک وہ رونے لگا، اونچا اونچا بلند آواز میں۔ یقیناً ”وہ بھی نشے میں تھا اور مار تھا کی طرح اس نے بھی بہت پی لی ہوگی۔ جوزفین ہولے ہولے چلتی اس کے قریب آئی اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

”پالا!“ پال نے آنسو بھری آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”مار تھا بہت ظالم ہے جوزی۔ وہ میری بات نہیں سمجھتی۔ آؤ ہم دونوں پاکستان چلتے ہیں!“

”پاکستان ہاں ٹھیک ہے لیکن۔“

اور یہ لیکن پتا نہیں کیسے اس کے ذہن میں آکر اٹک گیا۔ وہ بات ادھوری چھوڑ کر پال کو دیکھنے لگی۔ وہاں غلام مصطفیٰ تو نہیں ہوگا۔ اگر وہ پاکستان چلی گئی تو پھر کبھی غلام مصطفیٰ کو نہیں دیکھ سکے گی اور کبھی اس سے نہیں مل سکے گی۔

نہی۔

”ہم دونوں کی کمائی سے بمشکل گھر کا کرایہ مل اور ٹیکس ادا ہوتے ہیں۔ اور یہ جو ہم کھاتے ہیں ٹامپینے میں ایک بار چکن اور انڈے۔“

وہ زور زور سے منے لگی اتنا کہ آنکھوں سے آنسو بننے لگے۔ آنسو پونچھتے ہوئے اس نے پال کی طرف دیکھا۔ ”پھر یہ بھی نہیں ملیں گے بلکہ فالتے۔ سنا تم نے۔“

”میں اور ٹامپ کر لوں گا۔“

”واہ! تم اور ٹامپ کرو گے۔“ اس نے تالی بجائی۔

”یادری جیکب کے لاڈلے بیٹے تم۔ اور اس سے اپنی بیوی کو پرہاؤ گے۔“

اس نے پھر تالی بجائی اور دیر تک بجاتی رہی۔ وہ یقیناً ”نشے میں بھی۔ جوزفین کو یقین تھا، لیکن نشے میں بھی وہ ٹاک ٹاک کر نشانے لگا رہی تھی۔

”جو بھی کرو۔“ اس نے تالی بجانا بند کی۔ ”یہ کل سے یہاں نہیں رہے گی۔ اگر رہتا ہے تو اپنے حصے کا خرچ دے اور کمرے کا کرایہ۔“

مار تھا ذرا سی نرم پڑی تھی۔

”مار تھا! چلو پاکستان چلیں۔ وہاں ہم کتنے خوش تھے، اور ہماری کتنی عزت تھی۔ تم اسکول میں پڑھاتی تھیں۔ گھر میں ماسی کام کرنے آتی تھی۔ تمہیں کام نہیں کرنا پڑتا تھا اور۔“

وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور مار تھا کے پاس زمین پر بیٹھ کر اس کے گھٹنے پر ہاتھ رکھے۔

”پلیز چلو پاکستان واپس۔ وہاں ہماری جوزی پڑھ کر ڈاکٹر بنے گی۔ یہ جب پیدا ہوئی تھی تو اس کے دادا نے کہا تھا اے ہم ڈاکٹر بنائیں گے۔“

”ہرگز نہیں۔“ مار تھا نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔

”اتنے سالوں سے تمہارا بھائی کوشش کر رہا تھا اور اب جبکہ ہمیں برٹش پاسپورٹ ملنے والے ہیں ہم یہاں سے چلے جائیں احمق!“

”لیکن میں یہاں ناخوش ہوں مار تھا! بہت ناخوش۔“

اس کا لا شعور اس سے کہہ رہا تھا، لیکن وہ پال کو دیکھ رہی تھی اگر آج سے پہلے پال نے یہ کہا ہوتا تو وہ خوشی سے اچھل پڑتی۔

اسے پاکستان بہت پسند تھا اور پاکستان میں بھی اپنے باپ کا شہر جہاں گرجے سے منسلک ان کا گھر تھا۔ گرجے کی طرح ہی سرخ اینٹوں سے بنا انگریزوں کے زمانے کا اور جہاں گرجے کی پیشانی پر سن تعمیر 1942ء لکھا تھا اور گھر سے منسلک چھوٹا سا باغیچہ جس میں دادا سردیوں میں اپنی آرام دہ کرسی پر دراز یا بیل پر بٹھا کرتے تھے اور دادی پاس ہی بیٹھی سوٹر بنتی تھیں۔ وہ وہاں اس گھر میں جا کر بہت خوش ہوتی، لیکن یہ تو تب ہوتا تھا جب اسے غلام مصطفیٰ نہ ملا ہوتا، لیکن اب تو وہ غلام مصطفیٰ سے ملی تھی اور اسے لگتا تھا جیسے اس کے پاؤں بندھ گئے ہوں اور وہ اب یہاں سے نہ ہل سکے گی۔ کیوں کہ یہاں غلام مصطفیٰ ہے وہ غلام مصطفیٰ کی وجہ سے یہاں سے کیوں نہیں جانا چاہتی تھی، اس وقت وہ نہیں جانتی تھی، لیکن لا شعور نے شعور میں یہ بات منتقل کر دی تھی اور اب وہ پال کی طرف دیکھ رہی تھی۔

”ممی سچ کہتی ہیں۔ مارشل انکل سات سال سے کوشش کر رہے تھے اور اب جبکہ ہمیں پاسپورٹ ملنے والے ہیں تو ہمیں۔“ اس نے پال کے کندھے پر رکھے ہاتھ ذرا سادبا کر اسے تسلی دی۔

”ایک بار ہمیں برٹش پاسپورٹ مل جائیں تو پھر ہم چلے جائیں گے اور جب بھی آنا ہوا تو ہم آسکتے ہیں۔“ پال نے آنسو بھری آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔ ”ہوٹس تم بھی۔“ والی نظر سے، لیکن اس نے نظریں نہ اٹھیں۔

”اور میں جاب کر لوں گی بابا۔ ممی کے اسٹور پر ایک سیلزمین کی جگہ ہے یا پھر نہیں بھی۔“

”اور جاب کر کے تم گھر چھوڑ دو گی۔“

”نہیں۔ میں یہیں رہوں گی اور ممی کو کرایہ دوں گی۔“

”ہائے میں یہاں کیوں آیا!“ پال نے عورتوں کی

طرح سینے پر ہاتھ مارا۔

وہ بہت سنجیدہ اور بردبار سا تھا، لیکن اس وقت نشے میں اسے خود پر اختیار نہیں تھا۔ وہ وہاں پاکستان میں اس طرح رینج ٹیس گیا تھا کہ یہاں کے ماحول کو قبول نہیں کر رہا تھا۔ حالانکہ بہت سارے لوگ قبول کر لیتے ہیں اور یہاں زیادہ خوش رہتے ہیں، لیکن وہ خوش نہیں تھا۔ اسے جوزفین کے لیے یہ سب پسند نہیں تھا۔ شاید اس لیے کہ وہ ایک پادری کا بیٹا تھا یا پھر اس کی اپنی کیمسٹری ہی ایسی تھی کہ اسے جوزفین کے لیے یہ قبول نہیں تھا۔

”تمہ۔ تمہارا دل چاہتا ہے اپنی ممی کے پاس جانے کو۔“ اب اس نے پینتر ابد لا تھا۔

”میں تمہیں دھوکے سے لے آیا تھا تمہاری ممی کے پاس سے تو تمہ۔“

”نہیں۔ مجھے ممی کے پاس نہیں جانا۔“

وہ ممی کے بجائے پال کے ساتھ زیادہ خوش تھی اور مار تھا بھی جب تک پاکستان میں تھی اس کا رویہ ٹھیک تھا۔ ممی کے پاس جانے کا خیال تو اسے کبھی کبھی اس لیے آتا تھا کہ کیا خبر۔ اور پتا نہیں وہ۔ پال پھر رونے لگا تھا۔

”میں آپ کے ساتھ رہوں گی ہمیشہ۔“

وہ صوفے پر بیٹھ گئی اور اس نے پال کا سر سینے سے لگا لیا۔ پال کے سر کو چوم اور ہولے ہولے تھکنے لگی۔ بالکل ایسے جیسے پال کی ماں اسے تھکتی تھی۔

وہ صبح بہت چمکیلی اور روشن تھی جب اس کی آنکھ کھلی تو دھوپ کھڑکی کے شیشوں سے چھن چھن کر سیدھی اس کے بیڈ پر آرہی تھی۔ اس نے چاروں طرف دیکھا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ یہ کمرہ اس کا نہیں تھا۔ یہ تو کسی ہاسٹل کا کمرہ تھا۔

اس نے لوہے کے پائپوں والے بیڈ کو دیکھا۔ ایسا ہی ایک اور بیڈ اس کے بیڈ کے بائیں طرف والی دیوار کی طرف لگا تھا، لیکن وہ خالی تھا۔ میں یہاں کیسے۔ اس

نے اپنے آپ سے پوچھا اور پھر اسے سب کچھ یاد آتا گیا۔

مشاعل کی ممی نے اسے گھر سے نکال دیا تھا اور پھر وہ۔۔۔ ہاں وہ وہاں گول پوسٹ میں بیٹھا تھا پھر۔۔۔ پھر کیا ہوا تھا اسے یاد نہیں تھا۔ تب ہی واش روم کا دروازہ کھول کر تو لیے سے ہاتھ پونچھتے ہوئے محی الدین باہر نکلے۔ اسے بیڈ پر بیٹھے دیکھ کر مسکرائے۔

”ہیلوینگ بوائے! کیسے ہو تم؟“

اس نے مسکرائے کی کوشش کی لیکن آنکھوں میں نمی پھیل گئی۔ وہ خالی خالی آنکھوں سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ بیڈ پر اس کے پاس ہی بیٹھ گئے اور انہوں نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا۔

”اگر اس صبح تم مجھے گراؤنڈ میں نہ ملتے تو میں اس وقت اپنے گھر میں ہوتا۔ تم جانتے ہو تمہیں نمونیہ کا شدید اٹیک ہوا تھا اور تمہارے بچنے کی امید نہیں تھی۔ تم تین دن آئی سی یو میں رہے اور پھر دو دن پہلے تمہیں یہاں شفٹ کیا گیا تھا۔ تمہیں آج یہاں چھٹا دن ہے۔“

”کیا خبر پایا آگئے ہوں۔“ وہ سوچ رہا تھا۔

”میں نے بہت کوشش کی تمہارے گھر والوں کے متعلق، لیکن پتا نہیں چل سکا۔ چھ دنوں میں کوئی شخص بھی تمہیں ڈھونڈتا ہوا نہیں آیا۔ کسی نے کوئی اعلان نہیں کروایا۔ میں سوچ رہا تھا آج تمہاری طبیعت ٹھیک ہو جائے تو تھانے سے پتا کروں شاید کسی نے کوئی رپورٹ درج کروائی ہو۔“

”نہیں۔۔۔ میرے پیپا گھر پر نہیں تھے اور۔۔۔“ آنسو اس کی آنکھوں سے بہہ نکلے۔ ”مشاعل کی ممی نے مجھے گھر سے نکال دیا تھا۔“

وہ رک رک کر سب کچھ بتاتا چلا گیا اور محی الدین صاحب تاسف سے اسے دیکھتے رہے۔

”اب تم کیا کرو گے۔ کہو تو میں تمہارے ساتھ تمہارے گھر چلوں۔“

”لیکن اگر پیپا نہ آئے ہوئے تو ممی مجھے گھر میں نہیں گھسنے دیں گی۔“

”ہوں!“ وہ سوچنے لگے۔ ان کا دل اس بچے کے لیے گداز ہو رہا تھا جس کی سیاہ خوب صورت آنکھوں میں بلا کی کشش تھی۔ اس بچے سے انہیں بڑی اپنائیت محسوس ہو رہی تھی۔

”تمہارے رشتہ دار جن کے ہاں تم اپنے پیپا کے آنے تک ٹھہر سکو۔“ کچھ دیر بعد انہوں نے پوچھا۔ اس نے نفی میں سر ہلایا۔

”میرے دادا اور دادی زندہ نہیں ہیں۔ ایک چچا اور پھپھو ہیں، دونوں ناروے میں رہتے ہیں اور صرف ایک ماموں تھے جو ماپا کی ڈھنڈھ سے پہلے ہی فوت ہو گئے تھے۔ میری ماما کہتی تھیں وہ مجھے اس لیے ہادی کہہ کر بلاتی ہیں، کیوں کہ میرے ماموں کا نام بھی ہادی تھا۔“

ماں اور ماموں کے ذکر پر اس کی آنکھیں چمکنے لگی تھیں۔

”میرے ماموں پلیئر تھے۔ اگر ان کا ایکسپلنٹ نہ ہوتا تو آج پاکستان میں۔“

”تمہارے ماموں پلیئر تھے اور ان کا نام عبدالہادی تھا۔“ محی الدین نے بے قراری سے پوچھا۔ ”تب ہی تو۔ تب ہی تو تم اتنے اپنے سے لگ رہے تھے۔ تم کلثوم آپا کے بیٹے ہونا ہادی! ہاں مجھے پتا ہے آپا نے تمہارا نام ہادی رکھا تھا۔“

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ حیرت سے انہیں دیکھ رہا تھا۔

”ہادی میرا بہت اچھا دوست تھا۔ میرا واحد دوست۔ اور مجھے پتا ہی نہیں چلا۔ مجھے کسی نے بتایا ہی نہیں کہ آیا۔ آپا کا انتقال ہو گیا۔“ ان کی آواز بھرا گئی۔ ”میں تبھی تو پہلے پاکستان میں نہیں تھا اور اب آیا تو لاہور ہی سمیٹل ہو گیا۔ جب ہادی زندہ تھا تو میں اکثر ہادی کے ساتھ آپا کے گھر جاتا۔ تو وہ کھانا کھلائے بغیر آنے نہ دیتی تھیں۔ آپا کو ہادی سے بہت پیار تھا کیوں کہ ہادی بہت چھوٹا سا تھا جب ہادی کے والدین کا آگے پیچھے انتقال ہو گیا تھا اور خود ان کی اولاد نہیں تھی۔“

نرس اندر آئی۔ اس کے ہاتھ میں ٹرے تھی۔

”ناشتا لیا؟“ اس نے ہادی سے پوچھا۔
 ”نہیں سسٹر ابھی اٹھا ہے۔“ انہوں نے نرس کی طرف دیکھا۔

”کیا آج میں اسے گھر لے جاسکتا ہوں۔“
 ”ڈاکٹر صاحب سے پوچھ لیں ایک بار۔ میرے خیال میں یہ بہت ستر لگ رہا ہے۔“

اس نے بخار چیک کیا اور ان کی طرف دیکھا۔
 ”ناشتا کروا کے یہ دوا دے دیں۔“ اس نے ٹرے میں سے کچھ گولیاں اٹھا کر انہیں دیں اور فائل اٹھا کر اس میں سپر پیچر نوٹ کیا۔

”کیا ابھی سپر پیچر ہے۔“ انہوں نے پوچھا۔

”ہاں، لیکن زیادہ نہیں۔ ہنڈرڈ ہے۔“ نرس بتا کر چلی گئی تو وہ اس کے لیے ناشتا لینے چلے گئے۔ وہ خاموش لیٹا کھڑکی سے چھن چھن کر آتی دھوپ کو دیکھتا رہا۔ اس کے ذہن میں کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ کچھ بھی نہیں سوچ رہا تھا۔ نہ پیپا کے متعلق نہ مشاعل کی می کے متعلق۔ بس خالی خالی نظروں سے کبھی کھڑکی کی طرف دیکھتا اور کبھی پورے کمرے میں نظر دوڑاتا اور پھر آنکھیں بند کر لیتا۔ کچھ دیر بعد وہ ناشتا لے کر آگئے۔ اس نے صرف آدھا سلائس کھایا تھا وہ بہت پریشان لگ رہا تھا۔ انہوں نے اسے دوا میں دیں اور اس کا کندھا تھپتھپایا۔

”تم پریشان مت ہو بیٹا! میں خود تمہارے پیپا سے بات کروں گا اور انہیں سمجھاؤں گا۔ ان شاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

”پیپا آپ کی بات مان لیں گے؟“ وہ متذبذب سا انہیں دیکھ رہا تھا۔

”کیوں نہیں۔ وہ مجھے جانتے ہیں۔ جب ہادی زندہ تھا تو کئی بار ملاقات ہوئی تھی۔“ وہ مسکرائے۔

”تم اب لیٹ جاؤ۔“ وہ خاموشی سے لیٹ گیا اور کچھ دیر بعد ہی سو گیا۔ پچھلے دو دن بھی وہ دواؤں کے زیر اثر سو رہا تھا۔ وہ اسے اکیلا چھوڑ کر جانا نہیں چاہتے تھے، لیکن انہیں جانا تھا۔ پچھلے پانچ دنوں سے وہ اس کے پاس ہی اسپتال میں تھے۔ پہلے تین دن تو اس

کی حالت بہت ہی خراب تھی، لیکن آج انہیں ہر صورت حبیب الرحمن سے ملنا تھا۔ انہیں لاہور سے آئے بہت دن ہو گئے تھے۔ فاطمہ اور گڑیا بہت پریشان ہوں گی۔ وہ جانتے تھے، لیکن وہ اسے یوں بے یار و مدد گار چھوڑ کر نہیں جاسکتے تھے۔

وہ عبد الہادی کا بھانجا تھا، لیکن اگر وہ عبد الہادی کا بھانجا نہ بھی ہو تائب بھی وہ اسے یوں چھوڑ کر نہیں جاسکتے تھے۔ ایک وارڈ بوائے کو اس کا خیال رکھنے کا کہہ کر وہ اسپتال سے نکلے۔ باہر نکلتے ہی انہیں ٹانگہ مل گیا تھا اور حبیب الرحمن کے گھر تک پہنچنے میں انہیں کوئی دقت نہیں ہوئی تھی۔ سفیدے کے درختوں سے گزر کر وہ وہی گھر تھا جس میں کئی بار وہ ہادی کے ساتھ آیا سے ملنے آئے تھے۔ بیل دینے پر ملازمہ نے گیٹ کھولا اور ان کے استفسار پر بتایا کہ ”صاحب گھر نہیں ہیں۔ کراچی گئے ہوئے ہیں۔“

”اچھا!“
 وہ سوچ میں پڑ گئے۔ ”بیگم صاحبہ تو گھر پر ہیں نا؟“

”جی۔!“ ملازمہ نے سر ہلایا۔
 ”تو بیٹا! پھر ان سے جا کر کہو کوئی ملنے آیا ہے۔“

اور کچھ دیر بعد ہی وہ ڈرائنگ روم میں بیٹھے مشاعل کی می سے بات کر رہے تھے۔
 ”وہ ابھی تک مکمل طور پر ٹھیک نہیں ہوا۔ بہت کمزور ہے۔“ ہادی کی بیماری اور اس کے ملنے کی تفصیل بتا کر انہوں نے کہا۔

”میں چاہتا ہوں۔ آپ اسے معاف کر دیں۔ بچہ ہے یقیناً کوئی غلطی ہو گئی ہوگی۔ میں آج شام اسے اسپتال سے لے آؤں گا۔“

”ہرگز نہیں۔“ وہ جواب بھی کچھ دیر پہلے بہت اچھی طرح بات کر رہی تھیں۔ یکدم ہی ان کا لہجہ بدل گیا۔
 ”حبیب نے اسے گھر سے نکال دیا ہے۔ وہ ایسے آوارہ لڑکے کو گھر میں نہیں رکھنا چاہتے۔“

وہ کتنی ڈھٹائی سے جھوٹ بول رہی تھیں۔ انہوں نے حیرت سے انہیں دیکھا۔

”لیکن مجھے علم ہوا تھا کہ حبیب بھائی کافی دنوں سے

کراچی گئے ہوئے ہیں۔ بچوں سے غلطیاں ہو جاتی ہیں۔ بڑے دل بڑا کر لیتے ہیں۔ پلیز آپ بھی اسے معاف کر دیں۔ میں مزید اب یہاں نہیں رہ سکتا۔ مجھے لاہور جانا ہے وہ کہاں جائے گا۔“

”میری طرف سے جہنم میں جائے۔“ انہوں نے ہاتھ ہلایا۔ ”اس گھر میں تو نہیں آسکتا۔ ٹائلیں توڑوں گی اس کی۔ اگر اس نے یہاں قدم رکھا تو بتاؤ اس کو۔“

وہ بہت دل گرفتہ سے وہاں سے واپس آئے تھے۔ ان کی ہزار منتوں کے باوجود بھی وہ اسے گھر رکھنے پر تیار نہیں تھیں۔

یہ عورت اسے جینے نہیں دے گی، میں اگر اسے اس کے گھر چھوڑ بھی جاؤں تو وہ پھر اسے گھر سے نکل دے گی تب یہ کہاں جائے گا۔ کاش حبیب بھائی سے ملاقات ہو جاتی۔ انہوں نے سنا تھا کہ دوسری شادی کے بعد اکثر مردوں کے لیے ان کی اولاد پرانی ہو جاتی ہے اور انہیں یقین نہیں آتا تھا اور اب۔ حبیب الرحمن کے ہاں کافی عرصہ بعد اولاد ہوئی تھی جب آیا تقریباً ”مایوس ہو چکی تھیں“ جب وہ وہاں تھے۔ عبد الہادی زندہ تھا تو حبیب الرحمن اور وہ اولاد کے لیے منتیں ماننے پھرتے تھے اور حبیب الرحمن نے منتوں اور مرادوں سے ملنے والی اولاد کو بھلا دیا تھا۔ وہ حبیب الرحمن کے گھر سے اسپتال تک مسلسل ہادی کے متعلق ہی سوچتے رہے تھے۔

عبد الہادی ان کے جان سے زیادہ عزیز دوست کی بہت ساری مشابہت لیے یہ بچہ انہیں چند ہی دنوں میں بہت عزیز ہو گیا تھا۔ وہ اسے یوں در بدر بھٹکنے کے لیے نہیں چھوڑ سکتے تھے۔

وہ اسپتال واپس آئے تو ہادی جاگ رہا تھا۔ انہیں دیکھ کر اٹھ بیٹھا۔

”قائل میں کون جیتا تھا؟“

”طیقت میموریل!“ انہوں نے مسکرا کر اس کی

طرف دیکھا۔

”کیا تم جاننے کے بعد سے اب تک یہی سوچتے

رہے ہو؟“ ڈر اسسا مسکرایا۔

”مجھے پتا تھا۔ وہی جیتیں گے۔ محفوظ خان بہت اچھا گول کیپر ہے اور ان کا کپتان بھی زبردست ہے۔ درحقیقت ان کے سارے ہی کھلاڑی زبردست تھے۔“

”تمہیں فٹ بال سے بہت دلچسپی ہے؟“ ان کی آنکھوں میں یکدم چمک پیدا ہوئی تھی۔

”میں تمہیں فٹ بال بتاؤں گا۔“ وہ اس کے پاس ہی بیڈ پر بیٹھ گئے تھے۔

”تم میرے ساتھ میرے گھر چلو گے؟“ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

”آپ مجھے اپنے گھر رکھ لیں گے؟“ وہ بھری نظروں سے انہیں دیکھ رہا تھا۔

”میں اب اپنے گھر نہیں جاسکتا۔ مشاغل کی کمی نے مجھے گھر سے نکال دیا تھا اور پیپا نے بھی کہا تھا کہ وہ میری شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتے۔ میں ان کے لیے مر گیا ہوں۔ انہوں نے کہا تھا کہ ان کا صرف ایک ہی بیٹا ہے۔ سنی!“ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔

”اور مجھے ایک بار پیپا کو بتانا ہے کہ میں نے سنی کو نہیں گرایا۔“

”لو کے ریلیکس!“ انہوں نے اس کے بازو تھپتھپائے۔

”میں نے پتا کروایا تھا ابھی تمہارے پیپا نہیں آئے۔ کیا تمہیں اپنے پیپا کا کوئی کانٹیکٹ نمبر پتا ہے۔ وہ کراچی میں کہاں ٹھہرتے ہیں۔“

”نہیں۔“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔

وہ خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگے۔ وہ زیادہ دن یہاں نہیں ٹھہر سکتے تھے۔ وہاں فاطمہ اور گڑیا اکیلی تھیں۔

اور وہ عبد الہادی کے بھانجے کو یوں بے یار و مددگار چھوڑ کر بھی نہیں جاسکتے تھے۔ کیا خبر کن غلط ہاتھوں

میں چلا جائے اور روز محشر وہ عبد الہادی کا کسے سامنا کریں گے۔ یہ تو طے تھا کہ وہ عورت اسے گھر میں نہیں رکھنے دے گی۔ وہ ہادی کو اسپتال سے لے کر ایک

ہوٹل میں قفل ہو گئے۔ ہادی سے گھر کا نمبر لے کر

انہوں نے کئی بار فون کیا، لیکن ہر بار یہی جواب ملا کہ حبیب الرحمن صاحب ابھی کراچی سے نہیں آئے۔ ہوٹل میں آئے بھی انہیں تین دن ہو گئے تھے۔ اب مزید یہاں ٹھہرنا ان کے لیے ممکن نہ تھا۔ کیا خبر ان سے جھوٹ بولا جا رہا ہو اور حبیب الرحمن واپس آگئے ہوں۔ تب ایک بار پھر وہ ہادی کو بتا کر اس کے گھر گئے اور گیٹ پر آنے والی ملازم لڑکی نے بتایا کہ وہ ابھی تک نہیں آئے اور تب انہوں نے اس لڑکی کو اپنا لاہور کا فون نمبر دیا اور کہا کہ ”جب تمہارے صاحب آجائیں تو انہیں میرا نمبر دینا اور کہنا کہ وہ مجھے فون کر لیں۔ ہادی میرے پاس ہے۔ ہادی کا ضرور بتانا۔“

انہوں نے اسے تاکید کی تھی اور تب ہادی کو بتا کر کہ اس کے پاپا ابھی تک واپس نہیں آئے اور وہ مزید یہاں رک نہیں سکتے، جب اس کے پاپا آجائیں گے تو وہ اسے لاہور سے لے آئیں گے۔ تاہم اگر وہ یہاں کسی عزیز رشتہ دار کے ہاں جانا چاہے تو وہ اسے ادھر چھوڑ سکتے ہیں۔

”نہیں۔ میں آپ کے ساتھ جاؤں گا۔“ وہ خوف زدہ ہو گیا تھا۔

اور وہ اسے لاہور لے آئے۔



”فاطمہ! یہ عبد الہادی کا بھانجا ہے۔“ انہوں نے فاطمہ کو ساری تفصیل بتائی۔ ”اے اپنے ہادی کی جگہ سمجھو۔ جیسے اللہ نے ہمارا ہادی ہمیں واپس کر دیا ہے۔“

”لیکن یہ ہمارا ہادی کیسے ہو سکتا ہے۔ اس کا باپ ایک دن اسے واپس لے جائے گا۔“ وہ پریشانی سے اسے دیکھ رہی تھیں اور ان کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ انہیں اپنا بیٹا یاد آگیا تھا جس کا نام محی الدین نے اپنے مرحوم دوست کے نام پر عبد الہادی رکھا تھا، لیکن جو صرف تیرہ سال کی عمر میں جدا ہو گیا تھا۔

”مجھے لگتا ہے فاطمہ! کہ اس بچے کو قدرت مجھ تک لائی ہے ورنہ اس رات وہ بھٹک کر نہیں اور بھی جاسکتا

تھا، لیکن ایسا نہیں ہوا۔ شاید قدرت مجھ سے اور اس سے کوئی کام لینا چاہتی ہے۔ مجھے لگتا ہے یہ ہمارا ہادی ہے۔ اسے دیکھ کر وہ خواب ایک بار پھر میری آنکھوں میں اتر آیا ہے جو میں نے اپنے ہادی کے لیے دیکھا تھا۔“

وہ لمحہ بھر کے لیے خاموش ہوئے تھے۔ ان کی آنکھوں کے سامنے ان کا بیٹا آگیا تھا۔ وہ کیسے کس طرح اچانک ان کی زندگیوں سے نکل گیا تھا۔

”پھر بھی فاطمہ! میں ایک بار حبیب بھائی سے ضرور ملوں گا، میں نے ایک لمحہ کے لیے بھی اسے اپنے خاندان سے جدا کرنے کا نہیں سوچا، لیکن اگر انہیں اس کی ضرورت نہیں۔ وہ عورت اسے رکھنے کو تیار نہیں تو میں اسے حبیب بھائی سے مانگ لوں گا۔ تب کیا تم اسے اپنے ہادی کی جگہ دے سکو گی پیار کر سکو گی؟“

”یہ اتنا معصوم اور پیارا ہے۔ اس سے کون پیار نہیں کرے گا۔ بڑی بد نصیب ہے وہ عورت جس نے اس ہیرے کو ٹھکرا دیا ہے۔“

فاطمہ نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا تو وہ مطمئن سے ہو گئے تھے اور لاؤنج میں خاموش بیٹھے ہادی کو گڑیا بہت شوق اور اشتیاق سے دیکھ رہی تھی۔

”تم اب یہاں ہی رہو گے تاہم ہمارے گھر؟“

”پتا نہیں۔“ اس نے اس پیاری سی لڑکی کو دیکھا۔ جو اسے خود سے تھوڑی بڑی لگی تھی اور جس کے بال مشعل کی طرح کٹے ہوئے نہیں تھے بلکہ اس نے دو موٹی موٹی چوٹیاں بنا رکھی تھیں۔

”تم کس کلاس میں ہو؟“ اس نے پوچھا۔

”ففتھ میں۔“

”اور میں سکس میں ہوں۔“ اس نے بتایا۔

تب ہی محی الدین کمرے سے نکلے۔

”بیٹا! بھائی کو آرام کرنے دو۔ وہ ابھی بیماری سے

اٹھا ہے اور کمزور ہے۔“

”چھا ٹھیک ہے۔ تم آرام کرو۔ مجھے ویسے بھی ہوم

ورک کرنا ہے۔“

اس نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا اور اسے وہ

مشاعل کی طرح لگی مہمان اور ہمدردی۔ وہ اس کا بہت خیال رکھنے لگی تھی۔ اسکول سے آکر اس سے اپنے اسکول کی باتیں کرتی۔ کبھی کبھی اپنے اسکول کی کینٹین سے اس کے لیے چاکلیٹ لے کر آتی۔ اس کے لیے دعا کرتی کہ وہ جلد ٹھیک ہو کر اس کے ساتھ اسکول جانے لگے۔ فاطمہ نے اسے بتایا تھا کہ وہ اس کا بھائی ہے اور اب ہمیشہ ان کے ساتھ رہے گا اور پھر کئی دن گزر گئے۔ وہ ہولے ہولے صحت مند ہونے لگا۔ رخساروں پر سرخی دوڑنے لگی۔

محی الدین اور فاطمہ اس کا بہت خیال رکھتے تھے۔ فاطمہ تو اسے بہت چاہنے لگی تھیں، لیکن وہ پھر بھی بے چین سارے دن میں ایک بار گھر ضرور فون کرتا تھا۔ لیکن کبھی مشاعل کی ممی فون اٹھاتیں اور کبھی مینو۔ جب بھی مینو فون اٹھاتی وہ پیلا کے متعلق ضرور پوچھتا۔ لیکن ہر روز ہی جواب ملتا کہ وہ ابھی تک کراچی سے نہیں آئے۔

”وہ اتنے زیادہ دنوں کے لیے کبھی کراچی نہیں گئے تھے۔ زیادہ سے زیادہ ایک ہفتہ ٹھہرتے تھے وہاں۔“ اس روز فون پر مینو سے بات کرنے کے بعد اس نے محی الدین کو بتایا تھا۔

”مجھے لگتا ہے مینو جھوٹ بول رہی ہے۔ اسے یقیناً مشاعل کی ممی نے منع کر دیا ہو گا۔“ لیکن محی الدین کو پھر بھی ان کے فون کا انتظار تھا۔ جبکہ وہ ہر گزرتے دن کے ساتھ مایوس ہوتا جا رہا تھا۔ ”لیکن اگر وہ آجاتے تو تمہارا معلوم کرنے کے لیے ایک بار تو فون کرتے۔ میں اپنا فون نمبر دے آیا تھا۔ وہ کسی وجہ سے نہیں آسکے ہوں گے۔“ انہوں نے اسے تسلی دی۔

”نہیں پیلا نے کہا تھا تم میرے لیے مر گئے ہو۔“

اور وہ ان کے لیے مر ہی تو گیا تھا تب ہی تو انہوں نے فون نہیں کیا تھا۔

”بابا! آپ بھائی کو کب اسکول میں داخل کروائیں گے۔ اب تو یہ بالکل ٹھیک ہو گیا ہے۔“ گڑیا کو اس کی پڑھائی کی بہت فکر تھی۔ ناشتا کرتے ہوئے اس روز

اچانک گڑیا نے اس کی طرف دیکھا۔ ”اس کی پڑھائی کا حرج ہو رہا ہے اب اسے اسکول داخل کروادیں۔“

”ہاں ٹھیک ہے لیکن ایک بار مجھے حبیب بھائی سے بات کرنی ہے۔“ انہوں نے گڑیا کی بات کا جواب دینے کے بجائے فاطمہ کی طرف دیکھا جو آلیٹ اس کی پلیٹ میں رکھ رہی تھیں۔

”بیٹا! یہ تھوڑا سا کھالو۔ تم تو کچھ بھی نہیں کھا رہے ہو۔“ اور وہ جو گڑیا اور محی الدین کی طرف متوجہ تھا، چونک کر کھانے لگا۔

”فاطمہ! کیا خیال ہے تمہارا۔ کل میں گاؤں نہ چلا جاؤں اور خود جا کر حبیب بھائی کا پتا کروں۔“ انہوں نے فاطمہ سے پوچھا۔

”ہاں ٹھیک ہے۔ اس کا وقت ضائع ہو رہا ہے۔ گڑیا صحیح کہہ رہی ہے۔ کوئی فیصلہ ہو جائے تو بچہ اطمینان سے پڑھائی کرے۔“

اور دوسرے ہی دن وہ ہادی کو ساتھ لے کر اس کے گاؤں پہنچ گئے۔ گیٹ مینو نے کھولا تھا اور پوچھنے پر بتایا کہ صاحب تو دہلی چلے گئے ہیں۔

”تو مینو! تم نے پیلا کو میرا نہیں بتایا۔ میں روز فون کرتا تھا۔“ اس نے پوچھا۔

”وہ۔“ تب ہی اندرونی گیٹ کھلا اور مشاعل کی ممی گیٹ سے باہر آئیں۔ مینو نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ مشاعل کی ممی ادھر ہی آرہی تھیں۔

”ہاں جی بتایا تھا۔ لیکن وہ صاحب نے کہا وہ کسی ہادی کو نہیں جانتے۔“ مشاعل کی ممی قریب آگئی تھیں۔ ”جی وہ کہتے ہیں ہادی نام کا کوئی بیٹا نہیں ہے ان کا۔“

مینو نے ایک معذرت کرتی نظر ہادی پر ڈالی اور پیچھے ہٹ گئی۔ مشاعل کی ممی نے مینو کو اندر جانے کے لیے کہا۔ ان کے چہرے سے جھلکتی مکاری کو محی الدین نے ناگواری سے دیکھا۔ مشاعل کی ممی نے ایک نفرت بھری نظر ہادی پر ڈالی اور پھر محی الدین کی طرف دیکھا۔ ”آپ اسے پھر یہاں لے آئے ہیں۔ میں آپ کو

بتا چکی ہوں یہ ہمارے لیے مرچکا ہے۔ ہمارا اس سے کوئی واسطہ نہیں چور اچکا اور پورا بد معاش ہے۔ یہ۔“ اس کی فرد جرم میں کئی اضافے ہو چکے تھے۔

”لیکن میں اس کے والد سے ملنا چاہتا ہوں۔“ محی الدین نے جواباً کہا۔

”تو وہی چلے جائیں۔ مل آئیں اس کے والد سے۔“ مشاعل کی نمی کالجہ طنزیہ تھا۔

”ان کا کوئی رابطہ نمبر تو ہو گا نا۔ پلیز مجھے دے دیں میں ان سے بات کر لوں گا۔“ انہوں نے التجا کی۔

”کوئی نمبر نہیں ہے میرے پاس اور آپ خوا مخواہ گارجین نہ بنیں۔ اس کا باپ اسے عاق کر چکا ہے۔

اپنی ہر چیز سے بے دخل کر دیا ہے اس نے اسے۔ آپ اسے اپنی مرضی سے لے کر گئے تھے۔ اس سے کوئی مسئلہ ہے آپ کو تو چھوڑ دیں یہاں۔ میں اسے کسی یتیم خانے میں بھجوا دیتی ہوں۔ اس سے زیادہ ہمد روی

کی مجھ سے توقع نہ رکھیں۔“

انہوں نے ایک غصیلی نظر ہادی پر ڈالی۔

”نہیں۔“ انہوں نے ایک دم اس کے ہاتھ پر اپنی گرفت محسوس کی۔

”یا اللہ! میں نے پوری کوشش کی اس بچے کو اس کے وارثوں تک پہنچانے کی لیکن یہ فعل اگر تو نے میری ہی جھولی میں ڈال دیا ہے تو اسے اپنے سینے سے لگا کر رکھوں گا۔“

”بابا! چلیں!“ ہادی نے آہستگی سے کہا۔

انہوں نے ایک نظر گیٹ پر ہاتھ رکھے اپنی طرف دیکھتی مشاعل کی مٹی کی طرف دیکھا اور ایک گہرا سانس لے کر ہادی پر نظر ڈالی۔ جو اب کھلے گیٹ سے

برآمدے میں کھڑی مینو کی طرف دیکھ رہا تھا۔

اس کے پیانے اسے عاق کر دیا۔ وہ کسی ہادی کو نہیں جانتے تھے۔ مینو کو بھلا جھوٹ بولنے کی کیا

ضرورت تھی اور مینو تو۔

مشاعل کی مٹی کھٹ کھٹ کرتی واپس جا رہی تھیں۔ اور مینو گیٹ بند کرنے کے لیے سیڑھیاں اتر کر گیٹ کی طرف آ رہی تھی۔ اور سن روم کی کھڑکی کھولے

مشاعل اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

”مینو!“ اس نے مینو کے قریب آنے پر کھٹی کھٹی آواز میں پیانے کے متعلق پوچھا تھا۔

”ہادی بھائی! تم چلے جاؤ۔ دیکھو تمہاری صحت کتنی اچھی ہو گئی ہے۔ یہاں تو بیکم صاحب کہیں مار ہی

ڈالیں گی۔ صاحب سچ سچ وہی چلے گئے ہیں۔ اور یہ صاحب اچھے ہیں۔“

تیز تیز بولتے ہوئے اس نے جلدی سے گیٹ بند کر دیا۔ اس روز صرف گیٹ ہی بند نہیں ہوا تھا۔ ہادی

کی زندگی کا ایک باب ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا تھا۔ وہ اس گھر کو آخری بار دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں نمی

پھیل گئی لیکن اس نے محی الدین کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑتے ہوئے دہرایا۔

”چلیں بابا گھر۔“ وہ انہیں گڑیا کی طرح بابا ہی کہنے لگا تھا۔

اسے آج کے بعد یہاں کبھی نہیں آنا تھا اس نے فیصلہ کر لیا تھا۔ اسے اب ہمیشہ گڑیا۔ بابا اور فاطمہ کے

ساتھ رہنا تھا۔ اس رات مشاعل کی مٹی نے اسے دھکے دے کر گھر سے نکال دیا تھا۔ خالی ہاتھ اس کی

کتابیں، کپڑے کھلونے سب کچھ یہاں ہی رہ گیا تھا۔ ایک لمحے کو اس کا جی چاہا کہ وہ اپنے کمرے میں جا کر

سب کچھ لے آئے لیکن وہ جانتا تھا مشاعل کی مٹی اسے اندر نہیں گھسنے دے گی۔

”تمہارے پیانے کے کوئی دوست تو ہوں گے یہاں۔ تم جانتے ہو کسی کو۔“ انہوں نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں مجھے کسی کا گھر معلوم نہیں ہے۔ ان کے ایک دو دوست گھر آیا کرتے تھے لیکن مجھے کسی کے متعلق کچھ معلوم نہیں ہے۔“

اس نے بتایا تو انہوں نے تسلی دی۔

”تم فکر مت کرو ہادی! میں پھر بھی معلوم کرتا رہوں گا۔ یہاں ایک دو جاننے والے ہیں ان سے کہہ جاؤں گا۔“

”نہیں بابا! اب مجھے یہاں نہیں آنا۔ میں ہمیشہ

آپ کے ساتھ رہوں گا۔ آپ کا بیٹا بن کر۔“ انہوں نے خوشی بھری حیرت سے اسے دیکھا۔

”ٹھیک ہے تو چلو تمہارے اسکول چل کر تمہارا سرٹیفکیٹ لے لیں۔“

اور پھر اس کا سرٹیفکیٹ لے کر وہ لاہور واپس آگئے۔ وہ گھر وہ شہر پیشہ کے لیے اس سے چھوٹ گیا۔ اب ایک نئی زندگی تھی، نیا گھر اور نئے لوگ۔ اماں، بابا اور گڑیا اب اس کی زندگی کا محور تھے۔

محی الدین نے اسے گڑیا کے اسکول میں ہی داخل کروادیا تھا۔ ام کلثوم کا ہادی وہاں اسی شہر میں مر گیا تھا۔ اب وہ محی الدین اور فاطمہ کا شہزادہ تھا۔ فاطمہ اسے ہادی کہہ کر نہیں بلاتی تھیں، بلکہ اس نام سے پکارتیں جو اس کی دادی نے رکھا تھا اور جو اس کے اسکول کے سرٹیفکیٹ میں لکھا تھا۔

”اسے ہادی نہ بلایا کریں۔ جب آپ اسی ہادی بلاتے ہیں تو ہمارا ہادی میرے سامنے آکھڑا ہوتا ہے۔ میرا دل تھکنے لگتا ہے۔ مجھے وہم آتا ہے کہ کہیں ہادی ہم سے پھرنے پھڑ جائے۔“

ایک روز فاطمہ نے محی الدین سے کہا۔ اور ہولے ہولے ہادی پس منظر میں چلا گیا۔ وہ فاطمہ کا شہزادہ تھا تو گڑیا کا چاند بھیا۔ اور محی الدین کا لاڈلا چاند۔ وہ اور گڑیا اکٹھے اسکول جانے لگے تھے۔ گڑیا اکثر ہوم ورک میں اس کی مدد کرتی تھی۔ وہ بے حد خاموش رہتا تھا۔ بہت سارے دن محی الدین غور کرتے رہے پھر ایک روز وہ اسے ماڈل ٹاؤن میں ہی ایک فٹ بال کلب میں لے گئے۔

”یہ آج سے پہلے کبھی نہیں کھیلا لیکن اسے فٹ بال سے عشق ہے۔“ انہوں نے کلب کے فیجر سے کہا۔

”ظاہر ہے یہ تمہارا بیٹا ہے اسے فٹ بال سے عشق کیوں نہ ہو گا لیکن تم اسے ابلائے ہو جبکہ ہادی کو تم سات سال کی عمر میں لے گئے تھے۔“

کلب فیجر محی الدین کا دوست تھا۔

وہ دیر تک عبد الہادی کے متعلق باتیں کرتے رہے

اور وہ خاموش بیٹھا رہا۔ اس رات محی الدین نے تفصیل سے اسے بتایا۔

”تمہارا ماموں عبد الہادی میرا بہت اچھا دوست تھا۔ ہم دونوں فٹ بال کے عاشق تھے۔ اور یہ عشق ہمیں ورثے میں ملا تھا۔ کیونکہ اپنے زمانے میں ہم دونوں کے والد بھی فٹ بال کھیلا کرتے تھے، ہم دونوں ایک ہی محلے میں کھیل کود کر بڑے ہوئے تھے۔ ایک ہی اسکول میں پڑھتے تھے اور فٹ بال کے بڑے پلیئر بننے کے خواب دیکھتے تھے جن دنوں ہم فٹ بال کھیل رہے تھے پاکستان میں فٹ بال ختم ہوتا جا رہا تھا۔ مطلب کہ فٹ بال کا کوئی اسکوپ نہ تھا۔ کالج میں آتے ہی ہادی ہاکی کھیلنے لگا تھا۔ لیکن میں فٹ بال سے ہی وابستہ رہا اور ایک فٹ بال کلب کی طرف سے کھیلا تھا، یہ میچز ضلعی سطح پر ہوتے تھے۔ ہادی کے جانے کے بعد میں لاہور آگیا۔ اس کے بغیر وہ شہر مجھے کٹ کھانے کو دوڑاتا تھا۔ پڑھائی مکمل کر کے میں نے بینک میں جاب کر لی۔ اور شام کے وقت ایک فٹ بال کلب میں جانے لگا، جہاں بچوں کو کوچ کرتا تھا۔ پھر اللہ نے مجھے بیٹا دیا۔ میں نے اس کا نام عبد الہادی رکھا۔

جب ہادی آٹھ سال کا ہوا تو میں انگلینڈ شفٹ ہو گیا کیونکہ میں ہادی کے لیے جو خواب دیکھ رہا تھا اس کی تکمیل پاکستان میں ممکن نہ تھی۔ ہادی تمہارے ماموں کی طرح پیدائشی اسٹرائیکر تھا۔ بہت جلد اسے کم عمر کھلاڑیوں کے کلب میں لے لیا گیا۔ فوراً بعد وہ آرسل کلب میں چلا گیا۔ اور جلد ہی انڈر سکسٹین کا حصہ بن گیا۔ وہ اپنی ٹیم کا سب سے کم عمر کھلاڑی تھا۔ انگلش کلب آرسل کا میجر اس سے بہت پر امید تھا۔ وہ مجھ سے اکثر کہتا تھا، تمہارا بیٹا بہت جلد فٹ بال کے آسمان پر چھانے والا ہے لیکن وہ سب کی امیدیں توڑ کر چلا گیا۔ ہمیں تو کبھی پتا ہی نہیں چلا کہ اس کے ساتھ کوئی مسئلہ ہے۔ وہ تو بچپن سے ہی بہت ایکٹو تھا اور اب بھی وہ میرے خوابوں میں ہاتھوں میں لیے بھاگ رہا تھا اور مائچسٹر یونائیٹڈ میں شامل ہونے کے لیے ان تھک محنت کر رہا تھا۔ اس نے کبھی کسی تکلیف کا

اکتھار نہیں کیا تھا ایک کلب مقابلے میں۔“

وہ ذرا سانس لینے کے لیے رکے اور پھر چند لمحوں بعد بولے تو ان کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

”وہ ایک حیرت انگیز شاٹ تھا۔ اسے کارز کک لگانی تھی۔ سب کی نظریں اس پر تھیں۔ میں نے اسے جیتے کی سی رفتار سے دوڑتے بہت لگاتے پیر اٹھاتے گیند کو ٹھوکر لگاتے دیکھا۔ بال فضا میں بلند ہوا۔ مخالف کھلاڑیوں کے سر سے گزرتے ہوئے اس نے حیرت انگیز موڑ کاٹا اور بال نیٹ میں پہنچ چکا تھا۔ گراؤنڈ تالیوں، شور اور سیٹیوں سے گونج رہا تھا۔ انگلش کلب آرسل پیچ جیت چکا تھا اور وہ زمین پر اونڈھا گرا ہوا تھا۔ اس کے کوچ آرنلڈ نے جب دیکھا کہ وہ گرنے کے بعد اٹھا ہی نہیں تو وہ دوڑ کر اس تک گیا لیکن سب کچھ ختم ہو چکا تھا۔ لوگ تالیاں بجا رہے تھے۔ اس کے ٹیم کے کھلاڑی اس کے نام کے نعرے لگا رہے تھے لیکن اس کا دل بند ہو گیا تھا۔ ڈاکٹروں نے بتایا۔“

لیکن ہمیں کبھی پتا ہی نہیں چلا اور وہ سارے خوابوں کو آنکھوں میں لیے چلا گیا۔ ہمیں تنہا اور اکیلا کر گیا۔ وہاں لندن میں میرا دم کھٹنے لگا تو ہم واپس آگئے۔“ محی الدین کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

”ہر سال اس کی برسی پر ہم لندن جاتے ہیں اور اس کی قبر پر ڈھیروں پھولوں کے گل دستے بڑے ہوتے ہیں۔ یہ سب پھول اس کے آرسل کلب کے دوستوں کی طرف سے ہوتے ہیں۔“

”بابا! اس نے بے اختیار ان کے بازو پر ہاتھ رکھا۔“ میں آپ کا خواب پورا کروں گا۔ عبدالہادی اتنی ہی عمر لے کر آیا تھا۔ مجھے اگر اللہ نے زندگی دی تو ایک دن میں ماچسٹر یونائیٹڈ کی جرسی ضرور پہنوں گا۔“

انہوں نے آنسو بونچھ کر حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ جوا تاناکم گو تھا آج اس نے اتنی لمبی بات کی تھی اور ایسی بات۔

”ہاں بابا! میں۔“ وہ مسکرایا۔

”ہاں تم۔“ ان کے اندر جیسے کسی یقین کا دیا جلا اور انہوں نے بے ساختہ اسے گلے سے لگالیا۔

”لیکن میں۔“ اس نے اپنے ہاتھوں کو پھیلایا، اپنی انگلیوں کو دکھا اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

”میں آپ کے خواب پورے کرنا چاہتا ہوں بابا! وہ سارے خواب جو آپ نے عبدالہادی کے لیے دیکھے، لیکن کیا میں کر سکوں گا بابا! میرے ہاتھ۔ میرے ہاتھ بہت کمزور ہیں بابا۔“ وہ ہچکیاں لے لے کر رونے لگا۔ محی الدین نے اس کے پھلے ہوئے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور بہت دیر دیکھتے رہے۔ بظاہر تو ان ہاتھوں میں خرابی نہیں تھی۔

”تمہارے ہاتھوں کے ساتھ کیا مسئلہ ہے بیٹا!“

”میرے ہاتھ۔“ وہ کھوسا گیا۔

اس رات بابا گھر پر نہیں تھے اور وہ کچن سے اپنے لیے پانی لینے گیا تھا۔ مشاعل کی ممی بھی کچن میں تھیں اور یہ دو سال پہلے کی بات تھی، اس نے فریج میں سے پانی کی بوتل نکالی تھی اور ابھی مڑا ہی تھا کہ وہ دھاڑی اٹھیں۔

”ہر وقت فریج میں گھسے رہتے ہو، تمہارے پیٹ کی بھوک ہی ختم نہیں ہوتی۔“

اس کے ہاتھ کانپنے لگے تھے اور بوتل اس کے ہاتھ سے گر گئی تھی۔ وہ مشاعل کی ممی سے بہت خوف زدہ رہتا تھا۔ انہوں نے ہاتھ میں پکڑا گرم کفگیر اس کے ہاتھوں پر مارا تھا۔ اس کی سسکی نکل گئی تھی۔

”وقف۔ میں تو پانی۔“ اس کے لبوں سے بمشکل نکلا تھا۔

”زبان چلاتا ہے مجھ سے۔“ اور پھر وہ اندھا دھند اس کے ہاتھوں بازوؤں پر کفگیر پرسانے لگی تھیں اور جانے کب تک برساتی رہیں۔ اگر مشاعل آکر انہیں مخاطب نہ کر لیتی۔

”ممی! میرے پیٹ میں سخت درد ہے۔“ وہ رو رہی تھی۔

اور وہ کفگیر سنک میں پھینک کر اسے لے کر باہر چلی گئی تھیں اور پھر اس روز کے بعد اکثر چیزیں اس کے ہاتھ سے گرنے لگی تھیں۔ کبھی گلاس، کبھی پلیٹ۔ وہ کسی بھی چیز پر اپنی گرفت قائم نہیں رکھ سکتا تھا اور ہر بار جب کوئی چیز ٹوٹی، مشاعل کی مٹی اسے بے تحاشا پارتی تھیں۔ اس کے ہاتھ اور انگلیاں اکثر سوجی رہتی تھیں۔

اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئی تھیں اور وہ اٹک اٹک کرتا رہا تھا۔

محی الدین نے اس کے ہاتھ چھوڑ دیے اور مسکرائے وہ سمجھ گئے تھے کہ اس کے مسائل جسمانی نہیں، نفسیاتی ہیں۔

”تمہارے ہاتھ ٹھیک ہو جائیں گے ان شاء اللہ اور تم ضرور میرا خواب پورا کرو گے۔ ایک دن آئے گا جب میں اولڈ ٹریفک کے گراؤنڈ میں اپنے ہادی کو مائچسٹر یونائیٹڈ کی جرسی میں دیکھوں گا۔“

”بابا۔“ اس نے سراٹھا کر ڈیڈ پائی آنکھوں سے محی الدین کی طرف دیکھا اور اس کی نظریں محی الدین کے پیچھے کھڑی فاطمہ پر پڑیں، جن کی آنکھوں سے آنسو بہ رہے تھے۔ جانے کب وہ وہاں آئی تھیں، اسے پتا نہیں چلا تھا۔

”کیسی ظالم عورت ہے وہ گڑیا کے بابا!“ وہ پیچھے سے ہٹ کر سامنے آگئیں اور اسے اپنے لپٹائے بہت دیر تک اس کے ہاتھ چومتی رہیں۔

”سن لیں گڑیا کے بابا! میں نے اسے اب بھی نہیں بھیجا۔ اس ظالم عورت کے پاس۔“

انہوں نے اسے بھیج لیا اور وہ بھی ان کے ساتھ چمٹ گیا۔ اسے ان کے لمس میں ماما کے لمس کی خوشبو آرہی تھی۔ اسے لگا تھا جیسے ماما نے اسے چمٹا رکھا ہو۔

اس رات محی الدین نے بڑے بڑے فیصلے کیے تھے، لیکن پہلے اس کا علاج ضروری تھا۔ انہوں نے اگلے دن ہی ایک بہت اچھے سائیکاٹرسٹ سے رابطہ کیا اور پھر اس کے سیشن شروع ہو گئے تھے۔ اس کی اپنی تھیوری بھی ہو رہی تھی۔ محی الدین چاہتے تھے کہ وہ

پورے اعتماد کے ساتھ بات کرے۔ کیونکہ اس کے لیے انہوں نے جو فیصلے کیے تھے۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ اس میں اعتماد ہو۔ پڑھائی میں گڑیا اس کی مدد کرتی۔ شام کو باقاعدگی سے وہ اسے فٹ بال کلب لے کر جاتے۔ وہ خود اس کی کوچنگ کر رہے تھے۔ چیزیں یہاں بھی اس کے ہاتھوں سے چھوٹ جاتی تھیں، لیکن یہاں کوئی اس سے خفا نہیں ہوتا تھا۔ مارتا نہیں تھا۔

اسکول میں اردو، انگلش تقریری مقابلے ہو رہے تھے۔ گڑیا ہر سال حصہ لیتی تھی۔ اس سال اس نے محی الدین سے کہہ کر اس کے لیے بھی تقریر لکھوائی۔

”تمہیں بھی مباحثے میں حصہ لینا ہے، میں نے تمہارے لیے بھی بابا سے تقریر لکھوائی ہے، اسے یاد کر لو۔“

”نہیں بھلا میں کیسے نہیں۔“ وہ پریشان سا ہو کر اسے دیکھنے لگا۔ ”میں نہیں کر سکتا گڑیا۔ میں نے کبھی نہیں کی۔“

”لیکن ہادی بھائی ہمیشہ فرسٹ پرائز لیتے تھے اور تمہیں بھی فرسٹ پرائز لینا ہے۔“ وہ مسکرائی۔

”لیکن میں اتنی لمبی تقریر نہیں میں اٹک جاؤں گا۔ لوگ ہنس گے۔“

”نہیں۔ تم نہیں اٹکو گے۔“ گڑیا کو یقین تھا۔

”تمہیں خود۔ اندازہ نہیں ہے کہ اب تم بات کرتے ہوئے نہیں اٹکتے۔ کبھی کبھار بس۔ میں تمہیں خود تیاری کرواؤں گی۔ میں نے تمہارا نام ٹیچر کو دے دیا تھا اور اگر اب تم نے حصہ نہ لیا تو مجھے شرمندگی ہوگی۔“

اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ گڑیا کو اس کی وجہ سے شرمندگی ہو۔ سو وہ تیاری کرنے لگا۔ گڑیا خود اسے تیاری کروا رہی تھی۔ ایک ایک لفظ کی ادائیگی، ایکشن، اشاکل سب ہی کچھ بتاتی، لیکن پھر بھی وہ گھبرایا ہوا تھا۔

”تمہارے سامنے میں تقریر کر لیتا ہوں گڑیا! لیکن وہاں پورے اسکول کے سامنے نہیں بول پاؤں گا۔“

”تم بول پاؤ کے اور فرسٹ پرائز تمہیں ہی جیتنا ہے۔“
اور اب یہ گڑیا کا یقین تھا اس کی محنت تھی یا اللہ کا کرم کہ وہ فرسٹ آگیا تھا۔

جب وہ روٹم کے سامنے کھڑا ہوا تو اسے لگا تھا کہ وہ ایک لفظ بھی نہ بول سکے گا۔ اس کا حلق خشک ہو رہا تھا اور ہاتھوں میں پسینہ آ رہا تھا۔ ٹانگوں میں ہلکی لرزش تھی، لیکن پھر گڑیا کا مایوس چہرہ اس کی آنکھوں کے سامنے آگیا۔ اگر میں تقریر نہ کر سکا تو وہ کتنی ہرٹ ہوگی۔ کتنا دکھ ہو گا اسے۔ اس کا یقین ٹوٹ جائے گا۔ اور اس کا یقین نہیں ٹوٹا تھا۔ جب وہ اسٹیج سے اتر کر اپنی نشست کی طرف پرہا تھا تو سب سے پہلے گڑیا نے اسے مبارکباد دی تھی۔ اس کی آنکھیں جگمگا رہی تھیں اور چہرہ پھول کی طرح کھلا ہوا تھا۔

اس روز سب بہت خوش تھے اور محی الدین انہیں باہر کھانا کھلانے لے گئے تھے۔ محی الدین اس روز بہت مطمئن تھے۔ ڈاکٹر احمر نے بھی آج صبح ہی بتایا تھا کہ اب اسے مزید سنگ کی ضرورت نہیں ہے اور کلب کے مینجر اور کوچ نے بھی اس کی تعریف کی تھی۔
”آپ کا یہ بیٹا بھی حیرت انگیز صلاحیتوں کا مالک ہے۔ مجھے یقین ہے ایک روز یہ فٹ بال کی دنیا میں نام پیدا کرے گا۔“

اس روز وہ بھی بہت خوش تھا، لیکن رات کو جب وہ بیڈ پر لیٹا تو اسے پلایا بہت یاد آئے، اپنا گھریا یاد آیا۔ اس روز اس نے مشاغل کو بھی یاد کیا اور وہ چپکے چپکے بہت دیر تک روتا رہا۔ اس رات اس نے گھر فون بھی کیا تھا، کیا خبر پاپا دینی سے آگئے ہوں اور کیا پتا وہ بھی مجھے یاد کرتے ہوں گے۔ لیکن کسی نے فون اٹینڈ نہیں کیا۔ اس نے دو تین بار کوشش کی، لیکن لا حاصل۔

محی الدین اس کے کھیل کی طرف بہت توجہ دے رہے تھے۔ وہ خود بھی کھیلتے ہوئے بہت پرجوش ہو جاتا تھا۔ اسے لاہور آئے آٹھ ماہ ہو گئے تھے۔ اس روز وہ کلب گئے تو وہاں کے کوچ نے ان سے کہا۔

”یہاں میرے اس کلب میں آنے والے زیادہ

بچوں کا ایم کھلاڑی بننا اور فٹ بال میں نام پیدا کرنا نہیں ہے۔ یہ بچے محض تفریح کے لیے اور فٹنس کے لیے آتے ہیں، جبکہ آپ کے بیٹے کے سامنے ایک مقصد ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اب آپ اسے کوئی پروفیشنل کلب جوائن کروادیں۔ دوسری ٹیموں کے ساتھ مقابلے میں اس کی صلاحیتیں ابھریں گی۔“
”آپ کی بات صحیح ہے، لیکن میں نے کچھ اور سوچ رکھا ہے۔ میرا ارادہ انگلینڈ جانے کا ہے اور اس کے لیے میں کوشش کر رہا ہوں۔“ محی الدین نے جواب دیا۔

”یہ تو اور زیادہ اچھی بات ہے، یہ ہیرا وہاں ہی چمکے گا۔“ وہ برٹش نیشن تھے، لیکن ہادی ان کا بیٹا نہیں تھا۔ اوپنٹڈ بچوں کے لیے قوانین بہت سخت تھے۔ انہوں نے انگلینڈ فٹ بال کلب کے ایک مینجر سے بھی جوائن کے دوست تھے، رابطہ کیا تھا۔ لیکن ابھی تک کوئی مثبت صورت حال دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ تاہم وہ ناامید نہیں تھے۔ اس روز وہ کلب سے نکلے ٹوکیٹ پر ایک بوڑھے نے انہیں روک لیا۔

”تم نے میرا بیٹا دیکھا؟“ اس کی آنکھیں خالی خالی سی تھیں اور جسم پر ملگجاسا پھٹا رانا لباس تھا۔ واڑھی بے تربیتی سے بڑھی ہوئی تھی۔ آج اسے انہوں نے کئی مہینوں بعد دیکھا تھا۔ حالانکہ پہلے وہ اکثر ماڈل ٹاؤن کے مختلف بلاکوں میں پھرتا رہتا تھا۔ کبھی کبھی تو وہ کسی گھر کا دروازہ بھی بجا دیتا اور اپنے بیٹے کے متعلق پوچھتا۔ دس بارہ سال پہلے اس کا اکلوتا بیٹا گم ہو گیا تھا۔ یا اغوا ہو گیا تھا۔ جب تک بیوی زندہ رہی، دونوں ایک دوسرے کا دکھ بانٹتے رہے، لیکن بیوی کی وفات کے بعد وہ ہولے ہولے ہوش و حواس کھو گیا۔ اسے صرف یہ یاد رہ گیا تھا کہ اسے اپنے بیٹے کو ڈھونڈنا ہے، جو کھو گیا ہے۔

”نہیں۔“ انہوں نے نفی میں سر ہلایا۔

”پتا نہیں کہاں چلا گیا۔“ بوڑھا بریدراتا ہوا چلا گیا تو ان کے دل پر بوجھ سا آ پڑا۔ اس روز انہوں نے رات کا کھانا بھی نہیں کھایا۔ ایک دو گھنٹے کھا کر اٹھ گئے۔

”آپ کچھ پریشان ہیں؟“ فاطمہ کمرے میں آئیں تو پوچھا۔

”ہاں۔ میں سوچ رہا ہوں فاطمہ۔ ہم کچھ غلط تو نہیں کر رہے۔ ایک پرانے بچے پر قبضہ جما کر بیٹھ گئے ہیں، کہیں بددیانتی کے مرتکب تو نہیں ہو رہے۔“

”کیا مطلب ہے آپ کا؟“ فاطمہ حیران ہوئی۔

”ہم نے پھر حبیب بھائی سے رابطہ کرنے کی کوشش ہی نہیں کی۔“ آپ نے کئی بار کوشش تو کی ہے۔ خود گئے۔ وہ عورت اسے رکھنا ہی نہیں چاہتی اور باپ کو اس کی فکر ہی نہیں۔“

”کیا پتا فاطمہ! کیا پتا اب اتنا عرصہ گزرنے کے بعد حبیب بھائی اسے یاد کرتے ہوں۔ آخر بیٹا ہے ان کا۔ تڑپتے ہوں اس کے لیے مجھے ایک بار پھر وہاں جانا چاہیے۔ میں کبھی کبھی بے سکون ہو جاتا ہوں۔ اگر وہ اپنی خوشی سے اسے میرے حوالے کر دیں تو میری خوش قسمتی ہوگی۔ وہ عورت کہیں جھوٹ نہ بولتی ہو۔“

”اور اگر انہوں نے اسے لے لیا تو۔“ فاطمہ کا رنگ زرد پڑ گیا۔

”تو۔“ وہ افسردگی سے مسکرائے۔ ”ہم نے ہادی کی جدائی بھی تو برداشت کی ہے۔ اس کی بھی کر لیں گے۔ بہر حال ہمارا اس پر ایسا کوئی حق نہیں ہے کہ وہ لینا چاہیں تو ہم اسے زبردستی رکھ لیں۔“

”لیکن۔“ فاطمہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ وہ انہیں بالکل اپنے بیٹے کی طرح عزیز ہو گیا تھا۔ اس کے وجود میں جیسے ان کا عبد الہادی سما گیا تھا۔

انہوں نے فاطمہ کے آنسوؤں سے نظریں چرائیں۔ کیونکہ وہ فیصلہ کر چکے تھے کہ انہیں ہادی کو اس کے باپ کے پاس لے کر جانا ہے۔ سارا دن اس بوڑھے باپ کی خالی خالی آنکھیں ان کے تصور میں آتی رہی تھیں۔

”فاطمہ! میں صبح اسے لے کر جاؤں گا۔ تم میرا بیگ تیار کرونا اور ایک اس کا بھی سوٹ رکھ دینا۔“ انہوں نے سونے سے پہلے فاطمہ کو بتایا۔

اگر فاطمہ ساری رات کروٹیں بدلتی رہی تھی تو وہ بھی سو نہیں سکے تھے۔ اتنا ہی پیارا ہو گیا وہ انہیں اور صبح ناشتا کرتے ہی وہ ہادی کا ہاتھ پکڑ کر اور بیگ اٹھا کر کھڑے ہو گئے۔

”ہم کہاں جا رہے ہیں بابا؟“ ہادی حیران تھا۔

”تمہارے گھر۔“ انہوں نے اس کی طرف دیکھا۔

”تمہیں تمہارے پیپا سے ملوانے لے جا رہا ہوں کیا تمہارا دل نہیں چاہتا اپنے پیپا سے ملنے کو۔“

”دل تو چاہتا ہے لیکن وہ مشاغل کی مٹی۔ وہ نہیں ملنے دیں گی پیپا سے۔“ اس نے فاطمہ کی ڈیڈبائی آنکھوں اور گڑیا کے اداس چہرے کو دیکھا۔

”کوشش کرنے میں کیا حرج ہے بیٹا۔“ محی الدین نے نرمی سے کہا۔

”لیکن میں وہاں نہیں رکوں گا۔ میں پیپا سے مل کر واپس آ جاؤں گا۔“

”لیکن اگر تمہارے پیپا نے تمہیں روک لیا تو۔“

انہوں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کا رنگ زرد پڑ گیا اور وہ ان کی انگلی چھڑا کر دوڑ کر دروازے میں کھڑی فاطمہ سے لپٹ گیا۔

”نہیں مجھے نہیں جانا وہاں، میں یہاں رہوں گا“ آپ کے پاس بابا کے پاس۔“

فاطمہ نے بھی دونوں بازوؤں میں اسے بھینچ لیا۔ محی الدین ہولے ہولے چلتے ہوئے واپس پلٹے۔

”فاطمہ پلیز۔“ انہوں نے نرمی سے کہا۔

”جذبائی مت بنو، ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ اس کا ایک خونی رشتہ موجود ہے۔“

”بابا پلیز۔“ اس نے نسیمی نسیمی نظروں سے انہیں دیکھا۔ ”میں یہاں رہنا چاہتا ہوں۔“

”میں جانتا ہوں میری جان! میں تمہارے پیپا سے بات کروں گا۔ انہیں ساری صورت حال سمجھاؤں گا۔ عبد الہادی مرحوم کا حوالہ دوں گا اور مجھے یقین ہے تمہاری بہتری کے لیے وہ تمہیں میرے ساتھ آنے دیں گے۔“

”آپ مجھے وہاں چھوڑنے تو نہیں جا رہے نا۔“ وہ

ابھی تک فاطمہ سے لگا کھڑا تھا اور اب وہ پہلے جیسا ہادی نہیں تھا جو اپنے دل کی بات نہ کر سکتا تھا۔

”اگر بابا نے تمہیں وہاں چھوڑنا ہوتا تو وہ تمہارے کپڑے کتابیں سب ساتھ لے کر جاتے، لیکن تمہارا سب سامان تو اندر کمرے میں پڑا ہے نا۔“ گڑیا نے سمجھایا۔

”ہاں بیٹا! ابھی تو ہم صرف تمہارے پیاسے ملنے جا رہے ہیں۔“

انہوں نے ہاتھ برہمایا تو وہ فاطمہ کے پاس سے ہٹ کر ان کے پاس آیا۔

”فاطمہ پلیز۔ اپنے آپ کو سنہالو۔“

انہوں نے فاطمہ کو تسلی دی، لیکن خود ان کا دل جیسے ڈوب رہا تھا۔ وہ ان کا کوئی نہیں تھا، پھر بھی اس سے پچھڑنے کا خیال سوہان روح بنا ہوا تھا، لیکن نہیں وہ ان کے عزیز از جان دوست عبد الہادی کا بھانجا اور ان کی بہت پیاری بہت عزیز آپا کا بیٹا تھا۔ ام کلثوم نے ہمیشہ انہیں چھوٹے بھائیوں کا سامان دیا تھا۔

اسے محی الدین کی بات کا یقین تھا، لیکن پھر بھی اس نے کئی بار ان سے یقین دہانی چاہی۔

”آپ مجھے واپس لے آئیں گے نا بابا!“

اور ہر بار اسے یقین دلاتے ہوئے ان کا دل ڈوب جاتا۔ راستہ بھر وہ خود کو وضاحتیں دیتے رہے۔ کیا یہ میری خود غرضی تھی کہ میں نے آٹھ ماہ میں پھر حبیب الرحمن سے رابطہ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ کیا میں نے بھی اس کی شکل میں اپنا ہادی پالیا تھا یا میری کوتاہی ہے کہ میں غافل ہو گیا، مصروف ہو گیا۔

دوپہر ڈھل رہی تھی، جب وہ شہر پہنچے تھے اور پھر ہوٹل میں اپنا بیگ رکھ کر انہوں نے اسے کھانا کھلایا تھا۔ ان کا اپنا دل کچھ بھی کھانے کو نہیں چاہ رہا تھا۔ پھر وہ رکشالے کر گاؤں آئے تھے اور حبیب الرحمن کے گھر کے باہر کھڑے جب وہ ٹیل دے رہے تھے تو ایک بار پھر وہ ان سے یقین دہانی چاہ رہا تھا۔

”مجھے یہاں نہیں رہنا بابا! آپ پیاسے ملوانے کے بعد مجھے واپس لے جائیں گے نا۔“ انہوں نے سر

ہلایا۔

”اور اگر آپ نے مجھے یہاں چھوڑ دیا تو اماں اور گڑیا بہت روئیں گی۔“

وہ بہت تیز ہو گیا تھا۔ انہوں نے اس کی اس بات پر مسکرا کر اسے دیکھا اور ٹیل پر ہاتھ رکھ دیا۔ کچھ ہی دیر بعد ایک نوجوان لڑکا باہر آیا۔ یہ لڑکا کون تھا۔ وہ نہیں جانتے تھے۔ شاید حبیب الرحمن کا کوئی سسرالی عزیز ہو۔ لڑکا سوالیہ نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”مجھے حبیب الرحمن صاحب سے ملنا ہے۔“

”لیکن یہاں تو حبیب الرحمن صاحب نہیں رہتے۔ دراصل ہم نے پندرہ دن پہلے ہی یہ گھر کرائے پر لیا ہے۔ اب کچھ ویلی میرے بھائی کی یہاں ٹرانسفر ہوئی ہے۔ دو ماہ پہلے، لیکن گھر ہمیں اب ملا ہے پندرہ دن پہلے تو ہم یہاں شفٹ ہوئے ہیں۔“

”آپ سے پہلے جو لوگ یہاں رہتے تھے وہ کہاں گئے۔ آپ کو کچھ علم ہے۔“

”جی میرے بھائی نے بتایا تھا کہ یہاں جو صاحب رہتے تھے ان کا انتقال ہو گیا تھا۔ ان کی بیگم اپنے بچوں کے ساتھ سیکے جا رہی تھیں۔ بھائی کو کسی نے بتایا تھا اور چونکہ وہ مکان کے سلسلے میں پریشان تھے۔ انہوں نے فوراً ہی یہ گھر کرائے پر لے لیا۔“

لڑکا تفصیل سے بات کرنے کا عادی تھا اور خاصا خوش مزاج بھی۔

”آپ پلیز آئیں، بیٹھیں، کچھ چائے پانی۔“

”نہیں شکریہ بیٹا! آپ کو ان صاحب کا نام پتا ہے۔“ ایک موہوم سی امید کے سہارے انہوں نے پوچھا۔

لڑکے نے لمحہ بھر سوچا۔

”ہاں بھائی! ایک دن ان کا ذکر کرتے رہے تھے کہ رحمن صاحب کو وہ پہلے سے جانتے تھے۔ رحمن ہی نام لیا تھا انہوں نے۔“

وہ بے حد دکھی دل سے مڑے، انہوں نے ساکت کھڑے ہادی کا ہاتھ تھام لیا۔ اس کا رنگ زرد ہو رہا تھا۔ اور ہونٹ ہولے ہولے لرز رہے تھے مضبوطی سے

اس کا ہاتھ تھامے وہ ہوٹل واپس آگئے۔ رات انہوں نے ہوٹل میں ہی گزاری تھی۔ ساری رات دونوں نہیں سو سکے تھے۔ اسے پایا بہت یاد آرہے تھے۔ آج آخری بار وہ یہاں آیا تھا۔ آج کے بعد اس نے یہاں نہیں آتا تھا۔

گیٹ پر کھڑے کھڑے اس کا جی چاہا تھا وہ بھاگتا ہوا اندر جائے۔ پایا کا کمرادیکھے، ہر وہ جگہ دیکھے، جہاں پایا بیٹھتے تھے۔ چلتے پھرتے تھے، لیکن وہ خاموشی سے محسوس الدین کے ساتھ ہوٹل آگیا تھا اور چپ چاپ بیڈ پر لیٹ گیا تھا۔ وہ جانتے تھے وہ رو رہا ہے، لیکن انہوں نے اسے رونے دیا۔ بہت دیر تک وہ دیوار کی طرف رخ کیے رو تا رہا اور اس کا تکیہ آنسوؤں سے بھیلتا رہا۔ بہت دیر بعد انہوں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تھا۔

”ہاوی بیٹا!“ بہت دنوں بعد آج کسی نے اسے ہاوی کہہ کر بلایا تھا۔

”پاپا!“ وہ پلٹا تو انہوں نے ہاتھ پھیلا دیے۔ وہ ایک دم اٹھ کر ان سے لپٹ گیا۔

”پاپا چلے گئے۔ میری بات سنے بغیر۔ مجھے انہیں بتانا تھا کہ میں نے سنی کو نہیں گرایا۔ میں نے کبھی مشاغل کی محی سے بد تمیزی نہیں کی۔ پاپا مجھ سے خفا تھے، ناراض تھے۔ بابا اور میں۔“

وہ بلک بلک کر رونے لگا اور وہ ہولے ہولے اسے تھکتے رہے۔ دلا سا دیتے رہے اور خود اندر ہی اندر نادام ہوتے رہے۔ کاش انہوں نے اتنی تاخیر نہ کی ہوتی وہ بہت پہلے اسے لے کر آجاتے تو وہ اپنے باپ سے مل لیتا۔ لیکن شاید یہی تقدیر میں لکھا تھا۔ انہوں نے صحیح کہا تھا کہ قدرت نے خود اس ہیرے کو ان کی جھولی میں ڈالا ہے اور انہیں اب اس ہیرے کو تراشنا تھا۔

فاطمہ اور گریا نے اس کا بہت خیال رکھا۔ ان دنوں اس کی آنکھوں میں بار بار آنسو آجاتے تھے ایک بار چیزیں پھر اس کے ہاتھوں سے گرنے لگی تھیں۔ یہ بہت مشکل وقت تھا لیکن محی الدین فاطمہ اور گریا تینوں ہی اس کے کیر ٹیکر بن گئے تھے۔ وہ جلد ہی

سنبھل گیا۔ اب اس کا اس دنیا میں کوئی نہیں تھا۔ کوئی اپنا نہیں تھا۔ سوائے سنی کے جو سوتیلا ہی سہی، لیکن اس کا بھائی تھا۔ دونوں کی رگوں میں ایک ہی شخص کا خون دوڑ رہا تھا۔ لیکن سنی وہ جب بڑا ہو گا تو اسے شاید علم بھی نہیں ہو گا کہ اس دنیا میں کہیں کوئی اس کا بھائی بھی ہے یا شاید کبھی مشاغل اسے بتائے کہ وہ ہے اس کا بھائی۔

کبھی کبھی اسے خیال آتا تھا۔

ہو سکتا ہے زندگی کے کسی موڑ پر وہ اپنے بھائی سے مل سکے۔

محی الدین اس کی تربیت کے ساتھ ساتھ باہر جانے کی بھی کوشش کر رہے تھے اور بالآخر وہ کامیاب ہو گئے۔ اس کے لیے وہ فرگوسن کے بھی شکر گزار تھے۔ جو آج بھی عبدالہادی کو یاد کر کے دکھی ہو جاتا تھا۔

”ارے وہ تو میرے اس کلب کے آسمان پر چمکتا چاند تھا۔ کراؤن تھا اس کا۔“

جب بھی فون پر بات ہوتی وہ یہ جملہ ضرور دہراتا تھا۔ اور یہ فرگوسن کا خلوص ہی تھا کہ اس نے ان کی مدد کی تھی اور 2001ء کی ایک صبح جب ہمتھرو ایر پورٹ دھند میں لپٹا ہوا تھا۔ وہ گریا ہاوی اور فاطمہ کے ساتھ وہاں اترے۔ چار سال پہلے وہ تیرہ سالہ ہاوی کو اس سرزمین کی مٹی کے سپرد کر کے چلے گئے تھے اور آج تیرہ سالہ ہاوی کے ساتھ انہوں نے پھر یہاں قدم رکھا تھا۔

ان کا بے حد عزیز دوست سیف اللہ جو لندن کے قیام کے دوران انہیں ملا تھا۔ انہیں لینے آیا ہوا تھا۔ سیف اللہ کے پاس چند دن ٹھہر کر انہوں نے اپنا الگ گھر لے لیا تھا۔ انہیں یہاں طویل قیام کرنا تھا۔ سو یہاں آکر انہوں نے آرام بالکل نہیں کیا تھا۔ اپنے گھر منتقل ہونے کے بعد دوسرا کام چاب تلاش کرنا تھا۔ یہاں فرگوسن نے ان کی مدد کی تھی اور جلد ہی انہیں چاب مل گئی تھی۔ تیسرا کام بچوں کے ایڈمیشن کا تھا اور ایڈمیشن کے بعد وہ اسے آرسل کلب میں لے گئے

تھے، جہاں فرگوسن ان کا منتظر تھا۔ اس نے ٹرائل لینے کے بعد تبصرہ کیا۔

”اس کی تکنیک متاثر کن ہے تمہارے بڑے بیٹے ہادی کی طرح۔ اللہ اسے نظربند سے بچائے۔“ فرگوسن کے تبصرے نے انہیں مطمئن کر دیا تھا۔ بڑے دنوں بعد وہ پرسکون نیند سوئے تھے۔

ہادی کی زندگی کا اب ایک اور دور شروع ہو گیا تھا۔ وہ پڑھ رہا تھا۔ کھیل رہا تھا۔ اس کا کوچ اس سے مطمئن تھا اور گزرتے دن کے ساتھ فٹ بال سے اس کا لگاؤ، محبت، بلکہ عشق میں تبدیل ہوتا جا رہا تھا۔ وہ فارغ ہوتا تو پہلے، میرا ڈونا، ڈیوڈ، بیکھم، وین وغیرہ کے میچز کی سی ڈیز دیکھتا۔ اس کی نگاہ ان کی ہر حرکت پر ہوتی تھی۔ اس نے ان کا ہر میچ سینکڑوں بار دیکھا تھا۔ ان دنوں کم عمر کھلاڑیوں میں رونالڈو کا نام سنا جا رہا تھا جو مائنسٹر کلب کی طرف سے کھیل رہا تھا۔ لوگ اس کم عمر کھلاڑی کے عاشق تھے۔

ہادی بھی اپنے کلب کی طرف سے ٹولینہم سوشر پریمیر لیگ کے درمیان ہونے والے مقابلوں میں حصہ لے رہا تھا اور جب 2003-2004ء کا انگلش سینزن شروع ہوا تو لوگ اس کا نام جاننے لگے تھے۔ اخبارات میں اس کے متعلق لکھا بھی جانے لگا تھا۔ تاہم کچھ تعصب بھی پایا جاتا تھا، جس کی وجہ سے اس کی صلاحیتوں کا کھل کر اعتراف نہیں کیا جا رہا تھا تاہم محی الدین نے اسے تسلی دی تھی کہ ایک وقت آئے گا جب لوگ تمہاری صلاحیتوں کا اعتراف کر لیں گے۔ ان دنوں اس نے اولڈ ٹریفڈ تک سینکڑوں بار سفر کیا تھا اور میچ دیکھتے ہوئے وہ گروپش سے یوں ہی بے خبر ہو جاتا تھا جیسے ایگل کلب کے گراؤنڈ کے باہر بیٹھے بیٹھے۔

وہ اولڈ ٹریفڈ کے اسٹیڈیم میں بیٹھ کر صرف خواب ہی نہیں دیکھتا تھا بلکہ ان تھک محنت بھی کر رہا تھا۔ اسے یقین تھا، ایک دن آئے گا جب لوگ اسے بھی ڈیوڈ، بیکھم، جارج بریان اور روہنسن کی طرح جاننے لگیں گے۔ محی الدین اور قاطمہ جہاں ہر لمحہ اس کی

حوصلہ افزائی کر رہے تھے، وہاں گڑیا بھی ایک اچھے دوست کی طرح ہر قدم اس کے ساتھ تھی۔ ہر گزرتا دن اس کے لیے کامیابیوں کے دروازے وا کرتا جا رہا تھا اور ہر رات سونے سے پہلے وہ خود سے عہد کرتا تھا کہ اسے محی الدین کا خواب پورا کرنا ہے اور ہر رات وہ حبیب الرحمن کو یاد کرتا، اس کے تصور میں ام کلثوم کا سراپا آتا اور چند آنسو آنکھوں کے کونوں سے نکل کر تکیے میں جذب ہو جاتے۔

(دوسری اور آخری قسط میں آئندہ صفحہ ان شاء اللہ)

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے خوبصورت ناول

کتاب کا نام	قیمت
بہادول	500/-
درہم	750/-
زندگی اک روشنی	500/-
خوشبو کا کوئی کمر نہیں	200/-
شہر دل کے دروازے	500/-
حیرے نام کی شہرت	250/-
دل ایک شہرچوں	450/-
آئینوں کا شہر	500/-
ہول بھلیاں حیرتی کہیاں	600/-
بھلاں دے دنگ کالے	250/-
پہ کیاں یہ عہد ہمارے	300/-
میں سے عورت	200/-
دل اُسے لاٹھ لایا	350/-
بکھرتا جائیں خواب	200/-
دل کو خندھی مسمائی سے	250/-

ناول نگار کے لئے فی کتاب ڈاک خرچہ - 30/- روپے

نگارنے کا پتہ:

کتبہ عمران ڈائجسٹ - 37 اندھارا، کراچی۔

فون نمبر: 32216361



پیر اپنی گود میں رکھے اور نرمی سے دبانے لگی۔
”اے ٹٹا! تیرے بال کتنے خشک ہو رہے ہیں بیٹا! لا
میں اچھی طرح تیل ڈال دوں۔“

دادی کے نرم نرم ہاتھوں سے تیل کا مساج۔
خیال تو بڑا خوش کن تھا، لیکن سارا دن اسکول میں
بچوں کے ساتھ اور اس کے بعد گھر کے کاموں میں
مصروفیت نے اس قدر تھکا دیا تھا کہ اس وقت صرف
اپنے بستر پر لیٹنے کا شدت سے دل چاہ رہا تھا۔ سودا دی

ماں کو چادر اوڑھا کر ان کے کمرے کی لائٹ بند کرتے
ہوئے میں باہر نکلی تو امی فروٹ ٹراٹفل کا پیالا لے کر
میری طرف ہی آرہی تھیں۔

”یہ لوٹنا! تم نے تو کھایا نہیں، میں نے تمہارا حصہ
نکال کر فریج میں رکھ دیا تھا۔ اب کھا کر سونا۔“ امی نے
زبردستی پیالا میرے ہاتھوں میں تھمانے کی کوشش
کی۔

”امی پلیز! ابھی نہیں۔ کل اسکول سے آؤں گی،
تب کھالوں گی ٹھنڈا ٹھنڈا ٹراٹفل، مزا تو اسی وقت
آئے گا۔“ میں نے امی کے ہاتھوں سے پیالا لے کر
فریج میں رکھ دیا۔

”اچھا سنو! کل جب اسکول سے گھر آؤ تو دروازے
اچھی طرح بند کر لیتا۔ کیوں کہ صبا تو یونیورسٹی سے
لیٹ آئے گی۔ سمیہ کا میکے جانے کا پروگرام ہے اور
میں تمہاری دادی کے ساتھ ذرا انسیمہ خالہ کی طرف
جاؤں گی اور ہاں یاد سے چابی لے جانا گھر کی۔“ امی کی
تفصیلی ہدایات کو میں نے بند ہوتی ہوئی آنکھوں کو

”ٹٹا! کتنی دیر سے باورچی خانے میں تھسی ہوئی ہو،
تھک گئی ہوگی۔ حال تو دیکھو اپنا۔“ امی نے باورچی
خانے میں داخل ہوتے ہوئے بہت پیار بھرے لہجے
میں میٹھی سی ڈانٹ پلائی۔ ”بس کرو اب باہر نکلو تم۔
باقی کام صبا یا سمیہ دیکھ لیں گی۔“

”نہیں امی! کوئی اتنا کام نہیں ہے۔ بس تھوڑی دیر
اور۔“ میں نے پیاز کاٹتے ہوئے سر اٹھا کر امی کو دیکھا
اور دوبارہ مصروف ہو گئی۔ ”صبا کو تو بالکل نہ اٹھائے گا،
کل ٹیسٹ ہے اس کا اور سمیہ بھابھی کو رات بھر کتنا
ستایا ہے عروہ نے، ساری رات جاگتی رہیں اب ذرا
آنکھ لگی ہے ان کی بھی۔“

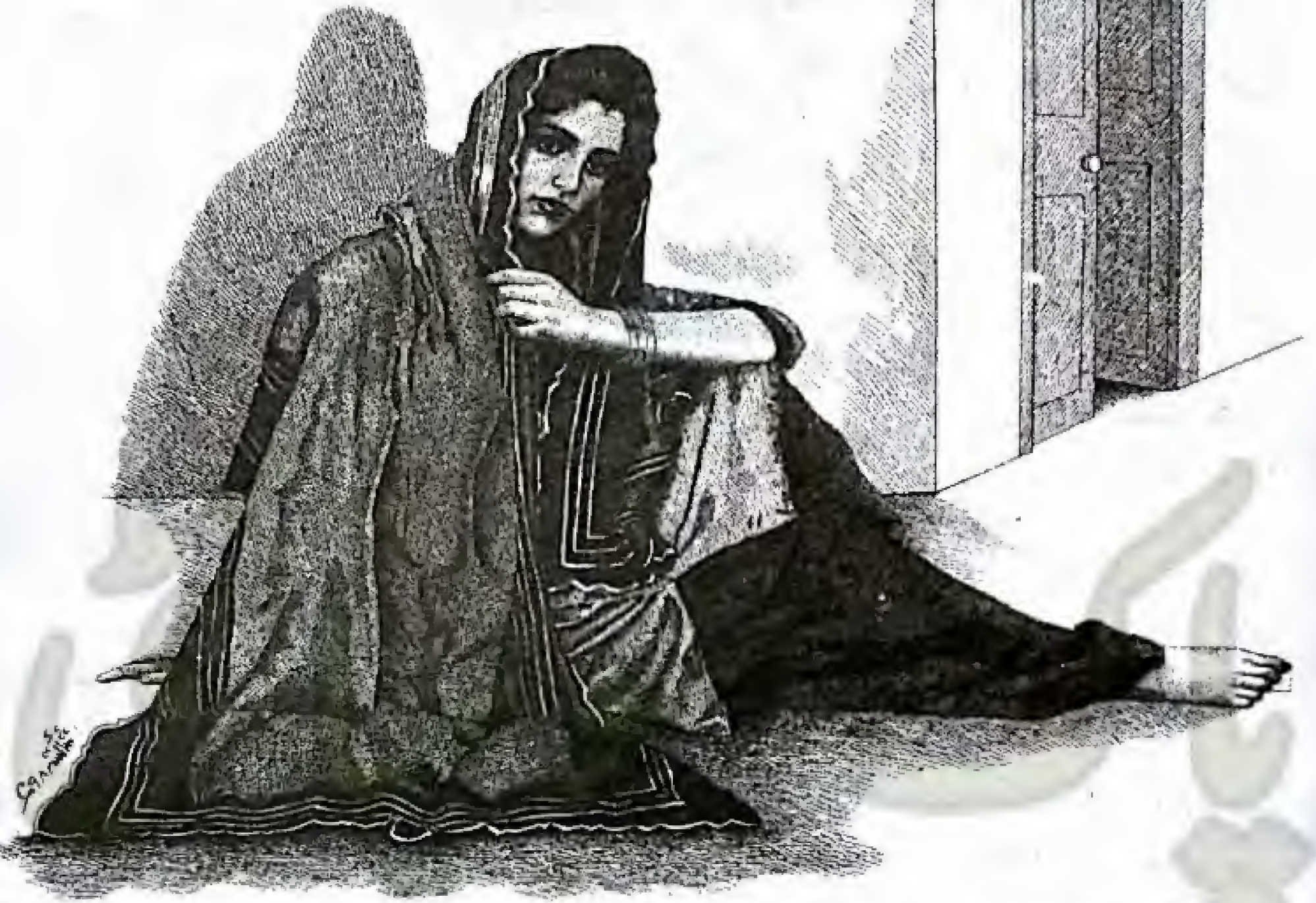
اپنی بات ختم کر کے میں کٹی ہوئی پیاز پتیلی میں ڈال
کر ٹماٹر کاٹنے لگی۔

”تم بھی ٹٹا! امی محبت سے میری طرف دیکھ کر
مسکرائیں اور گلاس میں دودھ ڈال کر دادی اماں کے
کمرے کی جانب بڑھ گئیں۔



”ارے بھئی! میں بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں کوئی
ضرورت نہیں میرے پیر دبانے کی۔“ دادی اماں نے
اپنی ٹانگیں بستر پر کھینچ لیں تو میں کارپٹ سے اٹھ کر ان
کے برابر میں آ بیٹھی۔

”دبانے دیں نادادی ماں! مجھے معلوم ہے کہ آپ کو
ضرورت نہیں ہے، لیکن مجھے اچھا لگتا ہے نا!“ میں
جانتی تھی کہ آج کل دادی اماں کے پیروں میں کس
قدر تکلیف رنے لگی تھی۔ میں نے پیار سے ان کے



اپنے بستر پر لیٹے ہوئے بند ہوتی آنکھوں کے ساتھ
صبا کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی تو میں طمانیت
سے مسکرا دی۔



”افوہ! یہ کیا ہو گیا؟“ اسٹاف روم میں یہ گھبرائی
گھبرائی سی آواز نئی ٹیچر روینہ کی تھی۔
”کیا ہو گیا مس روینہ!“ میں نے کاپیاں چیک
کرتے ہوئے سر اٹھایا۔

”یہ میں نے حاضری رجسٹر میں غلط تاریخ پر تعطیل
کی لیکرس کھینچ دی ہیں۔ اب کیا کروں؟“ وہ تقریباً ”رو
دینے کو تھی۔

”ارے بھئی! یہ کون سا مشکل کام ہے۔“
میں نے روینہ کے ہاتھ سے رجسٹر لیا اور آخری

کھولنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے بمشکل سنا اور
اپنے کمرے کا رخ کیا۔

”صبا لائٹ بند کر دو۔ مجھے بہت نیند آرہی ہے۔“
میری آواز پر صبا نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا تو میں
ایک دم سے پریشان ہو گئی۔

”کیا ہوا تمہیں۔ آنکھیں کیوں اتنی سرخ ہو رہی
ہیں؟“ میں تیزی سے اس کی جانب بڑھی۔
”کچھ نہیں بس سارا دن پڑھتی رہی نا اب سر میں
درد ہو رہا ہے۔“

صبا نے بے چارگی سے جواب دیا۔ اس کے بعد صبا
کے لیے چائے بنانے اس کو اصرار کر کے دوا کھلانے
اور اس کے سر میں تیل کا مساج کرنے میں کب رات
کے ڈیڑھ بج گئے۔ پتا ہی نہیں چلا۔

”نشا! تم بہت بہت اچھی ہو۔ آئی لو پو سوچ۔“

صحنے سے لہائی میں ایک ٹی کاٹ کر لیکسوں پر چپکادی۔
”بہت بہت شکریہ! ورنہ میرے تو اوسان خطا
ہو رہے تھے۔“ روینہ نے تشکر سے میری طرف دیکھتے
ہوئے کہا۔

”ٹٹا! اس مرتبہ آپ نے وعدہ کیا ہے کہ میری کلاس
کی رپورٹ کارڈز پر آپ ریمارکس لکھیں گی۔“ مس
احمد اشاف روم میں داخل ہوئیں اور رپورٹ کارڈز کا
بندل میرے سامنے دھردیا۔

”جی مس احمد! بالکل یاد ہے۔ لائیے ناموں کی
فہرست اور ریمارکس۔“ میں نے مسکراتے ہوئے قلم
رکھا اور رپورٹ کارڈز کی تمہیں کھولنے لگی۔



”اف! اس قدر شدید گرمی ہے۔“

آج تو گویا راستہ ہی نہیں کٹ رہا۔ اور سے دین
میں حد سے زیادہ رش۔ میں نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی
کالی سے خود کو جھلکا شروع کیا تو اچانک ہی مجھے ٹرانفل
کا ٹھنڈا ٹھارہ پالا یاد آیا، اتنی گرمی میں ٹھنڈے ٹھنڈے
ٹرانفل کا تصور نہایت خوش کن تھا۔

”گھر جاتے ہی سب سے پہلے ٹھنڈے پانی سے
خوب دیر تک منہ ہاتھ دھوؤں گی۔ پھر ٹرانفل کھاؤں
گی اس کے بعد کھانا کھا کر خوب ٹھنڈی کولڈ ڈرنک
بھی پیوں گی۔“

میں بچوں کی طرح سوچ سوچ کر مسکرا رہی تھی کہ

دین کو اپنے گھر کے دروازے پر رکتا پا کر اترنے لگی۔
”ارے یہ کیا۔ دروازے پر تو تالا لگا ہوا ہے۔“
تالے پر نظر پڑتے ہی رات سنی ہوئی امی کی ہدایات
یاد آنے لگیں۔

”اف اللہ! میں نے تو چابی رکھی ہی نہیں۔“ میں
بے بسی سے دروازے کو کھور رہی تھی۔ اندر میرا
پسندیدہ ٹرانفل ٹھنڈا پانی سب کچھ موجود تھا۔ میرا نرم
نرم بستر تھا جس پر لمبی نیند سونے کی شدید خواہش
تھی، لیکن میرے پاس دروازے کی ”چابی“ نہیں
تھی۔

”چابی۔“ میں نے زیر لب دہرایا اور دھک سے رہ
گئی۔ چابی تو واقعی میرے پاس نہیں تھی ہاں! اس کا
اہتمام ہی کب کیا تھا میں نے؟

بہت ساری چھوٹی بڑی نیکیاں اور ڈھیر سا حسن
اخلاق، میرے لیے میری جنت میں بہت کچھ تھا، لیکن
چابی؟ مجھے ایک دم سے اپنی دن بھر کی مصروفیات یاد
آنے لگیں بچن میں نماز کہیں بھی نہیں تھی۔

مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میں جنت کے دروازے پر
کھڑی ہوں جو ”میری جنت“ ہے، لیکن میں اس کے
اندر نہیں جاسکتی، ایک عجیب سی محرومی کا احساس
میرے اندر جاگا اور ساتھ ہی کہیں جذبہ شکر بھی کہ اگر
آج میں گھر کی چابی نہ بھولتی تو جنت کی چابی کی اہمیت کا
احساس پھر نہ جانے کب ہوتا۔



شائع ہو چکے ہیں

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لئے خوبصورت ناول

خوبصورت مردانہ

خوبصورت چھائی

مضبوط جلد

آفٹ ہینچر

- ☆ تئلیاں، پھول اور خوشبو راحت جبین قیمت: 250 روپے
- ☆ بھول بھلیاں تیری گلیاں فائزہ افتخار قیمت: 600 روپے
- ☆ محبت بیاں نہیں لہنی جدون قیمت: 250 روپے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37- اردو بازار کراچی۔ فون: 32216361

ماہنامہ شعل اپریل 2015 156

سیاہ حجاب

”دیکھو وہ جو سیاہ حاشیہ ہے۔ اسے پار مت کرنا۔“ پریشان آواز نے ایک دفعہ پھر اس کا تعاقب کیا۔ ایک لمحے کو وہ ساکت ہوئی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ اس کی خوب صورت ستواں ٹاک کے نیچے تنفر کے گہرے احساس سے پھر پڑا۔ اس نے لاپرواہی سے سر جھٹکا اور ایک دفعہ پھر بھاگنا شروع کر دیا۔

”شہر لڑکی، رک جاؤ، آگے مت جاؤ۔“ ایک خوف زدہ سی آواز اس کی سماعتوں میں گونجی۔ وہ جو زندگی کے پُر فریب میدان میں اپنی بے لگام خواہشوں کی گھڑی اٹھائے اندھا دھند بھاگ رہی تھی۔ اس کی سماعتوں نے من و عن ان الفاظ کو سنا تھا، لیکن ایسا لگتا تھا جیسے اس نے کوئی بھی بات سن کر نہ سننے کی قسم کھا رکھی ہو۔

ناولٹ





نے اس کے ارد گرد کی چیزیں روشن کر دیں تو خدا نے ان کی روشنی زائل کر دی۔ ان کو اندھیروں میں چھوڑ دیا کہ وہ کچھ نہیں دیکھتے۔



”آں۔ چھی۔“ مونہ نے ہاتھ منہ پر رکھ کر زور دار چھینک ماری۔ اس کی آنکھیں ارد گرد پھیلی گرد کے ذرات کی وجہ سے سرخ ہو رہی تھیں۔ وہ اس وقت آیا صالحہ کے اسٹور میں بنی پر چھتی پر مجبوراً ”بیٹھی فالتو سامان نیچے اتار رہی تھی پاس ہی لکڑی کی سیڑھی رکھی ہوئی تھی جس کے ذریعے وہ اوپر چڑھی تھی اور اسی سیڑھی کے پاس انیس سالہ عدینہ کھڑی تھی۔

”مونہ جلدی کرو تاں۔“ اسٹور میں کھڑی عدینہ نے گرد سے بچنے کے لیے اپنا دوپٹہ اچھی طرح منہ اور ناک کے گرد گپیٹا۔

”باجی! یہ لیں آخری بیگ۔“ مونہ نے بازو گھما کر نیلے رنگ کا ایک چھوٹا سا بوسیدہ بیگ فرش پر پھینکا۔ مٹی کا ایک اور طوفان اس کے ہمراہ آیا تو عدینہ کو تمام تر حفاظتی اقدامات کے باوجود چھینکیں آنا شروع ہو گئیں۔ اسے تو ویسے بھی ڈسٹ الرجی تھی۔

”اللہ پوچھے تمہیں۔“ عدینہ نے اپنا ناک مسلتے ہوئے سولہ سالہ مونہ کو گھورا جو اس کی فرمائش پر ہی اوپر چڑھی تھی۔

”ایک تو میں جان ہتھیلی پر رکھ کر بیٹھی ہوں، آپا صالحہ کو پتا چل گیا تو ٹانگیں ٹوڑ دیں گی میری۔“ وہ بمشکل سیڑھی پر مضبوطی سے قدم جماتے ہوئے اب نیچے اتر رہی تھی ساتھ ساتھ گفتگو کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ ”اوپر سے آپ بھی مجھے ہی باتیں سن رہی ہیں۔“ مونہ کا مزاج برہم ہوا۔

”اچھا اچھا۔ زیادہ باتیں نہ کرو۔“ عدینہ کاٹھ کباڑ میں اپنی پرانی ڈائریاں ڈھونڈ رہی تھی جو آپا صالحہ نے اس کے ہوشل جانے کے بعد اسٹور کی پرچھتی پر پھٹکوا دی تھیں۔ اب اسے اچانک ہی ان کی ضرورت

”رک جاؤ لڑکی۔ دنیا کی زندگی دھوکے کے سوا کچھ نہیں۔“ وہ حلق پھاڑ کر چیخا۔

”ہرگز نہیں۔“ وہ بولی نہیں تھی، لیکن اس کی آنکھوں میں یہ محرر صاف پڑھی جا رہی تھی۔

”میری بات مانو، واپس لوٹ آؤ۔“ التجا، یہ آواز میں درد کا ایک جہاں آباد ہوا۔

اس فرمائش پر لڑکی کی تیوری پر موجود بلوں میں اضافہ ہوا اور اب اس نے اور زیادہ قوت سے بھاگنا شروع کر دیا۔ سنگلاخ پتھریلی زمین اس کے خوب صورت پیروں کو زخمی کر رہی تھی، لیکن ایسا لگتا تھا جیسے وہ اب گونگی اور بہری بن چکی ہو۔

”وہ حاشیہ پار مت کرو، میں تم سے کہہ رہا ہوں، رک جاؤ۔“ اس نے چیخ کر غصے سے کہا۔ اس کا ساتھ دینے کو ناراض سورج نے اپنی شعاعوں کا ایک طوفان زمین پر بھیج دیا اور زمین تھپتا ہوا تندور بن گئی۔

”بہت پچھتاؤ گی۔“ اس آواز میں دھمکی کا عنصر شامل ہوا۔ ایک استہزائیہ سی مسکراہٹ اس لڑکی کے چہرے پر نمودار ہوئی، ایسا لگتا تھا جیسے اس پر کسی التجا، کسی دھمکی اور کسی بھی بات کا کوئی اثر نہ ہو رہا ہو۔

”بھاڑ میں جاؤ دیکھنا جہنم کی آگ میں جلوگی۔“ وہ

لڑکی بھاگتے بھاگتے رکی، مسکرائی اور سیاہ حاشیہ عبور کر گئی۔

وہ سیاہ حاشیہ جو اسے اندھا دھند بھاگتے ہوئے نظر نہیں آیا تھا۔ اندر داخل ہوتے ہی ایک لمحے کے ہزار ویں پل میں اسے احساس ہوا، وہ واقعی ایک جہنم میں داخل ہو چکی ہے۔ جس کا ٹکٹ اس نے خود اپنے لیے خریدا تھا، دوزخ کی آگ اب اس پر ہنس رہی تھی، کیوں کہ ان گنت گناہ گار لوگوں کی طرح اس کا وجود بھی جہنم کا اندھن بننے جا رہا تھا۔

”یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت چھوڑ کر گمراہی خریدی، تو نہ ہی ان کی تجارت نے کچھ نفع دیا اور نہ وہ ہدایت یافتہ ہوئے۔ ان کی مثال ایسے شخص کی سی ہے جس نے شب تاریک میں آگ جلائی۔ جب آگ

پریشان ہوئی۔

”باجی۔۔۔ باجی“ آپا صالحہ ادھر آرہی ہیں۔ ”مونا“
حواس باختہ سی اسٹور میں داخل ہوئی تو عدینہ نے بوکھلا
کر ہاتھ میں پکڑا کتبہ بیک میں پھینکا اور جلدی سے
زپ لگا کر بیک بند کیا۔ ایک لمحے میں اس کی توجہ
دوسری جانب مبذول ہو گئی تھی۔ وہ اب بے مقصد
چیزیں سمیٹنے لگی۔

”یہ کیا ہو رہا ہے؟“ آپا صالحہ نے ناک چڑھا کر اندر
کا منظر دیکھا اور مٹی سے بچنے کے لیے فوراً ”اپنا دوپٹہ
ناک پر رکھ لیا۔

”آپا“ میں اپنی پرانی ڈائریاں ڈھونڈ رہی تھی۔“
عدینہ کے منہ سے بے اختیار پھسلا جے سنتے ہی آپا کی
تیوری چڑھ گئی۔

”وہ تو میں نے پچھلے سال روی والے کو دے دی
تھیں۔“ آپا صالحہ کی بات پر اسے شاک لگا۔ سخت بے
یقینی سے اس نے آپا کو دیکھا اور چپ رہی۔ دل دکھ کے
گہرے احساس سے بھر گیا۔ آنکھوں میں آئے نمکین
پانی کو چھپانے کے لیے اس نے نظریں جھکا لیں۔ وہ
اب دل ہی دل میں ان سے خفا ہو چکی تھی۔

”ان میں تھا ہی کیا“ فضول سی شاعری، کچھ بے تکے
سے اشعار۔“ ان کی اگلی بات نے عدینہ کے زخموں پر
مزید نمک چھڑکا۔

اس نے ایک ناراض سی نگاہ ان پر ڈالی اور آہستگی

سے اسٹور روم سے نکل گئی۔ جب کہ آپا صالحہ اب
مونا پر برس رہی تھیں۔ جس نے یہ مخبری کی تھی اور نہ
عدینہ کو گھریلو معاملات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس
کا اوڑھنا بچھونا صرف اپنی نصاب کی کتابیں تھیں۔

میٹرک اس نے حسن ابدال کے اور ایف ایس سی
ہنڈی کے ایک کالج کے ہاسٹل میں رہ کر کیا تھا۔ ویسے
تھی وہ کم گو اور اپنے آپ میں مگن رہنے والی لڑکی
تھی۔ گھر کے معاملات میں نہ تو اس نے خود اور نہ ہی
آپا نے کبھی اسے دلچسپی لینے پر مجبور کیا تھا۔ عدینہ نے
کبھی بھی ان سے عام بچوں کی طرح لاڈ نہیں اٹھوائے

پڑ گئی تھی۔

”باجی! مل گئی ڈائریاں۔۔۔؟“ مونا نے بے تابی سے
بوچھا تو اس نے مایوسی سے نفی میں سر ہلایا۔ ”وہ بیک“
ایک بڑا کارٹن اور ایک پرانا اپتیجی وہ چیک کر چکی تھی۔
ابھی تک مطلوبہ چیز اس کے ہاتھ نہیں لگی تھی۔ کافی
وقت گزر چکا تھا۔

”جاؤ بھاگ کر دیکھ کر آؤ“ آپا کیا کر رہی ہیں۔“
عدینہ کے لہجے میں چھپا خوف محسوس کرتے ہی مونا
دبے قدموں اسٹور سے نکل گئی۔ عدینہ، آپا صالحہ کی
اکھوتی بیٹی تھی، جبکہ مونا، عدینہ کے والد کے کزن کی
بیٹی تھی۔ یہاں دینی تعلیم کے سلسلے میں آئی تھی۔

عدینہ نے بچپن ہی سے سب کی دیکھا دیکھی اپنی
والدہ کو ”آپا“ کہنا شروع کر دیا تھا اور باوجود کوشش کے
اس کے منہ سے ان کے لیے امی کا لفظ نہیں نکلتا تھا۔
آپا نے بھی اب اسے اس بات پر ٹوکنا چھوڑ دیا تھا۔

”یہ کیا۔۔۔؟“ نیلے بوسیدہ سے بیک میں بہت سی
چیزوں کے ساتھ چھپا ہوا ایک سنگ مرمر کا چوکور ٹکڑا
اس کے ہاتھ لگا۔ وہ کسی قبر پر لگانے کے لیے ایک
بالکل تیار کتبہ تھا۔ سفید رنگ کا یہ کتبہ خاصا بوسیدہ اور
میلا ہو چکا تھا، لیکن اس پر لکھے سیاہ روشنائی والے
حروف صاف پڑھے جا رہے تھے۔

”آخری آرام گاہ محترمہ صالحہ رفیق زوجہ محمد رفیق
احمد، تاریخ پیدائش 21 فروری 1970ء، تاریخ
وفات 22 دسمبر 1992ء“ کتبے پر لکھی تاریخ
وفات پڑھتے ہی عدینہ کو دھچکا سا لگا وہ سخت بے یقینی
سے اس ————— خنتی کو دیکھ رہی تھی۔ دماغ میں
ایک بھونچال سا برپا ہوا۔

صالحہ رفیق تو اس کی جیتی جاگتی والدہ کا نام تھا اور محمد
رفیق اس کے مرحوم والد کا نام، اس میں تو کوئی شک ہی
نہیں تھا۔ جب صالحہ بیگم زندہ تھیں تو پھر —————
اس خنتی پر تحریر عبارت کس کے لیے تھی؟۔ اس کا
ذہن بری طرح الجھ گیا۔

”یہ کتبہ کس نے اور کیوں بنوایا ہے؟“ وہ سخت

تھے اور نہ آپا نے ایسی کوئی شعوری کوشش کی تھی۔
اسی لیے اب عدینہ باوجود کوشش کہ اپنی ماں سے کھل
کریات نہیں کر سکتی تھی۔

اپنے کمرے میں بید پر لیٹتے ہی عدینہ کا دل بھر آیا۔
آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہنے لگے۔ وہ ڈائریاں
اس کی بچپن کی سہیلیاں اور غم گسار تھیں۔ جن کے
صفحات پر اس نے اپنے بے شمار دکھ شاعری کی زبان
میں لکھے تھے۔ وہ لفظ جن سے اسے بہت پیار تھا۔ وہ
اس سے ہمیشہ کے لیے دور جا چکے تھے۔

”آپا ہمیشہ میرے ساتھ زیادتی کرتی ہیں۔“ بے
آواز روتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی۔ اچانک اس کا
ذہن ————— اس سختی کی طرف چلا گیا۔

”وہ کتبہ کس کا تھا؟“ روتے روتے اس کی توجہ
دوسری جانب مبذول ہوئی۔

”نام اور تاریخ پیدائش تو آیا صالحہ کی تھی، لیکن
تاریخ وفات؟“ اس کا ذہن بری طرح الجھ گیا۔ وہ فوراً
انٹھی اور اپنے بیگ میں رکھی آپا صالحہ کے شناختی کارڈ
کی کاپی اٹھا کر تاریخ پیدائش دیکھی تو وہی تھی۔

”آپا نے اپنی قبر پر لگانے کے لیے یہ کتبہ پہلے سے
کیوں تیار کر رکھا ہے۔“ اس کا ذہن اس پسلی کو بوجھنے
سے قاصر تھا۔

”لیکن تاریخ وفات۔۔۔؟“ اس سوال کا جواب اس
کے پاس نہیں تھا۔

”کس سے پوچھوں؟“ عبد اللہ سے۔۔۔؟“ اس کی

سوچ کی حدیں اپنے منگیتر کے نام پر آکر ختم ہو جاتی
تھیں۔

”کتنے دن ہو گئے“ عبد اللہ نے آپا کو حساب کتاب
دینے کے لیے گھر کا چکر نہیں لگایا۔ ”اس کی ذہنی رو
بھٹک گئی۔“

کچھ سال پہلے ہی اس کے دل نے عبد اللہ کے نام پر
جب دھڑکنا سیکھا تو زندگی اسے خود بخود خوب صورت
لگنے لگی تھی۔ عبد اللہ نے عربی میں ایم فل کر رکھا
تھا۔ قرآن پاک حفظ کرنے کے علاوہ حدیث اور تفسیر

کے کورسز بھی کر رکھے تھے۔ اس کی آواز بہت خوب
صورت اور بے اختیار دل کو چھونے والی تھی۔ مسجد
کے لاؤڈ اسپیکر سے پانچ وقت اس کی آواز میں ہونے
والی اذان عدینہ بڑے عقیدت بھرے انداز سے سنتی
تھی۔ مدرسے کی بچیاں بھی اکثر آتے جاتے اسے
عبد اللہ کے نام سے چھیڑتی تھیں۔ وہ اپنی بوڑھی والدہ
کے ساتھ مدرسے کے بالکل سامنے بنے گھر میں رہتا
تھا۔ دراز قد، صاف رنگت، بڑی بڑی کشادہ آنکھوں
والا عبد اللہ خاصی متاثر کن شخصیت کا حامل تھا۔ ان
دونوں کا بچپن ایک ساتھ ہی گزرا تھا، لیکن بے تکلفی
نہ ہونے کے برابر تھی۔ ویسے بھی وہ عمر میں عدینہ سے
آٹھ سال بڑا تھا۔ ان دونوں کی منگنی دونوں گھرانوں کی
مکمل رضامندی سے ہوئی تھی۔

”پتا نہیں عبد اللہ کو مجھ سے محبت ہے کہ نہیں؟“
وہ اب کتبے کو بھول کر اپنے منگیتر کی یادوں میں ایسی گم
ہوئی کہ پتا ہی نہیں چلا، کب نیند کی وادیوں میں گم
ہو گئی۔ آج تو عصر کی اذان کا بھی اسے پتا نہیں چلا۔
ورنہ عبد اللہ کی آواز سنتے ہی اس کی آنکھ کھل جاتی
تھی۔

چپچھم سے ایک زوردار سرخ آندھی نمودار ہوئی۔
اس کے ساتھ ہی اجلی فضا میں گرد، ریت اور مٹی کا
ایک طوفان اٹھ آیا۔ گھر کے کھلے دروازے پوری قوت
سے ایک دوسرے کے ساتھ ٹکرائے اور فضا میں گویا
بھونچال برپا ہو گیا۔ عدینہ ہڑبڑا کر انٹھی، اور ننگے پاؤں
بھاگتی ہوئی اپنے کمرے سے برآمدے کی طرف نکل

آئی۔ ساری فضا گرد آلود تھی۔ مٹی کے جھکڑ فضا میں
رفس کر رہے تھے۔

”استغفر اللہ۔۔۔ استغفر اللہ۔۔۔“ بے بے صحن میں
دھلے ہوئے کپڑوں کو پکڑنے کی کوشش میں بلکان
ہو رہی تھیں۔ صبح ہی تو آیا صالحہ کے مدرسے کی کچھ
بچیوں نے واشنگ مشین لگا کر کپڑوں کا ایک ڈھیر دھویا
تھا، جو اس اچانک آنے والی آندھی کی وجہ سے مشرق و
مغرب میں اڑتا پھرتا تھا۔

تپانے بھی لگتا ہے سل بھر کے کپڑے آج ہی دھلوائے ہیں۔ ”عدینہ نے ناگواری سے سوچا۔
 ”توبہ۔ توبہ۔“ بے بے کا استغفار جاری تھا۔
 ساتھ ساتھ وہ کپڑے بھی سمیٹ رہی تھیں۔
 ”بے بے آپ جا میں اندر میں اکٹھے کر لیتی ہوں۔“ عدینہ کے منہ میں ریت کے چند ذرے اڑ کر چلے گئے تھے وہ — واش بیسن کے سامنے کھڑی کلیں کر رہی تھی۔

”لگتا ہے آج کسی کا ناحق خون ہوا ہے۔“ عدینہ جیسے ہی کپڑوں کا بھاری بھر کم ٹھنڈاٹھائے کمرے میں داخل ہوئی بے بے کی آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی۔ اس نے بے زاری سے کپڑے بیڈ پر پھینکے اور خود بیٹھ کر لمبے لمبے سانس لینے لگی۔

”بے بے آپ کی تیوری کو اگر درست مان بھی لیا جائے تو آج کل جس رفتار سے قتل و غارت ہو رہی ہے بس صبح و شام آندھیاں ہی چلتی رہیں۔“ عدینہ کا سانس بحال ہوا تو اس نے بے تکلفی سے لگے ہاتھوں تبصرہ بھی کر ڈالا۔

”تم نے عصر کی نماز پڑھی؟“ آپا صالحہ کی آواز پر وہ اچھل کر کھڑی ہوئی۔ لوڈ شیڈنگ کے کمالات کی وجہ سے وہ کمرے کے کونے میں تسبیح کرتی آپا صالحہ کو نہیں دیکھ پاتی تھی ورنہ اس طرح بے لاگ بصر نہ کرتی۔ ویسے بھی یہ وقت تو ان کا گھر کی پچھلی طرف پر بنے پردے میں گزرتا تھا آج خلاف توقع وہ یہاں موجود تھیں۔

”نہیں آپا۔ سو گئی تھی۔“ عدینہ نے شرمندہ سی آواز میں ان کی بات کا جواب دیا۔

”مغافل کرنے والی نیند سے پناہ مانگا کرو اللہ سے۔“ آپا صالحہ کی آواز میں اس قدر برہمی تھی کہ عدینہ اندھیرے میں صرف سر ہلا کر رہ گئی۔ ویسے بھی آج تو وہ آپا سے خوب دل ہی دل میں ناراض تھی۔ اس لیے چپ رہی۔

”ہوشل کب جاتا ہے تم نے؟“ ان کا سپاٹ لہجہ ایک دفعہ پھر اس کی سماعتوں سے ٹکرایا۔

”کل۔“ وہ آہستگی سے گویا ہوئی۔
 ”ٹھیک ہے اگلے جمعے گھر کا چکر لگالینا“ کچھ بچیوں کے ختم قرآن کی تقریب ہے۔“ انہوں نے سنجیدہ انداز سے یاد دلایا۔

”ٹھیک ہے آپا۔“ ان کی کسی بات سے انکار کرنا تو عدینہ نے سیکھا ہی نہ تھا۔

”عدینہ پتر! ایک پیالی چائے کی تو بنا دے۔“ بے بے کی فرمائش پر اس نے سکون کا سانس لیا اور فوراً اٹھ کر کچن کی طرف چلی آئی۔ اسی لمحے بجلی بھی آگئی۔ مغرب کی اذان ہو رہی تھی۔ عدینہ کچن کے فرش پر بیٹھی بہت خاموشی سے عبد اللہ کی آواز کو اپنے دل میں اترتا ہوا محسوس کر رہی تھی۔

چائے دم پر رکھ کر اس نے مغرب کی نماز پڑھی۔ اسی لمحے چند بچیاں چاول لیے چلی آئیں۔ جو اس نے لے کر کچن میں رکھ دیے۔ اچانک اسے خیال آیا اور اس نے ایک ڈونگے میں گاجر کی کھیر نکالی اور اسے اچھی طرح ڈھک دیا۔

”سنو۔ اپنے بھائی سے کہو یہ کھیر مسجد میں دے آئے۔“ عدینہ نے بارہ سالہ بچی کو آہستگی سے کہا۔
 ”باجی عبد اللہ بھائی کو کھیر بہت پسند ہے نا۔“ اس بچی نے شوخی سے آنکھیں گھما میں تو عدینہ بے اختیار شرمندہ ہو گئی۔

”ہاں۔ ہاں اب بھانگوں میں سے۔“ عدینہ جلدی سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

وہ اکثر آپا سے نظریں بچا کر اسے کچھ نہ کچھ بھجواتی رہتی تھی، لیکن عبد اللہ کی طرف مکمل سکوت رہتا۔ دونوں کے درمیان لفظوں کا کوئی تعلق نہیں تھا، لیکن اس کے باوجود وہ دونوں محبت کی مضبوط ڈور سے بندھے ہوئے تھے۔ عبد اللہ کا ان کے گھر میں بے تکلفی سے آنا جانا تھا۔ گھر میں کوئی اور مرد نہ ہونے کی وجہ سے آپا سے کسی نہ کسی کام کے لیے بلواتیں اور فرماں برداری اس پر ختم تھی۔ وہ سر جھکائے سیدھا آپا کے پاس آتا اور وہیں سے واپس چلا جاتا۔ آتے جاتے اکثر اس کا عدینہ سے سامنا ہوتا۔ چھوٹی چھوٹی ان

ملاقاتوں نے عدینہ کی زندگی میں بڑے خوب صورت رنگ بھر رکھے تھے۔ وہ دونوں بہت کم ایک دوسرے کو مخاطب کرتے، لیکن ایک سرسری سی نگاہ ہی دونوں کو کئی دن خوش رکھنے کے لیے کافی ہوتی۔

عبد اللہ کی والدہ کو عدینہ سے خصوصی لگاؤ تھا۔ وہ جب بھی ہوسٹل سے گھر آتی تو اس کی والدہ اس سے ملنے ضرور آتیں، ان کو اپنی اس مستقبل کی ڈاکٹر بہو سے بہت پیار تھا۔ جس کا اظہار ان کے ہر انداز سے بے اختیار چھلکتا تھا۔

مولوی رفیق اپنی بیوی صالحہ، اکلوتی بیٹی اور والدہ کے ساتھ حسن ابدال کے ایک گاؤں میں بہت سالوں سے مقیم تھے۔ ان کا گھر خاصا بڑا تھا۔ سامنے والے حصے میں ان کی اپنی رہائش اور پچھلی طرف کا بڑا صحن اور کمرے مدرسے کے لیے استعمال ہوتے تھے۔ ساتھ ہی چھوٹی سی مسجد تھی۔

عدینہ کی پیدائش بھی اسی گاؤں میں ہوئی تھی۔ اس کی پیدائش سے پہلے آپا صالحہ کے پانچ بچے پیدائش کے فوراً بعد ————— وفات پا گئے تھے۔ جس کا دونوں میاں بیوی کو بہت رنج تھا۔ اس موقع پر مولوی صاحب نے اپنی بیوی کا بھرپور ساتھ دیا۔

مولوی رفیق اور آپا صالحہ کے درمیان بہت ذہنی ہم آہنگی تھی۔ جبکہ عدینہ اپنی دادی کے زیادہ قریب تھی۔ ان ہی سے لاڈ اٹھوائے جاتے اور فرمائشیں بھی بے بے کے ذریعے ہی پوری ہوتیں۔ جب کہ مولوی صاحب اور آپا کا زیادہ وقت مدرسے میں گزرتا

عدینہ کی پرورش میں زیادہ ہاتھ بے بے کا تھا۔ آپا صالحہ کا اپنی اکلوتی بیٹی کے ساتھ تعلق جتنا پر تکلف تھا۔ اپنی ساس کے ساتھ اتنا ہی بے تکلفانہ اور مثالی تھا۔ دونوں ساس بہو میں خاصی انڈر اسٹینڈنگ تھی۔ جو مولوی صاحب کی وفات کے بعد مزید بڑھ گئی تھی۔ مولوی رفیق کی وفات کے بعد آپا صالحہ کے کہنے پر مدرسے کی ذمے داریاں عبد اللہ نے سنبھال لی تھیں، جو مولوی صاحب کے بہترین دوست عبدالرشید کا

اکلوتا بیٹا تھا۔ دونوں دوستوں میں بے تحاشا محبت تھی۔ اور دونوں کی وفات بھی اکٹھے روڈ ایکسیڈنٹ میں ہوئی، جب وہ شہر سے گاؤں واپس آرہے تھے۔ اس اچانک موت کا آپا صالحہ کو شدید صدمہ پہنچا، لیکن اس موقع پر عبد اللہ اور اس کی ماں نے ان کا بھرپور ساتھ دیا۔ عبد اللہ اپنے والد صاحب کی وفات پر شہر چھوڑ کر گاؤں میں شفٹ ہو گیا اور دوبارہ کبھی شہر جانے کا نام نہیں لیا۔ مولوی رفیق صاحب کی شہر میں کچھ دکانیں تھیں جن کا کرایہ ہر ماہ عبد اللہ لا کر انہیں دے دیتا تھا۔ اس لحاظ سے انہیں کسی بھی قسم کے معاشی مسائل کا سامنا نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی انہوں نے اپنی بیٹی کی خواہش پر اس کامیڈیکل کالج میں داخلہ کروادیا جس پر عبد اللہ اور اس کی والدہ بہت خوش تھے۔ خود آپا صالحہ اپنے مدرسے میں بچیوں کو دینی تعلیم دیتی تھیں۔

اپنی وفات سے ایک سال پہلے دونوں دوستوں نے اپنے بچوں کی نسبت آپس میں طے کر دی تھی، جس پر کسی کو بھی اعتراض نہ تھا۔ مدرسے کی بچیاں جب اسے عبد اللہ کے نام سے چھیڑتیں تو اس لمحے عدینہ کے چہرے پر بکھرنے والے رنگ بہت خوب صورت ہوتے۔



الصلوة خیر من النوم۔ (نماز نیند سے بہتر ہے)

الصلوة خیر من النوم۔ (نماز نیند سے بہتر ہے)

عبد اللہ کی آواز جیسے ہی اس کی سماعتوں میں پڑی،

عدینہ نے جلدی سے بستر چھوڑ دیا۔ دوپٹا اٹھ کر وہ صحن میں نکلی، سامنے صالحہ آپا وضو کر کے آرہی تھیں۔ نماز پڑھ کر وہ چائے کا پانی چولہے پر رکھ دیتی اور خود قرآن پاک کھول کر بیٹھ جاتی۔

گھر کے صحن میں جامن، لیموں اور امرود کے درخت لگے ہوئے تھے ایک کونے میں بے بے نے ضد کر کے چھوٹا سا تندور بنا رکھا تھا۔ جس پر وہ کبھی کبھار اپنے لیے اور مدرسے کی ختم قرآن کی تقریب کے لیے بڑے اہتمام سے روٹیاں لگاتی تھیں۔ آپا

صالحہ کو اپنی بوڑھی ساس کا یہ مشغلہ سخت ناپسند تھا، لیکن اس معاملے میں بے بے کسی کی بھی نہیں سنتی تھی۔

اس صبح عدینہ اٹھ کر صحن میں آئی تو جامن کے درخت سے کچھ فاصلے پر بے بے کامٹی اور گارے سے بنا تندور دھک رہا تھا۔ تندور کے اندر سے آگ کے لیے لے شعلے سے باہر نکل رہے تھے، ان شعلوں کے پس منظر میں بے بے کا چہرہ بہت عجیب سا لگ رہا تھا۔ ساٹھ سالہ بے بے جسمانی لحاظ سے ماشاء اللہ خاصی صحت مند تھیں۔ ایک تو خوراک اچھی لیتیں اور دوسرے وہ خود کو گھر کے کام کاج میں مصروف رکھتی تھیں جب کہ آپا صالحہ زیادہ تر اپنے مدرسے میں مصروف رہتیں یا پھر قرآن پاک کی تفسیر پڑھا کرتی تھیں۔ گاؤں کی عورتیں نہ صرف اپنی بچیوں کو دینی تعلیم کے لیے ان کے پاس بھجواتیں بلکہ وہ اپنے ذاتی نوعیت کے معاملات میں بھی اکثر آپا سے ہی مشورہ لینے آتی تھیں۔ آپا صالحہ ایک ایسا کنواں بن چکی تھیں، جہاں بے شمار لوگوں کے راز دفن تھے۔ وہ خود خاصی کم گو اور اپنے کام سے کام رکھنے والی خاتون تھیں۔

”بے بے آپ کو آگ سے ڈر نہیں لگتا۔“ عدینہ اکثر یہی سوال کرتی۔

”نہیں۔“ بے بے نے سوکھا بالن تندور کے پیٹ میں جھونکتے ہوئے ہمیشہ کی طرح وہی جواب دیا۔

”پھر بھی بے بے، آگ سے کسے ڈر نہیں لگتا۔؟“ عدینہ کے سوال کا جواب آپا کی طرف سے

آیا جو قرآن پاک پر غلاف چڑھا رہی تھیں۔

”جہنم کی آگ سے ڈرو بیٹا“ اس کے مقابلے میں یہ تو کچھ بھی نہیں۔“ آپا صالحہ کے تنبیہی انداز پر عدینہ نے شرمندگی سے سر جھکا لیا۔ وہ گھبرا کر بے بے کو دیکھنے لگی جو اس کی روٹی پر تازہ مکھن بڑے اہتمام سے لگا رہی تھیں۔

”بے بے! مجھے مکھن اچھا نہیں لگتا۔“ اس نے

منہ بتایا۔

”پہلی لڑکی ہے جسے مکھن اچھا نہیں لگتا۔“ بے بے نے مسکرا کر اپنی پوتی کو مزید چھیڑا۔ ”انسان تو بہت خوش ہوتا ہے مکھن والی باتوں سے۔“

”میں ایسی نہیں ہوں۔“ عدینہ منہ بناتے ہوئے بلا شک کی چٹکیر میں روٹی اور اوپر آلو قیے کا سالن ڈال کر صحن کی طرف نکل آئی۔ وہ اب بان کی چار پائی پر بیٹھی چھوٹے چھوٹے لقمے لیتے ہوئے آپا صالحہ کو غور سے دیکھنے لگی۔ جو آنکھیں بند کیے کسی گہری سوچ میں گم لیٹی ہوئی تھیں۔

عدینہ نے انہیں کبھی ننگے سر نہیں دیکھا تھا۔ وہ رات کو سوتے وقت بھی اچھی طرح سر ڈھانپ کر رکھتی تھیں۔ سوائے عبد اللہ کے وہ گاؤں کے سب ہی مردوں سے پردہ کرتی تھیں۔ اسے کبھی کبھی آپا صالحہ کسی راسرار سی کہانی کا ایک اچھوتا سا کردار لگتیں۔ جو ساری کہانی میں عام سا لگتا ہے، لیکن کلائمیکس پر پہنچ کر وہی کردار سب کرداروں پر حاوی ہو جاتا ہے اور سب کی توجہ اپنی جانب مبذول کروا لیتا ہے۔

اس نے آپا صالحہ کو کبھی بھی زیادہ بولتے ہوئے نہیں دیکھا۔ ان کا لہجہ کرخت، بارعب اور گفتگو خاصی متاثر کن ہوتی۔ بعض دفعہ تو وہ صرف آنکھ کے اشاروں سے ہی کام چلا لیتیں۔ مدرسے کی بچیوں پر ان کا بہت رعب تھا۔ وہ خود بھی سب سے لیے انداز میں رہتی تھیں۔

مونہ کے آنے کے بعد ان میں کچھ تبدیلی ضرور آئی تھی۔ نٹ کھٹ شرارتی سی مونہ، جو کہ ان کے میاں کے فرسٹ کزن کی بیٹی تھی اور حویلیاں شہر سے ان کے پاس قرآن پاک حفظ کرنے کے لیے آئی تھی۔ وہ اکثر بے بے اور آپا کو باتوں میں لگالتی اور فرمائشیں کر کے کھانے بنواتی۔ مونہ کی اپنے سے دو تین سال بڑی عدینہ سے خوب دوستی تھی۔ جس کا میڈیکل کالج میں ایڈمیشن ہو گیا تھا۔

”عدینہ باجی کب آئیں گی واپس۔؟“ وہ جو بے بی

سے اپنے کپڑے بیک میں ڈال رہی تھی، مونا کی بات پر چونک گئی۔

”تم ہر ہفتے ایک ہی سوال کر کے تھکتی نہیں ہو مونا۔“ عدینہ نے مونا کا افسردہ چہرہ دیکھتے ہوئے اسے چھیڑا۔

”آپ کو اتنے بڑے گھر میں اکیلے رہنا پڑے تو پتا چلے۔“ مونا جل کر بولی۔

”تمہاری اکیلے گھروں میں تھوڑا ہوتی ہے، یہ تو انسان کے اپنے اندر کسی ناگ کی طرح پھن پھیلانے بیٹھی ہوتی ہے، موقع دیکھتے ہی سر اٹھا کر کھڑی ہو جاتی ہے اور انسان کو ڈرانے لگتی ہے۔“ عدینہ کی بات اس کے سر کے پورے چار فٹ اوپر سے گزر گئی۔

”آپ نے بھی تپا کی طرح مشکل باتیں کرنا شروع کر دی ہیں۔ میرے تو بچے ہی نہیں پڑتیں۔“ مونا نے میز سے عدینہ کی کتابیں اٹھاتے ہوئے منہ بنایا تو وہ بے ساختہ ہنس پڑی۔

”تنی ساری لڑکیاں تو آتی ہیں آپا کے پاس۔ دوستی کر لو ان سے۔“ عدینہ نے مسکراتے ہوئے مشورہ دیا۔

”دوست ہوتا نہیں ہر ہاتھ ملائے والا۔“ مونا ناگ چڑھا کر بولی۔

”ہاتھ نہ سہی دل ملا لو کسی کے ساتھ۔“ عدینہ نے شرارتی لہجے میں ایک اور مشورہ دیا۔

”دل کا ٹانکا ہر کسی کے ساتھ تھوڑا فٹ ہوتا ہے۔ اس کی وائرنگ میں کرنٹ تو بس ایک خاص نام سے ہی آتا ہے۔“ مونا کی بات پر عدینہ کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

اس سے پہلے کہ وہ مونا کی بات پر تبصرہ کرتی، مونا نے اس کا سکون دور ہم برہم کیا۔

”معبود اللہ بھائی آئے ہیں۔ برآمدے میں بیٹھے ہیں۔“ مونا کی بات پر اس کا دل بے اختیار دھڑک نکلا۔ اس نے ہاتھ میں پکڑا سوٹ بیک میں ڈالا اور بے ساختہ کمرے کی کھڑکی کی طرف آگئی، ہلکا سا پردہ ہٹا کر ڈرتے ڈرتے برآمدے کی طرف دیکھا۔ مونا بھی لپک کر اس

کے پیچھے چلی آئی۔ دونوں اب کھڑکی سے جھانک رہی تھیں۔

سفید کرتا، شلوار کے ساتھ سیاہ پٹاوری چپل پہنے وہ بڑے مودبانہ انداز سے بے بے کے پاس بیٹھا اس کے دل کے شرے ہوئے پانی میں پلچل سی مچا گیا۔

”آپ دونوں کی جوڑی شان دار ہے۔“ مونا نے شوخ انداز سے سرگوشی کی تو عدینہ نے گھور کر اسے دیکھا۔ جو شرارت کے موڈ میں تھی۔

”کبھی تو ایک دوسرے سے بات کر لیا کریں۔“

”جی نہیں۔“ عدینہ نے صاف انکار کیا۔

”کیا فائدہ ایسی خاموش محبت کا۔؟“ مونا خاصی بے باک اور پُر اعتماد لڑکی تھی۔

”خاموش محبت اپنے اندر بے پناہ شدت لیے ہوتی ہے۔ جب دل کی دھڑکنیں ایک ہی نام کا ورد کریں،

نگاہیں ایک ہی چہرے کا طواف کر کے خوش ہوں اور محبت کی نمازوں میں ایک ہی شخص کو مانگا جائے تو دنیا کے سارے لفظ بے کار ہو جاتے ہیں۔ محبت کو نگلی بھی

ہو تو ہر انداز سے چھلکتی ہے۔ اپنا آپ منوا کر ہی دم لیتی ہے۔“ عدینہ کی بات نے مونا کو لا جواب کیا۔

”عدینہ، مانگہ آگیا ہے، جلدی کرو۔“ باہر سے آنے والی آپا صالحہ کی آواز پر دونوں ہی گھبرا کر کھڑکی سے

ہٹیں اور بنگ پر رکھا سلن سمیٹنے لگیں۔ مونا نے باقی چیزیں اس کے بیک میں باقاعدہ ٹھونس دیں۔ زپ بند کر کے مونا نے اس کا بیک اٹھایا اور باہر۔۔۔ نکل گئی،

ماکہ تانگے میں رکھ سکے۔

عدینہ نے کھونٹی سے لٹکا سیاہ رنگ کا عبا یا اتارا اور عجلت میں پہن کر سفید اور کالے رنگ کے پھولوں والا

اسکارف اپنے سر کے ارد گرد لپیٹا، اتنے میں آپا صالحہ کمرے میں داخل ہوئیں، وہ اب لوہے کے ٹرنک میں

کپڑوں کے نیچے بچھائے اخبار سے ہزار ہزار کے پانچ نوٹ نکال کر عدینہ کے پاس پہنچ گئیں۔

”یہ رکھ لو۔“ آپا صالحہ نے پیسے عدینہ کی طرف بڑھاتے ہوئے سرسری سی نگاہ اس کے چہرے پر ڈالی

جہاں ملاحت کا ایک جہان آباد تھا۔ عدینہ کے رہتی ہالوں کی ایک لٹوائیں کلن کی طرف سے نکل کر اس کے گل کو چھو رہی تھی۔ عدینہ کی رنگت صاف اور نقوش بہت پُرکشش تھے۔ جب کہ وہ اپنی ہم عمر لڑکیوں سے دراز قد تھی۔ سیاہ آنکھوں میں کاجل لگانے کی اجازت اسے آپا نے بھی نہیں دی تھی۔

”ہزار دفعہ سمجھایا ہے عورت کو اپنے بال نا محرموں سے چھپانے کا حکم ہے اسکارف اچھی طرح لیا کرو۔“ آپا صالحہ کے لہجے میں چھپی خفگی کو محسوس کر کے عدینہ گھبرا کر اسکارف کی ہنس کھول کر دوبارہ کئے لگی۔

”عدینہ باجی! چاچا جیدا ناراض ہو رہا ہے بس نکل جائے گی۔“ مونا دوڑتی ہوئی کمرے میں آئی۔

”آ رہی ہوں۔“ اس نے اپنا ہینڈ بیگ اٹھایا۔ جلدی سے باہر نکلی۔ برآمدے میں بے بے کے تخت کے پاس رکھی کرسی پر بیٹھے عبداللہ کو دیکھ کر اس کا دل پوری قوت سے دھڑکا۔ چلتے چلتے بے بے کے تخت سے اس کپاؤں نکلایا۔ مونا شرارت سے ہنسی۔

”یہ عبداللہ بھائی کو دیکھ کر آپ دیواروں اور ستونوں سے کیوں نکلنے لگتی ہیں۔“ ایک دفعہ مونا نے یونہی اسے چھیڑنے کو پوچھا تھا۔

”عورت جس مرد سے محبت کرتی ہو اسے دیکھ کر ویسے ہی حواس باختہ ہو جاتی ہے۔ نہ قدموں پر اپنا اختیار رہتا ہے اور نہ نظروں پر۔“ عدینہ نے بھی اس وقت اسے ہنستے ہوئے اندر کی بات بتائی تھی۔

”دھیان سے جانا۔“ بے بے نے اپنی عزیز از جان پوتی کو محبت بھرے لہجے میں کہا، لیکن اس کے دھیان کی ساری کھڑکیاں تو اس دشمن جاں کی طرف کھلی ہوئی تھیں جو نظریں جھکائے ہوئے اس کے دل کا سکون، بڑی دیدہ دلیری سے کسی بے رحم ڈاکو کی طرح لوٹ چکا تھا۔

”خدا حافظ بے بے۔“ اس نے مخاطبہ داری کو کیا تھا، لیکن سلیا اسے تھا جو سر جھکائے اپنی پشاور کی چیلوں

پر نظریں جمائے بیٹھا تھا۔ اس لمحے اسے اس پشاوری چیل کی قسمت پر رشک بھی آیا اور غصہ بھی۔ ”جلدی کرو ناں۔“ مونا دروازے میں کھڑی پہنچی۔ وہ جو داوی سے سر پر پیار لینے کے بہانے اس ظالم شخص کو کن اکھیوں سے دیکھنے کی کوشش میں ناکام ہو چکی تھی۔ بوکھلا کر چلی اور غلٹ بھرے انداز سے گمن عبور کر گئی۔

چلتے چلتے اسے اپنی پشت پر دو آنکھیں محسوس ہوئیں۔ اس کے دل کی بے ربط دھڑکنوں نے بالکل ٹھیک وقت پر بخری کی تھی۔ وہ پلٹی۔ عبداللہ آنکھوں میں محبت کا ایک جہاں سموئے اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اور بے بے اپنی دوائیوں میں گمن تھیں۔ عدینہ ایک دم بوکھلا کر پلٹی۔ اس کا سر دروازے کے پٹ سے ٹکرایا۔ ایک لمحے کو زمین گول گول گھومتی ہوئی محسوس ہوئی۔ بے بے نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا۔ عبداللہ زیر لب مسکرایا۔

”پتر دھیان سے۔“ بے بے کی فکر مند آواز اور مونا کی کھی کھی نے اکٹھے ہی اس کا تعاقب کیا۔

”اللہ حافظ۔“ عدینہ نے بغیر پلٹے جواب دیا اور جلدی سے تانگے پر بیٹھ گئی۔ واپسی کا سارا سفر گویا خوشبوؤں میں اڑتے ہوئے گزرا تھا۔ دو روشن اور چمک دار آنکھیں اس کے ساتھ ہی سفر کر رہی تھیں۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ بغیر پروں کے ہی فضاؤں میں اڑ رہی ہو۔ اسے پتا ہی نہیں چلا کہ وہ حسن ابدال سے پنڈی اور پھر اپنے ہوشل پہنچی۔ عبداللہ کی ایک نگاہ نے اس کا آج کا سفر آسان کر دیا تھا۔



اسلام آباد کے میسٹ ہوٹل میں روشنیوں، رنگوں اور خوشبوؤں کا ایک جہاں آباد تھا۔ شوپز، فیشن، صحافت سے تعلق رکھنے والے اہم لوگ اس فیشن

ویک کی افتتاحی تقریب میں شامل تھے۔ برائیدل ویک کے حوالے سے ہونے والی اس فیشن شو کی اخبارات

اور سوشل میڈیا میں بہت دن پہلے ہی ایڈورٹائزنگ شروع کر دی گئی تھی جس کی وجہ سے اس تقریب کے پاس دس دن پہلے ہی ختم ہو چکے تھے۔

”پار آئی ایم گمشدگ کنفیوٹ۔“ میک اپ روم میں کوئی بیسیویں دفعہ آئینے میں اپنا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے شانزے نے اپنی ساتھی ماڈل سونیا سے پریشانی سے کہا۔ سونیا جو کہ اپنے ہونٹوں پر لب گلوں لگا رہی تھی اس نے ناک چڑھا کر شانزے کو دیکھا۔ جو کیٹ واک میں حصہ لینے سے پہلے ہی سخت گھبرا رہی تھی۔

”ڈونٹ لی سکی شانزے۔“ نیک چڑھی سونیا نے منہ ہٹا کر کہا اور ایک دفعہ پھر آئینے کی طرف متوجہ ہو گئی۔

اس وقت میک اپ روم میں ٹاپ کلاس ماڈلز کے ساتھ ساتھ دو تین بالکل فریش ماڈلز بھی موجود تھیں۔ جن کا انتخاب کئی کڑے مراحل سے گزرنے کے بعد کیا گیا تھا۔ سب ہی ماڈلز خود کو آئینے میں ہر زاویے سے دیکھنے میں لگن لگی تھیں۔

ساتھ کی دہائی کی دلہن کے روپ میں شانزے غضب ڈھا رہی تھی ایک تو وہ ویسے ہی دراز قد تھی اوپر سے اللہ نے اسے حسن سے بے دریغ نوازا تھا۔ ماہر پوزیشن کے ہاتھوں نے اس کے حسن کو چار چاند لگا دیے تھے ڈریسنگ روم سے آنے والی کئی سینئر ماڈلز نے حسد بھری نگاہوں سے اسے دیکھا۔ سب ہی کو اپنی اپنی پوزیشن خطرے میں لگ رہی تھی۔ اس فیشن شو میں ہونے والی کیٹ واک بہت سے چہروں کو شہرت کے آسمان پر پہنچانے کے لیے بے تاب تھی جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا نئی ماڈلز کے چہروں پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے دھکتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے بظاہر خود کو پُر اعتماد شو کروانے والی کئی لڑکیوں کے دل اس وقت بری طرح دھڑک رہے تھے۔

”شانزے‘ رباب‘ سونیا۔ آپ لوگ کانفیڈنٹ ہیں نا۔“ فیشن شو کے آرگنائزر ہمیش نے اپنی تینوں

نئی ماڈلز کو ایک دم ہی مخاطب کیا۔ وہ ابھی ابھی وہاں پہنچا

تھا۔ اب تنقیدی نگاہوں سے سب کا جائزہ لے رہا تھا۔

”یس سر‘ آف کورس۔“ نیک چڑھی سونیا نے بے ساختہ جواب دیا۔

”اور شانزے آپ۔“ ہمیش جیسے ہی شانزے کی طرف پلٹا اس کے ملکوتی حسن سے ایک لمحے کو مرعوب ہو کر۔ بات کرتا ہی بھول گیا۔

”لوہیہ تو گیا کام سے۔“ علیزہ نے کہنی مار کر سونیا کو ایک فضول سا اشارہ کیا۔

”جج جی سر۔“ شانزے نے تھوک نکلنے ہوئے بمشکل جواب دیا۔

”او کے آپ سب کے پاس جسٹ فائو منٹس ہیں۔ ہری آپ۔“ ہمیش خود کو سنبھال چکا تھا۔

اگلے پندرہ منٹ کے بعد شانزے کی ریمپ پر انٹری ہوئی۔ روشنیوں کے ایک گولے کے درمیان میں وہ ہائی ہیل کی سینڈل پہنے بڑی نزاکت کے ساتھ اپنا لنگا سنبھالے جیسے ہی حاضرین کے سامنے آئی تالیوں کا ایک نہ ختم ہونے والا طوفان اس کی پذیرائی کرنے کو موجود تھا۔ دلکش میوزک‘ رنگ برنگی روشنیوں میں شانزے کا جسم ایک سانچے میں ڈھلا ہوا لگ رہا تھا۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی موم کی گڑیا ریمپ پر چل رہی ہو۔

تالیوں‘ سیٹیوں اور بلند آواز میں سراپے جانے والے جملے بھی شانزے کی تسلی کے لیے کافی نہ تھے اس کا دل بے ربط انداز سے دھڑک رہا تھا۔ وہ اپنے کیریئر کی پہلی کیٹ واک پر حاضرین کے سامنے حد درجہ نروس تھی لیکن خود کو پُر اعتماد ظاہر کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہی تھی۔

ریمپ کی آخری حد پر پہنچ کر اس نے اپنی کمر کو ایک خاص ادا سے جھٹکا دیا اور واپسی کے لیے پلٹی۔ اس کی نظر سامنے بیٹھے ایک بے زار سے نوجوان جرنلسٹ پر پڑی جو شانزے کو عجیب سی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

اسی لمحے جب وہ واپسی کے لیے مڑ رہی تھی، بسی ہیل میں اس کا پاؤں زمین پر توازن کھو بیٹھا اور وہ ہو گیا جو نہیں ہونا چاہیے تھا۔ اس نے خود کو سنبھالنے کی پوری کوشش کی، لیکن قسمت نے ہمیشہ کی طرح اس کا ساتھ نہیں دیا۔ وہ اپنی پروفیشنل لائف کی پہلی کیٹ واک میں نہ صرف زمین پر بلکہ میڈیا کے بہت سے آرگنائزرز کی نظروں سے بھی گر چکی تھی۔



اسلام آباد کے ایف سیکٹر میں بنی ڈیڑھ کینال کی نیلی کوٹھی دیکھنے والوں پر کوئی خاص تاثر نہیں چھوڑتی تھی۔ پرانے طرز پر بنی ہوئی اس کوٹھی کے اگلے اور پچھلے دونوں ہی طرف بڑے بڑے لان تھے۔ لان میں سرو کے بلند درختوں پر ایک عجیب سی اداسی اور وحشت چھائی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ یہ کوٹھی یاہر سے ہی دو بڑے پورشن میں تقسیم ہوئی نظر آتی تھی، لیکن لان دونوں کا مشترکہ تھا۔ اس کوٹھی کے دائیں والے پورشن میں ڈاکٹر بینش، اپنے سولہ سالہ بیٹے ارصم اور اپنے والد ڈاکٹر حماد کے ساتھ مقیم تھیں۔ وہ ایک شہید کرتل کی بیوہ تھیں اور ان کی والدہ کا انتقال ان کے بچپن میں ہی ہو چکا تھا۔

نیلی کوٹھی کے دوسرے پورشن میں ڈاکٹر بینش کے تایا ڈاکٹر جلال، اپنی بیوی اور پوتی اوریدا کے ساتھ قیام پذیر تھے۔ ان کی دونوں بیٹیاں شادی شدہ اور اکلوتا بیٹا تیمور انگلینڈ میں مقیم ہے، جبکہ تیمور کی بیٹی اوریدا کو پاکستان آئے ہوئے کچھ ہی عرصہ ہوا تھا۔

ڈاکٹر بینش کی سیاہ ہنڈاسوک نیلی کوٹھی کے گیٹ نمبر دو سے اندر داخل ہو چکی تھی۔ انہوں نے جیسے ہی گاڑی سے اتر کر پورچ میں قدم رکھا سامنے ستون کے پاس ٹوٹے ہوئے گملے کودیکھ کر ان کا پی ہائی ہوا۔

”رشید، فضل دین کہاں ہو تم لوگ۔“ ڈاکٹر بینش کی ناراض آواز سننے ہی ملازم دوڑتے ہوئے پورچ میں پہنچے، ویسے بھی بینش کے غصے سے سب ہی کی جان جاتی تھی۔ اس وقت بھی وہ ٹوٹے ہوئے گملے کودیکھ کر

سارا قصہ سمجھ گئے۔

”یہ گملا کس نے توڑا ہے؟“ ان کا لہجہ سرد اور آنکھوں سے غصہ چھلک رہا تھا۔

”وہ بڑی بیگم صاحبہ میرے ہاتھ سے ٹوٹا تھا۔“ فضل دین نے سچ بولنے میں ہی عافیت جانی۔

”ٹوٹ گیا تھا تو اٹھا کر باہر پھینکو، یہاں کیوں — اس کو نمائش کے لیے سجا رکھا ہے۔“ وہ ایک ناراض نگاہ دونوں ملازموں پر ڈال کر اندر کی جانب بڑھ گئیں، دونوں ہی کے حلق سے ایک پرسکون سانس خارج ہوئی۔ انہوں نے باقاعدہ منہ پر ہاتھ پھیر کر شکر ادا کیا۔

ڈاکٹر بینش نے جیسے ہی اپنے پورشن کے ٹی وی لاونج میں قدم رکھا۔ ان کے سارے جسم کا خون سمٹ کر چہرے پر آگیا۔ اشتعال کی لہر کسی برقی رو کی طرح ان کے پورے وجود میں دوڑی۔ ان کے چہرے کے زاویے بری طرح سے بگڑے۔

انہوں نے کھا جانے والی نظروں سے سامنے نیلے کارپٹ پر لاپرواہی سے لیٹی اپنے کزن کی بیٹی اوریدا کو دیکھا۔ جس کے گمان کی آخری سرحدوں پر بھی کہیں نہیں تھا کہ ڈاکٹر بیا آج اس طرح کامیاب چھاپہ ماریں گی۔ ورنہ وہ ان کے پورشن کا کبھی بھی رخ نہ کرتی، اور اگر کر بھی لیتی تو اس طرح کارپٹ پر بے تکلفی سے نیم دراز ٹی وی نہ دیکھ رہی ہوتی۔ اس کی آنٹی بینش سے جان جاتی تھی۔

”میرے بیٹے کو کبھی عقل نہیں آسکتی، یہ بھی ماں کی طرح ساری زندگی بدھو اور پاگل ہی رہے گا۔“ وہ حد درجہ کوفت اور جھنجھلاہٹ کا شکار ہوئیں۔ اپنی ماں کی موجودگی سے بے خبر ارصم، اپنے سامنے اوریدا کی میٹھس کی کتاب کھولے شاید ہمیں یقیناً اس کا ہوم ورک کرنے میں مصروف تھا۔ اس کی انگلیاں کیلیکولیٹر پر تیزی سے چل رہی تھیں۔ اس کے ماتھے پر بڑی شکن اس کی گہری مصروفیت کی غمازی کر رہی تھی۔

بینش نے ایک نظر میں ٹی وی لاونج میں پھیلی بے

باپ کی طرح دلیر تھا اور نیلی کو بھی میں ان کے سامنے اس طرح بولنے کی جرات دے ہی کر سکتا تھا۔
”تم ابھی تک اکیڈمی کیوں نہیں گئے؟“ انہیں آخر کار ایک مضبوط جواز مل ہی گیا تھا ارصم پر خفا ہونے کے لیے۔

ارصم نے پہلے وال کلاک کی طرف اور پھر جاتی ہوئی نظروں سے ماں کی طرف دیکھا وہ ایک لمحے میں سمجھ گئی کہ اکیڈمی کے جانے میں ابھی کافی وقت تھا اس سوچ نے انہیں اور بھی جھنجھلا ہٹ میں مبتلا کیا۔

”میرا اکیڈمی ٹائم ساڑھے پانچ بجے کا ہے اور ابھی صرف چار بجے ہیں۔“ ارصم کے جتانے ہوئے لمحے میں کچھ تھا کہ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی سیٹھاسی گئیں لیکن بڑی سرعت کے ساتھ انہوں نے خود پر قابو پایا۔

”خدمت خلق چھوڑ کر انٹری ٹیسٹ پر دھیان دو تو بہتر ہے۔“ انہوں نے ناپسندیدہ نظروں سے اورید کو دیکھتے ہوئے طنز لہجے میں کہا تو اورید کی رنگت فق ہو گئی۔ لگتا تھا کہ وہ کسی لمحے چکر اکر گر پڑے گی۔

ارصم نے ایک سیکنڈ میں اس کی حالت کا اندازہ لگا لیا تب ہی وہ ماں کو نظر انداز کر کے اس کی طرف متوجہ ہوا اور بڑے محل سے گویا ہوا۔

”اورید ایک سوال رہ گیا ہے وہ تم خود کر لیتا۔ اب جاؤ۔“ ارصم کی بات پر اس کی رکی ہوئی سانسیں بحال ہوئیں۔ اس نے فوراً ”سے بیشتر اپنی چیزیں عجلت بھرے انداز میں اٹھائیں۔ دل کی حالت سخت بری ہو رہی تھی۔ آنٹی بینش کی ایکسپریس جیسی نظروں کا سامنا کرنا کون سا آسان کام تھا۔ وہ اس وقت کھا جانے والی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھیں۔“

سیاہ رنگ کے سوٹ میں اورید کی شہابی رنگت خوب دمک رہی تھی۔ بڑی بڑی بادامی آنکھوں میں ہلکا ہلکا سا خوف کا تاثر اس کی خوب صورتی کو مزید اجاگر کر رہا تھا۔ وہ جھنجھلا سی گئیں۔ اس کے ہاتھوں کا ارتعاش اس کے اندرونی جذبات کی واضح عکاسی کر رہا تھا۔ اپنی چیزیں سمیٹنے ہی وہ گولی کی طرح اڑتی ہوئی کمرے سے نکلی اور باہر نکلتے ہی ایک لمبا سانس لیا۔ آج بڑی

ترتیبی کو دیکھا۔ جس سے ان کی طبیعت جی بھر کر مکدر ہوئی۔ نیلے کارٹ پر کتابیں، چرتلز، اخبارات اور ساتھ ہی پھلوں کی ٹوکری پڑی تھی۔ جس میں اب کیلے کے چھلکوں کا ڈھیر تھا۔ پاس ہی بڑے رکھی ہوئی تھی جس میں چائے کے خالی کپ اونڈھے بڑے ہوئے تھے۔ نمکو کی پلیٹ میں — بسکٹس تھے اور ڈرائے فروٹس والی پلیٹ بھی الٹی تھی۔ کچھ ہی فاصلے پر اورید اکابرانا سا بھالو والا ہیرینڈ گرا ہوا تھا جو اکثر ہی اس کے بالوں کے بجائے ادھر ادھر لڑھکاتا رہتا۔

ان تمام چیزوں کے درمیان اورید اصاحبہ فلور کشن سر کے نیچے رکھے بے تکلفی سے نیم دراز تھیں۔ اس کی ایک ٹانگ قریبی صوفے پر جب کہ ہاتھ میں ریموٹ کنٹرول تھا جس سے اس نے آواز کا ویلیوم مزید بڑھا دیا تھا۔ کمرے کا یہ منظر دیکھ کر ڈاکٹر بینش کے لیے زیادہ دیر تک خود پر قابو پانا محال ہو گیا۔

”یہ کیا تماشا ہو رہا ہے؟“

ان کی تلخ آواز پر اورید ایک دم ہراساں ہوئی اور اچھل کر بیٹھ گئی۔ اس کی رنگت ہلدی کی طرح زرد ہوئی۔ چونکا تو ارصم بھی تھا لیکن اسے اپنے تاثرات چھپانے میں کمال حاصل تھا۔ اس نے بس ایک سرسری نگاہ اپنی ماں پر ڈالی اور دوبارہ نوٹ بک پر جھک گیا۔ اس کا یہ انداز ڈاکٹر بیا کو آگ لگا گیا۔

”یہ گھر ہے یا کباڑ خانہ؟“ انہوں نے انتہائی سرد نظروں سے اورید کو دیکھا۔ جو اس وقت سخت خوف زدہ دکھائی دے رہی تھی۔

”تم پھر اورید اکا ہوم ورک کر رہے ہو۔“ انہوں نے خفگی آمیز انداز میں ارصم کی طرف دیکھا۔ جب کہ اورید اپریشان نظروں سے نی وی لاؤنج کے دروازے کو دیکھ رہی تھی۔ جس کے بالکل سامنے آنٹی بینش ڈٹ کر کھڑی تھیں۔ وہ کمرے سے آسانی سے نہیں نکل سکتی تھی۔

”تو؟“ ارصم نے انتہائی پرسکون مگر نڈر انداز سے اپنی ماں کا غصے سے لبریز سرخ چہرہ دیکھا۔ وہ اپنے فوجی

مشکل سے وہ آئی بنیش کے ہاتھوں قتل ہونے سے بچی تھی۔ اس لیے ابھی بھی حواس باختہ تھی۔

اوریدا کے کمرے سے نکلتے ہی ڈاکٹر بنیش نے صوفے پر نیم دراز اپنے بیٹے کو غور سے دیکھا۔ جس کا چہرہ سپاٹ تھا۔ وہ ان کو نظر انداز کیے اب بڑے پر اعتماد انداز سے ریموٹ کنٹرول اٹھا کر ٹی وی کے چینل بدل رہا تھا۔ اس کا یہ انداز ڈاکٹر بنیش کو سلگا گیا، لیکن مسئلہ یہ تھا، سامنے ان کے کزن کی بیٹی نہیں ان کا ذہن و فطین، سنجیدہ مزاج کا حامل اکلوتا بیٹا ارصم جاوید تھا۔ شوہر کی شہادت کے بعد ارصم میں ان کی جان تھی اور یہی جان اوریدا کے آنے کے بعد اکثر سولی پر لٹکی رہتی، کوئی بھی ان کے جذبات کو نہیں سمجھ سکتا تھا۔

”تم نے لچ کیا۔؟“ انہوں نے بیٹے کا موڈ جانچنے کے لیے یونہی پوچھا۔ ارصم نے جواباً ”انہیں جن نگاہوں سے دیکھا، وہ ہلکا سا کڑیڑا گئیں“ اور جلدی جلدی کارپٹ پر بکھری چیزیں سمیٹنے لگیں۔

”ہاں کرچکا ہوں۔“ ارصم کا لانا تعلق سا اندازا نہیں سلگا گیا۔ وہ اب اپنے سیل فون پر کوئی گیم کھیل رہا تھا۔ ”آغا جی کہاں ہیں۔؟“ ڈاکٹر بنیش نے بمشکل خود پر قابو پا کر تحمل سے پوچھا۔ ان کے سوال پر ارصم نے کچھ ایسی جتاتی ہوئی نظروں سے انہیں دیکھا جیسے کہہ رہا ہو کہ آپ کو نہیں پتا، وہ اس وقت کہاں ہوتے ہیں۔؟

”میں نے کچھ پوچھا ہے تم سے۔“ وہ جھنجھلا گئیں۔

”۳۱ اپنی اسٹڈی میں۔“ اس نے سپاٹ انداز میں مختصر جواب دیا۔

”ایک پمشنٹ کی رپورٹس گھر بھول گئی تھی، وہی لینے آتا پڑا۔“ انہوں نے ہی بات بڑھانے کی غرض سے غیر ضروری سی وضاحت دی جس کی آج بالکل بھی ضرورت نہیں تھی۔ ارصم نے ان کی بات پر بھی ”تولفٹ“ کا بورڈ نہیں ہٹایا۔

”نورے کمرے میں گندگی ہے۔ میں شریفان کو صفائی کے لیے بھیج رہی ہوں، تم اگر چاہو تو کچھ دیر کے لیے اپنے بیڈ روم میں چلے جاؤ۔“ اپنی بات کہہ کر وہ

رکیں نہیں اور فوراً ”کمرے سے نکل گئیں۔“

ڈاکٹر بنیش کے کمرے سے نکلتے ہی ارصم کا تاناؤ کا شکار چہرہ کچھ ڈھیلا ہوا، لیکن غصہ ابھی بھی باقی تھا۔ جس کا اظہار اس نے ہاتھ میں پکڑے ریموٹ کنٹرول کو سامنے والی دیوار پر مار کر کیا۔ ریموٹ کا پیچھے والا حصہ ٹوٹ گیا اور سیل دور جا گرے۔

”وہ بے وقوف ضرور رو رہی ہوگی۔“ اس سوچ نے ارصم کو مضطرب کیا۔

وہ جلدی سے اٹھا اس کے قدم بڑے ابا کے پورشن کی طرف اٹھ رہے تھے۔ وہ لٹ گرن آسٹریلیاں گھاس پر مشتمل وسیع و عریض لان کو عبور کرتا ہوا بڑی عجلت میں ان کے پورشن میں داخل ہوا۔ جدید انداز میں بنا ہوا لی وی لاؤنج اس وقت بالکل سنسان تھا۔ بڑی اماں اور بڑے ابا اس وقت آرام کر رہے تھے۔ وہ لی وی لاؤنج سے اوپر کے فلور کو جاتی ہوئی سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔ اوپر جاتے ہی کوریڈور میں دائیں جانب اوریدا کا کمرہ تھا۔

اس نے دروازہ ہلکے سے بجایا۔ اندر بالکل خاموشی تھی۔ دروازہ دوبارہ بجانے کے بعد بھی نہیں کھلا تو اس نے ہینڈل گھمایا۔ دروازہ لاک نہیں تھا۔ پورا کمرہ اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔

اس نے اندازے سے دیوار ٹٹول کر سوچ بچ بورڈ کے سارے ہی بٹن ایک جھٹکے سے آن کر دیے۔ کمرے میں ایک دم ہی روشنیوں کا ایک طوفان سا آگیا۔ ہلکے گلابی رنگ کی کلاسیکیم والا کمرہ اوریدا نے اپنی پسند سے ڈیکوریٹ کروایا تھا۔ سامنے ہی آف وائٹ رنگ کے جہازی سائز بیڈ پر وہ سیدھی لیٹی ہوئی تھی۔ ایک تکیہ اس کے منہ پر تھا اور دوسرا سر کے نیچے۔ یہ اس کا مخصوص اسٹائل تھا۔

”اوریدا۔ کیا ہوا۔؟“ اس نے بے چینی سے تکیہ اس کے منہ سے ہٹایا۔ اسے یہ دیکھ کر قطعاً حیرت نہیں ہوئی، وہ بے آواز رو رہی تھی۔



ناگواری سے عدینہ سے کہا۔
 ”اس میں چھپانے والی کیا بات ہے۔؟“ اس نے
 بھنویں اچکا کر سائرہ کو دیکھا۔ جس کا موڈ خاصا خراب
 تھا۔

”تم نے دیکھا وہ نتاشا کیسے تضحیک آمیز نظروں
 سے دیکھ رہی تھی تمہیں۔“ سائرہ نے منہ بنایا۔
 ”سو اٹ۔“ عدینہ نے لاپرواہی سے کندھے
 اچکائے۔ ”مجھے اس بات پر فخر ہے۔“
 ”لیکن دنیا کے فخر کرنے کے اسٹینڈرڈ مختلف ہیں
 یار۔“ سائرہ جھنجھلا کر گویا ہوئی۔

”شکر کرو ابھی تو میں نے ایک اور بات نہیں
 بتائی۔“ عدینہ نے اپنے بیگ سے مالٹا نکالتے ہوئے
 اسے مزید حیران کیا۔

”وہ کیا۔؟“ سائرہ پریشان ہوئی۔
 ”یہی کہ میری والدہ گاؤں میں مدرسہ چلاتی ہیں اور
 میرے منگیتر بھی امام مسجد ہیں۔“ عدینہ کی بات پر سائرہ
 کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا ہی رہ گیا۔
 ”کیا چیز ہو تم یار۔“ وہ تعجب سے اپنے سامنے بیٹھی
 سادہ اور بُرا اعتماد سی عدینہ کو دیکھتی رہ گئی جو ہاتھ میں پکڑا
 مالٹا چھیل کر اب باقاعدہ نمک لگا کر مزے سے کھا رہی
 تھی۔



”میں تو ہوں ہی بد قسمت۔“ شانزے اپنی واحد
 دوست رباب کے کندھے پر سر رکھے مسلسل ایک
 گھنٹے سے رو رہی تھی۔

”بد قسمتی میرا پیچھا کرتی ہوئی ہر جگہ پہنچ جاتی ہے۔
 کسی بھی موقع پر مجھے تنہا نہیں چھوڑتی۔“ شانزے
 کے گلے شکوؤں میں اس تقریب میں ناکام پرفارمنس
 کے بعد اور زیادہ اضافہ ہو گیا تھا۔

”موصلاً کرو یار۔“ رباب اس کے اس طرح
 بکھرنے پر پریشان ہو رہی تھی۔

”میرا تو شو بزم میں کیمرہ شروع ہونے سے پہلے ہی
 ختم ہو گیا۔“ شانزے پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

”ہوں تو آپ ہیں عدینہ احمد! جنہوں نے پنڈی بورڈ
 میں پہلی پوزیشن لی۔؟“ میڈیکل کی پہلی کلاس میں
 پروفیسر شفیق نے غور سے اپنے سامنے سیاہ گاؤں اور
 اسکارف میں موجود لڑکی کو دیکھا۔ وہ کلاس کی واحد لڑکی
 تھی جس کا چہرہ کسی بھی قسم کے میک اپ سے مبرا
 تھا۔ جس کی آنکھوں میں کاجل کی جگہ ذہانت کی چمک
 اور ہونٹوں پر لب اشک کی جگہ پُر اعتماد مسکراہٹ
 تھی۔

”میں نے میٹرک بورڈ میں بھی ٹاپ کیا تھا۔“ عدینہ
 کے پُر اعتماد انداز پر پروفیسر شفیق کے ساتھ پوری کلاس
 نے توصیفی نگاہوں سے اسے دیکھا۔

”آپ کے والد کہیں پنڈی بورڈ کے چیئرمین تو
 نہیں۔“ کلاس کی آخری بینچ پر بیٹھے جبران نے شرارتی
 انداز سے لقمہ دیا تو پوری کلاس کے چہرے پر
 مسکراہٹ دوڑ گئی۔ عدینہ نے پلٹ کر کلاس کے
 آخری بینچ پر بیٹھے لڑکے کو لاپرواہی سے دیکھا۔

”نہیں وہ گاؤں کی مسجد کے امام تھے۔“ عدینہ کی
 وضاحت پر کلاس میں موجود اسٹوڈنٹس میں سے کسی
 کے چہرے پر خوشگوار حیرت اور کسی چہرے پر بڑی طنزیہ
 مسکراہٹ ابھری۔ جب کہ دو چار آنکھوں میں تحقیر
 کے رنگ بھی صاف بڑھے جا رہے تھے۔

”ہوں۔ گڈ۔ مجھے امید ہے آپ یہاں بھی اپنا سابقہ
 ریکارڈ برقرار رکھیں گی۔“ پروفیسر شفیق نے مسکراتے
 ہوئے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

”ان شاء اللہ سر۔“ وہ اپنی سیٹ پر دوبارہ بیٹھ چکی
 تھی۔

پروفیسر شفیق اب باقی اسٹوڈنٹس کی طرف متوجہ
 ہوئے جبکہ عدینہ کو اپنے علاوہ کسی بھی کلاس فیلو کے
 تعارف سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی اس لیے وہ
 لاپرواہی سے اپنے ساتھ بیٹھی سائرہ کی طرف متوجہ
 ہو گئی جو کالج میں جمی اس کی کلاس فیلو تھی اور اب وہ
 دونوں ہوٹل میں روم میٹس تھیں۔

”تمہارے قادر امام مسجد تھے کیا ضرورت تھی یہ
 بتانے کی۔“ سائرہ نے کیمپس کی سیڑھیوں پر بیٹھتے ہی

اس کے ارادے سے بازار کھنا تھا۔



وہ فوٹو اسٹیٹ شاپ پر جانے کے لیے یونہی بڑے ابا کے پورشن کی طرف آگیا۔ شام کے چار بج رہے تھے۔ اس نے داخلی سیڑھیوں پر اداس اور خاموش سی اوریدا کو دیکھا۔ وہ کسی گہری سوچ میں گم ایک پڑا سا تنکا اٹھائے فرش پر بے معنی سی لکیریں کھینچ رہی تھی۔ اس نے اپنا بھالو والا ہیرینڈا اب برہسٹ کے طور پر ہاتھ میں پھنسا ہوا تھا۔

”ہیلو لڑکی، کیا ہوا؟“ بلیک ٹراؤزر پر سفید ٹی شرٹ پہنے وہ خاصے گھریلو سے حلیمے میں کھڑا اس سے پوچھ رہا تھا۔

”کچھ نہیں۔“ وہ زبردستی مسکرائی۔

”کوئی تو بات ہے، جس کی وجہ سے چہرے پر ساڑے بارہ بجے ہوئے ہیں۔“ وہ شوخ ہوا۔

”آج ماہیر کی سالگرہ ہے۔“ افسردہ سے انداز میں اس نے بتایا۔ ماہیر اس کا بڑا بھائی تھا، جو اس کے پیپا کے ساتھ ہی انگلینڈ میں مقیم تھا، جبکہ اسے اپنی ماما کی اچانک ڈھتھ کے بعد پاکستان آنا پڑا، وہ وہی بہن بھائی تھے۔

”ماہیر کی سالگرہ ہے تو اس میں اتنا اداس ہونے کی کیا بات ہے؟“ وہ اس سے ایک قدم نیچے والی سیڑھی پر بیٹھ کر بڑے خوشگوار انداز سے گویا ہوا۔ اس نے نا محسوس انداز سے اوریدا کے ہاتھ سے تنکا لے کر زمین پر پھینک دیا۔

”ہوں۔“ ہے تو خوشی کی بات، لیکن کاش کہ میں بھی وہاں ہوتی، تو ہم کتنا انجوائے کرتے، کتنی زیادہ آئس کریم کھاتے۔“ وہ زبردستی مسکرائی۔ ارہم کو ایک لمحے میں محسوس ہو گیا، وہ اپنے پیپا اور بڑے بھائی کو مس کر رہی ہے۔

”لو یہاں تو آئس کریم کا دکھ منایا جا رہا ہے، جب کہ میں سمجھتا تم اپنی فیملی کو مس کر رہی ہو۔“ اس نے شرارتی انداز سے اسے چھیڑا اور وہ چھڑ بھی گئی۔ ”میں

”بس بھی کرو، کل سے رو رو کر تم نے اپنا برا حال کر رکھا ہے۔“ رباب نے پانی کا گلاس اس کی جانب بڑھاتے ہوئے نرمی سے دلا سادیا۔

”میری تو ازل سے قسمت خراب ہے، لگتا ہے ابد تک ہی خراب رہے گی۔“ شانزے کا دکھ کسی صورت بھی کم ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔

”تم نے ہمیشہ سر سے بات کی۔“ رباب نے فیشن شو کے آرگنائزر کا نام لے کر پوچھا تو شانزے کے آنسوؤں میں روانی آگئی۔

”وہ بھی میرا فون نہیں اٹھا رہے، سخت ناراض ہیں مجھ سے۔“ شانزے نے رباب کا ہر بھایا ہوا ٹھوٹھا۔ ”تو دنیا ہمیشہ سر پر ختم تو نہیں ہو جاتی۔“ رباب نے دانستہ اپنے لمبے گولا پروا بتا دیا۔

”میری تو شروع ہی ان کے ذریعے ہوئی تھی۔“ شانزے نے نشو و استعال کر کے بے دردی سے ڈسٹ بن کی طرف اچھالا۔

”اللہ کوئی اور سبب بتا دے گا۔ انشاء اللہ۔“ رباب کے پاس ہمیشہ ہی اس کے لیے تسلیوں اور دلاسوں کی فروانی ہوتی تھی۔

”میرے لیے اللہ کے پاس کوئی سبب نہیں۔“ اسے ساری دنیا کے ساتھ ساتھ اللہ سے بھی شکوے تھے۔

”بے وقوفوں والی باتیں نہیں کرتے۔“ رباب نے بے ساختہ اسے ٹوکا۔

”جن لوگوں کو زندگی بن مانگے سب کچھ دے دیتی ہے، انہیں دوسروں کی باتیں بے وقوفانہ لگتی ہیں۔“ اس نے بازو کی پشت سے اپنی آنکھوں کو مسلا اور ناراض سے انداز سے کھڑی ہو گئی۔

”کہاں جا رہی ہو؟“ رباب پریشان ہوئی۔

”خود کشی کرنے۔“ شانزے کی بات پر اس کا داغ بھک سے اڑا۔ جب کہ وہ کمرے سے جا چکی تھی۔

”فضول لڑکی، میری بات تو سنو۔“ رباب ہمیشہ کی طرح اس کے پیچھے لپکی، اسے اس دفعہ بھی شانزے کو

”تمہیں کیسے پتا چلا تم تو یہاں کھڑے تھے؟“ اس کی بات پر وہ قہقہہ لگا کر ہنس۔ ”جس رفتار سے تم بھاگتی ہوئی اندر گئی تھیں مجھے ایک سو ایک فیصد یقین تھا تمہیں جاتے ہی جھاڑ پڑے گی۔“

”کیوں؟“ بڑی اماں کو اس طرح بھاگنا ناپسند ہے کیا۔؟ اس کے معصوم انداز پر ارصم نے اپنے ایک اور بے ساختہ قہقہے کا گلا بھشکل گھوٹا، ورنہ اوریدا کی ناراضگی کا سامنا کرنا پڑتا۔

”ہاں، تم سے پہلے رحمت بوا کی نوای کی شامت آئی رہتی تھی وہ بھی ڈپٹی نذیر احمد کی۔“ اکبری کی طرح تھی، لیکن بڑی اماں نے اے ”اصغری“ بتا کر ہی دم لیا تھا۔ ”وہ باتیں کرتے کرتے گیٹ عبور کر آئے۔“ یہ ڈپٹی نذیر کون ہیں اور اکبری اصغری کہاں رہتی ہیں۔؟“ اوریدا نے چلتے چلتے حیرت سے پوچھا اس کی بات پر ارصم نے بے ساختہ اپنے سر پر ہاتھ پھیر کر لمبا سانس لیا۔ اوریدا کی اردو زبان سے دوری کبھی کبھی اسے سخت امتحان میں ڈال دیتی تھی۔

”یا اللہ۔ کون سی تالاق کزن مل گئی ہے مجھے۔“ اس کی بات پر اوریدا نے برا سامنہ بنایا۔ ”مجھے آپ لوگوں کے رشتے داروں کا کیا پتا، ابھی کچھ عرصہ پہلے تو میں پاکستان آئی ہوں اور پھر بڑی اماں مجھے کہاں کسی اور کے گھر لے کر جاتی ہیں۔“ اوریدا کو ایک اور دکھ یاد آگیا۔

”اوہ مائی گاڈ! رشتے دار۔؟“ ارصم اب سڑک پر کھڑا بے تحاشا ہنس رہا تھا۔

”تم میرا مذاق اڑا رہے ہو۔“ اس نے شکوہ کنال نظروں سے دیکھتے ہوئے افسردہ لہجے میں گلہ کیا۔

”تو مائی ڈیئر۔ مجھے تو انکل تیمور پر غصہ آ رہا ہے، انہوں نے تمہیں اتالیٹ پاکستان بھجوا کر بہت زیادتی کی ہے تمہارے ساتھ۔“ ارصم نے فوراً ”بات بتائی۔“ ”تم پہلے یہاں آ جاتیں تو کچھ نہ کچھ۔“ اردو لٹریچر بھی پڑھ لیتیں۔ خیر ڈپٹی نذیر احمد اردو رائٹر ہیں اور اکبری اصغری ان کے مشہور کریکٹرز ہیں بے وقوف لڑکی۔“ ارصم کی وضاحت پر اس نے برا سامنہ بنایا۔

”کب کہا مجھے آئس کریم کی یاد آ رہی ہے۔؟“ وہ اپنی بڑی بڑی بلوای رنگ آنکھوں میں خفگی بھرے اسے دیکھ رہی تھی۔ ارصم نے بمشکل اپنی مسکراہٹ کو چھپایا اور غور سے اسے دیکھا۔ بلیک جینز پر اس نے پنک بل اور پس رکھا تھا۔ جس پر بڑی ساری باربلی بنی ہوئی تھی۔ جب کہ براؤن سلکی بال فریج ٹیل کی صورت میں بندھے ہوئے تھے جو شاید ہمیں یقیناً ”رحمت بوا کی نوای کا کارنامہ تھے جو سرونٹ کو اڑ میں اپنی ٹانگیں کے ساتھ ہی رہتی تھی۔“

”سوری مجھے سمجھنے میں غلطی ہو گئی۔“ اس نے مسکراہٹ دہاتے ہوئے کہا۔ ”وہے ماہیر تو اس وقت آ نہیں سکتا ہاں آئس کریم کھائی جاسکتی ہے۔“ اس کی بات پر اوریدا نے اپنی ٹیکسی سی ٹاک چڑھا کر اسے دیکھا اور خاموش رہی۔

”میں اس وقت مارکیٹ جا رہا ہوں فوٹو اسٹیٹ شاپ تک۔ چلو گی۔؟“ ارصم کی بات پر وہ تذبذب کا شکار ہوئی۔

”اٹھ جاؤ، تمہاری پسندیدہ جگہ ”آئس لینڈ“ سے کھائیں گے آئس کریم، ارصم نے اسے لالچ دیا تھا اور وہ اس لالچ میں ابھی کئی۔ اس لیے فوراً ”اٹھ کھڑی ہوئی۔ چہرے کے تاثرات تیزی سے تبدیل ہوئے۔“ بڑی اماں کو بتا کر آتی ہوں، تم دو منٹ رکو۔“ وہ برجوش انداز میں بھاگی، ارصم کو یقین تھا کہ وہ کچھ ہی منٹوں کے بعد جب واپس آئے گی تو اس کا منہ خوب پھولا ہوا ہو گا اور وہی ہوا۔ ارصم اس کی طرف دیکھ کر بے اختیار ہنسا تو اس نے گلہ آمیز نظروں سے اپنے کزن کو دیکھا۔

”کیا ہوا؟“ بڑی اماں سے ڈانٹ پڑی ہے نا۔؟“ اس کے سو فیصد درست اندازے پر اوریدا نے تعجب سے اسے دیکھا۔

”بڑی اماں نے کہا ہو گا کہ لوٹھا کی لوٹھا ہو گئی ہو اور انسانوں کی طرح چلنا نہیں آتا جو اونٹوں کی طرح بھاگتی آ رہی ہو۔“ وہ مزید مسکرایا جب کہ اوریدا کی خوبصورت آنکھوں میں سخت حیرانی در آئی۔

”اوہ سوری۔ میں سمجھی شاید تم کسی ریلوے کی بات کر رہے ہو۔“ اوریدہ ایک دم محنت کا شکار ہوئی۔
 ”ویسے مجھے اردو لٹریچر سے کوئی دلچسپی نہیں، بہت مشکل لہنگو تاج ہے یہ اس لیے تو میرے اردو میں کم مار کس آتے ہیں۔“ اس نے وضاحت دی۔
 ”اردو میں گہوار کس زبان کے مشکل ہونے کی وجہ سے نہیں، بلکہ تمہارے دلچسپی نہ لینے کی وجہ سے آتے ہیں۔“ ارصم صاف گوئی سے بولا۔
 ”حقیقت میں تمہیں پاکستان آنا ہی سخت ناپسند تھا۔ تیمور انکل نے زبردستی تمہیں بھجوایا اس لیے تم نے ابھی تک چیزوں کو ذہنی طور پر قبول ہی نہیں کیا۔“
 ارصم نے چلتے چلتے سڑک پر پڑے پتھر کو زور سے ٹھوکر لگائی۔

”مجھے پاکستان آنا نہیں، بلکہ پاپا اور ماہیر بھائی کے بغیر آنا ناپسند تھا۔ انہوں نے مجھے خود سے الگ کر کے بہت زیادتی کی ہے۔“ اس نے رنجیدہ لہجے میں فوراً اپنی صفائی دی۔

”انہوں نے زیادتی نہیں کی، تمہاری ماما کی ڈھتھہ کے بعد وہاں تمہارا رہنا مناسب نہیں تھا۔ پھر تیمور انکل تو ویسے بھی۔۔۔ ٹور پر رہتے ہیں، ایسے میں تم وہاں اکیلی کیسے رہتیں۔؟“ ارصم چلتے چلتے رکا۔ سڑک بالکل سنسان تھی۔

”کیوں، ماہیر بھی تو رہ رہا ہے نا۔؟“ اس نے احتجاجی نظروں سے اپنے کزن کو دیکھا جس کے ساتھ پاکستان آتے ہی اس کی دوستی ہو گئی تھی۔
 ”وہ لڑکا ہے وہ رہ سکتا ہے۔“ ارصم نے اسے سمجھانے کی ناکام کوشش کی۔

”یورپ میں لڑکا لڑکی کی کوئی تقسیم نہیں ہوتی۔“ اوریدہ نے جواباً اسے سمجھانے کی کوشش کی۔
 ”لیکن تمہاری روٹس تو مشرقی معاشرے کی ہیں، انکل تیمور جتنے بھی لبل ہو جائیں، وہ اپنی بیٹی کو یورپی سوسائٹی میں اکیلا نہیں چھوڑ سکتے۔“ ارصم ایک دفعہ پھر چلنے لگا۔ اوریدہ کو اس کی یہ بات بالکل پسند نہیں آئی۔

”تو یہاں کون سا کسی کو میری آمد سے خوشی ہوئی ہے۔“ اوریدہ نے سڑک پر پڑے ایک پتھر کو ٹھوکر لگائی۔
 ”تمہیں کس نے کہا۔۔۔؟“ ارصم نے نظریں چرا کر آہستگی سے پوچھا اس حقیقت سے تو وہ بھی باخبر تھا۔
 ”لو بوڑے ابا کا مجھے دیکھتے ہی بی بی ہائی ہو جاتا ہے۔“ اوریدہ نے منہ بتایا۔

”وہ تو ہائی بلڈ پریشر کے ہیشنٹ ہیں۔“ ارصم نے اسے ناکام سی دلیل دینے کی کوشش کی۔
 ”اور بیا آئی کا تو بس نہیں چلتا، مجھے گولی سے اڑا دس۔“ اوریدہ کی معصومیت اور صاف گوئی بعض دفعہ اگلے بندے کو اچھا خاصا شرمندہ کر دیتی تھی۔ یہی حال ارصم کا ہوا تھا اس وقت۔

”ماما تو ویسے بھی مزاج کی تیز ہیں، پاپا کی ڈھتھہ کے بعد وہ ویسے بھی شارٹ ٹیمپر ہو گئی ہیں اور چھوٹی چھوٹی بات پر غصہ کرنے لگتی ہیں۔“ ارصم نے اپنی طرف سے اسے مطمئن کرنے کی کوشش کی جسے اوریدہ نے ایک چٹکی میں اڑا دیا۔

”اچھا مجھے تو لگتا ہے، وہ مجھے سخت ناپسند کرتی ہیں، اور انہیں میرا پاکستان آنا بھی پسند نہیں آیا۔“ اوریدہ کی بات پر ارصم جھنجھلا سا گیا۔
 ”تم بعض دفعہ اپنی عمر سے بڑی باتیں کیوں کرنے لگتی ہو اوریدہ۔؟“

”جن بچوں کی مائیں بچپن میں انہیں تنہا چھوڑ جاتی ہیں، زندگی کی تلخ حقیقتیں انہیں وقت سے پہلے بڑا کر دیتی ہیں۔“ اوریدہ کی بات پر ارصم کو شاک سا لگا۔
 وہ پریشانی سے اپنی پندرہ سالہ کزن کا سنجیدہ سا چہرہ دیکھنے لگا، جسے پاکستان آئے ہوئے بمشکل چھ ماہ ہوئے تھے اور وہ میٹرک کی اسٹوڈنٹ تھی۔



”آپ کو ضرورت کیا تھی تیمور کی بیٹی کو پاکستان لانے کی۔“ بینش نے چائینز رائس اپنی پلیٹ میں نکالتے ہوئے ڈاکٹر حماد آغا سے گلہ کیا۔ جنہیں نیلی

چھوڑے گی تو وہ انٹری ٹیسٹ کی تیاری کرے گا۔“
ڈاکٹر بینش کا مسئلہ کچھ اور تھا۔

”تیمر کی بیٹی کا نام اوریدا ہے۔“ آغا جی نے
سنجیدگی سے یاد دلایا تو وہ بری طرح تپ گئیں۔
”آغا جی! میں جتنی سیریس ہوں، آپ اتنا ہی اس
مسئلے کو لائٹ لے رہے ہیں۔“

”تم نے خواجہ اس بات کو اپنے سر پر سوار کر لیا
ہے، اس فضول سی بات کو جواز بنا کر تم ارہم سے بھی
اپنی ریلیشن شپ خراب کر لو گی۔“ ان کی بات پر وہ
بری طرح چونکیں۔ انہوں نے غور سے آغا جی کے
چہرے پر کچھ کھوجنے کی کوشش کی۔

”آپ سے کچھ کہا ہے اس نے۔؟“ انہیں
معلوم تھا ان کا بیٹا ان سے زیادہ اپنے نانا اور بڑے ابا
کے قریب ہے۔

”ہاں۔۔۔“ آغا جی نے سنجیدگی سے بینش کا پریشان
چہرہ دیکھا اور صاف گوئی سے کہا۔ ”اے لگتا ہے تم اوریدا
کے ساتھ اوورری ایکٹ کرتی ہو۔“

”تو اے کیا رابلیم ہے۔“ وہ بھڑکیں۔

”وہ دونوں اچھے دوست ہیں۔“ آغا جی کی اطلاع
نے انہیں ایک دفعہ پھر بے سکون کیا۔

”اس دوستی ہی سے تو میں خار کھاتی ہوں، زہر لگتی
ہے تیمر کی بیٹی، میرا بس نہیں چلتا۔“ بے تحاشا غصے
کی زیادتی کی وجہ سے وہ نہ چاہتے ہوئے بھی جب کر
گئیں۔ آغا جی نے ملاستی نگاہوں سے اپنی اکلوتی بیٹی کو
دیکھا اور خاموشی سے ڈاکٹنگ روم سے نکل گئے۔ ڈاکٹر
بینش کا پارہ ایکسوم ہی ہائی ہوا تھا۔ ہمیشہ کی طرح آج کی
رات بھی ان کی خاصی ٹینشن میں گزرنی تھی۔



”ایا! لگتا ہے آپ نے مجھے بڑے ابا کے گھر میں
نہیں کسی ہاسپٹل میں سمجھوا دیا ہے۔“ اوریدا اپنا سیل
فون کان کے ساتھ لگائے بڑے سکون سے لی وی لاؤنج
کے صوفے پر آلتی پالتی مار کر بیٹھی ہوئی تھی۔ دوسری
طرف تیمر اپنی بیٹی کی بات سن کر مسکرائے۔

کوٹھی میں سب آغا جی کہتے تھے وہ بینش کے والد اور
ارہم کے نانا تھے۔

”وہ بے چارا اپنی مسز کی ڈنٹھ کے بعد اتنا اپ سیٹ
تھا، مجھ سے رہا نہیں گیا۔“ آغا جی نے رشین سلاڈ
کھاتے ہوئے سنجیدگی سے جواب دیا، ویسے بھی وہ اپنی
بیٹی کے مقابلے میں خاصے نرم دل اور شفیق واقع
ہوئے تھے۔

”ہاں تو وہ خود بڑے ابا سے بات کرتا، دوسروں کے
کندھے پر بندوق رکھ کر چلانے کی عادت تو اسے ہمیشہ
سے ہے۔“ بینش کے لہجے میں ناراضگی کا عنصر نمایاں
تھا۔ آغا جی نے بڑے غور سے اپنی بیٹی کا جھنجھلا ہوا
چہرہ دیکھا۔

”تمہیں تیمر کی بیٹی سے پر اہلم کیا ہے بینش۔؟“
بات اتنی سادہ نہیں تھی، جتنا سادہ آغا جی کا لہجہ تھا۔
”آپ کو نہیں پتا۔“ وہ ہاتھ میں پکڑا چچ پلیٹ میں
پنچ کر غصے سے کھڑی ہوئیں۔

”بیٹھ جاؤ اور آرام سے بات کرو۔“ آغا جی نے
نرمی سے کہا اور وہ کچھ سوچ کر بیٹھ گئیں، لیکن مزاج
ہنوز برہم تھا۔

”اس کی وجہ سے ارہم کی اسٹڈی سخت ڈسٹرب ہو
رہی ہے۔“ انہوں نے سوچ کر ایک بات نکال ہی لی۔
”میرے خیال میں تو ارہم کے پیپر ز زبردست
ہوئے ہیں اور مجھے امید ہے وہ اس دفعہ بھی ٹاپ کرے
گا۔“ آغا جی نے جب سے پانی گلاس میں اندھلتے
ہوئے اپنی بیٹی کو دلا سادیا۔

”آغا جی! انٹری ٹیسٹ ابھی باقی ہے اور میں اسے
کنگ ایڈورڈ سے ڈاکٹر بنانا چاہتی ہوں۔“ ڈاکٹر بینش
کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس طرح اپنے والد کو
سمجھائیں۔ ارہم ان کا لاڈلا تھا اور اس کے دفاع کے
لیے وہ کہیں نہ کہیں سے جواز ڈھونڈ ہی لاتے تھے۔

”ارہم، ماشاء اللہ جتنا لائق ہے، آرام سے فرسٹ
لسٹ میں اس کا نام آجائے گا۔“ وہ اب نشو سے ہاتھ
صاف کر رہے تھے۔

”تیمر کی دنیا جہان کی تالائق بیٹی اس کا پیچھا

”وہ کیوں بھی۔؟“

”دیکھیں نال بڑے ابا فزیشن“ آغا جی آر تھو پیڈک سرجن“ آئی بیا۔ گانا کو لوجسٹ اور اب ار صم بھی اس لسٹ میں شامل ہونے جا رہا ہے۔“ اس نے انگلیوں پر رگن کر میڈیکل پروفیشن سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے نام بتائے جو نیلی کو بھی میں موجود تھے۔

”ہاں۔ اس کے بعد اس لسٹ میں شامل ہوں گی ڈاکٹر اور ید تیمور۔“ بیبا کی بات پر اور ید کو کرنٹ لگا۔ ”نو نیور بیبا۔ ایسا سوچھیے گا بھی نہیں۔“ اور ید کے جواب سے تیمور صاحب کو جھٹکا سا لگا۔

”سخت برا لگتا ہے مجھے یہ پروفیشن“ میں تو فائن آرٹس میں ماسٹرز کروں گی۔“ اور ید کے مستقبل کے ارادے کو سن کر تیمور صاحب کو ایک دم ہی غصہ آیا۔ ”رہیں ناں کی طرح جاہل کی جاہل۔“ وہ بولے نہیں بلکہ پھنکارے تھے۔

”بیبا۔!“ اور ید کو سخت صدمہ پہنچا۔

”دوبارہ فائن آرٹس کا نام تمہاری زبان پر آیا تو زبان کھینچ لوں گا“ میں نے تمہیں اس لیے پاکستان نہیں بھجوایا کہ تم یہ فضول سبجیکٹ پڑھو سمجھیں۔“ تیمور کے غصے نے اور ید کی آدمی جان نکال دی۔

”جی بیبا۔“ وہ بمشکل بولی۔

”تم ایف ایس سی کر کے ڈاکٹر بنو گی بس۔“ تیمور صاحب کے اگلے حکم سے اس کی روح فنا ہوئی۔

”لیکن بیبا۔“ اس نے احتجاج کی خاطر منہ کھولا ہی تھا کہ دوسری جانب تیمور نے فوراً ہی اس کی بات کاٹ دی۔

”لیکن ویکن کچھ نہیں“ ایف ایس سی کے بعد سیدھا سیدھا میڈیکل میں جاؤ ورنہ میں تمہاری شادی کر دوں گا۔“ تیمور کی اگلی دھمکی سن کر تو اور ید کی ایسی زبان گنگ ہوئی جو شام میں ار صم کے سامنے جا کر کھلی۔

”تو اس میں رونے والی کیا بات ہے۔“ ار صم اس کے بے تحاشار رونے پر پریشان ہوا۔

”سخت برا لگتا ہے مجھے میڈیکل۔“ اس نے اپنا مسئلہ بتایا۔

”انتا بھی برا نہیں ہے جتنا برا تم منہ بنا رہی ہو۔“ ار صم نے نشو اس کی طرف بڑھاتے ہوئے دوستانہ انداز سے کہا۔

”میرا ایف ایس سی میں کبھی میرٹ نہیں بنے گا“ اس نے روتے ہوئے اصل مسئلہ بتایا۔

”محنت سے ہر کام ہو جاتا ہے۔“ اس کے پاس بھی ہر مسئلے کے لیے محنت اور کوشش کی چابی موجود تھی۔ ”مرمر کر تو میرا نانتھ میں بی گریڈ آیا تھا۔“ اور ید نے نشو سے آنکھیں صاف کرتے ہوئے یاد دلایا۔

”ان شاء اللہ اب اے گریڈ آجائے گا۔“ ار صم نے حوصلہ افزائی کی۔

”لیکن میں ڈاکٹر ہرگز ہرگز نہیں بنوں گی۔“ وہ اپنے ارادے پر ابھی تک ڈٹی ہوئی تھی۔

”تو چلو پھر شادی کر لینا۔“ ار صم نے اسے چھیڑا اور ید کی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو آگئے جسے دیکھ کر وہ گھبرا گیا۔

”افوہ یار انداق کر رہا تھا میں۔“ ار صم نے بازو سے پکڑ کر اسے بٹھایا وہ جو خفا ہو کر اندر جانے کے لیے اٹھی تھی۔ ایک دفعہ پھر دم سے لان کی گھاس پر بیٹھ گئی۔ ایک دفعہ پھر وہ دھواں دھار انداز سے رونا شروع کر چکی تھی۔ ار صم کو اگلے دو گھنٹے لگا کر اسے منانا تھا۔



”یہ میری بک کے اوپر چائے کا کپ بس نے رکھا تھا۔“ بڑے ابا جو ہسپتال سے سیدھا لاؤنج میں آئے تھے اور شایف میں رکھی اپنی میڈیکل کی کسی کتاب پر رکھا خالی چائے کا کپ انہیں بری طرح تپا گیا۔

اس وقت اور ید بڑی اماں اور یوار حمت کے ساتھ بیٹھی بی بی وی کا کوئی ڈرامہ بڑے ذوق و شوق سے دیکھنے میں مگن تھی۔ بڑے ابا سے تو اس کی جان جاتی تھی اور اس وقت انہیں بالکل اپنے سامنے کھڑا دیکھ کر وہ سخت گھبرا گئی۔

”کون سا کپ۔؟“ بوارحمت نے ریشانی سے بڑے ابا کے ہاتھ میں موجود کتاب کو دیکھا جس پر کپ کا گول سا نشان خاصا واضح تھا۔

”یہ۔۔۔“ بڑے ابا نے خالی کپ ان کے سامنے لہرایا۔

”یہ تو اوریدانے رکھا تھا۔۔۔“ بوارحمت کی زبان پھسلی۔

”ایک جاہل ماں کی جاہل بیٹی کو اتنی تمیز کہاں۔۔۔“ ان کے سہلے لہجے میں کسے جملے پر اوریداکار رنگ فق ہوا، یہ اس دن ماں کے حوالے سے ملنے والا درد سراسر طعنہ تھا۔ جسے سن کر اس کا دل بھر آیا۔ بڑے ابا اپنے کمرے کی طرف جا چکے تھے۔

”ہزار دفعہ سمجھایا ہے احتیاط کیا کرو اب بڑگئی ماں ڈانٹ۔“ بڑی ماں کی جھنجھلاہٹ پر اس کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے، جسے دیکھ کر بڑی ماں کا دل موم ہوا۔ ویسے بھی نیلی کو بھی میں ایک بڑی ماں، ارصم کے علاوہ بوارحمت ہی تھیں، جن کی محبت پر اسے کبھی شک نہیں ہوا تھا، لیکن اب وہ ان کی طرف سے بھی بدگمان ہو چکی تھی۔

”آئے ہائے“ اس میں بے چاری بیٹا کا کیا قصور، میری ہی سستی تھی جو اٹھانا بھول گئی۔“ بوارحمت اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر پریشان ہوئیں۔

”تو یہ کون سا چھوٹی ہے، میٹرک کا رزلٹ آنے والا ہے اس کا۔“ بڑی ماں آج اسے بخشنے کے موڈ میں نہیں تھیں۔

”آج چھا اچھا اب آپ کچھ مت کہئے گا بیٹا کو۔“ بوارحمت گھر کی خاندانی ملازمہ تھیں، اس لیے بے تکلفی سے ہر بات کہہ جاتیں۔

”میں تو اس کے بھلے کے لیے ہی کہہ رہی تھی، جتنا چاہتی ہوں دادا اور پوتی کے درمیان فاصلے کم ہوں اتنے ہی۔“ بڑی ماں نے سنجیدہ سے انداز سے بات ادھوری چھوڑی۔

”آج کا تو دن ہی برا ہے۔“ اوریدانے بازو کی پشت سے بے دردی سے آنسو صاف کرتے ہوئے سوچا،

اسی لمحے ڈاکٹر بینش عجلت بھرے انداز میں لاؤنج میں داخل ہوئیں اور اندر کا ماحول دیکھ کر ایک لمحے کو ٹھنک کر رک گئیں۔ سامنے اوریداکامتورم چہرہ اور بڑی ماں کی سنجیدگی نے انہیں معاملے کی سنگینی کا احساس دلایا۔ انہوں نے عجلت بھرے انداز سے سلام کیا، بڑی ماں کے چہرے پر ہلکی سی ناگواری کا تاثر اوریدانے پہلی دفعہ محسوس کیا۔

”نانی ماں! بڑے ابا کہاں ہیں؟“ بینش نے سپاٹ سے لہجے میں پوچھا۔

”اپنے کمرے میں۔“ بڑی ماں نے مختصراً جواب دیا، ڈاکٹر بینش فوراً ہی بڑے ابا کے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔

”اس کی موجودگی میں کہاں کسی کے تعلقات خوشگوار ہو سکتے ہیں۔“ بڑی ماں نے ناگوار انداز سے بوارحمت کو مخاطب کیا۔ جو نظریں چرا کر رہ گئی تھیں۔ اوریداکوان کا انداز خاصا عجیب لگا۔ اتنا تو اسے بھی احساس تھا کہ بڑی ماں اور آنٹی بینش کی ایک دوسرے کے ساتھ بنتی نہیں تھی، لیکن ان کا بیٹا ارصم بڑی ماں اور بڑے ابا کا خاصا چہیتا تھا۔ وہ اس پہلی کو بوجھنے سے قاصر تھی۔ اوریداکا خاموشی سے اسے کمرے میں چلی آئی اور پھر اگلے دن ہی شام کو باہر نکلی۔ نیلی کو بھی کے پچھلے صحن میں بنے برآمدے میں بڑی ماں کا بیٹا سا لکڑی کا ایک تخت اور کچھ فاصلے پر ایک جھولا تھا۔

”کیا بات ہے اوریداکا، چپ کیوں ہو؟“ شام کو بڑی ماں نے اس کی مسلسل خاموشی سے گھبرا کر پوچھا۔

”کچھ نہیں بڑی ماں۔“ وہ ان کے تخت پر بیٹاری سے لیٹ گئی۔

”اوں ہوں۔ مغرب کا ٹائم ہے، ایسے نہیں لیٹتے۔“ انہوں نے فوراً ٹوکا۔

”بڑی ماں، میں آپ کی سگی پوتی ہوں ناں۔“ اوریداکے اوٹ پٹانگ سے سوال پر بڑی ماں کا کروشہ چلاتا ہوا ہاتھ رکا۔

”کو پوتی بھی بھلا کوئی سوتیلی ہوتی ہے۔“ بڑی ماں

تھے کل لان میں اور رات ار صم سے شطرنج کی بازی بھی لگائی تھی سارا غصہ اور ساری ناراضی تو بس میرے لیے ہے۔“

وہ عام حالات میں توجہ بولتی تھی، لیکن غصے میں اس کی دوسروں کو آئینہ دکھانے والی صلاحیت کو چار چاند لگ جاتے تھے تب ہی وہ اپنی بات کر کے پاؤں پختی ہوئی کمرے کی طرف برہہ گئی اور بڑی اماں کے سر کا درد اچانک ہی برہہ گیا رات تک بلڈ پریشر بھی خطرناک حد کو چھونے لگا جس کے نتیجے میں بڑے ابا کے اچھے خاصے چھکے چھوٹ گئے۔



”کیا مصیبت ہے مونہ؟ تمہیں یہ ایکسرسائز سمجھ کیوں نہیں آرہی۔؟“

عدینہ جو کہ ویک اینڈ پر گھر آئی ہوئی تھی اس وقت مونہ کو مہتھس سمجھا رہی تھی جس نے فرسٹ ایئر کا امتحان دینا تھا۔ مونہ کا سارا دھیان بے بے کے چرنے کی طرف تھا جس پر وہ بڑی مہارت سے سوت کات رہی تھیں۔ ان سے کچھ فاصلے پر بیٹھی آپا صالحہ ایک ٹوٹی ہوئی تسبیح کے دانے پوری توجہ سے پرورہی تھیں۔

”بہت مشکل ہے ساری مشق۔“ مونہ نے منہ بتایا۔

”دھیان تو تمہارا سارا چرنے کی طرف ہے سوال کیا خاک سمجھ میں آئیں گے۔“ عدینہ نے چڑ کر کہا تو آپا صالحہ نے چونک کر بیٹی کا چہرہ دیکھا۔

”کوئی آسان فارمولا لگا کر سمجھاؤ میں اسے۔“ آپا صالحہ کی بات پر عدینہ کو جھٹکا سا لگا۔

”آپا آپ کو کیسے پتا اس سوال میں ایک اور فارمولا بھی لگ سکتا ہے۔“ عدینہ کے بے ساختہ سوال پر آپا بری طرح گڑبڑا گئیں۔ اگلے ہی لمحے انہوں نے خود کو سنبھال لیا۔

”ہر مشکل نظر آنے والی چیز کا ایک بڑا سا سادہ ساحل بھی ہوتا ہے جو انسان کو پہلی نگاہ میں الجھائی نہیں دیتا تھوڑا غور کرے تو مشکلوں میں ہی آسانیاں بھی مل جاتی

کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑی وہ اپنے سفید جارحٹ کے دوپٹے پر کروشیم سے ایک نفیس سی ٹیکل بنا رہی تھیں۔

”کیوں؟ اگر میں اپنے پیپا کی سوتیلی بیٹی ہوں تو آپ کی سوتیلی پوتی ہی ہونی چاہیے۔“ اس نے منہ بنا کر وضاحت کی۔

”لیکن تم تو تیمور کی سگی اولاد ہو۔“ بڑی اماں کا موڈ خاصا خوشگوار تھا ورنہ عموماً وہ اس کے سوال و جواب کے دورانے سے خاصا گھبراتی تھیں۔

”سگی اولاد ہوتی تو اتنی دور پھینکتے مجھے۔“ اس کا غصہ ہنوز برقرار تھا۔

”کیوں کیا ہوا۔؟“ بڑی اماں نے مسکراہٹ دیا کر پوچھا۔

”میں نے ڈاکٹر بننے سے انکار کیا تو خفا ہو گئے اس کے بعد سے میرا فون ہی اینڈ نہیں کر رہے۔“ اس نے اصل بات بتائی۔

”کوئی بات نہیں اس کا باپ بھی ایسے ہی خفا ہوا تھا جب اس نے بھی ڈاکٹر بننے سے انکار کیا تھا۔“ بڑی اماں کی زبان پھسلی وہ ایک دم اٹھ کر بیٹھ گئی۔

”اسی وجہ سے بڑے ابا پیپا سے خفا ہیں۔؟“ اوریدا کے سوال پر بڑی اماں سٹپٹا سی گئیں۔

”وہ کیوں ہونے لگے اپنے اکلوتے بیٹے سے خفا۔؟“ انہوں نے بات سنبھالنے کی کوشش کی۔

”پھر پیپا پچھلے تینو سال سے پاکستان کیوں نہیں آئے۔“ اوریدا کا دماغ آج ٹھیک کام کر رہا تھا۔

”اس کا بزنس جو ہے انگلینڈ میں۔“ بڑی اماں نے کمزوری دلیل دی۔

”چھا۔ بڑے ابا اور پیپا آپس میں بات کیوں نہیں کرتے۔؟“ اس کی بات پر بڑی اماں جھنجھلا سی گئیں۔

”میرا سرمست کھاؤ پہلے ہی تمہارے بڑے ابا کا کل سے سخت موڈ خراب ہے تم نے ان کی کتاب کا کور جو خراب کر دیا تھا۔“

”ہونہ۔ میرے اور آپ کے ساتھ ہی موڈ خراب ہوتا ہے آئی پیپا سے تو بہت ہنس ہنس کر باتیں کر رہے

ہیں۔ ”آپا صالحہ نے تسبیح کے دھاگے کو گانٹھ لگاتے ہوئے عدینہ کو حیران کیا۔

”لوھر آؤ اور سکون سے یہاں بیٹھو“ میں دوبارہ سمجھاتی ہوں۔ ”عدینہ نے مونہ کی پشت چرنے کی طرف کی تو بے بے کے چہرے پر مسکراہٹ آگئی۔

”جتنا مرضی زور لگالے پتر! اس کے دھیان کی کھڑکیاں تو میرے چرنے کی طرف ہی کھلی رہیں گی۔ جب یہ حساب سمجھنے پر راضی ہوگی تو تب سمجھانا۔“

بے بے نے مونہ کی طرف داری کرتے ہوئے عدینہ کو کہا تو اس نے منہ بتاتے ہوئے کتاب بند کر دی۔

”جاؤ بھاگو یہاں سے“ رات کو سمجھاؤں گی یہ مشق۔ ”مونہ کو جیسے ہی آزادی ملی وہ اچھلتی ہوئی بے بے کے چرنے کے سامنے جا بیٹھی۔ اب وہ بہت دلچسپی سے بے بے کو اپنا کام کرتے ہوئے دیکھنے لگی۔ جب کہ عدینہ خاموشی سے اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف آگئی۔

”عدینہ باجی۔ عدینہ باجی۔“ تھوڑی ہی دیر بعد مونہ بڑے مشکوک سے انداز میں کمرے میں داخل ہوئی، اور دائیں بائیں دیکھ کر آہستہ سے بولی۔

”عدینہ باجی! عبداللہ بھائی آپ کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔“ مونہ کی آنکھوں کی شوخی پر عدینہ کا دل ایک انوکھی لے پر دھڑکا۔

”کب؟“

”تھوڑی دیر پہلے بے بے اور آپا نے بلایا تھا انہیں“ ابھی بھی کمرے میں ہیں۔ ”مونہ کی بات پر وہ کچھ حیران ہوئی۔

”تو میں کیا کروں۔؟“ اس نے منہ بتایا۔

”آپ چائے والی ٹرے لے کر جائیں ناں اندر۔“

مونہ نے بڑی عجیب سی فرمائش کی۔

”میں۔؟“ عدینہ جھجک سی گئی۔

”ہاں ناں“ جلدی کریں مجھے لگتا ہے اندر کوئی خاص بات ہو رہی ہے۔ ”مونہ کی بات پر وہ فوراً اٹھی اور پکٹن سے جا کر وہ ٹرے اٹھائی جس میں مونہ نے چائے بنا کر پہلے سے رکھی ہوئی تھی۔ وہ جیسے ہی

مشہور و مزاح نگار اور شاعر

انشاء جی کی خوبصورت تحریریں،

کارٹونوں سے مزین

آفٹ طباعت، مضبوط جلد، خوبصورت گرد پوش

~~~~~



|       |                            |                        |
|-------|----------------------------|------------------------|
| 450/- | سفرنامہ                    | آوارہ گرد کی ڈائری     |
| 450/- | سفرنامہ                    | دنیا گول ہے            |
| 450/- | سفرنامہ                    | ابن بطوطہ کے تعاقب میں |
| 275/- | سفرنامہ                    | چلے ہو تو چین کو چلیے  |
| 225/- | سفرنامہ                    | مکرمی مکرری پھر مسافر  |
| 225/- | طہر و مزاح                 | خمار مہدم              |
| 225/- | طہر و مزاح                 | اردو کی آخری کتاب      |
| 300/- | مجموعہ کلام                | اس ہستی کے کوچے میں    |
| 225/- | مجموعہ کلام                | چاند مگر               |
| 225/- | مجموعہ کلام                | دل دہشی                |
| 200/- | ایڈ گرائلین پورا ابن انشاء | اندھا کنواں            |
| 120/- | ادھنری ابن انشاء           | لاکھوں کا شہر          |
| 400/- | طہر و مزاح                 | باتیں انشاء جی کی      |
| 400/- | طہر و مزاح                 | آپ سے کیا پردہ         |

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37، اردو بازار، کراچی



پہلے کے کمرے کے پاس پہنچی، دروازہ کھلا اور دروازہ  
عبداللہ کو دیکھتے ہی اس کے کانوں کی لوتیں سرخ  
ہوئیں۔

”عدینہ، مجھے تم سے ایک خاص بات کرنی ہے؟“  
اس نے ہلکا سا جھجک کر کہا۔ عدینہ کامل انوکھی لے پر  
دھڑک۔

”جی۔“ وہ پلکیں جھکائے اس کے سامنے کھڑی  
تھی۔ عبداللہ نے اس کے ہاتھ میں پکڑی چائے کی  
ٹرے پکڑنے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو اس کی دو انگلیاں  
عدینہ کے ہاتھ سے ٹکرائیں۔ عدینہ کو کرنٹ سا لگا اس  
نے گھبرا کر ٹرے چھوڑ دی۔ جو اس نے مسکراتے  
ہوئے پکڑ کر آدے میں۔ میز پر رکھ دی۔

”جی۔“ عدینہ کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی  
تھیں۔

”گھبراؤ مت۔“ وہ مسکرا کر مزید گویا ہوا۔

”یہ میرا سیل نمبر ہے۔ مجھے تم سے ایک ضروری  
بات کرنی ہے۔“ اس نے پہلے سے ایک چٹ پر لکھا  
نمبر عدینہ کی طرف بڑھایا جو اس نے جھجکتے ہوئے  
پکڑ لیا۔

”میں انتظار کر رہا ہوں۔“ وہ اس کی آنکھوں کی  
حدت سے پکھل رہی تھی۔ اسی لمحے بے بے کے  
کمرے کا دروازہ کھلا، آپا صالحہ کا ناراض چہرہ اندر سے  
برآمد ہوا۔ عبداللہ گھبرا کر فوراً ”باہر کی طرف چل پڑا۔  
آپا صالحہ نے جاچختی ہوئی نگاہوں سے دونوں کو دیکھا۔  
عدینہ کے ماتھے پر پسینے کی ننھی ننھی بوندیں شبنم کے  
قطروں کی طرح چمک رہی تھیں۔ اس نے گھبرا کر کاغذ  
کے چھوٹے سے پرزے کو اپنی مٹھی میں بند کیا جس  
میں عبداللہ کا نمبر تحریر تھا۔

”یہ کیا ہے؟“ آپا کی عقابی نظروں نے عدینہ کی  
اس حرکت کو ناڑ لیا۔

”کچھ نہیں۔“ وہ بوکھلا کر دو قدم پیچھے ہٹی۔

”دکھاؤ مجھے۔“ انہوں نے آگے بڑھ کر زبردستی  
اس کی مٹھی کھولی، عدینہ مزاحمت نہیں کر سکی۔

”حافظ عبداللہ“ چٹ پر لکھا نام اور اس کے آگے

لکھا نمبر بڑھ کر آپا کے چہرے کی رنگت متغیر ہوئی۔  
انہیں سارا معاملہ سمجھ میں آ گیا۔  
”اس نے دیا ہے تمہیں۔؟“ آپا کا سرواجہ عدینہ کی  
سماعتوں سے ٹکرایا۔

”جی۔“ اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی اثبات میں  
سر ہلا دیا۔

”کوئی ضرورت نہیں ہے اس سے بات کرنے کی۔  
کوئی تعلق نہیں ہے تمہارا اس سے۔“ آپا نے اس کی  
سماعتوں میں دم پھوڑا۔

”آپا۔“ لفظ اس کے لبوں میں ہی دم توڑ گئے۔  
”سب کچھ ختم کر دیا ہے میں نے۔“ آپا صالحہ نے  
اس کے جسم پر بلڈوزر چلایا۔

وہ گھبرا کر خوف زدہ نگاہوں سے آپا کا چہرہ دیکھنے لگی۔  
جس پر عبداللہ کے لیے سوائے نفرت، بے زاری اور  
کوفت کے کچھ نہیں تھا۔ انہوں نے غصے سے اس  
پرچی کے پرزے کر کے برآمدے کے کونے میں رکھے  
ڈسٹ بن میں ڈال دیے۔ اس کے ساتھ ہی عدینہ احمد  
کو یوں لگا جیسے کسی نے اس کے دل کے ٹکڑے  
— کر کے اسی ٹوکری میں ڈال دیے ہوں۔ وہ پھٹی  
پھٹی نگاہوں سے انہیں دیکھتی رہ گئی۔ جو بڑے  
سکون انداز سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی  
تھیں۔



”دیکھیں آپ مجھے ایک چائس دے کر تو دیکھیں،  
میں آپ کو مایوس نہیں کروں گی۔“ سرد بے زاری  
سے اپنے دوست ارسل کے پروڈکشن ہاؤس میں دھڑنا  
دیے بیٹھی اس لڑکی کو دیکھ رہا تھا، جواب باقاعدہ منتوں  
پر آتر آئی تھی، اسے ایسی لڑکیوں سے سخت چڑھتی  
تھی۔

وہ جو کسی کام سے ارسل کے پاس آیا تھا اور اب  
کوفت بھرے انداز سے پہلو پر پہلو بدل رہا تھا۔ اسے  
ارسل کے آفس میں آئے ہوئے پانچ منٹ ہی ہوئے  
تھے، جب شانزے نام کی یہ لڑکی وہاں چلی آئی اور اب



وہ خواہ مخواہ ارسل کے پیچھے پڑی ہوئی تھی۔  
 ”دیکھیں مس شانزے! جس پروجیکٹ کی آپ  
 بات کر رہی ہیں اس کے لیے ہمیں تجربے کار ایکٹرٹریس  
 کی ضرورت ہے، بلکہ اشار کاسٹ چاہیے۔“ ارسل  
 کی قوت برداشت پر سرد کو بے ساختہ رشک آیا۔  
 ”لیکن سر، جب تک آپ لوگ نیوٹیلنٹ کو چانس  
 نہیں دیں گے تب تک ہمیں کوئی ایکسپیرٹس کیسے  
 ہوگا۔“ اس لڑکی نے بھی ڈھٹالی کے سارے ریکارڈ توڑ  
 دیے تھے۔ وہ ارسل کے سامنے والی کرسی پر جم کر بیٹھی  
 تھی اور اس کا اگلے دو گھنٹے تک اٹھنے کا کوئی ارادہ نہیں  
 لگ رہا تھا۔

”لیکن میں اپنا اتنا بڑا پروجیکٹ کسی تجربے کی نظر  
 نہیں کر سکتا۔“ ارسل نے اسے سمجھانے کی کوشش  
 کی۔  
 ”میں آپ کو مایوس نہیں کروں گی سر۔“ وہ بھی  
 اپنے موقف سے ایک انچ ہٹنے کو تیار نہیں تھی۔  
 ”چلیں اس دفعہ تو نہیں لیکن نیکسٹ پروجیکٹ  
 پر میں آپ کو ضرور چانس دوں گا۔“ ارسل نے اسے  
 بہلانے کے لیے چارہ پھینکا، لیکن وہ بھی شاید ان  
 گھاگ پروڈکشن ہاؤس والوں کے مزاج کے سارے  
 رنگوں کو سمجھنے لگی تھی۔

”سب یہی کہتے ہیں اور اس کے بعد کوئی کال تک  
 اینڈ کرنا گوارا نہیں کرتا۔“ اس کی صاف گوئی بھی آج  
 عروج پر تھی۔  
 ”میں ایسا نہیں ہوں، آپ مارکیٹ میں کسی سے  
 بھی میرے بارے میں پوچھ سکتی ہیں۔“ ارسل اب  
 ہلکا سا جھنجھلا گیا۔  
 ”اسی لیے تو میں آپ کے پاس آئی ہوں۔“ اس کا  
 اطمینان دیدنی تھا۔  
 ”آپ کی کوالیفیکیشن کیا ہے؟“ خاموش بیٹھا سرد  
 اچانک ہی بولا۔  
 ”بی ایس میڈیا سائنسز۔“ اس نے بے زاری

سے سرد کی طرف دیکھا۔ اسی لمحے سرد کو بھی محسوس  
 ہوا کہ وہ یہ چہرہ پہلے بھی کہیں دیکھ چکا ہے۔ اس کے  
 ذہن میں جھماکا سا ہوا۔

”ایکسکیموزی، آپ نے میٹس کے برائڈل  
 ویک میں ماڈلنگ کی تھی نا؟“ سرد کو اچانک یاد آیا۔  
 ”جی نہیں۔“ شانزے اس دن کی ذلت کو کیسے  
 بھول سکتی تھی۔ لیکن اس لمحے اس قصے کو یہاں دہرانا  
 اپنے پیروں پر کلہاڑی مارنے کے مترادف تھا۔  
 شانزے کے جواب نے سرد کو ہلکا سا حیران کیا۔ لیکن  
 اس نے اس پر تبصرہ کرنے سے دانستہ گریز کیا۔ سرد  
 کے اس سوال نے شانزے کو اب پریشان کر دیا تھا۔ اور  
 وہ نہیں چاہتی تھی کہ کم از کم ارسل کے سامنے یہ  
 شخص اس حوالے سے کوئی اور سوال کرے تب ہی وہ  
 نہ چاہتے ہوئے بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔

”ٹھیک ہے سر! میں آپ کی آفر کا ویٹ کروں  
 گی۔“ اس نے پھیکے انداز سے مسکراتے ہوئے اپنا کچ  
 اٹھایا اور آفس کے دروازے کی طرف بڑھی، ارسل  
 کے منہ سے ایک پرسکون سانس خارج ہوا۔  
 ”یہ لڑکی جھوٹ بول رہی تھی، اس نے میٹس کے  
 برائڈل ویک میں حصہ لیا تھا۔“

گھر سے نکلتے ہوئے شانزے نے سرد کا جملہ سنا  
 اور اس کے ساتھ ہی اس کا سارا سکون بھی غارت  
 ہو گیا۔ آفس کی سیر حیاں اترتے ہوئے وہ ایک دفعہ پھر  
 خود کو بد قسمت لوگوں کی لسٹ میں سرفہرست دیکھ رہی  
 تھی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)





# اسیہ زلفی

## چہرہ کی نگار

سلوٹے سیاں سوتے ہو کیا؟ جاگو  
نندیا مانگے پھولوں جڑی رے  
حرافہ مانگے پھولوں جڑی رے  
منے کے ابا سوتے ہو کیا جاگو  
سب زیوروں میں جھوم رہا ہے  
وہی نند کو دورے

الیلے سیاں وہی نند کو دورے  
حرافہ جھوم لیتی نہیں رے۔“  
خود سوال۔ خود جواب۔ باریک ریلی کپکپاتی لہریں  
لیتی بوڑھی آواز میں سر کا جادو جگاتی ہوئی اماں جان کوئی  
اپنی ہی عمر کا پرانا گیت گا رہی تھیں۔ بہت شوقین  
تھیں پرانے سب گانے ان کو اذیر تھے۔ نواسی

مکمل ناول







2007



”چلیں پھر۔ میرے ساتھ آواز ملائیں۔“ سر میں  
گنا شروع کیا۔  
”باجرے دی راکھی۔ اڑیا باجرے دی راکھی۔  
ماہیا میں نہ پہندی دے۔  
اڑیا میں نہ پہندی دے۔  
تیرے باجرے دی راکھی۔“  
”اوکی‘ یہ کون سی جنتی زبان کاکیت ہے؟ ہمیں تو  
اپنے گانے آتے ہیں۔“  
”یہ میری دو حیالی زبان کاکیت ہے۔ لاہوریوں کا۔  
آپ اپنے سوسل پرانے دور سے نکلے اہل جان۔“  
”جیسے میرا خاندان کوئی اور ہے؟ چل بھاگ۔ مجھے  
اپنا گانا ختم کرنے دے۔“  
ارے سب بھائیوں میں بھولا ہے پگلا۔  
وہی نند کو دورے۔  
منے کے ابا وہی نند کو دورے۔  
نندیا باولا لیتی نہیں رے۔  
حرافہ باولا لیتی نہیں رے۔  
نندیا مانگے پھولوں جڑی رے۔“  
سائس لینے کو رکھیں۔ بوڑھے ہتھکڑوں میں بس  
انتہی دم تھا۔  
”اچھا اہل جان۔ یہ باولا کہیں دستیاب ہوا۔ اور  
کیوں نند کو دیا جا رہا ہے۔“  
”بھائی کے گھر بیٹا ہوا ہے۔ تو بہن نیک مانگ رہی  
ہے۔ بھابھی چالاک ہے۔ اپنا پاگل بھائی نند کے سر  
منڈھ رہی ہے۔ وہ بھلا باولا کیوں لے۔ اب سنو کیا لیتی  
ہے؟“  
”ارے سلونے سیاں سوتے ہو کیا؟ جاگو  
نندیا مانگے پھولوں جڑی رے  
ارے سب گاؤں میں میرٹھ بڑا ہے  
وہی نند کو دورے  
سلونے سیاں سو ہی نند کو دورے  
حرافہ میرٹھ لے کر چلی رے  
چالا کو میرٹھ لے کر چلی رے۔“

ناگواری سے منہ بتا رہی تھی۔ افواہ ان بڑی بلی کے شوق  
دل بھلانے کے لیے خوب فرصت ملتی تھی۔ اپنی خوشی  
میں مست۔ ارے کبھی مجھ غریب پر بھی نظر کرم فرما  
لیتیں کہ مجھے کیا چاہیے؟ مگر بھلا بتاؤ۔ سات سمندر  
پار پوتے کی پیدائش کی خبر ملتے ہی گانوں کا سلسلہ  
شروع ہو گیا۔

”اہل جان! کون سا گانا شروع کیا ہے۔ نور سے  
گائیں تو کچھ سمجھ میں بھی آئے۔“  
”ظن!“ کہا تھا اور نہ سب سمجھ میں آ رہا تھا۔ ثانی نے  
نواسی کو گھور کر دیکھا۔ کھجور کا پنکھا تکیے پر رکھا۔ یہ پنکھا  
ان کا ٹیڈ مارک نہ تھا۔ صرف شوق تھا۔ جو لوڈ شیڈنگ  
کی ایجلو کے طور پر ان کے ہاتھ میں رہتا۔ اس سے کئی  
کالم لیے جاتے۔ نواسی کی ٹھکائی کے لیے بھی بہترین۔  
”زچہ گیری گار ہی ہوں۔ اور کتنی نور سے گاؤں۔  
حلق اور ہتھکڑوں میں دم ہی کہاں ہے؟“ ہائے  
مجبوریاں۔

”تو۔ حلق اور ہتھکڑوں کو زحمت دینے کی  
ضرورت ہی کیا ہے؟“  
”اوکی۔ اپنی خوشی کے لیے گاؤں بھی نہیں؟  
چار پوتیوں کے بعد پوتے کی خوشخبری آئی ہے۔ جی تو  
چاہ رہا ہے۔ ناچوں۔ مگر ڈرلی ہوں۔ کر کر اگنی۔ تو بے  
موت نواسی اٹھانے بھی نہیں آئے گی۔“

”میں بے موت؟“ چھا پھر آپ کا ہی اثر آیا ہو گا۔ مجھ  
میں۔ خون کا آخر اثر ہوتا ہے۔“  
”دھیال سے ہوتا ہے خون کا تعلق۔ ننھیال کو  
بدنام نہ کرنا اور مجھے ٹوکنا نہ کرو۔ بندہ اپنی خوشی منانے،  
ناچنا بھی ہے گا تا بھی ہے۔ دو سروں کو دکھانے سنانے  
نہیں آئی سمجھ؟“

”اگلے کو خوشی میں شریک کر لیں تو خوشی دو آتشہ  
ہو جائے۔ کہے تو آپ کی خوشی کے لیے طائفہ بلا  
دوں۔“

”اے ہے۔ تو بہ کر۔ میں خود گا سکتی ہوں۔ شریک  
تو جب کروں کہ تم میرا ساتھ دو گانے میں۔“



”لو۔ میرٹھ کوئی پھولوں کی ڈالی ہے کہ لے کر چلی۔“

نواسی کی مین میخ سے ٹانی عاجز آ گئیں۔

”جائیداد۔ میری بچی۔ ایک گاؤں یعنی کہ جائیداد۔

زمین پھولوں جڑی۔ کیا کبھی کوڑھ مغز۔“

”او۔ اچھا اچھا اے کاش۔ میں بھی بڑے ماموں

سے میرٹھ مانگ لیتی نیگ میں۔ چلو میرٹھ نہ سہی۔

قصود دے دیں۔ اچھا تو پھر چھو کی ملیاں ہی سہی۔

نہیں تو پشاور کا ڈمہ ڈولا ہی لے لوں گی۔ بدرجہ

مجبوری۔ ورنہ تو۔ آپ ہی بتا دیں کون سا گاؤں

مانگوں۔“

”پانگلوں کے سر پر سینک نہیں ہوتے۔“ ٹانی سخت

تاراض ہوتیں تو ایسا ہی جملہ کہہ کر لیٹ جاتیں۔ مگر

اس وقت انہیں اپنے بیٹے کے کھانے کی فکر تھی۔

لاڈلی بیگم تو میاں کے لیے کچھ پکاتی نہ تھیں۔ ایک

نور اں ملازمہ تھی۔ وہ صبح کام کر کے جا چکی تھی۔

”ماموں کے کھانے کا سوچا۔ کیا کھائے گا آکر

نگوڑا۔“ آخر بولنا پڑا۔

”نور اں نے آلو پالک پکا دیا ہے۔ وہی دستیاب

سبزی گھر میں تھی۔ روٹی وہ تندور سے لائیں گے۔“

”آئیں؟ سبزی اور گوشت کہاں گیا۔“

”میرے پیٹ میں۔ بلکہ میرے اور نور اں کے

پیٹ میں۔ دو تین بوٹیاں ہی تھیں۔ ہم نے تکے بھون

کر کھائے۔ مزا آ گیا۔“

”پورا ایک پاؤ گوشت تھا۔ اللہ سمجھے فجر! نوید کو

پالک پسند نہیں۔“

”تو لے آئیں گے کباب۔ لاڈلی بیگم کی فرمائش پر

۔ روز کی طرح۔“ لاپرواہی۔ اف۔

اماں جان سٹپٹا کر پلنگ سے اتریں۔ کچن کی راہ لی۔

اب لاڈلے بیٹے کے لیے اینڈے بنائیں گی۔ یا چکن

قورمہ اور ساتھ ہی کوئی میٹھا۔ بڑی بی خود بھی سوٹ

ڈش کی شوقین۔ نواسی کو کھانے سے دلچسپی۔ پکانے

سے الرجی۔ ٹانی کچن میں بھی گنگنائے سے باز نہ

آئیں۔ باہر سے نواسی نے بہ آواز بلند یاد دلایا۔

”اماں جان! ایک پوتا۔ جوان جہان ماشاء اللہ لاہور

میں موجود ہے۔ آپ کو وہ یاد نہیں۔ اس کے لیے تو

کبھی کبھی گنگنائے بھی نہیں۔ بڑے ماموں کو تو بڑھائے

میں بیٹا بونس میں مل گیا۔ اس سے آپ کو بھلا کیا ملے

گا؟ جس کی مدد سرائی میں آپ مصروف ہیں۔“

”میں لالچی ہوں کیا؟ مجھے پوتا مل گیا۔ بس اور وہ

لاہور والا۔ وہ پرایا ہو گیا ہے۔“

”ہائے اللہ۔ پوتا اور پرایا جیسے میں پرانی آپ کی اور

ماموں کی کنیر۔“

”اللہ نہ کرے۔ وہ تو میں کبھی غصے میں کہہ دیتی

ہوں اسے پرایا۔ ٹانی ماموں کا غلام۔“

ٹانی نواسی کے مکالے تو چلتے رہتے تھے۔ گھر میں ہر

وقت کا ساتھ۔ نور اں بد بخت کو روز ہی جانے کی جلدی

پڑ جاتی۔ بیٹا ہو آفس اسکول۔ یہ لاڈلی نہ جانے

اسکول میں کیا کام کرتی ہے۔ چیرا سن لگی ہوگی۔ جاتی

فخریہ انداز میں ہے۔ مجھے اسکول جانا ہے۔ پڑھنے

جانے سے رہی۔ کہتی ہے تنخواہ ملتی ہے۔ یہ نہیں بتایا

کس کام کی تنخواہ۔

”یہ بن ٹھن کر کدھر کے ارادے ہیں؟“ نواسی کو

نہایا دھویا بہترین لباس میں دیکھ کر چونک گئیں۔

”گھر میں صاف ستھرا رہنا گناہ ہے کیا؟ میں تو ہر

وقت بن ٹھن کر رہتی ہوں۔“

”گناہ تو نہیں۔ مگر کل ہی تو وہ گلانی جوڑا پہنا تھا۔

آج اتار کر میلے دان میں ڈال دیا ہو گا۔ نہ تم گھر کی

صفائی کرو نہ کچن کا کام۔ کپڑے میلے ہونے کی نوبت

نہیں آئی کہ اتار پھینکتی ہو۔ اے بھئی روز روز کپڑے

دھلنے سے بدرنگ ہو جاتے ہیں۔ اتنے منگے ہماری

مجال نہ تھی کہ ٹانی یا داوی کی اجازت کے بغیر نئے

کپڑے نکال کر پہنتیں۔“ اماں جان کی فلا سنی الگ ہی

تھی۔

”اماں جان۔ بھول جائیں اپنا زمانہ۔ آپ کے اینڈیا

کا دستور ہے گھر میں میلا کچھلا رہنا۔ ہم پاک لوگ



ہیں۔ صاف ستھرے۔ یہ کیا کہ کہیں جانا ہو۔ تو صاف کپڑے پہن دو رہ نہ کینز بنے رہو۔“

”پٹے کی میرے ہاتھ سے۔ کہاں سے سن کر آجاتی ہے اٹھنا کے قہے۔ ہماری حویلی میں نوکر چاکر کام کرتے تھے۔ صاف ستھرے مگر یہ ہیں کہ۔۔۔ لو اور سنو۔“ گڑبڑا گئیں۔

”حوہلی۔ وہ کھنڈرات۔ دیکھ لی تھی تصویر میں نے۔ نوکر چاکر تو ہوتے تھے۔ مگر گھر میں روزمرہ نہانے کا رواج نہ تھا۔ نئے کپڑے۔ کہیں جاؤ تو نصیب ہوتے تھے عید کے علاوہ۔“

”اچھا اچھا۔ فضول بکواس نہ کر۔ نوید کے لیے دو روٹی تو ڈال دے میری بیٹی۔ میری جان۔“

فورا“ موضوع بدل ڈالا اور بھرنے بھی فورا“ ارادہ بدل لیا۔

”میں تو اپنی دوست سے ملنے جا رہی ہوں۔ نئے کپڑے پہنے ہیں۔ اس سے فائدہ اٹھالوں۔“ کہہ کر سامنے سے ہٹ گئی سچھے کی دسترس سے دور۔

اماں جان کی خفگی سے بچ کر باہر نکل آئی۔ دو چار ہی سہیلیاں تھیں۔ مینو نزدیک تھی۔ دس منٹ میں اس کے گھر پہنچ گئی۔

نوید ماموں اور لاڈلی بیگم ساتھ ساتھ گھر آتے تھے۔ ان کے آنے کا وقت قریب تھا۔ نانی ناشتہ ذرا دیر سے اور بھرپور کر لیتی تھیں پھر سات بجے ہی کھاتی تھیں۔ اسے بے فکری تھی۔

نانی بڑبڑاتی رہیں۔ پھر اس پر ترس آیا۔ ”کیا کرے بچاری مجھ سے ہی منہ ماری کرتی رہتی ہے۔ کوئی

ساتھی نہیں۔ لاڈلی کے نخرے۔۔۔ گھر کا سناٹا اسی کے دم سے ختم ہے وہ نہیں ہوتی تو میں تو پاگل ہو جاتی۔ ماں باپ اس کے نہیں رہے۔ کبھی داوی کے پاس بھی یہاں۔ اس کا دل بھی ایک جگہ نہ لگتا۔ کیا کرے۔ لڑکا ہوتی تو دوستیاں کرتی۔ اب یہاں ایک دو ہی سہیلیاں ہیں۔ کبھی آجاتی ہیں کبھی یہ چلی جاتی ہے۔ لاڈلی کو اس سے کد ہے۔ ہر بات میں تو اس کی نقل کرتی ہیں۔ مگر

۔ کہاں نقل اور اصل کا فرق رہتا ہے اور یہ بھی لاڈلی کی بات درست ہے کہ نانی داوی کے لاڈ پیار نے اسے بگاڑ دیا ہے۔ بگاڑا نہیں ہے۔ وہ ہے ہی بے فکر ذات نہ کسی کے برے میں نہ بھلے میں اپنی الگ ہی پہچان رکھتی ہے۔ نیک اور ہمدرد خوش مزاج تیز مزاج منہ پھٹ۔ بے دھڑک۔ کچھ بے لگام۔ مرضی کی مالک برا بھلا کہتی رہتی ہوں۔ اس پر اثر ہی کب ہوتا ہے بلکہ لاڈلی کو دکھانے کے لیے سچھے کی ڈنڈی سے پٹائی بھی کرتی ہوں۔ پھر بھی لاڈلی منہ بنائے رہتی ہے۔ اے بھئی اب کیا اپنے بچوں کو تیر تلوار سے مارا جائے تب چین ملے گا۔ لو اور سنو۔ نوید کے کان بھرتی ہے۔ وہ زن مرید۔ آکر تن فن سارا غصہ مجھ پر اگل دیتا ہے۔ پاگل اور فخر منہ پر ہاتھ رکھے ہنستی رہتی ہے۔ پتا بھی ہے سب اسی پر تیر برس رہے ہیں میری معرفت سے۔ توبہ ہے۔ چلی گئی اکیلا چھوڑ کر نہ جانے یہ چچہ کہاں رکھ دیا۔“



مینو فخر کو دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ اس کے پاس معلومات کا خزانہ ہوتا تھا۔ چائے کے ساتھ اس قدر چیزیں تھیں کہ فخر کھا کھا کر تھک گئی۔

”کس کی دعوت کا سامان کیا گیا ہے۔ اس قدر اعلیٰ

”پروانہ کرو۔ اپنا ہی مال سمجھ کر کھاؤ۔ کدو کا حلوہ تو تم نے چکھا تک نہیں۔ میں نے بدست خود بنایا ہے۔“

”مگر۔۔۔ تم نے بتایا نہیں۔ کون آنے والا ہے۔ کس

کے لیے اتنا کچھ۔ ضیافت کا انتظام۔“

”ہاں آکر چلے گئے۔ میری سسرال والے۔“ چمک کر مطلع کیا۔

”آہا تب ہی۔ شادی کی تاریخ لینے آئے ہوں گے۔“ فخر نے دہی بڑے کامز لیا۔

”شادی کی نہیں۔ ٹالنے کی۔ چار سال بعد کا جو نہی



ارادہ ظاہر کیا۔ ہم نے چائے کا چولہا بند کیا۔

”کیا؟ کیا؟ کیا؟“ یعنی کہ۔

”یعنی کہ۔۔۔ منگنی گئی چولہے میں۔ رشتہ ہوا ختم۔ شکر ہے کھانے کی سب چیزیں بچ گئیں۔ ورنہ تمہیں کیا کھلاتی؟“ مینو ایسی بے فکر جیسے کسی غیر کی منگنی ٹوٹنے کی خبر دے رہی ہو۔ چیزیں بچ جانے کی خوشی۔

”مجھے۔۔۔ آج نہیں آنا چاہیے تھا۔“ فجر کو افسوس ہوا۔

”کیوں؟ کیوں نہیں آنا چاہیے تھا؟“ مینو ایسی معصوم نہ تھی۔ مگر سن رہی تھی۔ ”تم سمجھ رہی ہو کہ مجھے کوئی غم ہو گا؟ اب بھی نہیں بلکہ میں تو آزادی کا جشن منانا چاہتی تھی۔ تمہارے آنے سے میری تمنا پوری ہو گئی۔“

مینو نے اٹھ کر کمرے کا دروازہ بند کیا۔

”منگنی تو میرے پیروں کی زنجیر تھی۔ اب جو وہ آئے۔ تو ان کی ایک اور طلب ساتھ کہ جی بڑی بہو کو جینز میں گھر ملا ہے اور دولہا کو سلامی میں کار۔ لہذا چھوٹی بہو سے بھی وہ یہی چاہتے تھے۔ میں بے چاری چھوٹی بہو۔ کہاں سے لاتی گھر اور ابا کہاں ڈاکہ مارتے کہ کار بھی دے دیتے۔ تو ان لوگوں نے کہا۔ چار سال ہم انتظار کر لیں گے۔ تب تک آپ اتنا تو جمع کر لیں گے۔“

مینو نے گلاب جامن فجر کے منہ میں ٹھونسی۔ خود بھی کھائی۔

”میں نے انگوٹھی ان کے منہ پر ماری۔ سب ہکا بکا۔ ابا اماں اور وہ جو آئے تھے۔ سب۔۔۔ ہائیں ہائیں کر کے رہ گئے۔ مگر ابا نے زیادہ زور دیا ہی نہیں۔ چار سو سال بعد بھی ابا گھر اور کار نہیں بنا سکتے۔ رشتہ بندہ۔“

تین بیٹیاں۔

”پھر اب۔۔۔؟“ فجر کا سانس اتھل پتھل ہو رہا تھا۔

اتنا لچ۔ چار سال میں خود بنا لو اپنا گھر۔

”اب؟“ وہ شوخی سے کھلکھلائی۔ ”خالہ کا بیٹا

سے ناں۔ بس جی۔ انہیں جلدی بھی ہے۔ وہ تو میری

منگنی کا سن کر دل مسوس کر رہ گئی تھیں۔ ان کی تو خوشی بس۔۔۔ میں نے ابھی فون پر بتا دیا وہ آرہی ہیں۔ دو گھنٹے میں پہنچیں گی۔ انگوٹھی لینے مارکیٹ بھی جانا ہے انہیں۔“ بہت خوش تھی۔

”اور اس انگلی کو دیکھو۔ تنگ انگوٹھی نے نشان ڈال دیا۔ میری بچاری ٹکڑی انگلی۔۔۔ چلو اسے آزادی ملی۔ اب خالہ سے کہوں گی۔ انگوٹھی نہیں۔ چوڑی پہنا دیں۔ ٹھیک ہے؟“

مینو کی خوشی۔ اس کی آرزو کی تکمیل۔۔۔ واہ کیا نصیب ہیں گو کہ ان کے گھر گاڑی تھی۔ مگر مینو کے والد نے بہت محنت سے گھر بنایا تھا۔ جوانی میں۔ کار بھی لے لی تھی۔ مگر لڑکے والے کس قدر ظالم ہوتے ہیں۔ مجبور یوں کے سودے۔ لڑکی والوں سے کس طرح سودا کرتے ہیں۔ اچھا ہوا۔ لاپچی لوگوں سے جان چھولی۔

مینو اسے خود گھر چھوڑنے آئی۔ وہ باہر سے ہی واپس چلی گئی۔ گاڑی میں آئی تھی اسے لے کر۔ چھوٹے بھائی کو لے کر اور بھائی کو میچ پر یکٹشن کے لیے دیر ہو رہی تھی۔ فجر بہت خوشگوار موڈ میں اندر آئی۔ سامنا ہو گیا لاڈلی بیگم سے۔ مسز نوید۔ میک اپ تھوپے ساڑی پہنے کہیں جانے کو تیار کھڑی تھیں۔ چہرے پر ازلی پھٹکار برس رہی تھی۔ گردن موڑ کر مغرور انداز میں پکاریں۔

”آگئی ہیں۔ شہر خیراں۔ محلے بھر کی سیر سے فارغ ہو کر۔“

اماں جان کو تو کمرے سے باہر آنے میں دو چار منٹ لگے۔ نوید ماموں شاید اسی پکار کے غصہ تھے۔ لمحہ بھر میں کمرے سے نکلے۔ جھپٹ کر فجر کو بالوں سے پکڑ کر چلائے۔

”کہاں گئی تھی۔ بول۔ آوارہ۔ کدھر تھی۔ اکیلی

۔۔۔ ہیں کہاں سے آئی ہے۔“ اب وہ اس کے بالوں کو

جڑ سے اکھاڑنے کی کوشش میں جھٹکے پر جھٹکا دے

رہے تھے۔ ”بولتی کیوں نہیں، کیا گونگی ہو گئی ہے؟“



چوکیداری ان سے بہتر کون کر سکتا ہے۔ ”اماں جان کم نہ تھیں اور بیگم کی شان میں گستاخی۔ افوہ۔۔۔“  
”آپ کی یہی حمایت اسے گستاخ بنا رہی ہے۔“  
بلبلا گئے۔

”آپ سن رہے ہیں۔ اماں بھی اسی کی زبان بول رہی ہیں۔“ لاڈلی بیگم نے اور اکسایا۔  
”ہاں ہاں اور صور پھونکو اس کے کان میں تاکہ وہ ماں کو بھی مار پیٹ کر تمہارا کلیجہ ٹھنڈا کرے۔ بھڑکاؤ اور۔ محلہ بھی تو تہا شادی کیے۔ ایسی ہی عورتیں فتنہ اٹھاتی ہیں۔ اسی کے گھر میں راج کر رہی ہو۔ اس کاہی کھا رہی ہو۔ شرم ہوتی تو میاں کے کان میں زہر بھرنے کے بجائے۔ خود ہی پی لیتیں۔ ہائے میرا احق بیٹا۔ دماغ سے نہیں کان سے کام لیتا ہے۔ لعنت ہے۔ جاہل بیوی مل گئی ہے۔ نمونے پیش کرتی رہتی ہے۔ بہت پچھتاؤ گے نوید۔“ اماں جان نگلی لکوار بن گئیں۔

”جاہل۔ مجھے جاہل کہا۔ بلبلا گئیں۔“ اسکول کیا گھاس کاٹنے جاتی ہوں؟“  
”ہو سکتا ہے۔ اس کے سوا اور کیا کرتی ہو بتاؤ۔“  
اماں جان تو آج نگلی لکوار بن گئی تھیں۔  
نوید کو اماں نے بٹھا کر از سر نو نصیحتیں شروع کر دیں۔ ”ہاں ماموں کو حق ہے مگر مار پیٹ کا نہیں۔“  
تسلی سے ٹھنڈے دل سے بات کرنی چاہیے۔ اپنے بچوں کو بھی اسی طرح مارو گے؟ یہ سکھایا ہے میں نے؟  
”بھئی ہاتھ اٹھایا تم پر یا سعید پر۔ یا کسی پر اب تم لاڈلی سے سیکھو گے جاہلانہ باتیں۔“  
”اماں مگر۔ بد زبانی۔“

”تم نے ابھی جو شرم ناک الفاظ منہ سے نکالے ہیں۔ انہیں کیا کہو گے؟ لاڈلی کی زبان کی مجھے پروا نہیں کہ اس کی تربیت ہی یہ ہوئی ہے۔ مگر فخر۔ تمہاری بچی ہے۔ اپنی بیٹی کو ایسے الفاظ کہہ سکو گے۔ لڑائی سے توقع کر سکتی ہوں۔“

لاڈلی کہیں جانے کو تیار کھڑی تھیں مگر حالات

وہ بولتی کیسے۔ اس کے حلق سے تو چیخیں ہی نکل رہی تھیں۔ اپنے ہاتھ سے اس نے نوید کی کلائی جکڑی ہوئی تھی۔ اور ”چھوڑیں۔ چھوڑیں“ کے سوا بس چیخیں۔  
”تو ارہ ذلیل کس کے ساتھ گئی تھی گلہ جھڑے اڑانے۔“

پچھے لاڈلی بیگم دبی زبان میں ”چھوڑیں نوید۔ چھوڑ بھی دیں۔ بس کریں۔“  
مگر کون سنتا ٹھنڈے بھرے سماعت میں جوائنٹ پلا جا رہا تھا۔ وہ چند منٹوں میں کیسے ختم ہو جاتا اور اماں جان بے چاری بھی گھبرا کر آئیں تو اتنی دیر میں فخر اوھ موٹی ہو چکی تھی۔ ان کے زوردار دھکے بھلا نوید کو کیا محسوس ہوتے جو طوطے کی رشتہ گائے ہوتے تھے۔  
”کون تھا؟ کس کے ساتھ گئی تھی رنگ رلیاں منانے؟“

لاڈلی بیگم نے ہی بزور شوہر کو نوچا۔ اماں جان کی موجودگی کا احساس ہوا تو انہوں نے فخر کو چھوڑا۔  
”زندہ نہیں چھوڑں گا اگر اب گھر سے اکیلی کہیں گئی۔“ ڈھمکی بھی دی۔  
فخر جھٹکے سے لڑکھرائی۔ اسے بھی اماں جان کی پر زور طاقت حاصل تھی۔

”جاؤں گی ضرور جاؤں گی۔ پھر کس کے ساتھ جاؤں۔ لاڈلی بیگم کو چوکیدار رکھ دیں۔ تنخواہ دے دیں گی۔“ کہہ کر اندر گھس گئی۔  
نوید ماموں سٹپٹا گئے۔ اماں جان تھپڑ تھپڑ رہی تھیں اور کیا طاقت تھی۔ اف۔

”تو ہوتا کون ہے اس کو مارنے والا۔ حق کیا ہے تیرا؟ بول میری اجازت سے جاتی ہے میری مرضی سے جاتی ہے۔ مینو کے گھر گئی تھی۔ ابھی وہ کھڑکی کے سامنے سے گزری سلام کرتی ہوئی۔ سنا۔“

”زبان دیکھی ہے؟ کیا بکواس کر کے گئی ہے۔ مار ڈالوں گا۔“ بیگم کی توہین برداشت نہ تھی۔  
”ٹھیک کہہ گئی ہے۔ اکیلی نہ جاتی۔ تو کیا کرتی۔ پھر



اپنا سارا پیسہ کھاپی کر اڑا دیا۔ فجر کے گھر رہ کر اس کا احسان ماننے کے بجائے اس کے خلاف سازش کرتی ہو۔ میرا بھی دل غ خراب ہے جاؤ۔“



رات کو میاں بیوی کہیں چلے گئے۔ فجر دو اند بند کر کے جو بیٹھی۔ تو پھر کھلا نہیں وہ جانتی تھیں۔ وہ بدلتی رہے گی اور اس کے دکھ پر ثانی رور ہی تھیں۔ رات دونوں کے لیے یکساں اذیت ناک تھی۔

صبح نوید اور لاڈلی بیگم اماں جان سے معافی مانگنے آئے۔ انہوں نے بے مروتی اور بے لحاظی کی چادر اوڑھ لی تھی۔

”مجھ سے معافی۔۔۔ زیادتی فجر کے ساتھ ہوئی ہے۔ اس سے معافی مانگو۔“ دونوں کی ٹی گم ہو گئی۔

”ماموں بھانجی سے معافی مانگے۔ یہ کہاں کا انصاف ہے؟“

”زبان کھولتے ہوئے۔ ہاتھ اٹھاتے وقت سوچا تھا کہ بھانجی ہے؟ کبھی عقل استعمال نہ کی۔ افسوس“ اتنا طرف نہ تھا۔ کہ بھانجی کے سامنے جاتے۔

دونوں کے جانے کے بعد فجر ہر آگئی۔ جانتی تھی اس کے کچھ کھائے پیئے بغیر اماں جان کے حلق سے کچھ نہ اترے گا۔ نور ایں نے ناشتہ بنا دیا۔ دونوں ناشتہ کر چکیں تو انہوں نے فجر کے بال سہلائے۔

”بہت درد ہوا ہو گا۔“ آواز بھاری ہو گئی۔

”نہیں تو مڑا آگیا۔ چلو برکائے میں آکر سہی۔ ماموں نے حق ادا کیا۔ یہ کم ہے؟“

”صبح دونوں آئے تھے معافی مانگ رہے تھے۔ میں نے کہا۔ فجر سے معافی مانگو۔ اب شام کو آکر۔“

”نہیں اس کی کیا ضرورت۔“ بہت سنجیدہ تھی۔

”میری قسمت آپ ذرا بھی فکر نہ کریں۔ میں آپ کی تابعدار بیٹی ہوں اور رہوں گی۔ آپ وعدہ کریں۔ مجھ سے کبھی تخفا نہیں ہوں گی۔“ لب کانپ رہے تھے۔

انہوں نے اسے لپٹا کر پیار کیا۔ ”میری جان تم تو

ماموں کو دیکھ کر اندر جا کر لباس تبدیل کر آئیں۔ بدرجہ مجبوری آگواں لک پر ہی اکتفا کرنا پڑا۔ ورنہ اماں جان۔۔۔ جو بیٹوں سے بدلتی کچا چکی تھیں۔ بیسن کا حلوہ خود بنا چکی تھیں۔ ان کے مزید لیتے لینے سے باز نہ رہیں۔

نوید بھی اماں سے جھاڑ کھا کر ٹھنڈے ہو چکے تھے۔ کھاپی کر معاملہ درست ہونے کا یقین ہو چلا تھا۔ تب اماں جان نے بے مروتی سے ان سے کہا۔

”نوید! اب تم اپنا کہیں اور انتظام کر لو۔ میں نہیں چاہوں گی کہ آج کے بعد پھر کوئی اور واقعہ ایسا ہو جائے۔ یہ گھر فجر کا ہے۔ تمہاری کسمپرسی دیکھ کر فجر نے ہی سفارش کی تو میں نے تمہیں بلا لیا۔ مگر بیٹا اب نہیں۔ میں فجر کا سامنا نہیں کر سکتی۔ تم کل رات تک۔۔۔ جہاں سے آئے تھے۔ وہیں چلے جاؤ۔ بس۔ اب میں تمہیں نہیں رکھ سکتی۔“

لاڈلی بیگم پر پہاڑ گرا کر اماں اپنے کمرے میں جا چکی تھیں۔

اب برتن سیٹا۔ کچن لے جا کر ان کو دھونا۔ یہ کام وہ اپنی نوکری کے فخر کی وجہ سے نہیں کرتی تھیں۔ یہ فجر کی ذمہ داری تھی۔ اور آج فجر۔ اف۔

اور اماں جان تو جب کچن میں بے ترتیبی دیکھتیں۔ فجر کی خبر لیتیں ساتھ ہی ان کو بھی سناتیں۔

”جس گھر میں رہتی ہو۔ اس کی کبھی تو دیکھ بھال کر لیا کرو۔“ یا ”اس قدر پھیلاوا۔“ کچن گندا۔ ارے کتا بھی بیٹھتا ہے تو دم سے جگہ صاف کر لیتا ہے۔ تم یہیں کرسی پر جمی بیٹھی ہو۔ نظر کمزور بھی نہیں ہے۔“ آج تو ہم گرا دیا تھا۔ میاں سے کہا۔

”اماں کو منالو۔ کیسے رہیں گے یہاں سے جا کر وہاں۔“

”سب تمہارا کیا دھرا ہے۔ ہر وقت فجر کے خلاف بکواس کر کے مجھے غصہ دلاتی ہو۔ دیکھ لیا نتیجہ۔“

”اوہو۔ بھانجی سے اگر ماموں پوچھ کچھ کر لے تو کیا گناہ ہوتا ہے؟ میں نے تو بس ایسے ہی۔“

”میں بھی خوا مخواہ غصے میں آگیا۔ تمہارے چکر میں



میرا سکھ چین ہو۔ میرا پیش قیمت ہیرا۔“  
نہ جانے اور کیا کیا کہتی رہیں۔ وہ اپنے کمرے میں  
چلی گئی اور فوراً ”واپس آئی۔ ایک سوٹ کیس کھینچتی  
ہوئی۔

”اماں جان! میں داوی کے پاس جا رہی ہوں۔ آپ  
مجھے معاف کرویں اور دعا میں دیتی رہیں۔“

اماں جان اس کے چہرے پر پختہ عزم دیکھ چکی  
تھیں۔ وہ جب کچھ ملے کرتی تھی۔ پھر مرضی کی مالک  
ہوتی وہ کھڑی ہو گئیں۔ اب وہ نہیں رک سکتی۔ شاید  
ذلت کا احساس شدید تھا۔ انہوں نے اسے گلے لگا کر  
دعا میں دیں۔

”اماں جان۔ میرا کمرہ بند ہے۔ چالی آپ کے پاس  
ہے۔ کبھی ضرورت ہو تو آپ ہی کھولیں گی۔ چالی کسی  
اور کو نہ دیں۔“ چہرے پر تمازت سی تھی۔ غصہ بے  
بسی یا تاسف۔

سڑک پر رکشے کے انتظار میں کھڑی تھی۔ تو  
آنکھیں برس رہی تھیں۔ یہ دن بھی آتا تھا، کبھی منہ  
دکھانے کے لائق نہ رہی۔ بے قصور۔ مگر قصور وار بن  
گئی۔ پتا ہی نہیں چلا کہ ایک چمکتی کالی سیاہ گاڑی آن  
رکی۔ اندر بیٹھا نوجوان کس حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ پھر  
وہ دروازہ کھول کر باہر نکلا۔

”یہاں کیا کر رہی ہو؟“ حیرت تاسف اور بے یقینی  
لہجے میں تھی۔ وہ اچھل پڑی۔ گاڑی اور اس کے مالک  
پر نظر پڑی۔ یک لخت چہرے کے تاثرات تبدیل  
ہوئے۔ شاید اطمینان کی سرخی۔

”نظر نہیں آ رہا۔ سوٹ کیس۔ جا رہی ہوں داوی  
کے پاس۔“

”اچھا مگر کیوں اکیلی پھر کوئی بھوت سوار ہوا ہے؟“  
”اکیلی نہیں تو کیا فوجیں لے کر آئی۔ اکیلی ہوں تو  
اکیلی ہی جاؤں گی۔“

”اگر۔ ایک دن رک جاتیں۔ میں کل ہی واپس  
جاؤں گا۔ ساتھ چلتے۔“ التجا تھی لہجے میں۔

”کیوں؟ تمہاری محتاج نہیں ہوں۔ ابھی ٹیکسی مل  
جائے گی۔ اسٹیشن تک کے لیے۔“

”اسٹیشن۔ چلو تھوڑی دیر کو مجھے ٹیکسی ڈرائیور  
سمجھ لو۔ آئیے بیگم صاحبہ۔“ لپک کر سوٹ کیس اٹھا  
لیا۔ اگلا دروازہ کھول کر اشارہ کیا۔ سوٹ کیس پچھلی  
سیٹ پر تینز سے رکھا۔ پھر اپنی سیٹ سنبھالی۔  
اسٹیشن پہنچ کر پہلی بار نسلی سے بات کی۔ ”کس  
سے جنگ ہوئی ہے؟“

”جنگ ہاری ہے۔ بغیر مقابلہ کیے۔ اس لیے نکل  
آئی۔ احتجاجاً راستے بھر بولتی تو رہی تھی۔  
”اپنے ٹیشن۔ اپنی پناہ گاہ سے بھی کوئی نکلتا ہے۔  
بارمان لی۔ یقین نہیں آتا۔ من مانی کا زمانہ نہیں رہا۔  
فجر حماقتیں نہ کرو۔ بہت نقصان اٹھاؤ گی۔“ دردمند  
لہجہ۔ ہمدرد انسان۔

”فتنے سے دور رہنا۔ حماقت نہیں۔ مجھے جنگ لڑنا  
نہیں آتا۔“ آنسو تو اتر سے بننے لگے۔  
ٹرین آگئی تھی۔ کھڑکی کے پاس تنہا سیٹ پر بیٹھا کر  
سوٹ کیس نیچے رکھ کر۔

اس کا سر تھپتھا کر نیچے اتر گیا۔ ٹرین چل پڑی۔  
پلیٹ فارم خالی ہو گیا۔ کزن بہت حساس ہے۔ سمجھ دار  
بھی ہے۔ گھر میں ملازمہ ملی اور۔ داوی۔  
”اماں جان۔ السلام علیکم۔“ لپٹ گیا۔

”چلی گئی، مجھے اکیلا کر کے چلی گئی۔“ باقاعدہ  
آنسوؤں کی برسات تھی۔ اثر نے ان کے بازوؤں میں  
سر ڈال دیا۔

”اماں جان، جانے دیجئے۔ آپ کو عادت ہو جانی  
چاہیے۔ آنیاں، جانیاں لگی رہتی ہیں۔ آجائے گی۔“  
نسلی دلا سا یقین سب کچھ لہجے میں سمودیا۔

”تمہیں۔؟ پتا چل گیا۔ کس نے۔“ گھبرا گئیں۔  
”اس نے خود باہر کھڑی تھی۔ میں اسٹیشن چھوڑ  
آیا۔ ٹرین میں بیٹھا کروانہ کیا۔ یعنی کہ۔“

”اچھا روک لیتے۔ تمہارے ساتھ چلی جاتی۔“  
”اچھا۔ مجھے بتائیے۔ ہوا کیا؟ محترمہ نے کچھ بتایا  
ہی نہیں۔“ دادی پوتے کو تفصیل سننے لگیں۔

دوپہر کو دادی کی پسند کا کھانا ہوٹل سے لے آیا۔



شام کے لیے نوید کے پسندیدہ پسندے بھی ایک دہی ہوٹل سے پک کر والیے۔ کھانا کھا کر دادی کی دعا میں لے کر آرام کرنے لیٹ گیا۔ دادی کے ہی ساتھ۔ وہ اس کے سر میں انگلیاں چلاتی رہیں۔ بہت لطف آ رہا تھا۔ نیند بھی آئی کئی گھنٹہ نہیں نیند۔

پھر ناگوار سی کھٹ پٹ پر آنکھ کھل گئی۔ لاڈلی بیگم کی آمد کا فائدہ بجا تھا۔ وہ اٹھ کر ان کے سامنے آ گیا۔ اور انہیں سلیوٹ کیا۔ ہنس پڑیں۔ خوشی سے دانت باہر آ گئے۔

”اوہو بھئی، میری ترقی ہو گئی ہے کیا؟ یہ سلیوٹ کس سلسلے میں۔“ مذاق کی عادت تھی اثر کی۔

”زبردست معرکہ سر کیا ہے آپ نے۔ سلیوٹ تو واجب ہوا۔ بلکہ توپوں کی سلامی دینی تھی۔ مگر سردست میرے پاس اس کا انتظام نہیں۔ چلیں آئندہ کسی معرکہ پر سہی۔“

”ارر رے۔ بھئی ایسا کیا کر دیا میں نے کہ۔ مجھے بھی خبر نہیں۔“ باپ چھین حد سے باہر تک چر گئیں۔ چہرہ سکر گیا۔ آنکھیں میچ گئیں۔

”فجر کو گھر سے نکالنے کی منصوبہ بندی کامیابی سے ہمسکار ہوئی۔ ذہن رسا کو داد نہ دوں؟ پھر زیادتی ہوگی۔ سلیوٹ تو واجب ہوا۔“ تسخرانہ مسکراہٹ اثر کے چہرے پر پھیل چکی تھی۔

انہوں نے ہونٹ پن سے اماں جان کی طرف جھانکا۔ وہ نیچے جھکی ہوئی اپنی چپل تلاش کر رہی تھیں۔ لاڈلی بیگم نے وہاں سے ٹل جانا مناسب سمجھا۔ تعجب نہ تھا کہ اماں کی چپل اڑتی ہوئی آئے اور عین ان کے چہرے پر ٹھک سے جا لگے۔ پچکی ہوئی ناک مزید پچکنے کی گنجائش نہ رکھتی تھی۔ اپنی ناک ٹوٹتی ہوئی وہ اپنے کمرے میں جا گئیں۔ فجر کی نانی کے رشتے کی مناسبت سے وہ کچھ بھی کر سکتی تھیں۔

اماں جان اپنی اور مہمان پوتے کی چائے بنا لائیں۔ دونوں کیک اور چائے میں مگن باتیں کر رہے تھے۔ نوید اور لاڈلی کی بند کمرے میں زوردار جھڑپ سے چونکے۔ نوید کو آتے دیکھا نہیں تھا۔

”جو ہے۔ وہ مجھے ہی سنا دیتا ہے۔ ہر بات کا الزام مجھ پر۔ واہ بی واہ۔ پوچھیں تو جا کر بیٹھے سے اور اگر وہ مجھے عزت نہیں دے سکتے۔ ذلیل کرنے کا بھی حق نہیں ہے۔ کرے کوئی بھرے کوئی۔“

”اچھا۔ اب چپ ہو جاؤ۔ باہر تک آواز جا رہی ہو گی۔“ نوید دبی زبان سے کہہ رہے تھے۔

”واہ کمال ہے۔ میں ہی چپ ہو جاؤں۔ سب مجھے ذلیل کیے جائیں۔ آپ نہ کچھ پوچھیں گے نہ کریں گے۔“

”تو اب اس گھر سے چلے ہی جائیں گے۔ نہ یہاں رہیں نہ کوئی ذلیل کرے گا۔“

”واہ یہ آپ کے گھر کا اچھا انصاف ہے۔“ تملتا رہی تھیں۔

”انصاف تو دنیا میں رہا ہی نہیں اماں جان۔“ اندر اثر دادی سے شکوہ کر رہا تھا۔ ”لوگ تو مجھے دادی کا لاڈلا کہتے ہیں۔ حالانکہ رہتا تو نانی کے ساتھ ہوں۔ مگر کوئی لاڈلا تو آسا نہیں کہتا۔ افسوس۔“

دادی اسے پیار سے دیکھ رہی تھیں۔ وہ ان کا لاڈلا کبھی نہیں رہا۔ حالانکہ اکلوتا پوتا تھا اور چند دن پہلے والے پوتے کو دیکھا تک نہ تھا۔ مگر بہار تھا کہ اندر پڑتا تھا۔ دراصل اثر تو نانی کے گھر رہتا تھا۔ انہیں اس کا ملال تھا۔ اور اپنی کسمپرسی کی مجبوری۔ لیکن یہ بات وہ کسی پر ظاہر نہیں کر سکتی تھیں۔ البتہ ناراضی۔ خفگی شکوہ کرتی رہتی تھیں۔

جب ان کا بڑا بیٹا۔ ایک حادثے کا شکار ہوا۔ جوان بیٹے کی موت، ناگہانی سانحہ، بہو بھانجی تھی۔ عدت کے بعد بچے کو لے کر میکے چلی گئی اور پھر اس کے والدین نے اس کی شادی بھی کر دی۔ جو اماں جان کے لیے دو سرا حادثہ تھی۔ بہو، نہ بہو رہی۔ نہ بھانجی۔

وہ اس سے خفا ہو گئیں۔ بہن کو چھوڑ دیا۔ بہو بچے کو لے کر نئے شوہر کے ساتھ دو بی بی چلی گئی۔ دو بی بی سے آتی۔ تو بچے کو دادی سے ملوانے لاتی۔ وہ بھانجی سے بے رخی برتنے لگیں، ساتھ ہی بچے کو بھی نظر انداز کرتیں۔ ہاں کبھی اکیلا نظر آتا تو کلیجے سے لگا لیتیں۔



# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو پیسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریزیوم ایبل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✧ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

**We Are Anti Waiting WebSite**

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

# WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on  
Facebook

[fb.com/paksociety](https://fb.com/paksociety)



[twitter.com/paksociety1](https://twitter.com/paksociety1)



آنسو بہا کر اس سے محبت کا اظہار کرتیں۔ لیکن وہ بہت چھوٹا تھا۔ نا سمجھ بچہ پھر ستم ایسا ہوا کہ انہیں کئی سال دوری سہی پڑی۔

بھانجی کا شوہر امریکہ چلا گیا۔ کئی سال بعد آتا ہوا۔ تو پھر بھانجی اسے لائیں۔ اس کے بعد۔ انہوں نے بھانجی سے ملنے سے انکار کر دیا۔ بھانجی جو کبھی بہو تھی۔ ان کے لیے غیر ہو گئی۔

پھر ان کی دعا میں قبول ہو گئیں۔ پوتا۔ ثانی کے پاس رہنے لگا۔ کیونکہ وہاں تعلیم کی نسبتاً زیادہ سہولت تھی۔ امریکہ آنا جانا بھی لگا رہا اور ثانی کے گھر سے داوی سے ملنے بھی آتا رہا۔ لیکن پیاس، پیار کی مامتا کی پیاس نہ بجھی۔

اب چند سال سے مستقل لاہور ہی میں رہ رہا تھا۔ چھٹیوں میں داوی کا پیار و وصول کرنے آتا تھا۔ ماں اور چھوٹی بہنوں سے ملنے امریکہ بھی جاتا تھا۔ غرض کئی حصوں میں تقسیم شدہ۔ مگر ہر کسی سے انصاف قائم رکھتا۔ حالات نے بے حد حساس اور دردمند بنا دیا تھا۔ اپنی زندگی کی اکھاڑ پچھاڑ نے اسے کبھی مایوس نہیں کیا۔ بگاڑا نہیں۔ سنوار دیا۔ حد سے زیادہ ضبط، برداشت، امید اور یقین زندگی میں شامل ہوتے گئے۔ اس کے علاوہ قصہ و فراست نے بھی مزاج میں دخیل ہو کر اسے آہنی انسان کا روپ دے دیا۔ سچا کھرا اور مضبوط کردار۔

فجر اور اس کی زندگی کے حالات کافی مماثلت رکھتے تھے۔ وہ اثر کے سگے ماموں، سگی پھوپھی کی بیٹی تھی۔ یہی رشتہ فجر کا اثر سے تھا۔ فجر کے والدین بھی اس کے بچپن میں فوت ہو گئے تھے۔ اس کی عمر داوی کے پاس گزر رہی تھی۔ وہ بھی ثانی سے ملنے کبھی تو اثر کے ساتھ ہی آجاتی تھی۔ اثر اس کے بڑے بھائی کا سارویہ رکھتا۔ فجر کو پابندی۔ نصیحتوں کی کبھی پروا نہ رہی وہ اپنے دل کے اشاروں پر چلتی تھی۔ اثر اسے سمجھاتا۔ ”دلغ اللہ نے دیا ہے۔ اس سے بھی مشورہ کر لیا کرو۔“ لیکن وہ۔ فوری عمل کو ترجیح دیتی۔ ادھر ڈھالی سال سے وہ ثانی کے پاس ہی آگئی تھی۔ ثانی نے ہی

تقاضے کر کے بلوایا تھا۔

فجر کے ثانی نے وفات سے پہلے اپنی جائیداد کا ہٹوارہ کر دیا تھا۔ دونوں بیٹوں کو ان کے شرعی حصے دینے کے بعد بیٹی کے لیے مکان چھوڑ دیا اس وصیت کے ساتھ کہ فجر ماں کی جائیداد کی وارث ہوگی۔ فجر اب بلوغت کی عمر کو پہنچنے کے بعد اس گھر کی مالک تھی اور ثانی چاہتی تھیں وہ آئے اور اپنا گھر آباد کرے۔

نوید نے اپنا حصہ شوق عاشقی میں ادھر ادھر گنوا دیا۔ سعد قیملی کے ساتھ آسٹریلیا جا بے۔ وہاں ایک اسٹور قائم کر لیا۔ چار بیٹیوں کے بعد اب بیٹا پیدا ہوا۔ نوید نے کسی کم حیثیت گانے والی لڑکی سے عشق کا چکر چلایا۔ وہ گھر سے باگ آئی۔ مجبوراً ”شادی کرنی پڑی۔ یہ ان کا آخری عشق تھا۔ ابھی تک تو۔“

فجر میں بھی برداشت کا مادہ تو تھا مگر اس کا استعمال گوارا نہ تھا۔ اب اس بار نہ جانے کون سی چوٹ کھائی تھی۔ شکوہ نہ شکایت روانہ۔ جسمانی چوٹوں کی تو اسے زیادہ پروا ہوتی نہ تھی۔ لیکن کہاں چوٹ لگی تھی کہ گھر سے نکل گئی۔ اثر نے سب قصہ سن کر اس کی چوٹ کو اپنے دل پر لے لیا۔ اسے بھی شدید زخم لگا تھا۔ جڑے کی رگیں ابھر آئی تھیں۔ آنکھیں بند کر کے اذیت برداشت کر لی۔ اب داوی کو باتوں میں لگا رہا تھا۔ بہت فکر مند تھیں وہ نوید نے آکر خوش دلی سے بھتیجے کا حال پوچھا۔ ”کدھر بھئی۔ شہزادے۔“ ہاتھ ملایا۔

لاڈلی بیگم بھی منہ پھلائے باہر آئیں۔ چائے کی خالی پیالیوں پر نظر جم گئی۔ ”اماں! فجر کا مزاج صحیح ہو گیا؟ چائے تو بنو ایسے۔“ سرسری لہجے میں بولے تھے۔ ”آپ کی بیگم چائے بھی نہیں بنا سکتیں؟“ اماں سے پہلے پوچھا گیا۔

”وہ تو چلی گئی۔ اپنے لیے میں نے بنالی تھی۔“ اماں نے آرام سے کہا۔ لاڈلی بیگم سرخ ہو گئیں۔

نوید کو لاڈلی نے اصل کہانی سنائی نہ تھی۔ وہ حیرانی سے بولے۔ ”ک کہاں۔ چلی گئی۔“



”کیس بھی چلی گئی۔ تمہارے لیے اتنا کافی ہے۔“  
 ”اور آپ نے روکا بھی نہیں۔ یعنی کہ پھر۔ اکیلی  
 کیس بھی چلی گئی اور آپ ایسے کہہ رہی ہیں۔ جیسے ہمت  
 پر گئی ہے آجائے گی۔ کب گئی اور کہاں؟“  
 ”صبح تمہارے جانے کے بعد۔“

”ہائیں۔ صبح کچھ کچھ تو آپ کو بتا کر گئی ہوگی۔  
 دیکھا یہ حال ہے خود سری کا۔“ انہوں نے اب اثر کی  
 طرف منہ کیا۔ ”بے باکی اور۔ اماں کا خیال ہے سب  
 نے اس پر ظلم کیا۔ بتایا ہو گا اماں نے لڑکی ذات کو  
 کنٹرول میں رکھنا چاہیے۔ زمانہ خراب ہے اور میں  
 نے صرف بال ہی پکڑے تھے۔ اس نے ایسا دواؤں کا کیا  
 جیسے میں اسے قتل کر رہا ہوں۔ پوچھنا نہ جائے کہ کہاں  
 گئی تھیں۔ کس سے ملنے۔ میں نے اپنا فرض ادا کیا  
 تھا۔ کیا برا کیا؟“

”میرا خیال ہے چچا! یہاں آپ ایک سال پہلے  
 آئے ہیں۔ اس سے پہلے۔ آپ کو کسی فرض کا  
 احساس نہ تھا۔ ماں کا نہ بھانجی کا اور وہ تو بیس سال سے  
 اسی دنیا میں ہے۔ پہلے کسی فرض کا خیال کیوں نہ آیا  
 آپ کو؟“

”لہجے میں تنیدی۔ الفاظ میں برفانی تو دے جیسی  
 ٹھنڈک۔ لہجہ بھر کو جم گئے۔ مگر اپنی صفائی دینی تھی نہ  
 جانے اماں نے کسی پیرائے میں بیان کیا ہو گا۔  
 ”میں تمہیں بتاتا ہوں۔ ہوا کیا۔ اب یہ تو نہیں ہو  
 سکتا کہ میں دیکھوں اور پوچھوں۔ میں گھر آیا۔ وہ موجود  
 نہ تھی۔ انہوں نے از سر نو واقعہ بتایا۔ لاڈلی بیگم کو گول  
 کر گئے۔“

”اور اب سن رہا ہوں کہ پھر وہ کیس چلی گئی۔ اماں  
 موجود۔ اسی طرح لڑکیاں گھر سے۔“  
 ”تو اب آپ کس سے جواب طلبی کریں گے؟  
 آپ کی سمجھ میں نہ آئے تو لاڈلی بیگم سے معلومات  
 لے لیں۔ ان کو تو خاصا تجربہ ہے۔ گھر سے بھاگنے کا۔“  
 لاڈلی بیگم چلانے لگیں۔ نوید گھبرا گئے۔

”تم اندر جاؤ۔“ بیگم سے کہا۔ وہ بھلا کب سنتی  
 تھیں۔ عام حالات میں بھی۔

”واہ میں کیوں اندر جاؤں سب کے تیر مجھ پر  
 برسیں۔ میں نہ بولوں اور وہ جو شریف زادی کا رنامہ  
 انجام دے کر گئی ہیں۔ انہیں تخت پر بٹھادیا جائے۔“  
 نوید کی آنکھ کا اشارہ بھی نہیں سمجھا۔ مزید گویا ہوئیں۔  
 ”اور۔۔۔ وہ بد تمیزی بھی سنائیں۔ جو کہہ رہی تھیں  
 کہ لاڈلی بیگم کو چوکیدار مقرر کر دیں۔ تنخواہ وہ دے  
 دیں گی۔“ اثر کو اطلاع دی۔

”تو بالکل درست کہا۔ اس میں غلط کیا ہے؟ آپ  
 کی اسکول کی تنخواہ سے چار گنا تنخواہ دے سکتی ہے۔  
 آپ کو علم تو ہو گا۔ آپ کی ایک سال کی تنخواہ سے  
 زیادہ اس کی ماہانہ انکم ہے۔“

”تو۔۔۔ تو اس کا مطلب کہ کسی کو کچھ بھی سناوے۔  
 چھوٹے بڑے کی تمیز بھی تو آخر آ۔۔۔“ کمزور لہجہ۔

”بے شک ہونا چاہیے۔ جب گھر کے بڑے اپنے  
 وقار کا بھرم نہ رکھ سکیں۔ تو چھوٹوں کو بھی تمیز نہیں  
 رہتی۔ آخر کچھ تو وہ بڑوں سے ہی ہیں۔“

”لو جی۔۔۔ کل ہی مک گئی۔ بری ہو گئیں ہر الزام  
 سے اور جو۔“ وہ پھر چراغ پا ہوئیں۔ میاں کی انگلی کا  
 اشارہ نظر انداز کر دیا۔ ”صبح سے غائب ہیں۔ تو کل کچھ  
 ملے کر کے ہی آئی ہوں گی بہانا مل گیا۔ اب کہہ دو۔ کہ  
 میں نے گھر سے بھگایا ہے۔ لگا دو الزام۔ کون زبان  
 پکڑے گا۔“

”شریفوں میں بہتان تراشی بہت بڑا جرم سمجھا جاتا  
 ہے۔ میں آپ پر الزام کیوں لگاؤں گا؟ آپ کو تو پہلے  
 ہی سے یہ طریقے آتے ہیں۔“ بے رحمی سے دانت  
 پیس کر کہا۔ بھنا گئیں۔ مگر۔

”تو۔۔۔ پھر بھی پتا لگانا چاہیے۔ کہاں گئی گھر چھوڑ کر  
 پولیس میں اطلاع کریں۔“ ”میاں سے فرمائش کی۔  
 ”کس لیے؟“ اثر نے از حد حیرت ظاہر کی۔

”یہ معلوم کرنے کہ کس کے ساتھ۔ یعنی کہ کوئی  
 غلط فائدہ بھی اٹھا سکتا ہے۔“

”میں کیوں غلط فائدہ اٹھاؤں گا اس نے کہا۔ دادی  
 کے پاس جانا ہے۔ میں اسٹیشن لے جا کر ٹرین میں بٹھا  
 آیا۔ کچھ چکی ہیں محترمہ فون آ گیا ہے۔ چھوٹے چچا!



آپ نے مجھے شکوہ ہے۔ آپ کی اخلاقی گراؤٹ۔  
چند سال گھر سے باہر نہ گرا تھی بڑھ گئی ہے۔ ایک پاک  
باز لڑکی پر الزام لگا کر تشدد کرنے پر کیسے جی چاہا۔ آپ کو  
اپنے خاندانی خون پر اعتبار نہ آیا۔ اپنے خالص خون کا تو  
احساس کر لیتے۔ گھر نے خود آپ کو بلا کر گھر میں رکھا  
تھا۔ اگر آپ سے جواب طلبی نہ کی گئی۔ تو اسے آپ  
نے اپنا اعزاز سمجھ کر قبول کر لیا۔ افسوس۔“  
پہلا فقرہ حیرت۔ اگلی بات نصیحت، تاسف نوید  
منمنانے لگے۔

”وہ بس لاڈلی نے اس طرح سے۔۔ میں گھر ڈھونڈ  
رہا ہوں۔ اماں نے کہا ہے۔ میں ایک دو دن میں۔۔ گھر  
ملنے ہی چلا جاؤں گا۔“

”کیوں۔ آپ کی سسرال میں کیا ایک کمرہ بھی نہیں  
ہو گا آپ کے لیے۔ وہی لوگ تو ہیں آپ۔“  
”میرے ماں باپ نے میرا اور نوید کا ٹھیکہ نہیں لیا  
ہے۔ شادی کا فائدہ ہی کیا۔ جب لڑکی میکے میں جا  
ڑے۔“ لاڈلی بیگم چپ رہنا جانتی نہ تھیں۔ اثر کی رخ  
گوئی کی اہمیت نہ تھی۔

”ماں باپ کبھی ٹھیکہ نہیں لیتے۔ مگر آپ نے  
انہیں موقعہ دیا ہی نہیں۔ خود ہی نکل پڑیں۔ تعجب  
ہے انہوں نے پولیس سے مدد نہیں لی۔ جس طرح آئی  
تھیں۔ اسی طرح چلی جائیں گی تو وہ خوش ہوں گے  
یقین سے مجھے۔ آپ کو وہاں جگہ مل جائے گی۔“

اثر فجر رگزی واردات کا بدلہ لے رہا تھا۔ وہ تن  
فن کرتی کمرے میں گھس گئیں۔ اثر نے کہا۔

”چچا آپ کہیں نہیں جائیں گے۔ اماں جان کو  
آپ کی۔ آپ کو اماں جان کی ضرورت ہے۔ فجر کا غصہ  
کم ہو گا۔ تو آجائے گی۔ آپ اپنا فرض سمجھ کر اماں  
جان کی خدمت کریں اور لاڈلی بیگم کو لگام دیں۔ جب  
تک وہ خود دو سروں کی عزت نہیں کرنا سیکھیں گی۔  
کوئی ان کی عزت نہیں کرے گا۔ اپنے رشتے آپ کو  
نہاٹنے ہیں۔ ان کی سروس چھڑا دیں۔ آپ خود ان کو  
مناسب رقم دے دیا کریں۔ میں آپ کو۔ بھیج دیا  
کروں گا۔“

چچا کی سمجھ میں آ تو گیا۔ مگر لاڈلی کو کون سمجھائے۔  
لیکن فجر کے جانے کے بعد اماں کی تنہائی کا بہانہ موجود  
تھا۔ جانے سے پہلے ایک بار پھر چچا کو نصیحت کی کہ وہ  
آنکھ بند کر کے لاڈلی بیگم پر انحصار نہ کر لیا کریں۔ ان کی  
وجہ سے خاندان میں آپ کی بہت بے عزتی ہو چکی  
ہے۔ اب عزت کو سنبھالیں۔ انہیں بھی اخلاق کا  
سبق دیں۔ اماں جان کی عزت اور خدمت آپ دونوں  
فرض سمجھ کر کریں۔ آپ کا تو حق بھی ہے فرض بھی  
اور آپ کو اماں جان کی دعاؤں کی بھی بہت ضرورت  
ہے۔ جتنا خسارہ ہو چکا۔ اب ماں کی ممتا کے سائے تلے  
فائدے حاصل کریں۔“

نوید اثر کی فہم و فراست کے قائل تھے ہی۔ اب  
بزرگانہ انداز پر بہت خوش ہو گئے۔ فائدہ  
”اماں جان۔ بڑے چچا کا حال سنائیں۔“ رات کو  
وادے کے پاس لیٹ کر باتیں شروع ہوئیں۔ ”میں ان  
سے ملا تھا۔ بہت مصروف تھے۔ ہاں چچی کھانا بہت عمدہ  
بناتی ہیں بچیاں۔ بہت پیاری ہیں۔ پریاں لگتی ہیں۔“  
”ارے ہاں خوش خبری سنانا بھول گئی۔ سعید کے  
ہاں بیٹا ہوا ہے۔ یا سرنام رکھا ہے میں نے۔“  
”ارے اچھا بوڑھا پے کی اولاد۔ چچا تو اس کے دادا  
لگتے ہوں گے۔ سفید بال ہو گئے ہیں سارے۔“  
”ارے اللہ نہ کرے۔ میرا بیٹا بوڑھا کیوں ہونے  
لگا۔ بالوں کا کیا ہے نزلے سے سفید ہو گئے ہوں  
گے۔“

”اچھا پھر بوڑھا کیسا ہوتا ہے؟“

”میرے جیسا۔“ اماں جان تڑپ گئی تھیں بیٹے  
کے برہائے کاسن کر۔

اثر نے اٹھ کر ان کا چہرہ اپنی گرم ہتھیلیوں کے  
پالے میں لے لیا۔ ”یہ بوڑھا چہرہ تو نہیں۔ معصوم  
بچے کا چہرہ ہے۔“

”چل ہٹ۔“ شرمائیں۔ ”ارے یہ تو بتا کوئی  
شادی وادی کا بھی ذکر ہے۔ یا بس۔ نکاح کافی ہے۔  
میری زندگی میں تمہارا گھر بس جاتا۔ میں پھر تمہارے  
گھر پر ہی آپڑوں کی یاد رکھنا۔“



”زندہ باد۔ اماں جان۔ میری دلی تمنا ہے۔ میں آپ کو ابھی لے جاتا۔ مگر آپ اکیلی کیسے رہیں گی۔“  
 ”کہہ دیاں۔ رخصتی کرا لو۔ آجاؤں گی ہائے موقع نکل گیا۔ اگر تو تم کل آجاتے۔ جیسے میرے بغیر نکاح ہوا ہے۔ میں ان سب کے بغیر رخصتی کر دیتی۔ ایک پتھرو کلج ہو جاتے۔“

”اور اماں جان۔ وہ کیا مثل ہے ینگ لگے نہ پھٹکری رنگ چوکھا۔ مگر افسوس دیر کر دیتا ہوں میں۔“



فجر کو توقع نہ تھی۔ مگر اسٹیشن پر عباد اور حماد موجود تھے۔ اثر نے انہیں اسٹیشن سے ہی فون کر دیا تھا۔ بوگی نمبر بتا دی تھی۔ سامنے ہی تھے۔ دونوں نے قد نکال لیے تھے۔ گھر پر پتیاک خیر مقدم ہوا۔ عشا کی چچ نکل گئی۔

”ہائے اپا۔ بل۔ اتنے گھنے لمبے بالوں کا کیا حشر کر دیا۔“

”بھئی۔ آج کل یہی فیشن چل رہا ہے۔ درمیان سے تھوڑے تھوڑے نکال دیے ہیں۔ گھنے تھے نا۔ میں تو بوائے کٹ کر رہی تھی۔ اماں جان نے اس قدر وہائیاں دیں کہ بس افوہ۔“

چچی نے شام تک بغور معائنہ کیا اور اعلان کیا۔ ”فجر تو ویسی ہی ہے جیسی تھی۔ بدلی نہیں۔“

”کیا دو ڈھائی سال میں بدل جانا چاہیے تھا؟“ وہ حیران ہو گئی۔

داوی کی پر شفقت آغوش ہمیشہ کی طرح محبت کی حرارت سے لبریز تھی۔ بہت بے تلبی سے بہن کا حال پوچھا۔ نوید کا۔ فجر ہمیشہ ان بہنوں کی جدائی خفگی کا سبب اماں جان کو گردانتی تھی۔ جو ضدی بھی تھیں۔ صرف شکوے کو انا بنا لیا۔ شنو پھپھو کی شادی کو قبول ہی نہیں کیا۔ آخر وہ کب تک بیوگی کی زندگی گزار تیں۔ صرف اماں جان کے پوتے کی خاطر ان کے ساتھ زندگی گزار تیں۔ مگر داوی نے سر د آہ کے ساتھ کہا۔

”نہیں ضدی نہیں۔ وہ شنو کی عاشق تھی۔ بہو نہیں بیٹی کی طرح سنبھالا تھا۔ شنو کی ہر خواہش پوری کرتی تھی۔ میں جانتی ہوں۔ اسے صدمہ ہوا تھا۔ بہو نہیں بیٹی بن کر اس کے پاس رہتی اور وہ خود اس کی شادی کرتی۔ ہم لوگوں سے غلطی ہو گئی۔ اس کی بے پایاں محبت کا خیال کر کے شادی چپ چاپتے کر دی۔ پھر وہ دوسری چلی گئی۔ تو اسے شدید دکھ ہوا۔ میری بہن۔ بہت بھروسہ تھا اسے شنو پر۔ بس اب میری بھی ہمت نہیں کہ جا کر اس سے معافی مانگوں ناراضی مجھ سے ہی ہے۔“

داوی غمگین تھیں۔ فجر نے انہیں لپٹا لیا اور اماں جان کے قصے سنا کر ہنسا بھی دیا۔



صبح سفینہ پھوپھو کی آمد۔ غیر متوقع فجر کو چٹ گئیں۔ پیار دلا سے وہ جھینپ گئی۔ تالی کے گھر جانے سے پہلے پھوپھو سے جو منہ ماری ہوئی۔ یاد آگیا۔

”سوری پھوپھو!“

”کس بات کے لیے؟“

”میں نے آپ سے بد تمیزی کی تھی۔“

”لو رات گئی بات گئی میں دل میں کینہ نہیں رکھتی۔ اور تم تم تو میری پیاری بھینجی ہو۔ اچھا خالہ کا حال سناؤ۔ کیسے آئے دیا تمہیں۔“ وہ واقعی صاف دل تھیں۔

”بس آگئی اور اماں جان کا پوتا ہوا ہے آسٹریلیا میں۔ بہت خوش ہیں۔ گانے گاٹی پھرتی ہیں۔ اسے زچہ گیری کہتی ہیں اور کیا گانا ہے کہ بہن نیگ میں نہ تو جھوم رہتی ہے۔ نہ بھا بھی کا باؤلا بھائی۔ بلکہ ایک گاؤں لے کر چل پڑتی ہے جیسے گاؤں کوئی برگر ہو۔ میں نے کہا۔ میں ماموں سے نیگ میں گاؤں مانگ لوں۔ تو خفا ہو گئیں کہا کہ پاگلوں کے سر پر سینگ نہیں ہوتے۔“

سب ہنسنے لگے۔

”گاؤں کیا۔ مجھے کوئی بکری دے تو نہ لوں۔ ہاں بھئی۔ بکری کا کیا بھروسہ۔ سینگ ہی مار دے۔“



چچی نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔ اس پر قہقہہ پڑا۔  
 ”ارے لاڈلی بیگم کا حال بتاؤ۔ نوید۔ خوش ہیں۔“  
 سفینہ پھوپھو کا شوق بھر اسوال۔

”ہاں لاڈلی بیگم بھی۔ جا ب کرتی ہیں اسکول میں۔  
 تنخواہ ملنے سے پہلے شاپنگ کارڈ گرام بناتا ہے۔“  
 ”اچھا پڑھاتی ہیں کیا؟ تنخواہ کتنی ملتی ہے بھلا؟“  
 ”کتنی ہیں چھ ہزار ملتے ہیں۔“ فجر جواب دینے کی  
 پابند تھی۔ داوی کی ناگواری ظاہر ہونے کے بعد بھی۔  
 ”اے سہ۔ چہرا سن ہوگی پھر۔“ سفینہ پھوپھو نے  
 پُریقین لہجے میں کہا۔

”مگر شاپنگ وہ چندرہ ہزار کی کر لیتی ہیں اسی تنخواہ  
 میں۔“ فجر نے فخریہ انداز میں بتایا۔

”اچھا۔ جاو بھی آتا ہے؟“ داوی نے پھر سفینہ پھوپھو  
 کو تنبیہا گھورا۔

”ہاں ماموں زندہ باد۔“  
 ”بری بات ہے بیٹا۔ کسی کی ٹوہ لیتا۔ جستجو کرنا گناہ  
 ہے۔ غیبت میں شمار ہوتا ہے۔ چھوڑوان کے قصے۔“  
 آخر داوی نے دخل دینا مناسب جانا۔ ورنہ۔ ”اپنی ٹانی  
 جان کی بات کرو۔“

”ہاں بھئی ہماری اماں کو تو بس اپنی بہن کی باتیں ہی  
 سننی ہوں گی۔ اچھی اچھی۔“

فجر ٹانی جان کی تعریف میں پوری کتاب لکھ سکتی  
 تھی۔ بیان کرنا تو اور بھی آسان تھا شروع ہو گئی۔

”ویسے تو دن بھر بڑھاپا طاری رہتا ہے۔ ہائے ہڈی  
 میں درد ہے۔ ارے گھٹنا رہ گیا۔ اوئی کندھے بیکار ہو  
 گئے۔ گکوڑی انگلیاں ہیں کہ بانس کی کچھی۔ بچی ذرا زور  
 لگا کر دبا دے ہائے کمر بھی۔ اور بچی کا کام یہی ہے کہ  
 صبح سے سہ پہر تک دبائی سہلاتی رہے۔“

”ہاں تو بڑھاپا تو۔ خدمت کرنی چاہیے تمہیں۔  
 اولاد ہوتی کس لیے ہے؟“

”کرتی ہوں خدمت اور میرا کام ہی کیا ہے۔ کچن تو  
 نور اں سنبھالتی ہے یا وہ خود۔ جوں ہی پتا چلا کہ سبزی بنی  
 ہے۔ بیٹے کے آنے سے پہلے درد ہڈیاں بڑھاپا بھول

بھال کے۔ پہنچ گئیں کچن میں۔ مرغی بھونی جا رہی  
 ہے۔ میٹھی چٹنیاں مرے بنائے جا رہے ہیں۔ حلوہ  
 ضرور بنے گا۔ بہانہ ماموں کا۔ خود بھی کم شوقین نہیں  
 ہیں۔ حلوے کے بغیر۔ اونہوں کھانا ہی کیا۔ جس کے  
 ساتھ بیٹھنا نہ ہو۔“

سب ہنس رہے تھے۔ انداز بیان بہت دلچسپ تھا۔  
 ”اچھا کرتی ہے۔“ داوی پیار سے بولیں۔ ”چلتی  
 پھرتی رہے۔ کسی کی محتاج تو نہیں ہوتی۔ طاقت بھی  
 کھانے پینے سے آتی ہے۔ اور عادت بھی ہے ساری  
 عمر کام کرنے کی۔ خالی کبھی بیٹھتی نہیں تھی۔“

”تو کچن میں سمجھتے ہی سمجھتے کیوں سناتی ہیں کہ جوان  
 جہان مسٹنڈی نو اسی کے ہوتے ہوئے مجھے ناتواں کو کفگیر  
 چلانا پڑ رہا ہے۔ بھئی میں کیوں کروں۔ کروائیں اپنی  
 لاڈلی بیگم سے۔“

”لاڈلی سے کیوں۔ ارے بابا وہی سدا کی۔ صفائی  
 کا تو مراق ہے اے جوانی سے گندگی برداشت نہیں۔  
 ہر کسی کا اعتبار نہیں کرتی۔ اس لیے تم سے چاہتی  
 ہے۔ بیٹا کرو یا کرو۔ تم بھی سیکھ لو گی۔“

چچی کو ایک دم کچھ خیال آیا۔ ”ارے فجر یہ اثر کتنے  
 دن کے لیے گیا ہے وہاں؟“

اس نے نظر چرا لیا۔ ”پتا نہیں میری تو۔ کوئی بات  
 نہیں ہوئی۔ میں تو باہر نکل رہی تھی۔ تو۔“

سفینہ گھر جانے لگیں تو فجر نے کہا۔ ”پھوپھو اقصیٰ  
 سے کہہے۔ یہاں آئے۔“ ڈرتے ڈرتے زبان کھولی۔

”وہ بیوٹی پارلر سے شام کو آتی ہے۔ تم ہی آجاؤ۔  
 آج حاکل۔“ لاپرواہی سے دعوت دے ڈالی۔

ان کے جانے کے بعد چچی نے بتایا۔ ”اقصیٰ  
 بیوٹیشن کورس کر رہی ہے۔ بیوٹی پارلر کھولے گی اپنا  
 اور ہاں اس کی بھی شادی طے ہو گئی ہے۔ حمزہ کی  
 بھی۔“

”اچھا پھوپھو نے بتایا نہیں مبارکباد دے دیتی۔“  
 وہ سناٹے کی زد سے نکلنے کی کوشش کر رہی تھی۔ کیا  
 ہو گیا۔ دل میں کوئی کانٹا چبھا۔ یا کچھ عجیب ہوا۔



پھپھواتنی بڑی خبر کیوں نہ سنا سکیں۔ یہاں وہاں کی باتیں اور اپنے گھر کی بات۔۔۔ بے چینی دور کرنے باہر نکلی۔ لان میں عباد حماد کرکٹ کھیل رہے تھے۔ حماد نے گیند فخر کو دی۔

”آپ ہی اسے آؤٹ کر لیں۔ میں تو تھک گیا ہانگ کر کے۔“

فخر نے بے دلی سے گیند وکٹوں کی طرف دے ماری۔ وکٹیں اڑ گئیں۔ عباد ناراض ہو کر بلا پھینک کر اندر چلا گیا۔ وہ ارے ارے کرتی رہ گئی۔

”تم نے خوا مخواہ مجھے بال پکڑا دی۔ خفا ہو گیا عباد۔“ ایک تو اس گھر کے لوگ خفا بھی جلدی ہو جاتے اور مٹانے پر بھی نہ مانتے۔ ”اب بھلا کیسے مٹاؤں اسے۔“

”کیوں پریشان ہو رہی ہیں۔ اسی لیے میں نے آپ کو بال دی تھی۔ مجھ سے آؤٹ نہیں ہوتا تھا۔ کبھی تو بال کہہ کر کبھی ایکشن صحیح نہیں کہہ کر جما ہوا تھا۔ سچری کرنے والا تھا کہ آپ نے ننانوے پروکٹیں اڑا دیں۔ ویسے اندر کی بات بتاؤں تھک گیا تھا۔ اس لیے خفا ہونے کا ڈھونگ رچا کر بھاگ گیا۔“ حماد مطمئن تھا۔ اندر آتے ہوئے اس نے سنا۔ دادی کہہ رہی تھیں۔ سفینہ کی عقل کو کیا کہوں۔ لوتاؤ فخر کو گھر آنے کی دعوت دے گئی۔ بیٹے کا جنون نہیں جانتی۔ اگر فخر نے جانے کا کہا تو میں ساتھ جاؤں گی۔ یا تم۔“

”اماں بی اثر کو آنے دیں۔ پھر دیکھتے ہیں وہ کیا کہتے ہیں۔“ چچی نے مشورہ دیا۔

اثر دادی سے ملنے گیا تھا۔ ابھی آیا نہیں پتا نہیں میرے بارے میں اماں جان سے کیا باتیں کی ہوں گی۔ اماں جان مجھے یاد تو کرتی ہوں گی۔ اور حمزہ، حمزہ سنا تھا کہیں چلا گیا ہے۔ پڑھنے۔ اب پھر۔

اقصی سے فخر کی دوستی قریبی رشتے داری کے علاوہ کلاس فیلو، ہم عمر، حمزہ کا بھی یہی معاملہ تھا۔ دونوں بہن بھائی تقریباً روز آجاتے۔ لان میں کرکٹ لاؤنج میں کیرم۔ دادی کے کمرے میں تاش۔ حس میں دادی بھی شریک ہوتیں۔ چچی کے کمرے میں ڈرامہ ہوتا۔ خوب لواکاری کے جوہر دکھائے جاتے۔ ہمیشہ حمزہ ہیرو

۔ فخر ہیروئن ہوتی حمزہ ڈرامے کا مصنف اور ہدایت کار ہوتا۔ چچی بھی ان کے ڈرامے میں کسی نہ کسی کردار میں موجود۔ فخر ڈرامے میں ہیروئن کیا بنی۔ زندگی میں بھی خود کو حقیقی ہیروئن کے کردار میں ڈھال لیا۔ حمزہ۔ ہیرو وہ اس کے لکھے ڈائلاگ پر یقین کرنے لگی۔ خیالوں میں گم رہنے لگی۔ اب شاید حمزہ۔ شاید کیوں۔ وہ اسی کے لیے تو ڈائلاگ لکھتا ہے۔ زندگی کو آسان سمجھنے والی فخر۔ محبت کے مشکل احوال میں پھنس گئی۔ حمزہ یقیناً ”اسے پسند کرتا ہے۔ آخر اسے ہی ہیروئن بناتا ہے۔ چونکہ ڈرامہ کچھ مزاحیہ سا ہوتا۔ کسی کو اعتراض بھی نہ ہوتا۔ چچی نے تو ایک بار کہا بھی۔

”ہم تو ایک ہی ہیروئن، ایک ہی ہیرو کو دیکھ دیکھ کر تھک گئے بھی۔“

”تو کیا کریں۔“ حمزہ نے فوراً کہا۔ ”آپ کو ہیروئن بنا سکتا ہوں نہ اقصیٰ کو، ہماری مختصر اندیشی ہے اور ہیرو تو دو سرا کوئی ہے بھی نہیں مجبوری۔“

”مجھے کبھی ہیروئن کا رول نہ تو سہی۔“ چچی نے حسرت آمیز لہجہ اختیار کیا۔

”ماموں جان سے مار دیں گے۔“

”تو ہیرو ان ہی کو بنانا۔ میں کب تم جیسے مسخرے کو ہیرو سمجھتی ہوں۔“

پھر اثر مستقل رہنے آگیا۔ اسے ولن کا کردار دے دیا جاتا۔ جو ہیرو ہیروئن کے درمیان آجاتا اور ہیرو کی پٹائی کرتا۔ پھر ہیرو اسے پچھاڑ دیتا۔ ولن زمین پر گر اہیرو سے معافی مانگتا۔ تالیاں بجاتی جاتیں۔ ڈرامہ ختم۔

فخر کو حسرت رہی کہ کبھی تو ڈرامہ شادی کے مناظر پر ختم ہو۔ شاید حمزہ ڈرامہ تھا کہ اعتراض نہ ہو جائے۔ تو وہ اسے پسند تو کرتا ہے۔ پھپھو سے کسے دادی سے کسے۔

مگر پھر ڈرامے ختم ہو گئے۔ سب پڑھائیوں میں جت گئے۔ اقصیٰ حمزہ بھی چھٹی کے دن آتے۔ حماد عباد کے ساتھ کرکٹ ہوتا اقصیٰ فخر فیلڈنگ کرتیں۔

کبھی فخر وکٹ کیپر اقصیٰ اسپائر ہوتی۔ کبھی حمزہ اور اثر یہ عمدہ سنبھالتے۔ آخر میں پیچ لڑائی جھگڑے پر ختم ہوتا



گئی۔ پھر امریکہ سے آنے والی شنو پھپھو۔ دعوتیں۔ فجر  
تو امتحان کے بعد کی نیندیں پوری کر رہی تھی۔  
اقصی بھی ایک بار شنو پھپھو سے ملنے کے بعد دوبارہ  
نہیں آئی۔ سنا کہ وہ اپنی دوھیال گئی ہوئی ہے پشاور۔  
حمزہ بھی ساتھ تھا۔ فجر نے اماں جان کو فون کر کے شنو  
پھپھو کا بتایا۔ اثر کی کامیابی کی تو خبر انہیں مل چکی تھی۔  
اثر نے ہی انہیں بتایا تھا۔ شنو پھپھو کا فجر نے بتایا۔ چپ  
ہو گئیں۔ سرد آہ بھر کر ادھر ادھر کی باتیں کرنے  
لگیں۔



چچی دبے قدموں اس کے پاس آئیں۔ ”سنو فجر۔  
تمہارے نصیب جاگ گئے۔ تم سے اماں پوچھیں گی۔  
سوچ سمجھ کر جواب دینا۔ خبردار“ انکار نہ کرنا۔ غلطی  
سے بھی نہیں۔“  
جیسے آئی تھیں ویسے ہی چلی گئیں۔ بے آواز وہ  
انہیں جاتا دیکھتی رہی۔ عشاء نے کاپی پر سے سر اٹھا کر  
کہا۔

”اپا! امی آپ کی شادی کا کہہ رہی ہیں۔ میں نے  
دادی سے سنا تھا۔ کچھ آپ کا ہی ذکر تھا۔“  
شادی۔ وہ سٹپٹا گئی۔ کیا؟ واقعی میرے نصیب  
جاگ گئے۔ ہاہ حمزہ اور اس کا وہ محل نمائنگ۔ یہاں سے  
وہاں تک۔ اور بڑے بڑے شاندار کمرے۔ سچ  
سجائے، قیمتی قالین۔ خوب صورت پردوں والے۔  
ہزاروں ڈیکوریشن کی اشیا اور نوکروں کی قطار۔ یہ ہوئی  
نابات۔ کیا حمزہ نے پھپھو سے کہا۔ یا دادی سے۔

”ہائے اللہ۔ کتنے ٹھاٹھ باٹ سے رہتی ہیں سفینہ  
پھپھو۔ جب دیکھو دوہنی۔ انگلینڈ چلی جاتی ہیں شاپنگ  
کے لیے۔ پھوپھا جان کے پاس تین گاڑیاں ہیں۔ ایک  
حمزہ کی ایک پھپھو کی۔ جب جی چاہا کہیں بھی چلی گئیں۔  
اقصی کے پاس ایک الماری جو تے سینڈلوں سے بھری  
ہوئی ہے۔ کپڑوں کا تو حساب نہیں۔ ایک دفعہ کے بعد  
دوسری دفعہ بننے نہیں دیکھا کوئی سوٹ چاہے کتنا ہی  
قیمتی ہو اور حمزہ کی ڈر سنک۔ اف ڈر سنک تو اثر کی بھی

فجر کی بانگ سے سب تنگ ہوتے۔ جونہ تو بال مانتی۔  
نہ کچھ۔ اس کی بال پتھر کی طرح سیدھی دکٹوں میں جا  
گتی۔ یا کسی کے سر پر پھم۔  
کیرم میں حمزہ سب کو ہرا دیتا۔ اقصیٰ چیختی بے ایمانی  
ہاتھ سے کوئن جال میں ڈالی ہے۔ چلو سب کو آکس  
کریم کھلانے چلتے ہیں۔ تم لوگوں کے ہارنے کی خوشی  
میں۔ اثر اور حمزہ چندہ کر کے سب کو آکس کریم  
کھلاتے۔ پھر ایسا ہوا کہ اثر دن بہ دن سنجیدہ ہو گیا۔  
الگ تھلگ رہنے لگا۔

”بی اماں کہتی ہیں مجھے پڑھ لکھ کر کچھ بن کر دکھانا  
ہے۔ یہ میرے بابا جان کی خواہش تھی۔ اور امی بھی۔  
یہی چاہتی ہیں۔“ اس نے اقصیٰ سے بہانہ کیا۔  
اقصیٰ اثر کو ہر کھیل میں شریک کرنا چاہتی مگر وہ  
رہتا رہتا۔ لان میں پڑھ رہا ہوتا۔ تو ان لوگوں کو دیکھ کر  
گمرے میں چلا جاتا۔ لیکن اس کا رزلٹ بھی بہت  
زبردست آیا۔ اس نے یونیورسٹی میں ٹاپ کیا تھا۔  
حمزہ فیل ہو گیا۔ مگر اسے فکر نہ تھی۔ وہ ہر حال میں  
خوش مگن تھا۔ اب تو اس کی لڑکیوں سے دوستی کی  
خبریں بھی آنے لگیں۔ فجر کو یقین تھا کہ لاکھ وہ کسی  
سے دوستی کر لے۔ محبت فجر سے ہی کرتا ہے۔ اور  
سفینہ پھپھو بھی اس کو ہی سونپنا نہیں گی۔  
اثر کی امی اس کی کامیابی کا سن کر آگئیں۔ بہت ہی  
نفیس خاتون تھیں۔ فجر کو اس طرح لپٹا کر ہار کرتیں۔  
جیسے وہ ان ہی کی بیٹی ہو۔ چچی نے ایک بار کہہ بھی دیا۔ تو  
بننے لگیں۔

”تو تم کو شک ہے کیا؟ میری بیٹی ہی ہے۔ بلکہ اولاد  
سے بڑھ کر۔ میری عزیز ترین دوست۔ سب سے  
پیارے بھائی کی بیٹی۔“

فجر کو اماں جان کا خیال آجاتا۔ جوان سے اسی لیے  
خفا تھیں کہ وہ کسی غیر کی بیوی بن کر چلی گئیں۔ جبکہ  
اماں جان انہیں اپنی بیٹی سمجھتی تھیں۔ بے چاری اماں  
جان اور بے چاری شنو پھپھو۔

یہاں تو ان کی آمد پر خوب خوشی منائی جا رہی تھی۔  
اثر کی شاندار کامیابی اور اسے بہترین جاب بھی مل



لا جواب ہوتی ہے مگر حمزہ کا مقابلہ۔ ایک بار اقصیٰ نے اثر کو توجہ دلائی۔

”امریکہ سے آئے ہو۔ امریکہ میں پڑھا ہے۔ مگر ڈریسنگ پاکستانی۔ حمزہ کو دیکھو۔“

اثر مسکرایا تھا۔ ”میرا باپ ہوتا۔ تب بھی میں پاکستانی ڈریسنگ کرتا۔ یوں میں ایک غریب ملک کا ٹھہری ہوں۔ جس کا بال بال قرض میں گروی ہے۔“

”ہائے اللہ۔ تم نے اتنا قرض کیوں لیا۔ ڈیڈی سے مانگ لیتے۔“ اقصیٰ بہت ہمدرد تھی۔

”میں نے قرض نہیں لیا۔ حکومت نے عوام کو بیرونی قرضوں میں جکڑا ہوا ہے۔ اس حساب سے ہمیں اپنی اوقات میں رہ کر سادہ زندگی گزارنے کی عادت ڈالنی چاہیے۔“

”تو حمزہ بھی تو اسی ملک کا۔ بلکہ میں بھی مگر ہم تو پرواہ نہیں کرتے۔ اسی منع بھی نہیں کرتیں۔“

اثر مسکرا دیا۔ ”شاید میری امی بھی منع نہ کرتیں۔ اگر سہاں ہوتیں یا میرے والد ہوتے۔ لیکن اپنا ضمیر اور احساس زندہ ہونا چاہیے۔ کسی کے منع کرنے کا انتظار نہیں ہونا چاہیے۔“

بات سمجھ میں نہیں آئی مگر فجر کو اس جواب سے خوشی ہوئی تھی۔ شاید اس لیے کہ وہ خود بھی غیر ضروری اشیاء کے خلاف تھی۔ یا پھر اس لیے کہ خود اس کے پاس محدود تعداد میں اشیاء ضروریہ ہوتی تھیں۔

دادی فضول خرچی اور اصراف کے خلاف تھیں۔ مگر کہ اس کے مرحوم باپ کی چند کانٹوں کا کرایہ اتنا ہوتا تھا کہ وہ بھی ہر شوق کی چیز خرید سکتی تھی۔ مگر دادی ثانی کی طرف سے پابندیوں کا سلسلہ۔

”یہ رقم تمہاری تعلیم اور شادی کے اخراجات کے لیے جمع ہو رہی ہے۔ دونوں ہاتھوں سے لٹانے کے لیے نہیں ہے۔“

اسے جو محدود رقم ملتی تھی۔ وہ زیادہ تر غریبوں کی ضرورت مندوں میں تقسیم کر دیتی تھی۔ اس کا دل چاہتا کوئی غریب نہ رہے۔ اپنی ساری رقم دے دلا کر لوگوں میں غربت کے احساس کو ختم کر دے۔ وہ اقصیٰ

کے سامنے اپنے کپڑے جو تے مانگنے والی کو دیتی تو وہ اس کے چٹکیاں کاٹتی۔ چپکے چپکے کہتی۔ ”تمہارے پاس بھی کون سے سینکڑوں جوڑے ہیں۔ اسے دیکھو خاصے ٹھیک ٹھاک کپڑے پہنے ہوئے ہے۔ ان لوگوں کو مانگنے کی عادت ہوتی ہے۔ تم جیسے لوگوں کو بے وقوف بنانے کے لیے دیکھنا بیچ دے گی۔“

فجر کو حیرت ہوتی۔ پھر یہ اطمینان کہ بیچ کر اپنی کوئی ضرورت ہی پوری کر لے گی بے چاری۔ اور ویسے جو رقم اسے ملتی تھی۔ وہ ہر ماہ اس سے دو گنی کسی نہ کسی بہانے لے کر خرچ کر دیتی تھی۔ دادی پابندی سے زکوٰۃ بھی ادا کرتی تھیں۔ اور اس کے جینز کے لیے بھی کچھ نہ کچھ منگا کر رکھتی تھیں۔ اسے دادی کی حرکتیں خاصی برا سرا لگا کرتیں۔ جو ایک بڑی سی بیٹی میں کچھ چیزیں فجر سے چھپا کر رکھتیں۔ مگر اسے سن کن مل جاتی۔ جیسے عشا نے بتایا کہ اس کی شادی کا سلسلہ چل رہا ہے۔

اور پھر دادی نے اسے بلا لیا۔ اور لمبی تمہید۔ جذباتی تقریر سے ملتی جلتی اس کے گوش گزار کی۔ اپنے خوابوں کی تعبیر۔ اپنے مرحوم بیٹے بہو کی آرزو۔ اپنی زندگی سے مایوسی۔ فجر سے اطاعت کی امید۔

”تم جانتی ہو۔ میری ذمہ داری اب صرف تمہارا مستقبل روشن دیکھنا ہے۔ بہت فکر رہتی ہے مجھے۔“

ہاں یہ تو درست تھا وہ واقعی اس کو بے پناہ چاہتی تھیں۔ باقی سب سے بڑھ کر شکر رہتی تھیں۔

”کیوں فکر کرتی ہیں میری۔ میں تو خوش ہوں۔ مزے میں۔ آپ جو ہیں میرے پاس۔“ وہ ان سے لپٹی۔

”بیٹا۔ تم میری سب سے پیاری اولاد ہو۔ سب سے پیارے بیٹے کی بیٹی۔ وہ آج زندہ ہوتا تو میرے فیصلے سے خوش ہوتا۔ شنو کو امریکہ جانے کی جلدی ہے اس کی بچیاں وہاں بے چین ہیں۔ تمہاری بہتر زندگی اور مضبوط روشن مستقبل کے لیے میں تمہارا اقرار چاہتی ہوں۔ میری فکروں کا خاتمہ اسی طرح ہو گا۔ اپنے اطمینان کے لیے پوچھ رہی ہوں۔ جلدی اس



بیٹا۔ اللہ تم دونوں کو بہت خوشیاں دے۔ میرا بوجھ ہلکا ہو گیا۔“

فجر تو برف کے سمندر میں جہی رہ گئی۔ اثر۔۔۔ یہ کیا ہوا؟ تو۔۔۔ حمزہ نے کچھ کہا ہی نہیں۔ سفینہ پھپھو سے۔۔۔ نہ بی ایماں سے۔۔۔ کبھی بھی۔۔۔ دادی تو اس کا صدقہ اتار رہی تھیں۔ خوشی اور سکون اطمینان ان کے روئیں روئیں میں سما گیا تھا۔ اس قدر مسرور تھیں ہنس رہی تھیں فجر کا منہ چوم رہی تھیں۔

پھر شنو پھپھو اتنی ہی خوشی کا اظہار کرتی آئیں۔ کبھی روتی کبھی ہنستی تھیں۔ اسے لپٹائے نہ جانے کیا بول رہی تھیں۔

سفینہ پھپھو بھی خوشی کے اظہار میں کم نہ تھیں۔ اس کا مطلب کہ وہ بھی اس رشتے پر راضی ہیں۔ چچا چچی سب خوش تھے۔ عشاء ندانے گلے گلے حماد عباد ڈانس کرنے لگے۔

وہ تو یوں گم صمم تھی جیسے سانپ سو نگہ گیا ہو۔ آخر اسے کیوں یہ توقع تھی کہ حمزہ۔۔۔ اس سے شادی کر لے گا۔ کیوں؟ کبھی اس نے اپنی پسند ظاہر نہیں کی۔ صرف ڈراموں میں ہیروئن کا اعزاز بخشا اور وہ سمجھ بیٹھی کہ۔۔۔ وہ زندگی کا سفر فجر کے ہمراہ لیکن ”کوئی جوڑ بھی تو ہو۔“ یہ الفاظ اس نے چچی سے سنے۔ وہ چچا کو بتا رہی تھیں۔

”انہوں نے سفینہ پھپھو سے کہا۔

”آپا! حمزہ اثر سے بڑا ہے۔ آپ چاہتیں تو۔۔۔ فجر آپ کی بہو ہوتی۔“

سفینہ آپا نے کہا۔ ”حمزہ تو رشتے داروں میں شادی کے خلاف ہے۔ اس کے علاوہ۔ کوئی جوڑ بھی تو ہو۔ اس کی دوھیال میں ایک سے بڑھ کر ایک امیر اور حسین لڑکیاں موجود ہیں۔ سب کی خواہش بھی ہے۔ لیکن میں آپس میں بد مزگی نہیں چاہتی اور حمزہ رشتے داروں کو پسند نہیں کرتا۔ بہت اوپر نظر ہے اس کی۔“ سنا آپ نے بھانجے کی اوپری نظر، تعلیم میں پھسڈی نخریوں میں اول۔ باپ کی دولت پر عیش کرنے والا۔ اثر کو دیکھو۔ یتیم بچے نے کیسی جدوجہد کی۔ آج اتنی

لپے ہے۔ کہ شنو چلی جائے گی۔ تمہیں جتنا پڑھنا ہو۔ پڑھتی رہنا۔ ابھی صرف نکاح ہو جائے۔ باقی رسمیں تو بعد میں ہوتی رہیں گی۔ بس میرے دل کو چین مل جائے گا۔ مجھے تمہاری محبت اور فرماں برداری پر فخر ہے۔ لیکن شرعاً بھی لڑکی سے اجازت درکار ہوتی ہے۔“

وہ ان کے بازوؤں میں سرگھسا کر بیٹھی رہی۔ کیا بولے۔ کیا کہے۔ وہ پھر گویا ہوئیں۔

”تم بتاؤ۔ کیا میں اپنی مرضی اور اختیار کو کام میں لا کر جو تمہارے لیے فیصلہ کروں گی۔ تمہیں منظور ہو گا۔“ مجھ پر بھروسہ ہے تم کو؟ میں نے کبھی تمہارے بارے میں غلط فیصلہ نہیں کیا۔ تعلیم تربیت ہر قدم ہر جگہ صرف تمہاری بہتری دیکھی اور سچ بات تو یہ کہ تم نے کبھی رخنہ بھی نہیں ڈالا کبھی انکار نہیں کیا۔“ ان کا انتظار کرنا اچھا نہیں لگا۔ بول پڑی۔

”پھر اب کیوں مجھ سے جواب مانگ رہی ہیں۔ مجھے اپنے اچھے برے کا کیا پتا۔ آپ سے بہتر کون بھلائی کر سکتا ہے میری نہیں ناں داوی جان۔“

وہ انہیں بی ایماں کہتی تھی۔ بلکہ سب بچے اثر اقصیٰ حمزہ سمیت بی ایماں کہتے تھے اس وقت اس نے شرارت میں انہیں دادی جان کہہ دیا۔ وہ جو اپنی جذباتی تقریر کے نتیجے میں خود ہی آنسو بہانے لگی تھیں۔ اس کے دادی جان کہنے پر ہنس پڑیں۔ سر پر چپت رسید کیا۔ ”آپ ہی میری ماں باپ ہیں دادا اور سب کچھ ہیں۔ کبھی میں نے آپ کو نالی کہا؟“

وہ اسے گلے لگا کر بولیں۔ ”تمہاری نالی بھی مجھ سے زیادہ خوش ہوں گی۔ ان کی تو پرانی تمنا تھی۔ ان کو اپنے پوتے سے بڑھ کر تمہارے لیے اور کون ہو گا۔ لاکھ وہ شنو سے ناراض ہوں۔ اثر اور تم سے زیادہ اور کون پیارا ہو سکتا ہے۔ بس یہی سوچ کر۔ اس یقین کے ساتھ کہ تم کو اس گھر کے سوا کہیں سے وہ خوشی نہیں ملے گی۔ شنو تمہاری عاشق زار۔ اثر بھی تمہیں پسند کرتا ہے اور میری دلی تمنا بھی یہی ہے۔ تم دونوں کے حالات زندگی بھی ایک جیسے ہیں۔ احساسات بھی۔ بس



”اچھی جا بجا شاء اللہ اور کتنا نفیس۔“

نہ جانے وہ کیا بولے جا رہی تھیں فجر تو ایک جملے سے ہی زخمی ہو گئی تھی۔ واقعی جوڑ تو نہ تھا۔ کہاں وہ سرمایہ دار اور کہاں ایک یتیم لڑکی۔ رات بھر وہ اپنے زخموں پر تسلی کے مزاج رکھتی رہی۔ دادی کی فرماں برداری۔ اطاعت۔ انہوں نے حالات زندگی یکساں دیکھ کر یہ فیصلہ کیا تھا۔

صبح ہوتے ہی دادی کی گھبراہٹ شروع ہوئی۔ انتظامات میں دخل۔ کھانے کی اقسام پر اعتراض بلکہ ہر بات اعتراض پر ختم ہوتی۔ دوپہر میں انہوں نے شنو کو بلا کر پاس بٹھایا۔

”لو بیوی! تمہارے اصرار پر میں نے ساہیوال فون کیا۔ بہن کو بتایا کہ ان کے پوتے سے میں اپنی پوتی کا رشتہ کر رہی ہوں۔ آج شام کو نکاح کی تقریب ہے۔ لو بی۔ وہ تو جھاڑ کے کانٹے کی طرح الجھ گئیں۔ بولیں۔ میرے پوتے کا نکاح۔ میری مرضی اور رائے لیے بغیر کس نے طے کیا۔ وہ لاوارث نہیں ہے کہ وہیں کے وہیں سب کچھ ہو جائے۔“ میں نے کہا۔ ”بہن تمہاری مرضی نہیں ہے تو یہ رشتہ ختم کر دوں۔ ابھی نکاح ہوا نہیں ہے۔“ تو خفا ہوئیں۔ کہ میں تمہارے باندھے بندھن کو کیوں توڑ کر رہی ہوں۔ میرے پوتے کی بارات میرے گھر سے جائے گی۔ اسے یہاں بٹھاجو۔ میں اس کو دلہا بنا کر روانہ کروں گی۔“ میں نے کہا۔ ”میرا اپنا بھی تم یہاں آکر بھی یہ کر سکتی ہو۔ تو بولیں۔“ میرا اپنا گھر موجود ہے۔ میرا پوتا میرے گھر سے بارات لے جائے گا۔“ اور میں نے پوچھا بارات میں کون کون کتنے لوگ ہوں گے تو بولیں۔ ”یہاں کون ہے۔ وہی جائے گا۔ میں تو سفر کر نہیں سکتی۔ لو سنو اکیلا لڑکا۔ دادی کے گھر سے دو لہا بن کر آئے گا۔ اب بولو۔“

چچی بھی آگئیں۔ سب سن کر متفکر ہوئیں۔ ”اماں آپ نے بھی عین وقت کے وقت انہیں اطلاع دی۔“

شنو پھوپھو پریشان ہو گئیں۔ چچی نے کہا۔ ”اکیلا کیوں۔ نوید بھی تو ہیں۔ وہ دو چار لوگ اور جمع کر لیں

گئے۔“

”ارے نوید نے تو کسی گانے والی لڑکی سے پوشیدہ شادی کر لی ہے۔ اسے گھر میں گھسنے کی اجازت کب دی ماں نے۔ خیر وہ ایسے ہی پھپھو لے پھوڑ رہی تھی۔ خوش تو ہو گئی۔ آواز سے پتا چل رہا تھا۔ تم اثر سے کہو فون کرے اور اجازت لے باقاعدہ۔ پھر نکاح کی اجازت دوں گی۔ میں نہیں چاہتی کہ وہ اثر اور فجر سے بھی ناراض ہو جائے۔“

چچا چچی ان کے چاروں بچے شام کی تقریب کی تیاریوں میں زور و شور سے حصہ لے رہے تھے۔ دادی پر جوش تھیں۔ فجر سنائے کے عالم میں۔ وہ اقصیٰ کی منتظر تھی۔ شام ہو گئی۔ اقصیٰ نہیں آئی۔ پشاور سے نہیں آئی کیا؟

سفینہ پھوپھو آگئیں اور فجر کا میک اپ کرنے لگیں۔ فجر نے اعتراض کیا تو انہوں نے کہا۔

”شنو کی خوشی ہے۔ تصویریں بنیں گی۔ وہ امریکہ جا کر دکھائے گی۔ سوٹ بھی لائی ہے۔“

شنو پھوپھو آگئیں۔ انہوں نے بھی وضاحت کی کہ ”امریکہ میں دونوں بہنیں بھائی کی شادی کی اور بھابھی کو دیکھنے کی تمنائی ہیں۔ ان کی خوشی کے لیے باقاعدہ دلہن بنانا مجبوری ہے۔“

شنو پھوپھو کی بیٹیاں بچپن میں ایک بار آئی تھیں۔ بہت الگ الگ رہتی تھیں۔ اثر سے ہی مخاطب ہوتی تھیں۔ اب بڑی ہو گئی ہوں گی۔ فجر تو کمرے میں ہی بیٹھ رہی۔ نگہا ہر کھن میں کافی لوگوں کا مجمع تھا۔ گانا بھی ہو رہا تھا اور قہقہے لگ رہے تھے۔

پھر نکاح کا وقت آگیا۔ چچا پھوپھا جان اور ایک اور رشتے دار ایجاب و قبول کے لیے اندر آئے تھے۔ رجسٹر ردِ ستخط کے بعد فجر کی حیثیت بدل گئی۔ اب وہ بیوی ہو گئی تھی۔ بہو بن گئی۔ بھابھی کہلائے گی۔ سب خواتین اس سے لپٹ کر مبارک باد دینے لگیں۔ آنسو بھی بہائے گئے۔ خوشی بھی منائی گئی۔ مبارک باد کی گالی گئی۔ اقصیٰ نہیں آئی۔

کچھ ایسا ہنگامہ رہا کہ وہ پوچھ نہ سکی کسی سے بھی



قصہ حزنہ کیوں نہیں آئے۔

پھر اثر اندر آیا۔ سلام کرنے۔ فجر کے پاس بٹھا کر اس کی تصویریں لی گئیں۔ خاصی گھما گھما رہی فجر نے نظر اٹھا کر دیکھا تک نہیں کہ دولہا کیسا لگ رہا ہے۔ کسی خاص روپ میں یا عام۔ داوی کے ساتھ بھی ان کی تصویریں لی گئیں۔ سب سے زیادہ داوی ہی خوش تھیں۔

رات گئے سب مہمان رخصت ہو گئے۔ اس نے بھی لباس تبدیل کیا۔ شہنو پھوپھو بار بار آکر اس کو اپنا کر پار کرتی رہیں۔ سب اس قدر خوش تھے کیوں؟ فجر کی خوش قسمتی پر۔ یا اثر کی خوش نصیبی پر۔ فجر کو بھی کیا خوش ہونا چاہیے؟ فیصلہ نہ کر سکی۔ اثر کی کوئی خوبی یا خاص بات۔ یاد کرنے پر بھی کچھ یاد نہ آئی۔ خصوصی طور پر بھی توجہ ہی نہیں دی تھی۔ سورنہ سب تعریفیں تو کرتے تھے۔ باپ کی شفقت کو ترسا ہوا۔ عیم لڑکا۔ ماں بھی اس کی کئی حصوں میں بی بی ہوئی۔ کوئی تربیت کرنے والا نہیں۔ اس کے بلوغت۔ اس نے خود کو سنبھالا۔ کوشش۔ محنت۔ جدوجہد کی اور سب کی دعا میں۔ اسے صلہ بھی ملا۔ عزت کی نوکری اور اب۔ ایک بہترین لڑکی کا ساتھ۔

اثر کے چہرے پر خوشیوں کا عکس بھر پور جھلک رہا تھا۔ آنے والی خوش رنگ۔ حسین زندگی کی توقعات۔ امید اور یقین کے ساتھ۔ اور فجر۔ اگلے دن وہ حسب عادت ادھر ادھر پھرتی نظر آرہی تھی۔ کسی بھی جذبے کے اظہار سے خالی۔ اثر کا سامنا ہونے کے بعد بھی۔ وہ نارمل نظر آرہی تھی۔ اثر اپنی بہنوں کے لیے کچھ تحائف لایا تھا۔ وہ دیکھ رہی تھی۔ تعریف بھی کر رہی تھی۔ شاید اسے ابھی تک اس رشتے کی اہمیت کا اندازہ نہ تھا۔

\*\*\*

سفینہ نے شہنو کی الوداعی دعوت اور بھانجے بھتیجی کے نکاح کی خوشی میں سب کی دعوت کی۔ شہنو پھوپھو تو بحر کو بہو کے روپ میں بنا سنوار کر لے جانا چاہتی تھیں۔

لیکن وہ سادگی سے تیار ہوئی سفینہ پھوپھو کے اصرار پر داوی شہنو اور فجر اثر کے ساتھ پہلے آگئیں۔ چچی نے بچا کے ہمراہ رات کو آنا تھا۔ سفینہ پھوپھو کی وسیع و عریض کوٹھی حسب معمول قیمتی سامان آرائش سے سجی ہوئی تھی۔ شاندار ہال نما ڈرائنگ روم میں انہیں بٹھایا گیا۔ فجر کو اثر کے ساتھ بیٹھنے سے گھراہٹ ہوئی۔ وہ اقصیٰ سے ملنے کا کہہ کر اوپر آگئی۔ اقصیٰ کمرے میں موجود تھی۔ تعجب۔ وہ سب سے ملنے نیچے نہیں آئی تھی۔ فجر بے تکلفی سے اس کے بستر پر بیٹھ گئی۔ اقصیٰ لیٹی تھی۔ لیٹی رہی۔

”تم یہاں ہو۔ میں تمہیں نیچے تلاش کرتی رہی۔ تم بیمار ہو؟ کسی نے بتایا ہی نہیں۔ کیا ہوا ہے؟“ اقصیٰ کے چہرے پر زردی کھڑی ہوئی تھی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

”کون بتاتا؟“ تیز لہجے میں ”تم نے جو تماشا وہاں لگایا ہوا تھا۔ سب اسی میں مصروف تھے۔ میری پروا تھی ہی کس کو؟“

”تماشا؟ میں نے؟“ فجر بوکھلا گئی۔ وہ تو شکوہ کرنا چاہتی تھی۔ مگر اقصیٰ۔

”ہاں تم نے۔“ اقصیٰ حلق کے بل چلائی۔ ”فجر! میں نے سوچا بھی نہ تھا۔ کہ تم تم میرے ساتھ اتنا بڑا دھوکا کرو گی۔ میں اثر سے محبت کرتی رہی اور تم اسے لے آؤ۔ تم سے بڑی ایکٹریس شاید ابھی پیدا نہیں ہوئی۔ میں تمہیں اپنی دوست سمجھتی رہی اور تم۔ میرا کلیجہ نوچ کر ہی کھا گئیں۔ کب سے چکر چل رہا تھا تمہارا بولو۔“

وہ اب بلند آواز میں چیخ رہی تھی۔ فجر مارے حیرت کی زیادتی کے دم بخود اسے دیکھ رہی تھی اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا تھا۔

”وہ میرا ہے۔ میں اس سے اتنی محبت کرتی ہوں کہ تم۔ ہو نہ تم اسے کیا دو گی؟ نہ تمہارا باپ زندہ ہے نہ ماں کون ہے تمہارا بی اماں نہ ہو تم تو تم۔ سڑک پر کھڑی بھیک مانگ رہی ہو تم۔ کیا اوقات ہے تمہاری۔ تم نے اثر کو۔ اپنی چالاکی سے۔ کھینی ہو



پوچھا۔ ”تم اوپر گئی تھیں۔ کیا ہو رہا ہے وہاں۔“  
اس نے کچھ اور بھی کہا تھا۔ جو فخر سن نہ سکی۔ اوپر  
سے اب بھی چیخوں کی آواز آرہی تھی۔ وہ تیزی سے  
اوپر چلا گیا۔

فجر حیران بیٹھی رہی۔ کبھی تو اقصیٰ نے اپنی پسند۔  
اپنی محبت اپنے دل کی بات اسے بتائی نہ تھی۔ اور فجر  
اسے اپنی رازدار دوست کہتی تھی۔ اور فجر کے راز ہی  
کیا تھے۔ اقصیٰ۔ اسے اتنی کم حیثیت سمجھتی تھی۔  
کمتر کہ کمترین۔ اس کے تلوے چائے والی نوکروں کی  
جتنی۔ اقصیٰ نے اپنی محبت۔ چاہت فجر سے اس لیے  
چھپائی کہ وہ اسے اس قابل سمجھتی نہ تھی۔ راز تو اپنے  
برابر والوں کو بتائے جاتے ہیں۔ اور فجر نیم لاوارث  
بے مایہ تھی۔

وہ کانپتی رہی پھر شنو پھو آکر اسے پکڑ کر ڈرائنگ  
روم میں لے گئیں۔ انہوں نے اسے خود سے لپٹا لیا  
تھا۔

”ڈرومست۔ بالکل نہ ڈرو وہ پاگل ہو گئی ہے۔“  
وہ اس سے لگ کر بیٹھ گئیں۔ فجر کو سکون ہوا مگر  
سکون اس کی قسمت میں نہ تھا۔ اثر اوپر سے آگیا۔ اس  
بیٹے آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ اشارے کرنے  
لگے۔ دادی صوفے پر آرام وہ حالت میں آنکھیں بند  
کیے کوئی وظیفہ زیر لب بڑھ رہی تھیں۔ اثر فکر مند  
تھا۔ اور پھر حمزہ بھی اندر آگیا۔ پہلے اس کی نظر فجر پر پھر  
اثر پر پڑی اور یک لخت اس پر جنون سا طاری ہو گیا۔  
وہ اثر پر حملہ آور ہو گیا۔

”ذلیل۔ کینے کیا کرنے آئے ہو تم میرے گھر۔“  
اس نے اثر کو دھکا دیا۔ وہ لاعلمی میں پیچھے ہٹا۔  
”کیوں آئے ہو۔ میرا سب کچھ تو چھین لیا تم نے۔“  
میری خوشیاں اور میری محبت مگر میں معاف نہیں  
کرتا۔ میں دشمنوں کو کبھی معاف نہیں کرتا۔“  
وہ جنون اشتعال کے عالم میں اثر کو کئے مار رہا تھا  
دھکے دے رہا تھا۔ مگر اثر صرف اسے روک رہا تھا۔  
اسے سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن وہ بے پناہ  
جان آگے ملازم آگے بمشکل سب نے حمزہ کو قابو

تم۔“ اقصیٰ اقصیٰ پلیز تم کیا کہہ رہی ہو۔ میں نے تو  
کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ تم مذاق تو۔“

یک لخت اسے خیال آیا۔ اقصیٰ مذاق کر رہی ہے۔  
ڈرامہ، ایکٹنگ۔ ایک ڈرامے کے یہی یا اس سے ملتے  
جلتے ڈانڈا لگتے تھے ابھی وہ ہنس پڑے گی۔ مگر اقصیٰ  
کی آنکھیں لال انگارہ ہو رہی تھیں۔ اس کا پورا جسم  
جیسے نفرت کی آگ میں دھک رہا تھا۔

”مذاق۔ ہاں۔ یہ مذاق تم نے میرے ساتھ کیا۔  
مجھے بے وقوف بنایا۔ ادھر میرے بھائی پر ڈورے ڈال  
رہی تھیں۔ ادھر اثر کو قابو کر لیا۔ ذلیل۔ منحوس۔ کھا  
گئی ماں باپ کو۔ اور اب مجھے۔ ادھر میں پشاور گئی۔  
ادھر مجھے موقع مل گیا۔ میرے گھر آنے کی ہمت کیسے  
ہوئی؟“

اس کی چیخوں کی آواز سن کر سفینہ پھو گھبرائی ہوئی  
آگئیں۔ اقصیٰ اب کھڑی ہو کر فجر کو دھکے دے رہی  
تھی۔

”مجھے اپنی فتح کی خبر دینے آئی تھی نا۔ میں تھوکتی بھی  
نہیں تجھ پر تیری جیسی میرے تلوے چاٹتی ہیں۔  
میری نوکر ہیں اور تو۔“

وہ فجر کو دھکے دے رہی تھی سفینہ پھو اسے روک  
رہی تھیں۔ مگر وہ ان کے قابو میں نہیں آرہی تھی۔  
”دشمن ہے یہ میری۔ مار ڈالوں گی۔“

سفینہ نے فجر کو اشارے سے نیچے جانے کا کہا۔  
”اقصیٰ چپ رہو۔ کیوں تماشا بنا رہی ہو خود کو۔ اپنی  
نہیں تو میری عزت کا خیال کر لو۔“

وہ اسے سمجھا رہی تھیں۔ سنبھال رہی تھیں۔ فجر  
کانپ رہی تھی۔ غم۔ ذلت۔ وہ دروازے کی طرف  
پڑھی۔ تو دیکھا۔ وہاں۔ شنو پھو حیران پریشان کھڑی  
تھیں۔ وہ بھی شاید سفینہ پھو کے ساتھ اوپر آئی تھیں  
۔ فجر لرزتی کانپتی سیڑھیاں اترنے لگی۔ ہر قدم جیسے  
من بھر کا تھا۔ بمشکل نیچے آئی مگر۔ ایک پائی پر کیلری  
میں ہی بیٹھ گئی۔

اثر اندر سے نکلا۔ اس کے پاس آکر اس نے



رہنا چاہیے۔ اماں کیا کر دیا آپ نے آپا کے لیے ایسا  
رشتہ ڈھونڈا۔“

دادی جوش میں اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ ”جب رشتہ کیا  
تھا۔ تب انسان تھا سفینہ کا شوہر۔ شیطان تو بعد میں  
ہوا۔ جب دولت پرسنے لگی۔ بچے بھلا پھر کیسے۔ اور  
ہاں سفینہ کی بھی کمزور ہے۔ اولاد کو چھوڑ دیا۔ ہاتھ سے  
نکل گئے۔ توبہ توبہ۔ ایسی زبان یہاں آتے تھے آخر۔  
کبھی نہیں دیکھا نہ سنا کہ کچھ غلط بات کی ہو۔ یہ اب  
کچھ عرصے سے نہ جانے آتا بھی چھوڑا ہوا تھا اور نہ  
جانے کیسی صحبت ملی ہوئی تھی۔ یہی سننے میں آتا کہ۔  
حزہ کی لڑائی ہوئی ہے۔ سر پھٹ گیا۔ یا کسی کا سر پھاڑ  
دیا۔ تھانہ پولیس تک بات۔ چھوڑ۔“

چچی نے اندر آ کر کہا۔ ”چلو سب لوگ کھانا لگ گیا  
ہے۔ آجائیں اماں۔“ چچی نے تو معاملہ ختم ہی کر دیا۔  
سب کھانے کے لیے اٹھ گئے۔ چچی کا یہی وصف  
تھا معاملے کو ہینڈل کر لیتی تھیں۔

لیکن آج کا معاملہ اتنا معمولی نہ تھا۔ سب متفکر  
تھے۔ فجر کو سب سے شرمندگی ہو رہی تھی۔ وہی تو اس  
واقعے کی وجہ بنی تھی۔ نہ صرف اقصیٰ بلکہ حزہ نے جو  
زبان کے جوہر دکھائے تھے سب کے سامنے اسے تو  
ذلیل کر دیا۔ خواہ اثر کو سنایا۔ مارا۔ مگر وجہ فساد فجر بنی  
۔ کس کس سے صفائی دے گی یہ کہ اقصیٰ نے کبھی اپنی  
چاہت ظاہر نہیں کی۔ لیکن فجر اس رشتے کو روک  
بھی نہیں سکتی تھی۔ وہ اقصیٰ کو بتانا چاہتی تھی لیکن  
کیسے؟ جب وہ اس قابل تھی ہی نہیں کہ اسے قائل  
کر سکے۔

اقصیٰ نے اسے پاتال میں گرادیا تھا۔ اور اثر کو دیکھو  
مجال ہے کچھ بولا ہو۔ کہہ دیتا ہاں میں بھی فجر کو چاہتا  
ہوں اس لیے۔ میں جیت گیا۔ ارے مگر حزہ نے بھی  
تو کبھی منہ سے نہ نکالا۔ فجر سے ہی کہہ دیتا۔ تم میری  
چاہت ہو۔ تو۔ کتنا شرمناک الزام اس پر لگایا۔ دونوں  
بہن بھائی نے۔ اپنی دولت سے خرید لیا ہوتا اثر کو۔  
میں کب ان کے عشق میں مر رہی تھی۔ مگر میں بکاؤ مالی  
نہ تھی۔ انسان کو دل کی کشش اور طاقت سے خریدا

کیا۔ مگر اس کی زبان۔  
”زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ میں ہارنا نہیں جانتا۔  
سمجھے تم۔ اپنی جیت کو عارضی سمجھو۔ میری محبت فجر  
ہے۔ اور تم نے مجھ سے اسے چھینا ہے۔“  
دادی الگ چیخ رہی تھیں۔ انہوں نے شنو سے  
کہا۔

”تمہیں بیٹھنا ہے تو بیٹھو۔ میں جا رہی ہوں۔ چلو  
فجر! اسے پکڑو۔ گر جائے گی۔“  
پھپھا جان حزہ کو لے جا چکے تھے۔ اثر نے فجر کا ہاتھ  
پکڑ کر اٹھایا۔ اس کی کیکیا ہٹ۔ لرزہ ختم ہی نہیں ہو  
رہا تھا۔ شنو پھپھو بھی اٹھ گئیں۔ دادی کو پکڑ کر باہر کے  
دروازے کی طرف چل پڑیں۔ فجر نے اثر کے ہاتھ  
سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔

”ٹھیک ہوں میں۔“ اور دادی کا ہاتھ پکڑ لیا۔ سناٹا  
۔ گیٹ کے پاس وہ باہر جا رہے تھے۔ چچا چچی اور بچے  
اندر داخل ہو رہے تھے۔ وہ پوچھتے رہے۔  
”کہاں۔ کیا ہوا کہہ۔“ مگر کسی نے جواب نہ دیا۔  
یہ لوگ باہر چچا چچی اندر چلے گئے۔

گھر آ کر بھی سب خاموش تھے۔ جیسے کسی نے  
جادو کر دیا تھا۔ دادی لیٹ گئیں انہیں بہت جھکن ہو  
گئی تھی۔ جذباتی تاسف اور غصہ۔ فجر کو انہوں نے  
اپنے پاس بٹھا لیا۔ پلنگ کے دوسری جانب اثر بیٹھ کر  
ان کا ہاتھ سہلانے لگا۔ دس منٹ بعد چچا چچی بھی آ  
گئے۔ چچی وہاں سے اندر کہیں چلی گئیں۔ چچا شنو پھپھو  
کے پاس بیٹھ کر افسوس کے عالم میں سہلانے لگے۔

”مجھے ذرا بھی اندازہ نہ تھا۔ آپا کے بچے اس قدر  
بد تمیز۔ گستاخ ہو سکتے ہیں۔ یہ کیسی تربیت کی ہے آپا  
نے۔ حزہ آپے سے باہر۔ ارے میں نے صرف اتنا  
پوچھا تھا کہ اماں وغیرہ کیوں چلے گئے۔ جواب حزہ کی  
دھانڈوں نے دیا۔ اقصیٰ کی چیخ پکار میری تو سمجھ میں نہیں  
آیا۔ کہ قصہ کیا ہے آخر پھر اندازہ ہوا۔ سب کچھ  
دولت کا شاخسانہ ہے۔ وہ کسی کو اپنے برابر نہیں  
سمجھتے۔ دولت سے سب کچھ خرید سکتے ہیں۔ محبت اور  
شادی اور انسان تک۔ سب کو ان کے سامنے جھکا



”مگر حمزہ کو نوکری کی تو ضرورت نہیں لی اماں۔ اتنی دولت ہے۔“

”ہاں۔ اسے کیا ضرورت۔ لٹانے اڑانے کے لیے باپ کا روپیہ بہت۔ مگر تعریف بھی نہیں کرتا کوئی ہر جگہ سے پٹ کر آ جاتا ہے۔ باپ پھر خبر لیتا ہے۔ مگر سدھارنے کی کوشش نہیں کرتا۔ تو سمجھ لو کہ غلط فہمی دور کرنا تمہارے بس میں نہیں۔ اقصیٰ کی نہ حمزہ کی۔“

دادی لیٹ گئیں۔ حمزہ کی۔۔۔ دادی جانتی ہیں کہ۔۔۔ حمزہ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ فجر کو اس سے محبت نہیں۔ شاید حمزہ کو بھی صرف اثر سے حسد ہے۔ مقبولیت کا۔ کامیابیوں کا۔

”سو جاؤ فجر۔ بچوں کو ان معاملات سے کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیے۔ ہم ہیں نا۔ تمہارے بڑے سنبھال لیں گے سب۔۔۔ چلو۔“

ارے کس آسانی سے کہہ دیا۔ بچوں کو سروکار نہیں ہونا چاہیے۔ اتنا بڑا واقعہ۔ بلکہ حادثہ اس کی زندگی میں آکر سب کچھ بگاڑ گیا اور دادی کہتی ہیں۔۔۔ یوں تو اس کی زندگی کتنے ہی حادثوں سے کامیاب گزر گئی تھی۔ ماں باپ کا نہ ہونا کبھی دادی کبھی نانی کے پاس رہنا۔ کوئی پیار کرنا کوئی گھر کرنا۔ کوئی رحم کھانا کوئی بچھڑ کرنا۔

تربیت کے نام پر اسے سب نے ہی تختہ مشق بنایا۔ پھر وہ سب کچھ سہہ کر مضبوط ہو گئی۔ مضبوط اور لا پرواہ۔ بے فکر اور ڈھیٹ۔ مشکلیں اتنی پرہیز کہ آساں ہو گئیں۔ ہاں سچ اور انصاف بھی اس کی فطرت کا خاصہ بن گئی۔ درد مندی ہمدردی اخلاص کی خوبیوں نے اسے مقبول بنا دیا۔

محبت نفرت کی پہچان بھی اسے ہوتی گئی کمال ہے۔ ”وہ اقصیٰ کی نفرت جان سکی (خود سے) نہ محبت سمجھ سکی (اثر سے) کہاں کو تاہی ہوئی اور حمزہ مہربان تھا لیکن محبت کا تو اس نے کبھی نام تک نہ لیا۔ شاید جوڑ نہ ہونے کا فرق اسے بھی ہو گا ہی۔ پھر اثر سے لڑائی جھگڑا اور اثر نے بھی خود کو بچایا ہی اس کے تابڑ توڑ حملوں سے اس کو ایک مکار سید کر دیتا۔ پتا چلتا حمزہ میاں کو۔

جاتا ہے۔ دولت سے نہیں۔ مجھے تو پتا نہ تھا کہ لوگ دولت کو خدا سمجھ لیتے ہیں۔ حمزہ نے کبھی لگاوٹ کا اظہار کیا ہوتا۔ میں اسے سچ سمجھتی اور پھر ہتا نہیں اس سے زیادہ ذلیل کی جاتی۔

اقصیٰ کو بہت اعلیٰ دوست سمجھا۔ دل میں جگہ دی۔ اور وہ اسے کم تر نوکر کے درجے تک سمجھتی رہی۔ پتا نہیں دوستی سے محرومی۔ خسارے کا سودا تھا یا بروقت انکشاف ہوا۔ وہ تو پھر بھی اقصیٰ کی غلط فہمی دور کرنا چاہتی تھی۔ لیکن۔۔۔ موقعہ کہاں آیا۔ معلوم نہیں چچا چچی کے سامنے کیا ڈرامہ ہوا ہو گا۔ اور اثر نے۔۔۔ فجر کے بارے میں کیا سوچا ہو گا۔ اس کا ابھی اظہار نہیں ہوا تھا۔ سونے کے لیے لیٹی تو۔۔۔ نیند تو کیا آتی شام کے مناظر آنکھوں کے سامنے گزرتے رہے۔

”لی اماں۔“ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ”اگر میں اقصیٰ کی غلط فہمی دور کر دوں؟“

”کون سی غلط فہمی؟“ انہوں نے اقصیٰ کی داستان تو سنی نہ تھی (شنو پھونے بھی نہیں بتایا؟)

”وہ۔۔۔ وہی۔“ ہکلا گئی۔ ”اس نے مجھ سے لڑائی کی کہ میں نے اس کی محبت چھین لی۔ لی اماں میں نے تو آپ نے کہا تو میں مان گئی۔ اگر مجھے اقصیٰ بتا دیتی کہ وہ اثر سے محبت کرتی ہے تو میں آپ کو بتا دیتی۔ ہیں نا؟ پھر تو مگر اس نے کبھی بتایا بھی نہیں۔“

دادی نے اسے لیٹنے کا اشارہ کیا۔ وہ لیٹ گئی۔ ”بیٹا! پھر بھی۔ اقصیٰ کے چاہنے سے کیا ہوتا ہے؟ جب شنو اور اثر کی وہ پسند نہیں تم ہو تم ہی تھیں۔ بھول جاؤ سو جاؤ۔“

”جب درمیان میں غلط فہمی کی گرہ پڑ جائے۔ اسے کھولنے کی کوشش تو کرنی چاہیے۔“

”چپ ہو جاؤ۔ تم میری دادی ہو۔ یا میں تمہاری۔۔۔ یہ غلط فہمی نہیں۔ ضد ہے بس گور حمزہ بھی ضد میں بکواس کر رہا تھا۔ اثر سے جلتا ہے۔ حسد کرتا ہے۔ وہ ہر کلاس میں پھسڈا ہی رہتا تھا۔ اثر ہمیشہ کامیاب اور اس نے سب کی تعریفیں حاصل کیں۔ نوکری بھی مل گئی۔ اور اب نکاح۔“



دھڑام سے گر جاتے۔ مڑا آتا۔ کھا کھا کر مستنڈے ہو جکے ہیں مسٹر۔ مگر بس غصہ۔ گری دولت کی طاقت۔ اثر تو باقاعدگی سے جم جاتا اور گھر پر بھی صبح سویرے سے ورزش 'جاگنگ' باڈی بنالی ہے۔ ہیرو جیسا۔ اونہر ہیرو کون سے خوش جمال ہوتے ہیں۔ فلمی ہیرو تو بس اپنے نام پر چلتے ہیں۔ اثر تو ان سے ہزار۔

"افوہ۔ اثر کا کیا ذکر ہے بھئی۔" خود کو جھڑکا۔ "ہاں خیر طاقت تو حمزہ سے زیادہ ہوگی ہی پھر چپ چاپ تے مار کیوں کھالی۔ پوچھوں گی۔ شاید جواب دے ہی دے۔ ویسے تو مجھ سے مخاطب ہوتا نہیں۔ مگر۔۔۔ داوی نے کہا تو میرا ہاتھ کس مضبوطی سے پکڑا۔ میں گرنے والی ہو رہی تھی۔ کہاں کی دعوت۔ کیسا کھانا۔ جب سفینہ پھپھو کو خبر تھی۔ (ہوگی ہی) کہ بیٹا بیٹی یہ ٹھانے بیٹھے ہیں۔ تو نہ کرتیں دعوت۔

اقصی نے کبھی بھی کیوں مجھ پر ظاہر نہ کیا۔ شاید اثر سے کہا ہو۔ ارے تو اقصیٰ سے کر لیتا شادی۔ اتنا جینز ملتا۔ کوٹھی کار۔ امریکہ سونٹزر لینڈ میں ہنی مون۔ سفینہ پھپھو ذکر کرتی ہی رہتی تھیں۔ داماد کی تلاش کے ذکر پر کس کس طرح بخشش کی جائے گی۔ تو اثر ہی فائدہ اٹھا لیتا۔ کتنا احمق ہے۔ میں تو بہت عقل مند سمجھی تھی اور شتو پھپھو انہیں بھانجی کیوں پسند نہ تھی۔ اتنی خوب صورت اوپر سے میک اپ کا سلیقہ بھی ہے اور قیمتی لباس بھی اسے دو آتشہ بنا دیتے۔

اقصی شدید غصے میں ہے۔ اسے کتنا صدمہ ہوا ہو گا۔ اسے چاہیے تھا کہ اپنی خالہ سے جواب طلب کرتی۔ ہاں مگر شاید میرے آنے کے بعد کچھ کہا ہو گا۔ بے چاری کے ساتھ زیادتی ہو گئی۔ اب ازالہ۔ کوئی تدبیر۔ دوست ایسے ہوتے ہیں؟ کبھی مجھ سے کہا ہوتا۔ میں فٹ انکار کر دیتی۔ مجھے کون سا عشق تھا اثر سے۔ لیکن اب۔۔۔

سوچ سوچ کر تھک گئی۔ تو نیند بھی آہی گئی اور پھر۔۔۔ رات گزر گئی۔

صبح داوی نے جگایا۔ "نماز پڑھ لو۔" نماز پڑھ لی۔ داوی نے کہا۔

"دعا مانگو۔ اپنے لیے اور ان کے لیے بھی۔" وہ دونوں ہاتھ گود میں رکھے بیٹھی سوچتی رہی۔ کیا مانگے۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ تو پھر لیٹ گئی۔ نیند پھر آگئی۔ آنکھ پھر دیر سے کھلی۔

داوی نے اپنا اور اس کا ناشتہ کمرے میں ہی منگالیا۔ چچی لے کر آئیں۔ پھر خود ہی بتانے لگیں۔

"شنو آیا تو سفینہ آیا کی طرف گئی ہیں۔ وہیں ناشتہ کریں گی۔ بدگمانیاں دور ہونی چاہیں۔ اثر بھی گیا ہے اللہ رحم کرے۔"

"ہوں۔ اچھا ہے۔" داوی نے سر ہلایا "شاید ان کوڑھ مغزوں کی سمجھ میں کوئی بات آجائے۔ میں بھی جاؤں گی۔ مگر ابھی نہیں۔ معاملات سدھارنے کی کوشش تو کرنی ہوگی۔ شنو کو سمجھانے دو۔"

سدھارنا اور سمجھانا۔ شنو پھپھو نے اقصیٰ کا جنون خود کھاتا تھا۔ حمزہ کا بھی۔ اثر کو کیوں لے گئیں۔ داوی ہاتھ رو مہاتھ دھونے گئیں تو چچی نے جکے سے کہا۔ "اقصی جل کر کوئلہ ہو رہی ہے۔ کیا سمجھے گی۔" "چچی! میرا کیا قصور ہے؟ میں نے تو نہیں کہا تھا کہ۔"

"تم۔۔۔ بہت سادہ ہو اور سب کو اپنا جیسا سمجھتی ہو۔ ایسا نہیں ہوتا ہر کسی کی فطرت مختلف ہوتی ہے۔" داوی باہر آرہی تھیں۔ ساتھ ہی باہر سے آہٹیں اور آوازیں بھی۔ پھر سفینہ پھپھو آئی اور داوی سے لپٹ کر رونے چننے لگیں۔ شنو پھپھو ان کے پیچھے کچھ حیران سی۔ سفینہ پھپھو کچھ کہہ رہی تھیں۔ رو رو کر فریاد کر رہی تھیں۔

"کیا میں آپ کی بیٹی نہیں۔؟ میرے بچے آپ کے کچھ نہیں ہوتے جو ہے وہ وہی ہے۔ کہاں گئی فتنہ۔" پھر ان کی نظر فجر پر پڑی۔ ہاں کو چھوڑا اسے پکڑ لیا۔ "یہ یہ ہے فساد کی جڑ۔ اسی فتنی کی وجہ سے کیا آپ مجھے چھوڑ دیں گی؟ یہ ہے کیا چیز۔ میرے بچوں کا اس کا مقابلہ ہی کیا ہے؟ ارے اس نے تو میرے کلیجے پر ہاتھ ڈالا ہے۔ میں پھر بھی چپ رہی۔ ایک طرف بیٹا۔ دوسری طرف بھانجا۔ اس نے تو دلوں میں دراڑیں ڈلوا



دی ہیں۔ میری بچی کا کیا حق نہ تھا؟ آپ نے اس کی خاطر میرے ساتھ نا انصافی کی ہے۔ میں احتجاج نہ کروں۔ اس ایک ہستی کے لیے آپ اپنی اولاد کو چھوڑ دیں گی میں اس کا۔“

انہوں نے فجر کو دھکا دیا۔ وہ ویسے ہی سراسیمہ تھی سنبھل نہ سکی۔ لڑکھڑا کر دور جا گری۔ سنبھلتے سنبھلتے بھی اس کا سر نماز کی چوکی کے کنارے سے ٹکرایا۔ سر چکرا گیا۔ چچی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا۔ اور کمرے سے باہر لے آئیں۔ بچوں کے کمرے میں اسے بٹھایا۔

”پریشان نہ ہو۔ پتا نہیں شنو آیا کے ساتھ وہاں کیا بات ہوئی ہے پتا کرتی ہوں۔ بس اتنا کہہ سکتی ہوں فجر۔ تم اپنی جگہ مضبوط رہنا ڈاٹ کر مقابلہ کرنا۔“

”میں اپنی جگہ مضبوط رہوں؟ اس کا کیا مطلب چچی! کیا میں اس لیے کمزور ہوں کہ میرا اس نکاح کے معاملے میں کوئی حصہ نہیں۔ بلکہ بیوں کا فیصلہ تھا۔ یا اس لیے کہ میرے ماں باپ نہیں۔“

”فجر! یہ شنو آیا اور اماں کی خواہش تھی۔ اگر اثر چاہتا۔ اقصیٰ کا انتخاب ہوتا، مگر اثر نے بھی تمہارا نام لیا۔ سفینہ آیا بیٹی کی محبت میں اس اہم بات پر غور نہیں کر رہیں۔ ادھر بیٹے نے نیند سے جاگ کر انگڑائی لی ہے۔ سفینہ آیا کے پچھتاوے ہی ختم نہیں ہو رہے۔ لو اب اثر سے کچھ کہہ رہی ہیں۔ میرا خیال ہے ادھر آ رہی ہیں اثر روک رہا ہے۔“

اور دیکھتے دیکھتے سفینہ پھپھو لپکتی ہوئی کمرے میں آ گئیں، چچی گھبراہٹ میں دروازہ بھی بند نہ کر سکیں۔ سفینہ کے پیچھے اثر اور ہائیں ہائیں کرتی دادی بھی آرہی تھیں۔ سفینہ نے فجر کو دیکھ لیا تھا۔

”کدھر گئی۔ یہاں آکر چھپ گئی۔ دیکھا چوروں کی خصلت ہے۔“

چچی نے سفینہ کو روکنا چاہا۔

”آیا! اس کا کیا قصور ہے۔ بیوں کا فیصلہ۔“

”نوا سی نے بیوں کو پیٹی پڑھائی ہوگی۔ اس نے تانا

بات بن کر تیار کیا۔ کہ سب مجبور ہو گئے۔“

کمر پر ہاتھ رکھے دو سرا ہاتھ نچاتی چیختی چلاتی کہیں سے کسی شریف خاندان کی خاتون نہیں لگ رہی تھیں۔ ایک بار فجر نے ایک تور والی کو گلے میں اپنے ایک گاہک سے لڑتے ہوئے دیکھا تھا۔ بالکل اسی طرح کمر پر ہاتھ رکھے دو سرا ہاتھ نچاتی تھوک اڑاتی گالیاں بک رہی تھی۔ اس وقت فجر کو بہت ہنسی آئی تھی۔ مگر اس وقت وہ خوف زدہ تھی۔ چچی کی بات کا جواب دے کر پھر فجر پر توجہ مرکوز کر دی اور پھر اسے زور سے دھکا دیا۔ وہ پھر گر گئی۔ (کیا اتنی کمزور تھی وہ؟) پلنگ کی پیٹا تھے پر اسی جگہ ٹکرائی۔ جہاں پہلے چوٹ لگی تھی۔ پھر چچی کے منہ سے نکلا۔ ”آئے ہائے۔“

انہوں نے ہی سفینہ کو ہٹا کر فجر کو اٹھانے کی کوشش کی۔ جو واقعی چکرا گئی تھی۔ ”خون نکل رہا ہے۔“

دادی نے اسے اٹھایا اور وہیں بیٹھ گئیں اسے پاس بٹھالیا۔ چچی نے اثر سے کہا۔

”پیٹی اور دو۔ میرے کمرے سے لے آؤ۔ عشا جتا دے گی۔“

فجر کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا کیا ہو رہا ہے وہ آنکھیں بند کیے جھوم رہی تھی۔ شنو پھپھو کچھ بول رہی تھیں۔ پھر سفینہ پھپھو بھی بحث کرنے لگیں۔ چچی نے خون صاف کر کے اس کے زخم پر دوا لگا دی۔

”سنو، سنو، سفینہ میری بات تو سنو۔“ سفینہ پھپھو کہہ رہی تھیں۔ ”کیا سنوں۔ صبح سے سن رہی ہوں۔ کیا میرا بھانجے پر کوئی حق نہیں۔ تم نے بھی۔“ فجر نے ماتھے کو ہتھیلی سے دبایا اور کھڑی ہو گئی۔

”سنیے پھپھو! میری بات بھی سنیں۔ آپ پریشان نہ ہوں اور کوئی غم نہ کریں۔ میں آپ کے بھانجے سے دستبردار ہوتی ہوں، لے جائے اپنا حق اپنا بھانجا اور باندھ لیجئے بیٹی کے آپٹل سے۔ میں اپنا حق چھوڑ رہی ہوں۔“ آواز بھرا گئی۔

”آئے ہائے۔ دست بردار جانتی ہے کہ اس طرح نکاح ختم نہیں ہوتا۔ حق چھوڑنا ہے تو طلاق۔“

دادی پھپھی، بھتیجی کے مکالموں پر سر پکڑے بیٹھی تھیں۔ چیخ پڑیں۔ ”سفینہ!“



”اچھا وہ تو پھر یونہی سہی میں نے طلاق دی۔ طلاق دی۔ طلاق دی۔ بس خوش‘ میں نے ہر تعلق ختم کر دیا اب۔ یہی چاہتی تھیں آپ؟“

چکر آگیا۔ وہیں کرگئی داوی کی گود میں۔ اثر سفینہ کو زبردستی پکڑ کر باہر لے گیا۔ عجیب سا سناٹا کمرے میں چھا گیا۔ پھر چچی کی کھلکھلاہٹیں اس سناٹے کو توڑنے میں کامیاب ہو گئیں۔ فجر نے آنکھ کھولی۔ منہ پر ہاتھ رکھے چچی ہنسی سے دہری ہو رہی تھیں۔

”جی اماں! مجھے ہنسی آرہی ہے فجر کے طلاق کہنے پر۔ کیا چپ کیا سفینہ آیا کو۔ بھاری پھر کیا کرتی۔“

وہ پھر نسنے لگیں۔ بی اماں بھی مسکرا دیں۔ اور شنو پھپھو دیوار سے لگی رو رہی تھیں۔ انہیں بھی چچی نے گدگدایا۔ وہ بھی ہنس دیں۔ انہیں ہنسا دیکھ کر فجر کو بھی ہنسی آگئی۔ ساری لختی فضا میں بکھر گئی۔

شنو پھپھو نے اسے گلے لگا لیا۔ ”تم میری آرزو ہو۔ سفینہ پاگل ہے۔“ (پاگل ایسے ہوتے ہیں؟)

دوپہر ہو گئی تھی اور چچی کی انتظامی سرگرمیاں۔ کھانے کے لیے بلانے آگئیں۔ فجر لیٹ گئی تھی مگر اٹھنا پڑا۔ اسے کون بھوکا رہنے دیتا۔ کھانا کھانے کے بعد اس نے اعلان کیا۔

”بس بی اماں آج میں ساہیوال جا رہی ہوں۔ اگر آج یا کبھی سفینہ پھپھو نے مجھے قتل کر دیا۔ تو میری بھاری اماں جان (نانی) تو سنتے ہی مرجائیں گی۔ مجھے ان کی زندگی بہت عزیز ہے۔“

اس کے ارادے اور پروگرام یونہی اچانک بن جاتے تھے۔ سب کی گردنیں ایک دوسرے کی طرف اٹھ گئیں۔

”آپ فکر نہ کریں اماں! مجھے جانے دیں ورنہ یہاں بہت خراب حالات ہو جائیں گے۔ آپ دیکھ رہی ہیں نا۔ مگر میں۔۔۔ میری برداشت بس اتنی ہی ہے۔“ داوی سے لپٹ کر بیٹھ گئی۔ بہت غمگین تھیں۔

۵۵

”میں جانتی ہوں۔ تمہیں برداشت نہیں۔ میں تمہیں کیسے تسلی دوں۔ بڑھاپا انسان کو کمزور کر دیتا

ہے۔ بوڑھا ذہن اور دل بھی کمزور ہو جاتا ہے۔ کبھی کبھی مجبوری میں غلط فیصلے بھی ہو جاتے ہیں۔ لیکن میں مطمئن ہوں۔ تمہارے مستقبل کے لیے میں نے کوئی غلط فیصلہ نہیں کیا۔ کیونکہ جانتی ہوں۔ شنو بے ریا۔ محبت کرنے والی ہستی ہے۔ اثر کی تربیت اس نے کی ہے۔ بہت دکھ اٹھائے ہیں شنو نے۔ اور اثر نے بھی بہت ہمت سے قیمتی کی زندگی گزاری۔ میں نے اس کے دل کی خوشی پوری کی ہے۔ وہ بھی مجھے اتنا ہی عزیز ہے۔ جتنی تم۔ شاید میں اپنے سب بچوں میں توازن نہیں رکھ سکی۔ محبت کمزور کر دیتی ہے۔ لیکن چاہا تھا کہ سب ایک لڑی میں پروئے ہوئے تسبیح کے دانوں کی طرح رہیں۔ اتفاق اور محبت سے۔ کبھی کبھی کوئی دانہ ادھر ادھر گم ہو جائے توازیت ہوتی ہے۔ یہ جو دل کی دھڑکن ہے۔ یہ محبت کا منبع ہے۔ تم نے شاید محسوس کیا ہو۔ میں نے سفینہ کی بہت سی ناگوار اور نا انصافی والا باتیں برداشت کر لیں۔ وہی کمزوری۔ تمہاری حمایت دے نہ کر سکی۔ جس کی شاید تم کو توقع تھی۔ شاید اس لیے۔ تم نے یہ فیصلہ کیا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ میں اختیار رکھتے ہوئے بھی۔ بے اختیار ہوں۔ جان بوجھ کر نہیں کمزور قوت ارادی کے باعث۔ اپنی ہر بات نہیں منوا سکتی۔ بہر حال۔ ایک مضبوط گرہ لگا دی ہے۔ تم سے بس اتنا چاہوں گی کہ اس کو کمزور نہ ہونے دیتا۔“

داوی رو رہی تھیں۔ فجر کو خود پر غصہ آگیا۔ ایسی بھی خود سری اچھی نہیں۔ سفینہ پھپھو کی محبت نے داوی کو۔ کچھ کہنے نہ دیا ہو گا۔ یا کمزوری کی وجہ سے نہیں بول سکیں۔ محبت بھی کمزور کر دیتی ہے۔

”بی اماں۔“ وہ ان کے ہاتھ پکڑ کر دردمندی سے بولی۔ ”اگر آپ اجازت نہیں دیں گی تو میں نہیں جاؤں گی۔ لیکن مجھے اب ڈر لگ رہا ہے۔ جانیے میرا کیا قصور ہے۔ سب مجھے ہی خطا وار سمجھ رہے ہیں۔ کیا اس لیے میں ہر الزام سہتی رہوں۔ سب کی باتیں سنوں کہ میرے باپ ماں نہیں۔ جو میری حمایت کریں۔ یا میرے لیے لڑیں۔ میں اکیلی ہوں اس لیے



کمزور ہوں۔“

دادی نے بزور اس کو کھینچ کر اپنی آغوش میں لے لیا۔ ”میں جو ہوں۔ زندہ سلامت۔ میری چاند۔ میں لڑوں گی سب سے۔“ چمکوں پہکوں رو رہی تھیں۔ بیٹی کی زنا زن چلتی ہوئی آواز کے سامنے تو بول نہ سکیں۔

”ابھی کہہ رہی تھیں کہ بے اختیار ہیں۔ پھر کیسے لڑیں گی۔“

”یہ تو نہیں کہا تھا میں نے۔“ صاف مکر گئیں۔ ”بس یہ ہے کہ کوئی زور سے بولے۔ تو میں چپ ہو جاتی ہوں۔“

”بی اماں۔ شر کو بڑھنے سے پہلے اس کا تدارک کر لینا چاہیے۔ میں جب تک یہاں رہوں گی۔ کوئی نہ کوئی فتنہ اٹھا تا رہے گا۔ آپ بول سکیں گی نہ میں۔ میں بھی آپ کی پوتی ہوں۔“

جب اقصیٰ نے دوستی کا لحاظ نہ کیا۔ سفینہ پھپھونے رشتے کا بھرم نہ رکھا۔ پھر اب اور الزام نہیں۔

”اچھا بیٹی۔ جیسی تمہاری مرضی۔ کیسے روکوں۔ تم بھی حق پر ہو۔“

کمرے سے اپنا سامان اکٹھا کیا۔ کپڑے سوٹ کیس میں بھرے۔ ایک بیگ میں ضروری چیزیں۔

”پھر آؤں گی۔ فکر نہ کریں۔ بوا کو لے جاؤں گی۔ وہ بس میں بٹھا کر آجائیں گی۔“

دادی اس کے ارادے کی مضبوطی۔ لب جھپ تیاری کرتے دیکھتی رہیں۔ دونوں چیزیں کھینچتی ہوئی باہر نکلی۔ چچی کو بتایا۔ بوا سے بات کی۔ چچی شنو پھپھو کو بتانے دوڑیں۔ جو کھانے کے بعد آرام کر رہی تھیں۔

فورا ”آئیں۔ اس کی ایکس نہ سنی۔ سامان برآمدے میں چھوڑا۔ شنو پھپھو کے ساتھ ان کے کمرے میں آگئی۔

”سنو فخر! میں تمہیں روکوں گی نہیں۔ مگر اس طرح اکیلی۔ میں تمہیں اکیلی نہیں جانے دوں گی۔ اب تم میری ذمہ داری ہو۔ میں خود تمہارے ساتھ چلتی۔

مگر خالہ جان مجھ سے ناراض ہیں۔ میری شکل دیکھنا نہیں چاہتیں۔ تمہیں باہر سے ہی چھوڑ کر آجانی۔ مگر

۔ وہاں سے فورا ”واپسی۔ ہمت نہیں ہے۔ تھک جاتی ہوں۔ ہمت کر لوں گی۔ یقین کرو۔ مگر ابھی نہیں۔ کل صبح۔ میرا دل داغ صبح سے اس قضیے کو پنپانے میں۔ تھک گئے ہیں۔ دن میں تو واپسی بھی آسان ہو گی۔ اس وقت اگر گئے۔ تو مجھے رات ہو جائے گی واپسی میں۔ میں تو یہاں کے راستے بھی بھول گئی ہوں۔ ساہیوال کے تو پھر۔ مجھے وہاں کی بسوں کا بھی علم نہیں نہ ٹرین کا۔“

”پھپھو! مجھے سب معلوم ہے۔ میں جاسکتی ہوں۔ اکیلی بھی مشکل نہیں ہے۔“ کبھی اکیلی گئی تو نہیں تھی۔ مگر آج۔

”میں نے کہاناں۔ اب تم میری ذمہ داری ہو۔ تمہیں جانا بھی چاہیے۔ رخصتی تو تمہارے ہی گھر سے ہوگی۔ اثر سفینہ کو گھر لے گیا ہے۔ دیکھو۔ وہاں اب کیا۔“ آزرہ تھیں۔ فخر کو ترس اٹھا۔

”اچھا۔ چلیے میں کل چلی جاؤں گی۔“ انہیں تسلی دی۔ وہ خوش ہو گئیں۔ بہت ہی سادہ دل صاف دل۔ محبت کرنے والی ہستی۔ وہ انہیں بچپن سے دیکھ رہی تھی۔ گھر میں سب ہی اسے ڈانٹ دیتے۔ شنو پھپھو نے کبھی اس پر اعتراض نہیں کیا ہمیشہ پیار سے مسکرا کر اسے سمجھایا۔ اور اب حمزہ کی بے ہودہ گوئی نہ جانے وہ اس کے بارے میں کیا رائے رکھتی ہوں گی۔

موجودہ حالات میں۔

”پھپھو۔ آ۔ آپ نے اقصیٰ کے بارے میں کیوں نہیں سوچا۔ میں تو کچھ بھی نہیں ہوں۔ اس کے مقابلے میں وہ خوب صورت بھی ہے۔ لائق۔ یعنی کہ۔ اور اس کے والد کی اعلا ابوزیشن ہے۔ سفینہ پھپھو آپ کی سگی بہن ہیں۔“ فی الحال حمزہ کے بارے میں بات کرنا مناسب نہ سمجھا۔

شنو پھپھو تڑپ گئیں۔ فخر کو کھینچ کر قریب کر لیا۔

”ہاں سچ ہے۔ مقابلہ ہی کیا ہے؟ تو سنو۔ تم میری اپنی ہو۔ وہ غیر خاندان کی ہے۔ تم میرے بے حد پیارے عزیز بھائی اور بہترین پیاری دوست کی بیٹی۔ جو میری مند بھی بنی۔ ہم میں اتنی چاہت تھی۔ کہ سب



انہیں بتایا کہ میں نے اسے اثر کے لیے نامزد کر دیا ہے۔ تو بہت خوش ہوئیں۔“  
 شنو پھو کے چہرے پر روشنی سی پھوٹ رہی تھی۔  
 پرانی یادیں۔ خوشگوار یادیں۔ نہ جانے انہیں کیا کیا یاد آ رہا تھا۔

”میری اور شمر کی دوستی تو تھی ہی۔ خالہ جان پہلے لاہور میں ہی رہتی تھیں۔ ہم دونوں نہ صرف یہ کہ خالہ زاد بلکہ۔ کلاس فیلو بھی۔ اثر کے والد اور تمہارے والد میں بھی دوستی تھی۔ رشتے اس طرح جڑے کہ پھر میں اور تو نہیں ہم ہو گئے۔ ہر جگہ ساتھ، ہر خوشی ساتھ، کوئی چھوٹی موٹی پریشانی بھی مل بیٹھ کر دور کر لیتے۔ غم تو کہیں تھا ہی نہیں۔ خوشیاں، قیمتی، جچھے، خوش قسمتی کا مہربان برندہ ہمارے ساتھ اڑتا پھرتا۔ پھر نہ جانے کس کی نظر لگی۔ کہتے ہیں۔ ہماری خوش قسمتی بردشمن بھی رشک کرتے تھے۔ پھر وہ برندہ جانے کس کے پاس چلا گیا۔ خوشیاں پانی کے بلبلے کی طرح پھوٹ گئیں۔ سب جدا تر ہو گئے۔ میں تو پھر بھی۔ اثر اور تمہیں لے کر خالہ جان کے ساتھ رہنا چاہتی تھی۔ خالو جان ساہوال میں گھر بنا چکے تھے۔ میں نے عدت کے دن وہیں گزارے۔ پھر رسم و رواج کے مطابق عدت کے بعد میکے آئی۔ یہاں تم بھائی اور شمر نے میرے دکھوں پر مرہم رکھا۔ میرا دل لگ گیا۔ شمر اور بھائی تمہیں میرے پاس چھوڑ کر کسی شادی میں شرکت کے لیے گئے اور ایسولینس میں جنازے آئے۔ اپنا غم سنبھالتے سنبھالتے ادھ موٹی ہو رہی تھی۔ کہ یہ ناقابل برداشت صدمہ۔ کتنے دن اس گھر میں سناٹے کا دور رہا۔ اماں کا حوصلہ، ہمت اور برداشت۔ انہی نے سب کو تسلیاں دے کر۔ اثر اور تمہارے حوالے دے کر۔ مجھے زندہ رہنے پر مجبور کیا۔ ورنہ میں تو۔“

انہوں نے سر تکیے پر ڈال دیا۔ آنسو یوں روانی سے بہہ رہے تھے۔ جیسے ابھی جنازے اٹھے ہوں۔  
 فجر نے ان کے آنسو انگلیوں کے پوروں میں اٹھائے۔

ایک جان دو قالب کہتے تھے۔ اور پھر۔ میری یتیم چاری بیٹھی۔ اثر کی جیسی، مجھے یہی لگا۔ تم دونوں میں فرق نہیں اور شروع سے میں چاہتی تھی کہ تمہیں اپنے ساتھ رکھوں۔ میں پرورش کروں۔ اپنے بھائی اور اپنی دوست کی محبت کا قرض ادا کروں۔ اگر دوسرے ملک کا معاملہ نہ ہوتا تو یہ ممکن بھی تھا۔ حالات ہی ایسے ہو گئے کہ۔“

سرد آہ بھر کر چپ ہو گئیں۔ نہ جانے بے چاری کے کیا کیا ارمان تھے۔ جو دوسرے ملک جا کر تشنہ رہ گئے۔

”لیکن میں نے سوچ لیا تھا۔ میں تم سے دور نہیں رہوں گی۔ میں نے اس لیے اثر کی تربیت اس طرح کی کہ وہ یہاں کے معاشرے میں اچھی نہ رہے۔ بار بار اسے یہاں بھیجتی کہ سب سے تعلق رہے اور خاندان کے طور طریقوں سے واقف ہو۔ میں اسے تمہارے لائق بنانا چاہتی تھی اور وہ بن گیا۔ جب اس نے خود تم کو دیکھا، بار بار واسطہ پڑا۔ اور جو میں چاہتی تھی۔ ویسا ہی ہوا۔ یعنی وہ تم کو پسند کرنے لگا۔ میں اچھی طرح جانتی ہوں یہاں کے لوگوں کی ذہنیت، مگر تمہاری کسی جگہ شادی ہو جاتی اور سسرال قدر دان نہ ہوتی۔ تمہیں محبت نہ ملتی۔ یا تمہاری بیٹی تمہارے لیے سزا بن جاتی۔ میں اپنے مرحوم بھائی اور اپنی عزیز دوست، بھابھی، بہن، نند، ارے کتنے رشتے جمتے ہیں۔ ان کو کیا جواب دیتی۔ میں تمہارے سامنے ہمیشہ شرمندہ رہتی۔ اور کوئی مداوانہ کر پاتی۔ تم جب پیدا ہوئیں۔ میں نے کہا۔ بس یہ میری ہے۔ میرے اثر کی سب ناراض ہوئے کہ کیا جاہلانہ ذہنیت ہے۔ مگر۔ تمہارے اور اثر کے والد۔ بہت خنے تھے۔ خوش ہوئے۔ پہلے ہی کئی رشتے آپس میں بنے تھے۔ شنو نے ایک نیا رشتہ بھی استوار کر لیا۔ مجھے یاد ہے۔ اثر پیدا ہوا۔ مجھ سے زیادہ تمہاری ماں نے خوشی منائی۔ گانے گائے۔ تحفے۔ ہر دن کچھ نہ کچھ لے آتی تھیں۔ تم کئی سال بعد پیدا ہوئیں۔ سب نے بے حد خوشی منائی۔ خالہ جان۔ کو کچھ مایوسی ہوئی۔ جب میں نے



”پھوپھو پلیز اب تو میں بھی رونے لگوں گی۔ ہاں۔“  
اس کی آواز میں بھی آنسوؤں کا گولا پھنس رہا تھا۔ ماں  
باپ کی موت کو تو وہ بھول چکی تھی۔ مگر شنو پھوپھو کے  
آنسو۔ کتنا صدمہ انہوں نے سہا ہو گا۔ وہ خود تو ماں  
باپ کے لیے کبھی نہیں روئی۔ لیکن یہ۔ ایسی ہوتی  
ہے دوستی اور محبت۔ رفاقت۔ ایک انصاف ہے۔ نہ  
دوستی کی لانج رکھی نہ رشتے کا بھرم۔  
شنو پھوپھو مسکرائیں۔ اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ محبت سے  
اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”نہ کھایہ ہے فرق۔ اس دن میں سفینہ کے گھر بھی  
اسی طرح رونے لگی تو اقصیٰ نے مذاق اڑایا۔ کہ اتنے  
برسوں میں تو مرنے والوں کی ہڈیاں بھی گل گئی ہوں گی  
”آپ یوں آنسو بہا رہی ہیں۔ جیسے ابھی جنازے اٹھے  
ہوں اور تم آنسو پونچھ رہی ہو۔“ وہ جھینپ گئی۔ ”ج  
پھوپھو! مجھے اپنی ماں یا باپ تو یاد نہیں۔ نہ ہی احساس ہے  
ان کے نہ ہونے کا مگر آپ کو اتنا احساس ہے۔ تو محبت  
بھی کتنی ہوتی ان لوگوں سے۔“

”ہاں۔ سب کچھ محبت ہوتی ہے۔ یہی محبت تم  
سے ہے۔“ وہ اداسی سے پھر بولنے لگیں۔ ”خالہ جان  
تمہیں لے جانا چاہتی تھیں۔ میں نے کہا میں آؤں گی  
تو فجر کو لے آؤں گی۔ مگر ماں میرے رشتے آنے  
لگے۔ میری خوب صورتی میرے لیے میری جوانی۔  
ابا اماں کے لیے خطرہ بن گئی۔ حالانکہ میں۔۔۔ تم دونوں  
کے سہارے پوری عمر گزار سکتی تھی۔ خالہ جان کو  
بہت صدمہ ہو گا۔ اس لیے ان کو میری شادی کا بتایا ہی  
نہیں۔ جب انہوں نے سنا بے حد ناراض ہو میں۔ مجھ  
سے ہر رشتہ توڑنے کا اعلان کر دیا۔ میں دعویٰ سے آئی  
ان کے پاس گئی۔ انہوں نے بات کی نہ اثر کو پار کیا۔  
مگر میں نے دیکھا۔ میری غیر موجودگی میں۔ وہ اثر کو لپٹا  
لیتی ہیں۔ بہت پیار کرتی ہیں۔ پھر میں اکثر اسے اکیلا  
چھوڑ کر ادھر ادھر چلی جاتی۔ وہ مجھ سے مخاطب ہوتا  
درکنار۔ کھانے کا بھی نہیں کہتیں۔ بس کھانا میز پر رکھا  
اور ہٹ گئیں۔ ایسی صورت میں کب تک رہتی۔  
اس کے بعد جب آنا ہوتا۔ اثر کو کسی کے ساتھ بھیج

دیتی۔ پھر آسٹریلیا۔ امریکہ غرض میں خانہ بدوش ہو  
گئی۔ اثر کی اسکو لنگ شروع ہو گئی۔ پھر بھی۔ میں  
لائی رہی۔ تعلق نہ ٹوٹے۔ خالو جان فوت ہوئے تو۔  
اثر کے والد کا جائیداد میں جو ترکہ تھا۔ وہ رقم کی صورت  
مجھے دیا اور گھر بھی آدھا تمہارے لیے آدھا اثر کے نام  
کر دیا۔ بہت ہی منصف مزاج اور حساس تھے وہ۔ اب  
وقت آگیا کہ میں اپنا ارمان اور تمہارے لیے جو میرا  
منصوبہ تھا اسے پورا کرتی۔ اماں سے ذکر کیا۔ وہ تو خود  
بھی۔ میں تو رخصتی بھی کر لیتی۔ اماں نے کہا اثر اپنا  
گھر بنالے پھر اس کے علاوہ بہنوں کے بڑے ارمان  
ہیں وہ اور ان کے والد بھی شریک ہونا چاہتے ہیں۔ مجھے  
جلدی یہ بھی کہ۔ مضبوطی کر جاؤں۔ نہ جانے اب  
کب آنا ہو۔“

شنو پھوپھو آج دل کھول کر دکھا رہی تھیں۔ وہ متاثر  
ہو گئی۔

چچی چائے لے آئیں۔ وہ فجر کو مسکرا مسکرا کر دیکھ  
رہی تھیں۔ انہیں آج کے معرکے میں بہت لطف  
آیا۔ سفینہ کی دولت مرتبے کی فجر نے پرواہی نہ کی۔  
خوب سنائیں۔ وہ بہت خوش مزاج تھیں۔ ہر حال میں  
خوش رہتیں۔ میاں سے بھی کبھی جھگڑا ہوتا۔ ان کی  
ڈانٹ ڈپٹ کو ادھر ادھر ڈال دیتیں۔ جیسے کسی نے  
آنچل ایک اس کندھے پر دوسرا دوسرے کندھے پر  
ڈال دیا ہو۔ ڈانٹ سنی۔ اور سامنے سے ہٹ گئیں۔  
چند منٹ بعد آکر خاص طور پر میاں سے یوں مخاطب  
ہوئیں جیسے انہوں نے کسی اور کو ڈانٹا ہو۔ وہ بھی ہنس  
کر کہتے۔

”بہت ہی ڈھیٹ شے ہو روی بیگم۔“

”تو کیا روتی رہوں کیوں بھئی۔ تمہارے ساتھ  
ہنسوں گی بھی بسوں گی بھی اور پھنسوں گی بھی۔“

رات فجر دادی کے پاس ہی سوئی۔ شنو پھوپھو کی باتیں  
کرتی رہی۔ انہوں نے بھی کئی باتوں کی تصدیق کی۔

”تم پیدا ہوئیں تو شنو نے کہا۔ یہ میرے ٹھیکرے  
کی مانگ ہے۔ ٹھیکرا تو ملا نہیں چینی کی پلیٹ میں سکے

ڈال کر شمر کے آگے رکھا۔ اس پر تمہارے دادا بہت



ناراض ہوئے کہ جاہل لڑکی ہے۔ یہ اس طرح کرنے سے کیا ہوتا ہے۔ جوان ہو جائیں تو عمل کے ذریعے خواہش پوری کرنا۔“

”ٹھیکرے کی مانگ۔ یہ کیا ہوتا ہے۔“ فخر بن کر

ہی پریشان ہو گئی۔

”ہوتا تھا۔ پہلے زمانے میں بچی کے سید اہونے کے بعد رشتہ ایسے دیا جاتا تھا، ٹھیکرے میں سگہ ڈال کر بچی کے ماں باپ کے سامنے رکھا جاتا تھا کہ یہ میری ٹھیکرے کی مانگ ہے۔ بچی کے ماں باپ مان گئے تو سگہ قبول۔ بس یہ سید انٹی منگنی سمجھو۔ اب اور کوئی رشتہ بھی نہیں دے گا۔“ بچہ کو غرہوا (میری تو چینی کی پلیٹ کی مانگ ہوئی پھر)

\*\*\*

صبح پھر فخر کی روانگی کا غلغلہ ہوا۔ چچا نے کہا۔

”میں چھٹی لے کر تمہیں لے جاتا۔ مگر دو تین دن بہت مصروفیت ہوگی۔ ورنہ میں تمہیں جانے نہ دیتا۔“

”پھوپھل رہی ہیں میرے ساتھ ویسے میں جاسکتی ہوں۔ اکیلی بھی۔“ حکیمانہ دانا چاہا۔

”آپا کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ وہ نہیں جاسکتیں۔ اب ایسا ہے کہ۔ اثر چلا جائے گا اپنی داوی سے مل بھی لے گا۔ ورنہ انہیں شکایت ہوگی کہ نواسی کو اکیلا بھیج دیا۔“

”میں اکیلی جاسکتی ہوں چچا۔“ اس نے جتایا کہ وہ اثر کے ساتھ نہیں جائے گی۔

”ہاں ٹھیک ہے۔ ٹرین میں تم اکیلی ہوگی اپنے ڈبے میں۔ اثر دو سرے ڈبے میں۔ مگر یہ تمہاری ٹائی کی تسلی کے لیے ساتھ جائے گا۔ ورنہ وہ کیس گی۔“ (اور اثر کو تو جیسے آفس میں کام ہو گا نہیں۔ منہ دیکھنے کے لیے رکھا ہے انہیں۔ حسن کا دیوتا جیسے۔) چڑ گئی تھی۔

”ہاں بھی اپنے کمپارٹمنٹ میں تم اکیلی ہی ہوگی۔ اثر کیا عورتوں میں کھس کر بیٹھے گا؟ اصل میں اثر کے آفس کے فینجنگ ڈائرکٹر لندن میں فونٹ ہو گئے ہیں۔ ان کے سوگ میں آفس میں چھٹی ہے تین دن کی۔“

لو ان کو بھی آج ہی مرنا تھا۔ اچھا اور چچا تو جیسے جانتے ہیں۔ اب تو عورت مرد ایک جگہ ہی بیٹھ جاتے ہیں۔ مزید چڑ کر منہ بنا لیا۔ مگر بحث بے کار تھی۔ چچا

اف غصیلے۔

وہ اندر گئی۔ دادی کے پاس شنو پھوپھو بیٹھی تھیں۔ اثر بھی تھا۔ اسے آنا دیکھ کر باہر چلا گیا۔ شنو پھوپھو رنجیدہ تھیں۔ دونوں کو سلام کر کے گلے لگ کر فکرنہ کرنے کی ہدایت دیتی باہر آئی۔ چچا انہیں چھوڑ کر اپنے آفس جانے گئے۔ چلو ٹیکسی کا کرایہ بچا۔ دادی باہر نکل کر آگئیں۔ بے چینی۔ نصیحت بھی لازمی تھی۔

”دیکھو بیٹا! ہمیں علم ہے۔ تم بہت دلیر ہو۔ ہمت والی بھی ہو۔ مگر دنیا کی نظر میں تو لڑکی ہی ہو۔ مرد کا سایہ ساتھ ہو۔ وہ بھی مضبوطی کا سبب بن جاتا ہے۔ کسی بھی ناخوشگوار حادثے کی صورت میں۔ مرد کی ہمراہی۔ تقویت کا باعث ہوتی ہے۔ اور اب نہ وہ غیر ہے نہ نا محرم۔“

اثر کے ہمراہ سفر اسے کب ارمان تھا۔ عجیب نامعلوم حالات میں یک دم نکاح کا شوشہ چھوڑا گیا اور کم بخت بلکہ بد بخت حمزہ کا نام لیا ہوتا دادی نے۔ کتنی خوشی ہوتی اسے۔ ہنس مکھ چلبلا۔ شوخ اور امیر زادہ۔ لوحی کیسا دوسرا کمپارٹمنٹ اور کون سی الگ سیٹ۔ چچا بس اسٹاپ کی طرف مڑ گئے۔

”ٹرین اس وقت نہیں جاتی۔“ کی اطلاع۔ بس اسٹاپ پر پہنچ کر دی۔ انہیں چھوڑ کر خدا حافظ کہا یہ جاوہ جا۔

بس تیار تھی۔ اثر ٹکٹ لے آیا۔ دو سیٹیں برابر برابر۔ وہ جلتی بھنتی کھڑکی کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ کھڑکی کے باہر دیکھتی رہی۔

اثر دیدہ دلیری سے مسکرا رہا تھا۔ ”کچھ کھاؤ گی؟ لاؤں؟“ جی میں آیا کہے۔ تمہارا کلیجہ۔ چپ رہی کہ ساری زندگی یہی کرتا تھا۔ بس روانہ ہوئی۔ شہر کے باہر پہنچی کہ ہچکیاں لینے لگی۔ پھر تشنچ سا ہوا۔ اف آخر رک گئی۔

”اجن میں خرابی ہے۔ کچھ دیر لگے گی۔“ کلہنوں نے بلند



آواز میں صور پھونکا۔ گو کہ سب سمجھ ہی گئے تھے۔  
سواریاں سب اتر گئیں۔ مرد خواتین کے نام پر اگلی  
سیٹ پر ایک بوڑھی سماعت سے محروم عورت۔ فجر  
سے پوچھتی رہی۔ ”گڈی کیوں رک گئی۔“ اس کا  
ساتھی مرد تو اسے کچھ بتا کر اتر گیا تھا۔ جو اس نے سنا  
نہیں تھا۔ گاڑی کے رکتے ہی وہاں سگریٹ پان  
والے۔ شربت والے، چاکلیٹ ٹافی جوس والے۔  
پھل والے۔ جمع ہو گئے۔ لمحہ بھر میں ہی۔ نہ جانے  
کہاں چھپے ہوئے تھے۔

اثر کی بن آئی۔ کبھی جا کر چاکلیٹ ٹافی لاتا۔ کبھی  
جوس کے پیکٹ کبھی چیس۔ وہ غصے میں اس سے  
جھپٹتی اور کھاتی رہی۔ حتیٰ کہ سوکھے مارے کیلے جو  
لایا۔ وہ بھی کچر کچر جباٹی۔ کھانے سے پہلے اور بعد میں  
بھی اثر کو کھور کر دیکھا۔ وہ لاپرواہی سے بڑی بی کو بلند  
آواز میں حالات حاضرہ سے باخبر کر رہا تھا۔ حسب  
عادت پھر کہیں غائب ہوا۔ آخر لوگ آ آ کر بیٹھنے لگے۔  
بڑی بی نے پوچھا۔

”گڈی واہ وا ہو گئی۔“

فجر نے سر ہلا کر اقرار کیا۔ وہ اچھل پڑیں۔  
”میرا منڈا۔ میرا منڈا کدھر گیا۔ کتھے رہ نہ  
جاوے۔ میرے منڈے نوں۔“  
”خیر منڈا آگیا۔ جوان جہاں۔“

بس اشارت ہو گئی۔ بچی ہوئی سواریاں دھما دھم  
چڑھنے لگیں۔ اس کے ساتھ والی سیٹ خالی دیکھ کر  
موچھوں پر بل دیتے کئی لوگ بیٹھنے کو ہوئے۔ اس نے  
بس رکھ کر سیٹ خالی نہیں ہے کا تاثر بھی دیا۔ پھر بھی  
کوئی کن اکیوں سے دیکھا۔ جائزہ لیتا گزرتا وہ بھنا کر  
کہہ دیتی۔

”بیچھے جاؤ اپنی سیٹ پر۔“ گھورتا ہوا چلا جاتا۔  
ڈرائیور سے شکایت کرنی چاہیے۔ مگر بس خاصی آگے  
بڑھ چکی تھی۔ سرکتی ہوئی۔ جب اثر ایک پھولا ہوا  
شاپر لیے آیا۔ نہ جانے کیا لے آیا تھا اب۔ (شاپنگ تو  
خوب کرائے گا۔ جل کر سوچا)

اپنی سیٹ پر رکھا پرس دیکھ کر مسکرایا۔ فجر نے پھرتی

سے پرس جھپٹ لیا بیٹھ گیا۔

”جج کر کے آئے تھے بڑے میاں۔ جاء نماز لیے  
بیٹھے تھے۔ میں نے اماں جان اور بی اماں کے لیے لے  
لیں۔ تمہارے لیے بھی لے لوں۔“

ہائے معصومیت بس نے اسپینڈ پکڑی نہیں تھی مگر  
آگے بڑھ رہی تھی۔ ابھی میں کہہ دوں ہاں بھاگتا ہوا  
جائے گا۔ بڑے میاں کے سامنے جو بھی جیسی بھی جاء  
نماز کھسوٹ کر (دیکھے بغیر) پیسے پھینک کر دوڑ لگائے  
گا۔ بس کی طرف ہنس اسپینڈ پکڑ چکی ہوگی۔ چیخیں  
مارتا۔ ”روکو روکو بھئی۔ او بس والے میں رہ گیا  
ہوں بھائی۔“ خاصا مزاحیہ سین ہوگا۔ مسکرائی۔ اے  
کاش۔ مگر (جھرجھری) اتنے عجیب عجیب اجنبی  
موچھوں والوں کے ساتھ اور سیٹ خالی دیکھ کر کوئی  
موچھ موڑتا آکر بیٹھ ہی گیا۔ تب (مرد کا تو سایہ بھی  
تقویت کا باعث ہوتا ہے) نفی میں سر ہلا دیا۔ گھبرا کر۔  
مزاحیہ سین کے نظارے سے نکل آئی۔ وہ بھی آفت  
ہنس رہا تھا۔

”اب اتنا بھی احمق نہیں بنا۔ نہ مجنوں ہوا ہوں۔  
کہ آپ کے اشارہ کرتے ہی۔ چھلانگ لگا کر بس سے  
کوڈ کر بھاگوں گا۔ اور جاء نماز جھپٹ کر۔ پیسے پھینک  
کر دوڑ لگاؤں گا“ بس کے تعاقب میں کہہ کر بھائی  
روک روک مجھے پکڑ۔ اور بس دور ہوتی جائے گی۔  
پھر تمہارے ساتھ کوئی اکھڑ ساتی پگڑا باز آکر بیٹھ  
جائے گا۔ کیسا پر لطف سین ہوگا۔“ سراونچا کر کے  
قہقہہ لگایا۔

وہ کھڑکی سے جھانکنے لگی۔ مرد کا سایہ۔ اپنے مرد کا  
۔۔۔ مسخرے کا؟

آج تین سال گزرنے کے بعد بھی۔ اس سفر کی یاد  
آتے ہی مسکراہٹ دوڑ جاتی۔ اثر سے چاہے جتنا بھی  
مضبوط بندھن تھا۔ مگر تعلقات بہت معمولی تھے۔  
اماں جان سے ملنے کئی بار اس کی موجودگی میں آیا۔ مگر  
ایک یا دو دن رہا۔ امریکہ بھی جانا پڑا۔ شنو پھوپھو کچھ بیمار  
ہوئیں۔ پھر ان کے شوہر۔ شنو پھوپھو آنہ سکیں۔ نہ تو  
اثر نے روابط برہائے۔ نہ وہ آگے بڑھی۔ اماں جان



کے ہاں لاڈلی بیگم کی کھوجتی نظروں سے بچنے کے لیے وہ حتی الامکان اثر کا سامنا نہ کرتی۔ وہ بھی محتاط رہتا اس بارے میں جب وہ اسے اسٹیشن لاکر ٹرین میں بٹھا رہا تھا۔ باقاعدہ بزرگی طاری کیے رہا۔ وہ ایک دن ٹھہر کر اثر کے ساتھ آ سکتی تھی۔ مگر لاڈلی بیگم اور ماموں کے سلوک کے بعد۔ ان کا سامنا کرنا مناسب نہ سمجھا۔

سفینہ پھپھو نے اس سے مل کر پرانی رنجش دور کر دی تھی۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ کیا اقصیٰ بھی اس واقعے کو بھلا چکی ہے یا نہیں۔ اب جبکہ اس کی شادی بھی طے ہو گئی تھی۔ اس کی مرضی بھی تو اس میں شامل ہوگی۔ لی ماں سے پوچھنے کی ہمت نہ ہوئی۔ تین سال میں وہ نواقصیٰ کو معاف کر چکی تھی۔ اب سفینہ پھپھو دعوت دے گئی ہیں۔ تو دیکھنا چاہیے۔ اب بھی وہ اسے دوست سمجھتی ہے یا ادنیٰ نوکر جتنی حیثیت۔ اس کے منگیتر کی تصویر ہی دیکھ لے۔

”لی ماں! پھپھو کے گھر چلیں؟“

”اثر کے ساتھ چلیں گے۔ ذرا صبر کرو۔“

”چچا کے ساتھ چلیں۔ کوئی بات ہوئی تو۔ وہ سنبھال لیں گے۔ کیا کسی خطرے کا ڈر ہے؟“

وہ تو سمجھتی تھی۔ اقصیٰ اور حمزہ اپنے منگیتروں میں لگن ہوں گے۔ اتنے دن بعد تو انسان ساری رنجش بھلا دیتا ہے۔ سفینہ پھپھو کی طرح انہوں نے خود ہی تو کہا تھا۔ اگر اثر نہ بھی ہو تو کیا ہو جائے گا، چچی نے مخالفت کی۔ ”اثر کے بغیر جاؤ گی تو وہ سمجھیں گے اثر نے اللہ نہ کرے۔ تمہیں چھوڑ دیا ہے۔ جس کی بہن بھائی کی کوشش ہے اور تمنا بھی۔ اس لیے ماں کی بات مانو۔“

عشا نے بتایا۔ ”اب اثر بھائی اپنے گھر رہتے ہیں۔ بڑا خوب صورت گھر بنایا ہے۔ اکیلے رہتے تھے۔ اب سرونٹ کوارٹر میں فیملی آ گئی ہے۔ میاں چوکیداری اور مالی کام کرتا ہے۔ بیوی کھانا پکاتی ہے اور صفائی کرتی ہے۔ پھپھو نے اب تک گھر نہیں دیکھا۔ جب آئیں گی۔ تو ان کا اور فروراجا کے کمرے

کھلیں گے۔

”اور سفینہ پھپھو نے دیکھا ہے؟“

”نہیں۔ حمزہ بھائی کی اثر بھائی سے لڑائی ہوئی تھی۔ تو پھپھو تو ان سے نہیں ملتیں۔ اثر بھائی ان سے جا کر مل آتے ہیں کبھی کبھی۔ جب حمزہ بھائی کہیں گئے ہوں۔ دوسرے شہر تو۔“ اثر سے لڑائی تو پھر حمزہ نے ابھی تک۔

چچی نے بتایا ”تم آگئیں۔ اچھا ہو گیا شنو آیا کا پتا نہیں۔ مگر ماں تمہاری رخصتی میں دیر نہیں کرنا چاہتیں۔ ویسے بھی دیر ہو چکی ہے۔ شنو آیا کے میاں کب صحت یاب ہوں گے کب وہ آئیں گی۔ ایک کام ہونا ہے۔ تو ہو ہی جائے۔ اس سے پہلے کہ کوئی سازش۔ ارے کچن کی خبر ہی نہیں۔ دیکھ کر آؤں۔“

”لو۔ میں کہاں بھاگی جا رہی ہوں۔ جلدی کا ہے کی ہے۔ اثر نے تو کبھی۔ ذکر نہیں کیا۔ ماں جان سے تو کہتا۔ وہ فوراً بغیر کسی بارات کے رخصتی کروا دیتیں۔ اکیلا۔ گھر میں کتے لوٹتے ہوں گے۔ کیا گھرواری کرے گا۔ اور میں تو بالکل کچھ نہیں کروں گی۔

گاڑی تو شاندار ہے۔ واہ بھئی تین سال میں اتنی ترقی اسٹیشن آنے تک چند جملے ہی بولے۔ وہ تو غصے میں لاڈلی بیگم کے بچے ادھیڑ رہی تھی۔ اور وہ غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش۔

”کوئی بات نہیں۔ آرام سے ہو جاتا ہے۔ ہو جاتا ہے۔ کوئی بات نہیں ہم کسی کی فطرت بدل نہیں سکتے۔ سب مختلف مزاج کے ہوتے ہیں۔ پروا نہیں کرنا چاہیے۔ جلد بازی نقصان دہ ہوتی ہے۔ غصہ کسی مرض کا علاج نہیں۔ بہت سوچ کر سمجھ داری سے۔ حماقت سب سے بڑی دشمن ہوتی ہے اور جلد بازی حماقت کی وجہ بن سکتی ہے۔“

اس وقت تو وہ مشتعل تھی۔ اثر کی مختصر نصیحت پر اور بھی۔ گھر سے نکلتے ہوئے آنسو بہہ رہے تھے سڑک پر کھڑی رو رہی تھی۔ اثر کو دیکھتے ہی۔ بے بسی کا احساس جاتا رہا۔ مرد کا سہارا۔ اتنا مضبوط ہوتا ہے؟ گو کہ وہ خود کو بہت بہادر سمجھتی تھی۔ شاید اشتعال



کنزوری کی علامت ہو۔

”بی اماں۔ صبح چلیں؟ ان بادشاہ سلامت کا کب تک انتظار کریں گی۔“ (پتا تو چلے اقصیٰ کی مزاجی کیفیت)

”ٹھہر جاؤ۔ صبر کرو۔ میں کوئی نیا قصہ نہیں چاہتی۔ برداشت نہیں ہے مجھ میں اب۔ غصہ آگیا تو کچھ کہہ بیٹھوں گی۔ چاہے بعد میں پچھتاؤں۔“  
”ہیں؟ کیا کہہ بیٹھیں گی۔“ وہ گھبرائی۔  
”سفینہ سے تعلق توڑ لوں گی۔ زندگی بھر کے لیے بہت کچھ سن رہی ہوں۔“

”ارے نہیں میری وجہ سے بالکل نہیں اور بی اماں۔ غصہ حرام ہے یہ کسی مرض کا علاج بھی نہیں۔“  
بے خیالی میں اثر کی کہی بات دہرا دی۔ یاد آیا تو زبان دانتوں تلے دبائی۔ اسٹیشن پر یہی بیڑا رہا تھا۔  
”اب سوچ رہی ہوں۔ اثر کا گھر بھی اللہ رکھے بن گیا۔ تو بس۔“ رک گئیں کچھ کہتے کہتے۔  
”بس کون سی بس۔ اچھا بس بھی لے لی محترم نے۔ شاہزادے ٹھہرے بھی۔“ بیڑا کرپولی آخری جملہ۔

”اللہ چاہے گا۔ تو بس بھی لے لے گا۔“ اطمینان۔

”اور اس میں۔۔۔ بٹھائیں گے کس کو لاڈلے نواسے۔ آپ کو؟“ دانت پیس کر (رتی بھی رتی)  
دادی ہنس پڑیں۔ اسے پکڑ کر کہا ”آپ کو۔“ وہ شٹا گئی۔

”میں آ آمیں کیوں میرا کیا تعلق۔“  
”سب سے بڑھ کر۔ سب سے زیادہ۔ سب سے بڑا تعلق۔ سب کچھ۔“  
”آپ کی یادداشت کنزور ہو گئی ہے۔ میں نے ہر تعلق سے دست برداری اور طلاق دے دی تھی۔“  
”فضول باتیں مت کرو۔ خبردار آئندہ یہ لفظ منہ سے نکلا۔ عورت کو ایسا حق ہے نہ اختیار۔“

”اللہ نے تو مرد عورت کو برابری کا درجہ دیا ہے۔ تو یہ اختیار صرف مرد کو کیوں؟“

”کیونکہ پھر تم جیسی بے وقوف کم علم لڑکیاں۔ اسی طرح احقانہ فیصلے کرتیں۔ میں تو چاہتی بھی نہیں۔ کہ تم سفینہ کے گھر جاؤ۔ اقصیٰ کو ملنا ہو گا تو آجائے۔ مگر اس نے بھی یہاں آنا بہت ہی کم کر دیا ہے۔“

”میں تو اقصیٰ کو منگنی کی مبارکباد۔ بی اماں۔ مجھے جانا چاہیے ناں۔۔۔ پھر وہ جیسا چاہے۔“  
بی اماں چپ رہیں۔ ٹالنا چاہتی تھیں۔ لیکن احمق لڑکی۔

”کہاں شادی ہو کر جائے گی؟“ پوچھ لیا۔  
”فیصل آباد۔ لڑکے کا کپڑے کا کاروبار ہے۔“  
کاروبار کا سن کر فحرج کی چیخ نکل گئی۔

”اوتی بڑا کاروبار ہے۔ اس میں چیخ مارنے کی کیا بات ہے۔ بہت لاڈلا ہے ماں باپ کا اور وہ ماں باپ کے ساتھ رہتا ہے۔ باقی کے چھ بھائی الگ گھروں میں رہتے ہیں۔“

”لاڈلا تو ہو گا ہی۔ جب ماں باپ کو اسی کے ساتھ رہنا ہے۔“ چھ بھائی اور وہ۔ لاڈلا۔  
”اقصیٰ گئے سامنے کوئی بات نہ کرنا۔ وہ فیصل آباد کے نام سے جڑ جاتی ہے۔“

چچی نے بھی بتایا کہ وہ فیصل آباد سے لاہور نہیں بلکہ کراچی شفٹ ہونے کا منصوبہ بنا رہی ہے۔ ماں باپ کسی اور کے ساتھ رہ سکتے ہیں۔ وہ تو اب بیوٹیشن کورس کر رہی ہے۔ ڈانس سیکھ رہی ہے۔ فیصل آباد میں تو اپنے ہنر کا مظاہرہ نہیں کر سکے گی۔ اور اصل قصہ ساس سر سے چھٹکارا بھی ہے۔“

ڈانس تو اقصیٰ پہلے بھی کرتی تھی۔ خاندان کی شادیوں میں دوستوں کلاس فیلوز کی شادیوں میں فحرج کو ڈانس پسند نہ تھا۔ ہاں وہ گانے خوب گاتی تھی۔ اماں جان کی صحبت میں رہ کر اور بھی شوق ہو گیا تھا۔ ان کی فرمائش پر اکثر انہیں سنائی تھی۔ ان کو گاتے دیکھ کر ٹوکتی تھی۔

”اماں جان۔ دیکھئے سنیے۔ اس طرح کا گانا بھی سیکھ لیں۔ یاد رکھیے۔ پنجابی گیت وہ بھی پرانے تصوف کی جھلک لیے ہوئے ہمیشہ بہت مقبول رہے۔ آپ پتا



نہیں کسی صدی کے پوری لگاتی ہیں۔  
 ”اور تم نے جانے کو کسی جتنا کی زبان۔ خیر خفا نہ ہو۔  
 سناؤ بھی باز نہیں آؤ گی۔ ہوتا ہے مجھے۔“  
 ”اچھا تو سنہیے۔ ہاں کیا سر ہے۔ کیا الفاظ ہیں۔ مزا  
 آجاتا ہے۔“ کانے کا سوچ کر بھونسنے لگی تھی۔ میری  
 ڈاچی دے گل دینے لگیاں۔

میری ڈاچی دے گل دینے لگیاں  
 میں تو پھر مناؤں چلیاں  
 ڈاچی والیا سوڑ مہار دے  
 میرے ہتھ کٹور اے مانگاوا  
 میری ہتھ کٹور اے مانگاوا  
 میرا پیرولی انہاں راہواں دا

شاعر والیاں پیراں۔ پیراں ہو۔ پیراں  
 بے خیالی میں آواز اونچی ہو گئی۔ چچی تالیاں بجاتی  
 آئیں تو خیال آیا۔ وہ ساہیوال میں نہیں۔ لاہور میں  
 ہے۔

”واہ فجر۔ تم تو آج کل کی تمام نئی سگڑ سے زیادہ  
 اچھا لگاتی ہو۔ کچھ اور سناؤ۔ اقصیٰ کا ڈالس ہو۔ تمہاری  
 آواز زبردست مگر۔“

وہ فوراً ”جوش میں آگئی“ سچ چچی؟

”زیادہ خوش ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں  
 کاروباری لحاظ سے کہہ رہی تھی۔ گانوں کی وڈیو بنتی  
 ہیں۔ بہت بکتی ہیں۔ مگر اقصیٰ بہت اونچی چیز ہے اور تم  
 خیر کچھ اور سناؤ خالہ جان والا کوئی گیت۔“

چچی اماں جان کے قصے بہت شوق سے سنتی تھیں۔  
 اماں جان۔۔۔ فجر کو بہت یاد آئیں۔ مسکرا دی۔  
 اچھا سنئے۔

”میں نے رات کہوا خوب سنا  
 میں نے رات کہوا خوب سنا  
 ساس ہماری کہہ گئی تھیں  
 بہو چو لھے پہ ہانڈی چڑھا دیجوری  
 میں سیدھی سادی میں بھولی بھالی  
 سیاں کو چو لھے پہ بٹھا آئی رے  
 میں نے رات کہوا خوب سنا رے

ساس ہماری کہہ گئی تھیں  
 بہو بکری کو کھونٹے سے باندھ دیجوری  
 میں سیدھی سادی میں بھولی بھالی  
 سر کو کھونٹے سے باندھ آئی رے  
 میں نے رات کہوا خوب سنا رے  
 ساس ہماری کہہ گئی تھیں  
 بہو مرغی کو ٹاپے میں بند کر دیجوری  
 میں سیدھی سادی میں بھولی بھالی  
 منڈیا کو ٹاپے میں بند کر آئی  
 میں نے رات کہوا خوب سنا رے  
 میں نے رات کہوا۔

”ہائے“ اللہ چچی کو ہنسنے کا موقع دے کھلکھلا رہی  
 تھیں۔ ”اور بھی سناؤ فجر۔“

”واہ۔ آپ کو مزہ ہی پڑ گیا۔ خیر سنہیے؟“  
 سرو تاکماں بھول آئے پیارے مندویا۔  
 ساس ہماری بیان کھائیں چھالیا مندویا  
 میں بھاری الاپچی چابوں چونا چائے سیاں  
 سرو تاکماں بھول آئے

ساس ہماری مسہری پہ سوئیں۔ تخت پہ مندویا  
 میں بھاری چھپر کھٹ لیٹوں۔ نیچے سوئے سیاں  
 سرو تاکماں

”ارے بھئی یہ سیاں بھارا۔ ایسا کیوں تھا؟ اور مند  
 کہاں تھی۔ توبہ فجر ہائے میں کچن دیکھوں۔“ دوڑ  
 گئیں۔



ادھر فجر کو سفینہ پھپھو کے گھر جانے کی ضد۔ ادھر بی  
 اماں کو بغیر اثر کے جانے پر اعتراض۔  
 پھر ایک دن صبح ہی تشریف آوری ہوئی۔ ناشتا کر  
 کے آفس روانہ کام کی زیادتی مصروفیت کا بہانہ بکئی  
 دن یونہی گزر گئے۔ پھر چچی کو یاد آیا۔

”ارے ہاں۔ تمہاری دوست عنبرین آئی تھی۔ تم  
 بھی تو کسی کو خبر دیے بغیر۔ روانہ ہو گئیں اور وہاں جا کر  
 کسی سے رابطہ بھی نہیں کیا۔“



بیکم کا کوئی جملہ ایسا یاد نہ آیا۔ جس میں راستے میں نہ رکنے کا اشارہ ملا ہو۔

تینوں گیٹ میں جا گھسیں۔ واہ، ہریالی، پھولوں کے لاتعداد پودے لان کی سبز گھاس اور پورے پرچے پر چڑھی ہوئی آبیوی کی ٹیل۔ ملازمہ ہستی ہوئی آئی۔ پہچانتی تھی، عشاندا کو۔ فجر تو لان کی بہار میں گم تھی۔

”کمرے تو سارے بند ہیں جی۔ آئیے۔ لاؤنج میں“ میں ٹھنڈا لے کر آتی ہوں۔ ”بہت مہمان نواز تھی۔ مگر فجر نے انکار کر دیا۔ لان ہی اچھا تھا۔ باہر سے تو سجا اچھا ہی لگا۔ بابا رمضان نے نکلے سے نہ صرف اپنی پیاس بجھائی۔ بلکہ رکشہ بھی دھو دیا تھا۔



عبرین کی خوشی دیدنی تھی۔ فوراً ”فجر کا ہاتھ پکڑ کر تانی کے پاس لائی۔ بہت ہی ضعیف ناتواں خاتون تھیں۔ فجر نے بیکری سے کافی بسکٹ وغیرہ اور کیک لے لیا تھا۔ کیک تانی کی نذر کیا۔ بسکٹ کا شمار عبرین کو دیا۔ وہ چائے لینے چلی گئی۔ تانی فجر سے باتیں کرنے لگیں۔

”عبرین کی اگلے مہینے شادی ہو رہی ہے۔“ انہوں نے بتایا۔ ”لڑکا اولاد کی خاطر شادی کر رہا ہے۔ بیوی ہی کروا رہی ہے۔“

فجر دنگ ہو گئی۔ عبرین کی اماں آئیں۔ ان سے فجر نے پوچھا۔

”کیوں کر رہی ہیں بڑی عمر کے مرد سے شادی۔ عبرین کے ساتھ ظلم ہے۔ اسے اچھا رشتہ مل سکتا ہے۔ شکل کی بھی اچھی ہے۔ تانی نے بتایا کہ اسکول ٹیچر ہے۔ اپنا کماتی ہے۔ پھر۔“ عبرین کی اماں سنجیدہ ہو گئیں۔ تبسم غائب۔

”کون کرے گا اس کے۔ باپ نہ بھائی۔ جینر کے نام پر چھلا نہیں۔ کپڑے کے نام پر ٹانگا نہیں۔ لوگ گھر دیکھتے ہیں۔ پوزیشن۔ اس عورت کی مہربانی ہے کہ عبرین کو سو کن بنانے پر تیار ہو گئی۔ بہت شوق سے چلتا ہوا اسٹور ہے۔ اپنا ذاتی گھر ہے بڑا سا۔ میرا۔ میرا

فجر اس سے ملنے کے لیے بے تاب ہو گئی۔ چچی اسے ہنسی کا گول مپا کہتی تھیں۔ غبرین سیدھی سا دی بلکہ کچھ زیادہ ہی سادہ تھی۔ بے وقوف۔ اس کی باتوں پر سب بہت ہنستے تھے۔ چالاکی تھی نہیں اس میں۔ ایسے لوگ زیادہ ہی مشکل میں رہتے ہیں۔ اور وہ بچاری۔ یتیم تھی۔ نانا کے گھر رہتی تھی ماں کے ساتھ۔ ان کے خاندان میں لڑکی کی پیدائش پر باقاعدہ سوگ منایا جاتا تھا۔ غبرین اور اس کی بیوہ ماں کے ساتھ نانا کے گھر میں نوکروں جیسا سلوک ہوتا تھا۔ اس لیے وہ بھی سہمی ہوئی رہتی تھی بوکھلائی ہوئی۔ سوال کچھ کرو۔ جواب مختلف۔

فجر کی اس سے اسکول سے دوستی تھی پھر کالج میں بھی ساتھ رہا۔ بہت نیک صورت اور شریف تمیز دار۔ غبرین سے ملنے کو جانا چاہیے سوچا اور پروگرام بنالیا۔ چچی نے کہا ”بابا رمضان رکشے والا غبرین کے محلے میں ہی رہتا ہے۔ سامنے ہی آکر کھڑا ہو جاتا ہے۔ مجھے جانا ہوا لڑکیوں کو۔ اسی کے رکشے پر چلے جاتے ہیں۔“

فوری پروگرام طے ہوا۔ عشاندا کی چھٹیاں تھیں۔ بابا رمضان کو بلایا گیا۔ تینوں بیٹھ گئیں۔ جانے سے پہلے بی اماں حسب عادت بابا کو نصیحت کرنا نہ بھولیں۔

”تیز نہ چلانا۔ چاہے یہ جتنا بھی کہیں اور وہاں چھوڑ کر کسی اور سواری کے لانچ میں نہ چل پڑنا۔ واپس لے کر آؤ گے۔ تو ڈبل کرایہ دوں گی۔“

اب بابا جی بھلا کا ہے کو اسپیڈ پکڑیں۔ نصیحتوں کی گٹھڑی جو کندھوں پر دھری تھی۔ ڈبل کرایہ الگ۔ مجال تھی کہ گٹھڑی کو اس کندھے سے اس کندھے ہی سرکا دے۔

”اس سے تو پیدل ہی چلے جاتے۔“ عشانے اسے درغلانا چاہا، مگر نہ جی۔ بابا رمضان، منوج میں آکر تان اڑا رہے تھے۔ میرا لال دھڑا ملل دا۔

”ارے اپنا دیکھیں یہ سامنے کالے گیٹ والی کو تھی۔ اثر بھائی کی ہے۔ بابا جی ذرا ایک دو منٹ کو روکیں۔ اپنا چلیں اندر چلتے ہیں۔“ بابا جی کو پیاس لگی تھی۔ گیٹ کے باہر نکلا دیکھ لیا۔ فوراً ”رک گئے۔ بڑی



بھی ٹھکانہ ہو جائے گا۔ راضی ہیں مجھے ساتھ رکھنے پر۔

انہوں نے گلو کیر آواز میں اپنی مجبوری کی داستان سنائی۔

”اماں کی زندگی تک تو میں یہاں ہوں، پھر اماں کے بعد بھائی کیوں رکھیں گے۔ ہاتھ پکڑ کر نکال باہر کریں گے۔ پھر خوف ہراس پریشانی۔

”لیکن آپ کے بھائی وہ کیوں آپ کو نکالیں گے، آپ ان کی بہن ہیں۔“

”بہن بھائی سب اپنے مفاد کے لیے برواشت کرتے ہیں۔ اماں کی خدمت گھر کے کام کرتی ہوں۔ مگر اعتراض، نکتہ چینی اور احسان۔ یہ صلہ ملتا ہے۔ اماں کا سہارا نہ رہا تو دوروئی کا آسرا بھی گیا۔“

غبرین منگنی کا جوڑا دکھانے لائی۔ گلابی کالدار۔ انگوٹھی بھی اچھی تھی۔ بہت خوش تھی۔

فجر نے چپکے سے پوچھا۔ ”تم بڑی عمر کے آدمی کے ساتھ خوش رہو گی؟“

”میری خوشی کیا۔ اور غم کیا؟ عمر سے کیا ہوتا ہے۔ گھر کی چھت اور عزت۔ اس کے سوا کچھ نہیں۔“ وہ

خاصی سنجیدہ اور مطمئن تھی۔ ”اسکول میں پڑھاتی ہوں۔ میں نے ان سے کہا ہے کہ میں اپنی جاب چھوڑوں گی نہیں۔ تنخواہ امی کو دوں گی۔ تاکہ وہ اپنا

خرچ اٹھائیں۔ وہ راضی ہیں۔ مجھے اور کیا چاہیے۔ یہاں گھر ہے۔ چھت ہے۔ عزت نہیں۔ تنخواہ۔

ماموں لے لیتے ہیں۔ پھر بھی ہم بھکاریوں کی حیثیت سے رہتے ہیں۔“

شاید۔ غبرین اور اس کی ماں کا فیصلہ درست ہو۔ اللہ کرے ایسا ہو۔ وہ فکر مند تھی۔

”دنیا اچھے لوگوں سے خالی نہیں۔ مجھے اپنے اللہ پر بھروسہ ہے۔ عزت کے ساتھ بیوگی کا زمانہ گزار دیا۔

برہنہ بھی انشاء اللہ بیٹی کے سہارے اللہ کی مدد کے ساتھ گزار لوں گی۔“

غبرین کی اماں پر امید تھیں۔ فجر نے اپنے پرس میں ہاتھ ڈال کر جتنی رقم بھی نکال کر اماں کے ہاتھ میں

دے کر منگی بند کر دی۔ وہ انکار کرتی رہیں۔ ایک موبانی بھی آکر کھڑی دیکھ رہی تھیں۔ غبرین کی اماں کے چہرے پر بڑا سکون اور خوشی کی سرخی آگئی۔ غبرین باہر تک آئی۔ شکریہ ادا کیا۔ اور آہستہ سے کہنے لگی۔

”اچھے لوگ ہیں وہ کہہ رہے تھے۔ ماؤں سے خرچا لیا نہیں جاتا۔ گھر میں۔۔۔ ماں کی طرح رہیں گی امی۔

بس۔۔۔ میں بے فکر ہوں۔ تم بھی فکر نہ کرو۔“



بھاری دل کے ساتھ گھر آئی۔ کسی سے بات کرنے کو دل نہ چاہا۔ کمرہ بند کر کے لیٹ گئی۔ وسوسے،

افسوس، اتنی مجبوری۔ کیسے بھائی ہیں۔ دنیا۔ خون کے رشتے۔ خود غرض، مفاد پرست۔ خدا سے بھی نہیں

ڈرتے۔ بائیس بیس سال کی لڑکی پینتالیس برس کا مرد۔ بیس سال ایک بیوی کے ساتھ۔ بیس سال گزار

کر اولاد کے لیے شادی کر رہا ہے اور لڑکی خوش ماں مطمئن، سہارے کی تلاش۔ بے بسی لاچاری۔ ماں کی

خاطر قربانی۔ نہ جانے ایسے کتنے کردار ہیں دنیا میں۔ کاش کوئی بے آسرا نہ ہو۔

اندھیرا پھیل گیا۔ مغرب ہو گئی۔ نماز پڑھ کر باہر آئی۔ چچی نے بتایا۔

”اثر آیا تھا۔ تم سو رہی تھیں۔“ وہ کب سوئی۔ رو رہی تھی۔ غبرین کے لیے دعا کرتی رہی۔

”عشا بتا رہی تھی غبرین کی شادی بڑی عمر کے مرد سے ہو رہی ہے۔ چلو ماں بیٹی کو ٹھکانہ مل جائے۔ ورنہ

دنیا بہت خراب ہے۔“ دادی کو مگر سن کر افسوس ہوا۔ ”اور اگر دوسری سے

اولاد نہ ہوئی تو تیسری کرے گا کیا؟“ ”تم انصاف سے ملنے نہ جاؤ تو اچھا ہے۔“ چچی نے

مشورہ دیا۔ ”اثر بھی گھبرا رہا ہے جاتے ہوئے۔“ ”کیوں چچی؟“ چونک گئی۔ غبرین کے غم سے باہر

نکلے۔ ”حمزہ کی بدزبانی اور فضول بکواس سے سب ہی تنگ

ہیں۔“



”کیا؟ اب بھی؟“ وہ حیران ہو گئی۔

”ہاں اب بھی۔ کئی دفعہ اثر سے منہ ماری کر چکا ہے۔ وہ تو اثر ہی ہے۔ جو نہ صفائی دیتا ہے۔ نہ اس کی بد تمیزی کا جواب۔ تم اقصیٰ کو فون کر کے مبارکباد دے دو۔ اس کے مزاج کا پتا چل جائے گا۔“

فجر کو یہ مشورہ پسند آیا۔ مگر ہمت نہ ہوئی۔

دو تین دن کے بعد آخر ہمت کر ہی لی۔ اقصیٰ نے ہیلو کہا فجر اچھا پھل پڑی۔ عرصہ بعد اس دوست سے بات۔ جو کبھی اسے بے حد عزیز تھی۔ ”اقصیٰ میں فجر۔“

”اچھا اچھا بولو۔“ ہمت شکن لہجہ تھا۔ مگر وہ سنتا چاہتی تھی۔

”میں آگئی ہوں۔ تمہیں شادی کی مبارکباد دینا چاہتی ہوں۔“

”شکریہ۔ امی سے بات کرو۔“ مگر لائن کٹ گئی۔ دوبارہ نمبر ملا یا۔ انکمیج ملا۔ خوش ہو کر چچی کو بتایا۔ ”بات تو کی یہ کم ہے شکریہ کہہ رہی تھی۔ اب اپنی شادی سے خوش ہوئی۔ تین سال پہلے کا واقعہ بھول گئی ہو گی۔ شادی کی خوشی میں پرانی بات کو بھلا دینا ہی اچھا ہوتا ہے۔“

”چلو۔ یہ کافی ہے۔ شادی کا بلاوا آئے تو چلی جانا۔“ ”نہیں۔ اب تو مجھے جانا ہو گا۔ ورنہ وہ کہے گی میں نے دکھاوے کے لیے فون کیا ہے۔“

”نہیں کہنے گی اور کہے گی تو کہنے دو۔ سن لینا۔ لیکن حمزہ جو اثر کو سنائے گا۔ وہ تمہیں اچھا لگے گا نہ اثر کو۔ خصوصاً تمہاری موجودگی میں۔ ویسے بھی وہ کہتا پھرتا ہے کہ۔ حمزہ کے حق پر اثر نے ڈاکا ڈالا ہے۔ ورنہ فجر تو بچپن سے حمزہ کو چاہتی ہے۔ اثر نے خبر ہی نہ ہونے دی۔ پوشیدہ نکاح کر لیا۔“

”ہاں! چچی جھوٹ۔ اور اچھا اگر ایسا تھا تو کیا میں ان حضرات کے آگے ہاتھ جوڑتی کہ مہاراج۔ حضور مجھے قبول کریں۔ پہلے ہی کیوں نہ قدم برہمائے۔“ الزام۔ غصہ سے آگ بگولہ ہو گئی۔ بزنل ویسے۔ اب مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ”بات پرانی ہو گئی۔“

”پڑتا ہے فرق۔ لڑکی پر ہر حال میں۔ خواہ وہ شادی

شدہ بچوں کی ماں ہی کیوں نہ ہو۔“

وہ چپ ہو گئی۔ عجیب بات تھی۔ یہ حیثیت ہوتی ہے عورت کی۔ تہمت الزام بہتان کسی بھی پاک و امن کو۔

”دیکھو۔ کوئی بات تو اثر سے کہی جائے۔ تو اثر ہو سکتا ہے۔ اور مرد کو غصہ آجائے۔ یا شک بہت ہی خطرناک ہے یہ شک۔ میں تم کو الزام نہیں دے رہی۔ اثر سن کر۔ غیرت مند مرد بہت جلد بھڑک اٹھتا ہے۔“

”میرا دل صاف ہے۔ اور اثر کا بھی تو مجھے حمزہ کا ڈر ہے نہ اقصیٰ کا۔“

وہ نہیں جانتی تھی۔ زمانہ کتنا خراب ہے اور ابھی تو ایک عمر باتی ہے۔

”نہ جانے اور کتنا نقصان اٹھائے گی یہ لڑکی۔“ چچی سوچ کر رہ گئیں۔

خاندان۔ دوستی خون کے رشتے آزمائے میں حرج کیا ہے۔ جستجو۔ اپنا دل صاف ہے تو ڈر کیا۔



پھپھو کا وہ شاندار سنگھ۔ جوں کا توں۔ مزید ترقی یافتہ۔ بی اماں کو اثر پکڑ کر لارہا تھا۔

فجر نے باہر سے ہی آواز لگائی۔ ”اقصیٰ! پھپھو! میں آگئی“ اقصیٰ اور اس کے پیچھے گھبرائی ہوئی پھپھو باہر آ رہی تھیں۔ مگر یہ کیا۔

کیوں آئی ہے یہ میرے گھر آنے کی ہمت کیسے ہوئی اسے۔ امی میں نے آپ کو کہا تھا۔ اسے روکیں۔ ”وہی غصہ وہی آواز وہی اشتعال۔ وہی انداز فجرانی جگہ جم کر رہ گئی۔ بی اماں بھی اقصیٰ کے چہرے کے بگڑتے زاویے۔ چیختی ہوئی آواز۔“

”دشمن دشمن ہے میری۔ مذاق اڑانے آگئی۔“ پھپھو اقصیٰ کو اندر کھینچ رہی تھیں۔ اور اوپر سے لپکتا ہوا حمزہ۔ فجر کی طرف بڑھا۔

”اوہو۔ آگئیں۔“ تسخرانہ لہجہ تھا۔ ”لگتا ہے۔“

نانی نے بھی نکال دیا۔ وہاں کے کتنے لوگوں سے افیر



چلائے تھے۔ ظاہر ہو گئے ہوں گے یہاں تو سب پردے ڈالتے تھے۔“

اثر نے پیچھے سے ہی آواز دی۔ ”حمزہ چپ رہو۔“  
”ارے اثر! تم۔ مگر بہت ہی بے غیرت ہو۔ ساری داستان سادی۔ کس طرح میرے ساتھ چکر چلایا۔ کلج کے زمانے میں دوسرے لڑکوں کے ساتھ اس کی تصویریں دکھائیں۔ پھر بھی شاباش۔“  
بی اماں تھک گئی تھیں زور سے چلائیں۔ ”حمزہ! خبردار اب اگر ایک لفظ منہ سے نکالا۔ میں تمہاری زبان کھینچ لوں گی۔ بے حیثیت، بے غیرت۔ تجھے کوئی شرم ہے۔“

حمزہ ہنسا۔ ”بی اماں زبان کیا کھینچیں گی۔ آپ میری انگلی ہی کھینچ کر دکھادیں۔ تو مان جاؤں۔“  
اثر نے ڈپٹ کر کہا۔ ”حمزہ حد میں رہو۔ کس سے بات کر رہے ہو۔ اندر آنے دو۔“

”کیا؟ میں حد میں رہوں۔ اور تم اس رسوائے زمانہ چلتی پرزہ کے ساتھ عیش کرو۔ واہ یہ مردانگی ہے؟ ہاں مگر۔ ایسی لڑکیاں پھر اسی لیے ہوتی ہیں۔“  
کیا الفاظ تھے بم شور آگ کا سیلاب۔ اثر تیزی سے آگے آیا۔ اس کا چہرہ اسی آگ میں دھک گیا تھا۔ آتے ہی حمزہ کو زبردست مکار سید کیا۔ حمزہ لڑکھڑایا۔ ایک اور مکار اور دھکا۔

”الفاظ واپس لو اپنے۔ الفاظ واپس لو۔“ سرد لوجہ برفانی آواز مگر اس کا پورا جسم شعلوں کی زد میں تھا حمزہ نے جھپٹنا چاہا۔ لیکن اثر میں آج ایسی طاقت آگئی تھی اور اب اس کی برداشت بھی جواب دے گئی تھی۔ تابڑتوڑ مکوں نے حمزہ کو چکرا دیا۔ وہ زور سے زمین پر گرا۔

”الفاظ واپس لو۔ ورنہ یہیں قبر بنا دوں گا۔“ یہ اثر تھا۔ یہ اس کا نیا ہی روپ تھا۔ اب حمزہ کی چیخیں اندر تک پہنچ گئی تھیں۔ نوکر آگئے اور دم بخود کھڑے تھے۔ حمزہ زمین پر اور اثر اس کے سینے پر اپنا پیر رکھے۔

”الفاظ واپس لو۔“ حمزہ نے ہاتھ جوڑ دیے۔ وہ رو رہا تھا نہ جانے کہاں چوٹ لگی تھی۔ اثر آگ بکولہ بول

رہا تھا۔

”کیا کہہ رہے تھے؟ اب کہو اس دن کیا کہا تھا۔ ہاں اور وہ تصویریں۔ بولو بولو۔ حمزہ۔“ دباڑ رہا تھا۔ یہ کون سا روپ تھا۔

کبھی تو اثر نے اونچی آواز میں کسی سے بات نہ کی تھی۔ آج آج غیرت کا طعنہ نہ سن سکا۔  
”حمزہ اپنے الفاظ واپس لو گے یا۔ کچل دوں۔ بہت برداشت کر لیا۔ اب نہیں حمزہ۔“

اور چشم حیراں نے کیا دکھا۔ حمزہ روتے ہوئے ہاتھ جوڑے زمین پر گرا ہوا معافی مانگ رہا تھا۔

”میں ہاں میں الفاظ واپس۔ ہاں وہ میں نے فجر کے ساتھ دوست کی تصویر کیپیوٹر سے بنوا کر۔ آہ۔ بہت درد ہے۔ امی ہاں میں جھوٹ بولتا رہا۔ میں پاگل ہو گیا تھا۔ الزام لگایا تھا۔“

حمزہ اب چیخ رہا تھا۔ دم بخود سفینہ پھپھو اپنی ماں کے سامنے اٹھتی جو رک چکی تھی۔ اور نوکر سب کے سامنے۔ اس امیر زادے نے اثر کے سامنے ہاتھ جوڑے۔ اثر نے اس کے سینے پر پیر کا دباؤ بڑھایا۔ اس کی چیخیں۔ سفینہ پھپھو چیخیں تھیں مگر وہ اپنے بیٹے کو نہیں۔ اپنی ماں کو اٹھانے آرہی تھیں جو زمین پر گری ہوئی تھیں۔ بی اماں نے ان کا سہارا رو کر دیا۔ وہ چیخیں۔

”اثر! اماں گر گئی ہیں۔“ اور اثر یک لخت ہوش میں آکر حمزہ کو چھوڑ کر پیچھے بھاگا۔ فجر زمین پر گھٹنوں میں سر دیے کانپ رہی تھی۔ اسے سفینہ پھپھو نے اٹھایا۔ اثر بی اماں کو اٹھا کر گیٹ کی طرف چلا۔

”فجر! چلو کھر چلتے ہیں۔“ اور فجر مسمو ریم کے اثر میں سوئی جاگی اس کے پیچھے چل دی۔ نوکر اب حمزہ کو اٹھا رہے تھے۔

سفینہ پھپھو بے بسی سے ماں کو ان کے پاروں کے ساتھ جاتا دیکھ رہی تھیں۔ گاڑی میں بی اماں کو بٹھاتے ہوئے اثر نے فکر سے دیکھا۔

”تکلیف ہو رہی ہے؟ کلینک ہوتے ہوئے چلیں۔ فجر بیٹھ جاؤ۔ کسی سے کچھ کہنے کی ضرورت



بٹھالیا۔

”اپنی اماں جان سے کب سے بات نہیں کی۔ وہ انتظار کر رہی ہوں گی۔“

فجر چونک گئی۔ بی اماں ٹھیک تو کہہ رہی تھیں۔ مگر آج اس پوزیشن میں وہ ان سے کیا بات کریں گی۔ گو کہ وہ خنجر ہوں گی۔ کوئی نئی خبر بھی ان کے پاس ضرور ہو گی۔ سنانے کے لیے بے قرار ہوں گی۔ رات بھر بے چینی رہی۔ نیند تو عائب ہی ہو چکی تھی۔ سوچنے کی صلاحیت بھی نہ رہی۔ کاش سماعت سے بھی عاری ہو جائے نہ جانے ابھی اور کیا کیا سنتا باقی ہے۔

بی اماں کے دوبارہ یاد دلانے پر صبح اس نے فون ملا لیا۔ ادھر سے گانے بلکہ چچھانے کی آواز سنی۔ خوش لگ رہی تھیں۔ خود کو سنہال کر اس نے کہا۔

”اماں جان۔ السلام علیکم۔“ آواز بھاری ہو گئی۔ نہ جانے کس طرح بات کروں گی۔ آواز تو سب راز کھول دے گی۔

”ہاں فجر ارے میری جان۔ کل سے اس قدر یاد آرہی ہے۔ کئی دن سے دل چاہ رہا تھا۔ آپ کو سب کچھ بتا دوں اور آپ سے آپ کی طبیعت کا پوچھوں۔“

”اماں جان آپ مجھے آپ کہہ رہی ہیں۔ کیا میں کہیں کی ملکہ ہو گئی ہوں۔“ (ہاں بدنامی رسوائی کی)

”آپ بہت مصروف ہستی ہیں۔ ہم جیسے غریب غریبا کو بھلا دیتی ہیں۔ اس لیے عزت احترام سے یاد دلا رہی ہوں۔ کہ محترمہ آپ کی ایک بچاری ثانی بھی ہے۔“

اماں جان کی آواز میں طنز مگر خوشی کا عنصر بھی تھا۔ گو کہ وہ رونا چاہتی تھی۔ اپنا غم اپنی ازیت ان کو سنا کر۔ مگر نہیں اپنی دور بیٹھی ہوئی بوڑھی ثانی بھلا کیا کر سکتی تھیں۔ آنسوؤں کا گلا گھونٹ دیا۔ اور آواز قابو میں کر کے پوچھا۔

”خوش لگ رہی ہیں تب ہی طنز کے تیر بر سارہی ہیں۔“

”ہاں تو ہوتی تو مجھے سناتی۔ جو ابھی گا رہی تھی۔ ارے خوش خبری ہے۔ لاڈلی کے گھر لاڈلا آنے والا

نہیں۔ بہت دن سے سن اور دیکھ رہا تھا۔ ٹال جاتا تھا۔ مگر بی اماں۔ آپ ٹھیک تو ہیں؟ کوئی تکلیف ہو تو۔“ فکر مند تھا۔

”ہاں بیٹا۔ میں ٹھیک ہوں۔ کمزور ہو گئی ہوں۔“

گھر آنے تک۔ ہوش اور بے ہوشی کا عالم طاری رہا۔ گھر میں سامنا کسی سے نہ ہوا۔ بی اماں کو بستر پر لٹا کر ان کو تسلی دے کر گرم صم کھڑی فجر سے کہا۔

”دنیا میں سب کچھ ہوتا رہتا ہے۔ اپنا ضمیر زندہ ہے اور دل صاف ہے۔ تو کسی سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ چلتا ہوں۔“

یوں جیسے کوئی عام بات ہو۔ اٹھا اور چلا گیا۔

فجر کو لگا۔ وہ مر گئی ہے۔ قبر میں لٹائی جا رہی ہے۔ تارکی، جسم سن ہو رہا تھا۔ بی اماں ہمت سے کام لے رہی تھیں۔ مگر فجر کو گئی ہو گئی تھی۔ یا بھری۔ اثر کی تسلی دلا سوں کے باوجود نیچے پاتال میں گرتی جا رہی تھی۔ ایسی زندگی اور یہ زندگی نہ تھی۔ اس طرح کا جینا اس نے کب سیکھا تھا جو وہ خوش باش۔ آزاد پچھی۔ اس کے فخر کو کس نے آگ لگا دی۔ اس کے رجحوش مائل پرواز پر کسی نے کتر دیے۔ جسے وہ اپنا محبوب سمجھتی تھی۔

اب وہ کبھی بھی سراٹھا کر چلنے کے قابل نہیں رہے گی۔ سر جھکا کر۔ نظر چرا کر جینا آتا نہ تھا۔ مگر اب یہی کرنا تھا۔ خصوصاً اثر کے سامنے۔ وہ اپنی صفائی میں کیا گواہی دے۔ اس کے وجود پر لگا ہوا بدنامی کا داغ کیسے دور ہو گا۔ حمزہ کے اپنا جرم تسلیم کرنے کے باوجود۔

وہ چچی کو گزری ہوئی واردات کے بارے میں بھی کچھ نہ بتا سکی۔ خالی خالی نظروں سے ان کو دیکھتی رہی۔ چچی زیادہ تجسس نہیں کرتی تھیں۔ جانتی تھیں معلوم ہو ہی جائے گا۔

دادی اس کی ذہنی کیفیت جانتی تھیں۔ ان کی اپنی حالت بھی مختلف نہ تھی۔ مگر کس طرح اسے معمول پر لائیں۔ کوئی جملہ، فقرہ کوئی نصیحت بھی کام نہ آئی۔ دو تین دن ایسے ہی گزر گئے۔ تو انہوں نے اس کو پاس



ہے ابھی میں گانے گا رہی تھی۔ تجھے سنائی۔ مگر تو اتنی دور ہے۔ گلاؤں میں تو تکار پر اتر آنا عادت تھی۔  
آنسوؤں کا گولا حلق میں پھنس گیا۔ کسی طور نیچے اتارا۔

”اچھا میرے وہاں سے آتے ہی۔ گانا سنائیے۔“  
وہ اس کا غم نہیں پٹا سکتی تھیں۔ وہ ان کی خوشی میں شریک ہونا چاہتی تھی۔ فوراً شروع ہو گئیں۔  
”ارے پیڑسوں آنگن میں کھڑی پیڑسوں آنگن میں۔ (پیڑ۔ تکلیف۔ درد)

”ارے دائی اماں آو ذرا کھٹیا بچھاؤ آنگن میں۔  
او بے ہودے او بے ہنرے (شوہر کی عزت افزائی)  
کھٹیا نہ کہو۔ زچہ خانہ کہو بچہ خانہ کہو۔ چھپر کھٹ کہو۔  
آنگن میں (ہائیں) کھڑی پیڑسوں۔  
آو دائی اماں۔ ذرا چھتھڑے بکھیرو گودڑ تو لاؤ آنگن میں او بے ہودے۔ اے بے ہنرے۔ گودڑ نہ کہو چھٹی چھو چھک کہو آنگن میں۔ پیڑسوں۔  
ارے دائی اماں ذرا وہ کیرا دکھاؤ۔  
لو تھرا دکھاؤ آنگن میں۔ او بے ہودے۔ او بے ہنرے۔

کیرا نہ کہو۔ شہزادہ کہو۔ فرزند کہو آنگن میں۔  
آنگن میں کھڑی پیڑسوں آنگن میں۔  
”استغفار۔ سارے کام آنگن میں ہوں گے؟ گلاڈی سے اور توقع بھی کیا ہو سکتی ہے؟“ چڑکنی۔  
”اے ہئے گانا ہے۔ آنگن تو بس۔ سرور بست کرنے کا بہانہ ہے۔ فکر نہ کر میری رانی۔ تیری رخصتی کے لیے بھی گانے تیار کر رہی ہوں۔ (گا کر) ساجن گھونگھرو باجیں گے کہ ہم تم ناچا کریں گے۔“  
نجر نے رسیور کلن سے ہٹا کر گھورا۔

”مجھے معاف کریں۔ بس ماموں کو پیشگی مبارکباد دے دیں۔ اللہ کرے لڑکی ہو۔ انہیں بھی احساس ہو کہ بٹی گیا ہوتی ہے۔“

جل کر فون بند کر کے دادی کے پاس آگئی۔ پورا گانا سنا دیا۔ انہیں زور کی ہنسی آئی۔ ان کو ہنستا دیکھ کر نجر کو تسلی ہوئی۔

چچی کو بھی بی اماں نے گانا سنا دیا۔ ان کی ہنسی تو رکنے کا نام نہ لیتی تھی۔  
کھنٹی پھر ہوئی۔ فجر نے رسیور اٹھایا۔ حسب توقع اماں جان۔ ”میرے لاڈلے اثر کا حال تو نہ میں نے پوچھا۔ نہ تم نے بتایا۔ کیسا ہے میرا لال۔ وہ بھی مجھے بھول گیا۔ وہاں کے پانی کی تاثیر میں بے وفائی ہے۔ آزا چکی ہوں۔“

”بتا نہیں۔ بھولنے کی عادت بے وفائی نہیں۔ برہمچاری کی علامت ہے۔ کیا اس منزل کو پہنچ گئے موصوف۔“ (شیطان کو یاد کرو۔ وہ آجاتا ہے۔)  
اثر نے بلند آواز میں سلام کر کے کہا ”یہ کس موصوف کا ذکر ہے۔“

چچی کھلکھلائی۔ ”تمہارے سوا اور کون ہو سکتا ہے۔“  
”اچھا۔ ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے۔“ نجر نے فون رکھ دیا۔  
اثر نے سنجیدہ ہو کر بتایا۔ ”انکل فوت ہو گئے۔ ای کا فون آیا تھا۔“

فون بند کرتے ہی نجر کو تاسف سا ہوا۔ ”میں بات کرا ہی دیتی۔ مگر نہیں اچھا ہی ہوا۔ انکل کی وفات کی خبر سن کر۔ اماں جان نہ جانے کس جذبے کا اظہار کرتیں۔“

”میں تو ابھی جا نہیں سکتا۔ اس کے علاوہ۔ وہاں انکل کے بھائی بہن ہیں۔ جاؤں گا لیکن شاید کچھ وقت لگ جائے۔“ وہ بی اماں سے مخاطب تھا۔ چچی بھی شریک گفتگو تھیں۔

”نجر! ایک چائے کی پیالی ملے گی؟ اسٹرائنگ سی۔“  
یوں مخاطب تھا جیسے کوئی عام حالات ہوں۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ چچی چائے لے آئیں پھر اثر سے کہا۔  
”اس دن۔ سفینہ آپا کے گھر کیا ہوا تھا؟“ بی اماں ہاتھ روم میں تھیں۔

”بہت حیرانی سے اثر نے کہا۔“ کیا کچھ ہونا چاہیے تھا۔“

”میرا مطلب ہے۔ حمزہ کو چوٹ کیسے لگی۔ کس



نے زینے سے دھکا دیا۔ پیر مڑ گیا ہے اور بازو فرہکچو ہے۔ سر میں ٹانگے لگے ہیں۔ ہاسپٹل میں ہے۔“

”آپ کیا وہاں گئی تھیں۔“

”نا بابا میں تو بہت کم جاتی ہوں وہاں۔ عشا کی کلاس فیلو کا بھائی حمزہ کا دوست ہے۔ اس نے عشا کو بتایا تھا۔“ چچی نے وضاحت کی۔

”تو آپ کا خیال ہے میں نے یہ کارنامہ انجام دیا۔ پھر تو مجھے لاگ اپ میں ہونا چاہیے تھا پولیس کی۔“

”ہاں یہ تو ہے۔ تمہارے ماموں کہہ رہے تھے۔ کیا نئی بات ہے۔ روزانہ ہی کسی لڑکی کے چکر میں کبھی کسی کا سر پھاڑتا ہے۔ کبھی اپنا سر تڑواتا ہے۔ ایسا ہی کچھ ہوا ہو گا۔“

”ہو سکتا ہے۔ لڑکی کا ہی۔ کوئی معاملہ ہو۔ اچھا جاؤں گا۔“

چچی کے جانے کے بعد لی اماں کو بتایا۔ لاڈلی بیگم نے جعلی کاغذات بنوا کر۔ گھر اپنے نام کروانے کی درخواست دی ہے۔ گویا ان کے سر نے یہ بہو لاڈلی بیگم کے نام گھر کر دیا تھا۔

”اچھا ہے۔ کاغذات بنوانے کی کیا ضرورت تھی۔“ فحرج نے چڑ کر کہا۔ ”قبضہ ان ہی کا ہے۔ لے بھی لیں۔ مجھے گھر لے کر کیا کرنا ہے۔“ دنیا سے لوگوں سے بیزاری ہو رہی تھی۔ فضول دنیا۔

”اپنا جائز حق کسی ضرورت مند کو اپنی مرضی سے خوشی سے دینا جائز ہے۔ مگر بے ایمانی سے ہتھیانا تو ناجائز عمل ہے۔ میں کم از کم اس معاملے میں مختلف خیال رکھتا ہوں۔ مالکہ بن کر تو لاڈلی بیگم کے پر لگ جائیں گے۔“ اثر کے کہنے پر۔ فحرج نے تصور میں لاڈلی کے بازوؤں پر بڑے بڑے پر لگے دیکھے۔ اڑنے کی کوشش میں وہ دھڑام سے زمین پر جا گریں فحرج ہنسی روکنہ سکی۔

”کیا میں نے لطیفہ سنایا ہے؟“ اثر برامان گیا۔ ویسے بھی فحرج کا مکان بخش دینے کا سن کر غصہ میں تھا۔

”نہیں میں نے خود بنا لیا پر لگا کر لاڈلی بیگم کو اڑتے دیکھنا۔ پھر دھم سے گرنا۔ اچھا لطیفہ ہے۔“

کئی دن بعد عشا نے اپنی سہیلی کے بھائی کی زبانی سن کر بتایا۔

”حمزہ بھائی کا علاج اب یورپ میں ہو گا۔ ان کا فرہکچو صحیح نہیں ہو رہا اور پیر کی ہڈی مڑ گئی ہے۔“

ایک دن سفینہ پھپھو آ گئیں۔ اماں سے معافی مانگنے۔ انہیں منانے۔ انہوں نے فجر سے بھی معافی مانگی۔ لی اماں ان سے بدستور ناراض تھیں۔ انہوں نے سفینہ پھپھو سے بات کی نہ معاف کیا۔ چپ سا دھمے رہیں۔ وہ روتی ہوئی آ گئیں۔ چچی کو آج سارا قصہ معلوم ہوا۔ اثر ہاسپٹل گیا تھا۔ حمزہ نے اس سے صدق دل سے معافی مانگی۔ اس نے کہا۔

”تم فجر کے مجرم ہو۔ فجر معاف کر دے تو۔۔۔ مجھے تو تمہاری بکو اس پر پہلے بھی یقین نہ تھا۔ مگر تم نے ایک پاکدامن لڑکی پر شہمت لگائی۔ اللہ بھی اس فعل کو معاف نہیں کرنا۔“

سفینہ پھپھو نے چچی کو ہر بات بتادی۔ وہ دم بخود حیران رہ گئیں۔ تاسف اور تکلیف ان کے چہرے سے ظاہر تھی۔ چند دن بعد اثر آیا۔ وہ اپنی ماں کے پاس جا رہا تھا۔ ماں بہنوں کی دلدہی کے لیے۔ فجر کے قریب آ کر رکا۔ مسکرایا۔

”جلدی آ جاؤں گا۔ انتظار کرنا۔“ اور چلا گیا لیکن اسے وہاں رکنا پڑا۔ فجر کو غیر ارادی طور پر انتظار رہنے لگا۔ آ جاتا تھا۔ کچھ باتیں لی اماں سے کرتا۔ عشا، ندا سے مذاق کرتا۔ چچی اس کی خاطر تواضع کرتیں۔ گھر میں کچھ دیر ہانچل سی ہو جاتی۔

ہانچل ہاں ہانچل ضرور ہوئی۔ چچا نے فجر کو اپنی مجبوریاں۔ کاروبار میں خسارہ۔ قرض کا انبار۔ کچھ ایسی ٹیکنیکل تالیفات۔ جو وہ سمجھ نہ سکی۔ فجر کی دوکانیں۔ فروخت کر کے وہ ڈوبا ہوا کاروبار بچا سکتے ہیں۔ قرض کے بوجھ سے چھٹکارا۔۔۔ کاروبار سیٹ ہو جانے پر قسطوں میں فجر کی رقم ادا کر دیں گے۔ داوی تو راضی نہ تھیں۔ مگر چار بچوں کی تعلیم۔ لڑکیوں کی شادیاں، چچا کی فکر۔۔۔ چچا کو پریشان دیکھنا اور خود دل کھول کر خرچ کرنا۔ اسے ہرگز پسند نہ تھا۔



”مجھے دو وقت کی روٹی چاہیے لی اماں۔ پیسے ہوتے تھے۔ تو خرچ کر لیتی تھی۔ نہیں ہوں گے۔ تو نہیں کروں گی۔ میرے ذریعے چچا کی پریشانی ختم ہو جائے۔ اس سے زیادہ اچھا اور کیا ہو گا میرے لیے۔“ اس نے انہیں راضی کر لیا۔

پھر سب طرح درست ہو گیا۔ چچا بے حد مصروف ہو گئے۔ وہ دعا کرتی کہ سب ٹھیک ہو جائے۔ کئی دن ہو گئے۔ ایک دن پتا چلا۔ چچا شہر سے باہر گئے ہیں۔ اثر کافون آیا۔ ”کیسی ہو؟“

”ٹھیک۔“

”تم نے پھر من مانی کر ڈالی۔ دوکانیں فروخت کر دیں۔ کتنے موقع کی۔ بے حد قیمتی تھیں۔“

”اسی لیے تو۔۔۔ چچا کا قرض اور کاروبار ٹھیک ہو گا۔ انہیں ضرورت تھی۔“

”تمہیں ضرورت نہ تھی؟“

”میرے پاس زندگی ہے۔ اور یہ کافی ہے۔“

”زندگی کو بھی سہاروں کی ضرورت ہوتی ہے۔ کیا ہر حق سے دست برداری کو ایمان سمجھ لیا ہے۔“

وہ سمجھ نہ سکی۔ اثر کیوں ناراض ہو رہا ہے۔

”میرے چچا۔۔۔ مجھ سے الگ نہیں ہیں۔“

”ہاں اسی لیے دینی میں اپنا کاروبار سیٹ کر رہے ہیں۔ تمہارے پیسے کو یہاں لگا رہے ہیں۔ اور کچھ عرصہ بعد فیملی کے ساتھ ادھر ہی شفٹ بھی ہو رہے ہیں۔ مجھے فون کیا تھا۔ تمہاری جائیداد کا بتایا۔ فجر عقل جمی کام میں لینی چاہیے۔“ نہ لکھا پڑھی نہ کوئی معاہدہ میں تم پر بہت برا وقت آتا دیکھ رہا ہوں۔ بہر حال کچھ اصول بھی ہوتے ہیں زندگی گزارنے کے لیے میرا تو انتظار کر لیتیں۔ خیر اللہ رحم کرے۔ میرا گھر دیکھا ہے ناں۔ تم نے ٹھیک ہے۔ ادھر ادھر بھٹکتا نہیں۔“

یوں بول رہا تھا۔ جیسے برسوں کے لیے گیا ہے۔ اور میں بے آسرا ہوں۔ کئی دن بعد چچا نظر آئے۔ خاصے خوش تھے۔

”چچا آپ دینی گئے تھے؟“ پوچھنا ضروری تھا۔ مگر بس ایک سوال۔

”کس نے بتایا تمہیں۔ اثر نے؟ ہاں میں نے اسے بتایا تھا۔ تمہاری جائیداد کے بارے میں اس سے رائے لی تھی۔ بھئی اس کے علم میں ہونا چاہیے۔ کل کو وہ عدالت میں کھیٹے کچھ کہہ رہا تھا؟“ فکر مند ہو گئے۔

”نہیں بس بتایا تھا آپ کا بچا جب مجھے ضرورت ہو گی۔ آپ کچھ رقم تو دے سکیں گے مجھے؟“

”ہاں ہاں لے لیتا اور تمہیں ضرورت بھی کیا ہے۔ اچھا خیر لے لیتا۔“ مگر چہرہ الفاظ کی نفی کر رہا تھا۔



وقت دھیرے دھیرے گزر رہا تھا۔ اسے خبر ہی نہ ہوئی۔ اقصیٰ کی شادی بھی ہو گئی۔ عشا نے آکر بتایا۔ چچا چچی۔ دادی کسی کو کارڈ نہیں ملا تھا۔ اس صبح انھی۔ تو آسمان پر بادل تھے۔ دادی ابھی سو رہی تھیں۔ مگر اتنی دیر وہ سو گئی تھیں۔ ابدی نیند نہ جانے رات کے کس پر۔ کسی کو بتائے بغیر۔ رحمت کے فرشتوں کے پروں پر سوار ہو کر۔ آخری منزل کی طرف روانہ ہو گئیں۔

پر سکون سکوت۔ ابدی سکوت۔ فجر کو لگا۔ اس پر بھی ویسا ہی سکوت طاری ہو گیا ہے۔ وہ یوں کب تنہا ہوئی تھی۔ ہمیشہ لی اماں اس کا سایہ بنی رہیں۔ اب گھنٹوں ایک جگہ گھنٹوں پر سر رکھے بیٹھی رہی۔ باہر خاموش ہلچل تھی۔ پھر سفینہ پھوپھو اس کے پاس آکر بیٹھ گئیں۔ اسی کی طرح خاموش۔ جیسے۔۔۔ دونوں کا ایک ہی غم ہو۔ شاید۔

اماں جان عمر کی کمزوری کی پروا کئے بغیر نوید ماموں کے ساتھ آ گئیں۔ زندگی میں خفگی تھی۔ زندگی ختم۔ ناراضگی ختم۔ مستقل آنسو بہاتی۔ قرآن پاک پڑھتی رہیں۔ پھرے دن فجر سے کہا۔

”چلو فجر۔ اب یہاں کیا رکھا ہے؟“

فجر حیران ہو گئی۔ کیا رکھا ہے؟ ابھی تو کمرے میں لی اماں کے وجود کی حرارت تھی۔ مہک تھی۔ آہٹیں تھیں۔ ان کا نماز کا دوپٹہ تہہ کیا رکھا تھا۔ جو فجر منہ پر رکھ سوتی تھی۔ ان کے وجود کی خوشبو اس میں تھی۔ اماں جان نہ جانے کیا کہتی ہوئی چلی گئیں۔ بعد میں



خیال آیا۔ اماں جان۔ اب ان کو بھی بھلا کب دیکھوں گی۔ چلی ہی جاتی ساری انا۔ اور لاڈلی سے خفگی کو دور کر کے۔ وہ بہت کم روتی تھی۔ مگر اب رات بھر تکیہ بھیکتا۔ دن بھر دامن۔ آنسو کہاں کہاں سے نکل کر برس جاتے۔

چچی نے بتایا۔ اثر کو کچھ وقت اور لگ جائے گا۔ جان سے زیادہ پیاری ثانی کو رخصت ہوتے نہ دیکھا۔ پھر دن گزرنے لگے اور وقت بدلنے لگا۔ موسم بدلا روپے بدل گئے۔ گھر اجنبی ہو گیا۔ لوگ اجنبی ہونے لگے۔ کسی کو فجر سے مخاطب ہونے کی ضرورت نہ پڑتی۔ پھر سب بیگانہ ہو گئے۔ کسی کو یاد نہ رہتا کہ فجر اسی گھر میں رہتی ہے۔ کبھی کھانے پر بلا نایاد نہ رہتا۔ کبھی ناشتہ دینا بھول جاتا۔ بی اماں اپنے گھرے میں دالان میں چلتی پھرتی۔ نظر آتیں۔ خاموش۔

ایک دن دادی کی پرانی ملازمہ آگئی۔ تعزیت کے لیے آئی تھی۔ حسب عادت فجر نے پرس کھولا۔ دھک سے رہ گئی۔ پھر یاد آیا۔ دو ماہ سے کرایہ نہیں آیا۔ بنک جانے کا موقعہ نہ ملا۔

”چچی! مجھے چار پانچ سو روپے دے سکتی ہیں آپ؟“ بڑی لجاجت سے کہا۔ ”میں کل بنک سے۔“ ”سوری فجر۔ میں نہیں دے سکتی۔“ صاف جواب دیا۔ وہ نا سمجھی سے انہیں دیکھنے لگی۔

”تمہارے چچا نے منع کیا ہے۔ تمہاری عادت ہے ہر کسی کو دل کھول کر دے دیتی ہو۔ اس طرح تو قارون کا خزانہ بھی ختم ہو جاتا ہے۔ جب سے پتا چلا کہ تم نے عنبرین کی اماں کو دس ہزار روپے آرام سے نکال کر دے دیے۔ وہ خفا ہیں۔ اور اب تمہارے پاس بچا بھی کیا ہے۔ اثر کو دو ڈھائی مہینے ہو گئے۔ غائب ہے۔ اماں کے انتقال پر۔ شنو آیا کا اور اثر کا فون آیا تھا اور بس۔“ ”اثر کا یہاں کیا ذکر؟“ وہ چکرا گئی۔ اس تفصیل کی بھلا یہاں کیا ضرورت تھی۔ یہ کون سا موقعہ تھا بھلا۔

”تو اور کس کا ذکر ہے۔ اس کے سوا اور ہے کون تمہارا۔ اگر وہ چاہے تو۔ ورنہ۔“ جانے چچی کیا سمجھانا چاہتی تھیں۔ وہ احمقوں کی

طرح انہیں دیکھتی رہ گئی۔ بنک بھی گئی۔ ان نہ جانے کب چچا نے۔ رقم نکلائی تھی۔ کس طرح ایک معمولی رقم جو اکاؤنٹ رکھنے کے لیے ضروری ہوتی ہے۔ وہی باقی تھی۔ وہ بھاری دل بھاری قدموں سے گھر آئی۔ چچا نظر آئے۔

”چچا! مجھے کچھ رقم چاہیے۔“ کہتے ہوئے سانس پھول گیا۔ ”اصل میں۔ بنک گئی۔ تو وہاں بھی کچھ نہیں پہلے دکانوں کا کرایہ آتا تھا۔ تو مجھے مشکل نہیں ہوتی تھی۔“ وضاحت دینی بھی بہت مشکل تھی۔ شرم آ رہی تھی۔

”جب دونوں ہاتھوں سے لٹاؤ گی۔ تو یہ تو ہو گا۔ مجھے ضرورت تھی۔ اس لیے نکلا لیے تم سے چیک بک لی تھی نا۔ ابھی کسی طرح کام چلاؤ۔ پیسہ درخت پر نہیں لگتا کہ جب چاہا توڑ لیا۔“ چلے گئے۔ وہ ہکا بکا۔ میں بھکارن ہوں۔ یہ اوقات ہے اب۔ ایسا نکالنا جواب کب سوچا تھا۔ جی چاہا ابھی مر جائے۔ مگر موت بھی کب تھی اختیار میں۔ ایک ایک پیسے کو ترسنا کہتے ہیں اب علم ہوا۔ بالا خرچہ کوئی قاصد بنایا۔

”چچی! چچا نے کہا تھا۔ کام چل جائے تو قسط وار کچھ رقم دے دیا کریں گے۔ اب تو کام شروع ہو گیا ہے اور مجھے سخت ضرورت ہے۔ پانچ ہزار ہی دے دیں۔“ ”میں کہہ دوں گی مگر یقین نہیں ہے۔ اچھا دیکھو۔“ صبح اس نے چچا کی چٹھاڑ سنی۔ ”کیا کہا؟ قسط کون سی قسط۔ میرے بھائی کی جائداد تھی۔ جتنا اس کا حصہ بنا تھا۔ وہ کھاپی چکی خرچ کر چکی۔ بھائی بھتیجیوں کا شرعی حصہ باقی تھا جو میں نے لے لیا۔ اس میں اس کا کوئی شرعی حصہ نہیں۔ کہہ دو۔ ہم نے بہت زیادہ ڈھیل دی۔ اتنے عرصے اپنے پاس رکھا۔ اب یہ ہم پر احسان بنائے گی۔ نہ جانے کیا کر کے بیٹھی ہے۔ جو اثر امریکہ جا کر جم گیا ہے۔ کونسا اہم کام کر رہا ہے۔ کہ آنے میں عذر بھی۔ لے جائے اپنی بیوی۔ مجھے تو لگتا ہے وہیں شفٹ ہو گیا ہے۔ آئے وائے گا نہیں اب۔“

اثر کا کیا ذکر؟ پتا نہیں سب فجر کے معاملے میں اثر کو کیوں گھسیٹ لیتے ہیں۔ رقم مجھے چاہیے۔ اپنی رقم



چچی کچھ آہستہ سے بولی تھیں۔ مگر چچا کی چیخیں۔  
 ”اچھا اصرار کر رہی ہے؟ تو کہہ دو۔ اس کا حصہ باقی  
 نہیں اور بہت کر لی ہم نے اس کی قدر۔ اپنی بہن تک  
 کو اس کی خاطر چھوڑ دیا۔ کہہ دو کہ اب وہ اپنا انتظام کر  
 لے۔ جہاں مرضی ثانی کے پاس جائے۔ یہاں اب نہ  
 دیکھوں۔“ حکم دیا تھا۔

میں کیا ہوں۔ کسی کی کچھ نہیں۔ محبت میں حصہ  
 نہیں۔ خون کا تعلق نہیں۔ داوی سے جو واسطہ تھا۔  
 ان کے ساتھ ختم ہو گیا۔ جنون کی کیفیت میں کپڑوں کی  
 الماری تلپٹ کر دی۔ بالا خراوہر اوہر ہاتھ مارنے سے  
 یہاں وہاں رکھے کچھ نوٹ سوکے پانچ سوکے مل گئے۔  
 اس سے پہلے کہ چچا ہاتھ پکڑ کر نکالیں۔ وہ خود وہاں  
 سے نکل گئی۔ غبربن کی ماں کو یہی اندیشہ تھا ناں۔  
 انہوں نے ایک چھت کا انتخاب کر لیا۔ چلو وہ کچھ نا  
 ہموار سی۔ چار دیواری کا تحفظ تو تھا۔ آج میں غبربن  
 بن گئی۔ وہ چلتی جا رہی تھی۔ کوئی چھت ملے۔ اماں  
 جان۔ وہاں تو لاڈلی بیگم کا حکم ہو گا۔ اوہر سے نکالی گئی تو  
 سڑک پر ٹریفک رواں دواں تھی۔ سب کام ہو  
 رہے تھے۔ ٹھیلے پر کیلے والا چڑھا بیٹھا تھا۔

”بی بی! کچھ لے لو۔ صبح سے بونہی نہیں ہوئی۔“  
 رک گئی۔ دو درجن کیلے لے لیے۔ رقم بھی زیادہ  
 دے دی۔ ”بچوں کے لیے کچھ لے جانا۔“ شاید اس  
 کی دعا لگ جائے۔ نوٹ گن کر اسے ممنون نظروں  
 سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی دعا۔ باریاب ہو گئی۔ کچھ لوگ  
 خضر کی صورت دنیا میں بھیجے جاتے ہیں۔ بھٹکے ہوئے  
 لوگوں کو راستہ دکھانے۔ تو بابا رمضان رکشہ لے کر آ  
 کھڑا ہوا۔

”بی بی۔ کدھر جانا ہے۔ چلو بیٹھو۔“ وہ بیٹھ گئی۔  
 راستہ کہاں تھا۔ رکشہ چل پڑا۔ نہ بابا نے پوچھا۔ نہ  
 اس نے منزل کا بتایا اور اسے وہیں پہنچا دیا۔ جہاں جانا  
 ہی تھا۔

”بی بی گڈی گرم ہو گئی ہے۔ پانی ڈال لوں سامنے  
 کے نلکے سے۔“ وہ اثر کے بنگلے کے سامنے کھڑا تھا۔  
 ”گڈی۔ پرانا رکشہ۔ بابے رمضان جیسا۔“ اسے

ہنسی آگئی۔ خود حیران ہو گئی۔ کب سے ہنسی نہ تھی اور  
 آج۔۔۔ سب بدل گئے تھے۔ وہ آج بھی نہ بدلی۔ ہنسی  
 روک لیتی۔ یا بدل گئی ہوتی تو۔۔۔

”بی بی۔ چلتی کا نام گڈی ہوتا ہے۔ یہ میرا روزگار  
 ہے۔ میرا رکشہ۔ میری گڈی۔“ رمضان نلکے کے  
 پاس جاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ وہ بھی اتر گئی۔ پانچ سو کا  
 نوٹ اس کی سیٹ پر رکھا۔ ”یہ تمہارا کرایہ ہے۔ اندر  
 سے چائے بھجواتی ہوں۔ انتظار کرو۔“

”بی بی! میرے پاس ٹوٹے پیسے نہیں ہیں۔ صبح سے  
 سواری نہ ملی۔“ لجاجت بھی لہجے میں۔

”سب رکھ لو اور ابھی رکے رہو۔“ مالکانہ خوبو تو  
 کبھی نہ تھی۔ آج کیوں مزاج بدل گیا۔ بلیقیس دانت  
 چمکائی اس کے استقبال کو کھڑی تھی۔

”تم لوگ گیٹ بند کیوں نہیں کرتے۔ اس دن بھی  
 کھلا ہوا تھا۔ آج بھی کوئی چور چکار آجائے تو۔ اور اچھا  
 رکشہ والے بابا کو چائے اور کچھ کھانے کو دے دو۔“

لان ویسا ہی سرسبز تھا۔ پھول اسی طرح مہک رہے  
 تھے۔ بلیقیس اسے لاؤنج میں لے آئی۔ نرم صوفے  
 میں دھنس کر اوہر اوہر دیکھنے لگی۔ سامنے ہی دیوار پر  
 اس کی اپنی ہنسی تصویر لگی تھی۔ وہ اچک کر کھڑی ہو  
 گئی۔ اثر اور وہ۔ دونوں ایک ساتھ کھڑے تھے۔ یہ؟ یہ  
 کب کی تصویر تھی۔ یاد نہ آیا۔ بلیقیس جا چکی تھی۔ پھر  
 آکر اپنی کار گزاری جتائی۔

”رکشہ۔۔۔ والے بابا کو کھانا بھی دے دیا۔ چائے  
 بھی پکڑا آئی۔ اور کل کا بچا ہوا سالن شاپر میں کر کے  
 اس کے بچوں کے لیے دے دیا۔ کل کی ڈنل روٹی بھی  
 دے دی۔ آپ کے لیے کھانا لے آؤں؟“

دوپہر ہو گئی۔ اسے خبر نہ ہوئی۔ صبح سے سڑکوں پر  
 کہاں سے کہاں جا پہنچی تھی۔ کھانا آگیا کھالیا۔ پھر  
 احساس ہوا۔ خاصی بھوک تھی۔

”بی بی۔ آپ لاؤنج میں رہ لیں گی؟ کمرے تو سب  
 بند ہیں اسٹور کھلا ہوا ہے۔ بستر وغیرہ سب ہے۔“  
 ارے اسے کس نے بتایا کہ وہ رہنے آئی ہے۔

”صاحب نے فون پر کہا تھا۔ آپ کسی وقت بھی آ



سکتی ہیں۔ ہم روز کھانا پکاتے تھے۔ پھر فقیروں کو دے دیتے تھے۔ صاحب کہتے ہیں گیٹ کھلا رکھو۔ کبھی کسی فقیر ضرورت مند کو تھنٹی بجا کر انتظار نہ کرنا پڑے۔“ گیٹ کھلے رہنے کی توجیہ پیش کی۔ ارے ہائیں یہ اثر چیز کیا ہے۔

”وہ خود کپ آئیں گے۔“ چچا کی اطلاع کی تصدیق کرنی ضروری تھی۔ پسینہ اگیاما تھے پر۔

”کچھ بتاتے نہیں۔۔۔ ہم تو خود پریشان ہیں۔“ پسینہ پورے جسم کو تر کرنے لگا۔ وہ اکیلی۔

”کہہ رہے تھے۔ کسی دن بھی۔۔۔ آجاؤں گا۔“ بارے کچھ امید افزا خبر ملی۔ صوفے پر دھنس کر ایسی بے خبر سوئی۔ جیسے کب کی جاگی ہوئی ہو۔

”تم‘ تم نے مجھے پہچانا کیسے کہ میں۔“ صبح ہی سوال کر ڈالا۔ اور اپنی حماقت پر پچھتائی۔ جب اس نے تصویر کی طرف انگلی اٹھائی۔ کئی دن نیندیں پوری کرنے میں گزار دیں۔ افوہ۔ بس سونا کھانا لان میں چہل قدمی۔ کبھی گیٹ سے باہر جھانکنا۔ کب تک یہ مشغلہ رہے گا۔ کپڑے میلے ہو گئے۔

پائپ لے کر لان میں آگئی۔ ڈرائیوے تو دھویا۔ آئیوی کی کیاری پانی سے بھر دی۔ ساری کیاریاں۔ لان میں پانی دیتے ہوئی خود بھی بھگی۔ غور نہیں کیا۔ گاڑیاں آگے پیچھے کب آکر کھڑی ہو گئیں۔ بلقیس کی کھلکھلاہٹ اور پھر چیخیں۔ خوشی سے بھرپور نہ جانے کون۔ کیا۔ دو حسین پریاں اس کے بھیلے بدن سے چمٹ گئیں۔ (زندگی کتنی حسین ہے۔) رہا اور فدا۔ اثر کی بہنیں۔ شنو پھپھو۔

وہ پائپ پھینک کر ان کی طرف بڑھی اور چیخیں مارتی روتی ہوئی لپٹ گئی۔ اس کے گلے سے درد بھری فریاد۔

”پھپھو۔ بی اماں گئیں۔ میں اکیلی رہ گئی۔“ دونوں پھوپھی بھتیجی۔۔۔ پھڑی ماں کی تعزیت کر رہی تھیں۔ اثر ٹیکسی سے سامان اتار رہا تھا۔

شنو پھپھو کو دو صدے تھے۔ ماں اور شوہر سے جدائی تو فجر بھی کئی صدوں سے گزر رہی تھی۔ دادی پیاری دادی اور رشتوں سے جدائی کا۔

اثر بہت دلچسپی سے اس کا حلیہ دیکھ رہا تھا۔ ابھی بال میلے کپڑے۔ اجڑی ہوئی کیفیت۔ مگر میلے سے زیادہ مضبوط کم از کم راستے متعین کرنے کی عقل آگئی تھی۔

لاؤنج میں شنو پھپھو کے ساتھ آئے ہوئے اثر کو دیکھا۔ بہنوں کے ساتھ گھر دکھاتا پھر رہا تھا۔

”آپ نے پوچھا نہیں۔ میں یہاں کیسے۔۔۔ کیوں آ گئی؟“ ہچکچائی۔

”بہت ہی اچھا فیصلہ کیا۔ جہاں آنا چاہیے تھا۔ محفوظ راستہ یہی تھا۔“

”در اصل مجھے ساہیوال جانا چاہیے تھا۔ مگر وہاں تو لاڈلی نے قبضہ کر رکھا تھا۔ وہ مجھے وہاں گھسنے بھی نہ دیتیں۔ پھپھو۔ اب میں کہاں جاؤں۔“

ہائے بے چارگی۔ شنو نے اس کو پیار کیا۔

”تمہیں نہیں معلوم؟ امریکہ جانے سے پہلے اثر وہاں جا کر سب معاملات درست کر آیا۔ اپنے حصے کا آدھا حصہ ان کو۔ نوید کو دے دیا۔ دو کمرے صحن وغیرہ۔ اس طرح خالہ جان بھی۔۔۔ وہیں ہیں۔ اب میں تم کو لے کر پرسوں ساہیوال جاؤں گی۔ عدت کے ختم ہونے پر عورت میکے جاتی ہے۔ اب میرا میکہ وہی ہے۔ پھر ہم ان کو لے کر آجائیں گے۔ مجھے میری بچیوں کو خالہ جان کی ضرورت ہے اور تمہیں اور اثر کو بھی۔۔۔ اثر سے وعدہ کر چکی ہیں۔ انکار نہیں کریں گی۔ تمہاری رخصتی بھی کرنی ہے آخر!“

وہ سٹیٹا کر کھڑی ہو گئی۔ بے بسی سے اپنے میلے کپڑے دیکھ رہی تھی۔ اندر داخل ہوتے اثر۔ رہا اور فدا ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ انہوں نے امی کی بات سن لی۔ سمجھ لی تھی۔ پھر قہقہہ لگانے لگے۔

فجر پر کسی نے گھڑوں پانی ڈال دیا۔ اس کے چہرے پر حیا کی سرخی بڑھتی گئی اور پہلی بار ایک حسین نظارہ دیکھنے کو ملا۔ اثر مبہوت ہو کر دیکھنے لگا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا کر کرسی پر بیٹھ گئی۔ اثر کی موجودگی محسوس کر کے۔ پہلی بار اس نے اثر کی دل کی گہرائی میں موجودگی کا احساس کیا تھا۔ آمادگی کے ساتھ۔ دل اور دل غ کی گواہی کے ساتھ۔





زندگین آرزو

# مسکرتی ہوئی

کے پل پل بدلتے موڈ کو، نہ اس کی طبیعت کو۔ سیف کندیٰ بن نہیں تھا اور نہ ہی کم فہم تھا، لیکن جس منزل کا تعین کر دیا گیا تھا، وہ بے تحاشا پر پیچ راہوں سے مزین تھی، یہ بزرگ بھی کبھی کبھی عجیب امتحان میں ڈال دیتے ہیں، چاہے اس امتحان میں سرخرو ہونے کی اہلیت ایک فیصد بھی نہ ہو۔ وہ بھی کسی نالائق شاگرد کی طرح خوف زدہ تھا۔

یہ سیف کے بچپن کی بات تھی۔

بابا جان اور سعید انکل نے شیرل کو اس سے منسوب کر دیا تھا۔ اسے سیاہ بالوں اور سیاہ آنکھوں والی شیرل اچھی لگا کرتی۔ دونوں کا بچپن نہایت دوستانہ ماحول میں ہنستے کھیلتے گزرا تھا۔ شعور کی منزلوں میں قدم رکھتے ہوئے سیف کو وہ دل کے قریب محسوس ہوئی۔ وہ بار بار اسے گھر آتے، اپنی ذاتی زندگی میں دلچسپی لیتے اور اس کے چھوٹے چھوٹے کام پاگلوں کی طرح کرتے دیکھا کرتا، لیکن اس کے کام ہوتے بھی کیا تھے۔ اس

کے کمرے کی طرف جاتی رسولن سے وہ خود کافی کا کپ لے کر اس کے سر پر پہنچ جایا کرتی یا پھر اس کی وارڈ روپ سے استری کیے خوب صورت تراش خراش کے سوٹ اپنی پسند سے نکال دیا کرتی۔ اسے یہ سب کرتے دیکھ کر سیف کا دل خوشیوں اور مسرتوں سے لبریز ہو جاتا۔ اسے اپنی منزل بے حد شفاف اور قریب محسوس ہوتی۔

دونوں نے ایف ایس سی کے بعد اکٹھے ہی میڈیکل

پچھلے دو تین دنوں سے وہ کالج سے جلد لوٹ آتا تھا۔ مایوسیوں اور شکستگی نے جیسے اسے بے حال کر دیا تھا۔

شکستگی اور مایوسی اسے ایک دن مار ڈالے گی۔ شاید وہ اچھی طرح سمجھا نہیں تھا شیرل کو۔ وہ سمجھنا چاہتا تھا اسے، لیکن کبھی بھی سمجھ نہیں پایا تھا۔ نہ اس

## مسکرتی ہوئی









کالج جوائن کیا تھا، تب وہ کتنے فخر سے اپنی دوستوں کو بتایا کرتی کہ یہ بے انتہا جیلا سا خوبوندہ اس کا تایا زاد ہونے کے ساتھ ساتھ منگیتر بھی ہے۔ اس کی شدید چاہتوں کو محسوس کرتے ہوئے وہ خود کو بہت معتبر بہت اونچا جانتا، اسے لگتا جیسے وہ اس روئے زمین کا خوش نصیب ترین شخص ہے۔

مگر یہ سب اس کی خام خیالی تھی۔

کسی نے سچ کہا ہے کہ ہر چمکتی چیز سونا نہیں ہوتی اور شیرل بھی سونا نہیں تھی۔ بابا جان کی موت کے بعد یہ عقدہ کھلا کہ وہ بہت مقروض ہو چکے ہیں۔ نام نہاد کاروبار ٹھپ ہو چکا ہے اور اتنا بڑا محل نمابنگلہ بھی رہن تھا۔ حقیقت میں پیروں تلے سے زمین تب کھسکی، جب سیٹھ کریم بنگلے کی نیلامی کے کاغذات لے آیا۔ سب کچھ ختم ہو گیا۔ سارا کچھ بیچ کر بھی قرض سے نجات نہیں ملی تو سعید انکل اس موقع پر بڑے کام آئے۔ انہیں اپنے گھر میں رکھ لیا اور باقی قرضہ بھی چکا دیا، لیکن سیف بچھ کر رہ گیا۔ اس کی غیرت مند طبیعت کو یہ سب قطعی گوارا نہیں تھا۔ مگر وہ مجبور تھا، جب تک کہ اپنے پیروں پر کھڑا نہ ہو جاتا۔

لیکن جانے اچانک کیا ہوا؟

وہ پروانہ وار شمار ہونے والی آنکھیں ایک دم ہی بدل گئیں۔ ہمہ وقت ناراض سی رہنے لگیں، تسنخر اڑانے لگیں۔

اگر کوئی آپ کو اپنے التفات اور اپنی چاہتوں سے بہت بلندیوں پر پہنچادے اور پھر عین اس وقت جب آپ بہت اوپر بہت بلندی پر پرواز کر رہے ہوں اور وہ

ایک دم سے آپ کو دھکادے کر اپنا تعلق قطع کر لے تو آپ اپنا دم گھٹا محسوس کریں گے۔ بلندی سے گرنے کے خوف سے آنکھیں سختی سے میچ لیں گے۔ وہ بھی گرنے کے خوف سے آنکھیں بند کیے کھڑا تھا۔

شیرل کے غیر محسوس انداز میں بدلتے رویے سے اسے بہت مایوسی ہوئی تھی۔ وہ شیرل کو کھونا نہیں چاہتا تھا۔ بلکہ جلد از جلد کچھ بن کر اپنی پوزیشن مستحکم کرنا

چاہتا تھا۔

مگر وہ دو سال تک مزید اپنے اس ارادے کو عملی جامہ پہنانے سے معذور تھا۔ اس کی پڑھائی کے اخراجات بھی سعید انکل برداشت کر رہے تھے۔ سیف ہاشعور و سمجھ دار تھا اور بہت کچھ کر گزرنے کے لیے پر عزم بھی، لیکن شیرل کی بدلتی آنکھوں اور بدلتے رویے نے اسے حد سے زیادہ مایوس اور شکستہ کر دیا تھا۔ وہ اپنی بدلتی قسمت اور تقدیر کی ستم ظریفی سے مایوس نہیں ہوا، لیکن شیرل کے وقتاً فوقتاً بدلتے موڈ سے دل شکستہ ہو گیا تھا۔ اس کی دے دے انداز میں کی گئی باتیں اسے بہت کچھ سمجھانا چاہ رہی تھیں۔

”فوفو سیف پلیز، اپنی پرسنالٹی میں ذرا تو گلیمبر پیدا کرو۔ تم جانتے ہو مجھے کھٹیا اور کمتر چیزوں سے سخت چڑ ہے۔“

یہ فقرہ وہ دن میں کوئی دس پندرہ بار تو ضرور اس کے کانوں میں اندھ پلتی تھی۔ اس کے لہجے کی ساری شرینی جیسے کہیں اڑ پھو ہو چکی تھی۔ سیف دل مسوس کر رہ جاتا۔ اس کی پرسنالٹی میں ہرگز کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ ہاں البتہ تبدیلی شیرل کی نگاہوں میں واقع ہوئی تھی۔ شیرل نے اپنے سوچنے کا انداز بدل لیا تھا۔ اسے ابھی طرح یاد تھا۔

خوشحالی کے دنوں میں جب وہ ملگجے سے لباس میں بھی پھرتا تو وہ اسے اس حلیے میں بھی بے پناہ اچھا لگتا تھا۔ تب وہ تنقید نہیں کیا کرتی تھی، بلکہ اسے بے نیازی اور ایک لالباہی سا دلفریب انداز جانا کرتی تھی اور کہیں باہر ڈنر کے لیے وہ اسے ایک منٹ انتظار کر کے کپڑے بدل آنے کا کہتا تو شیرل نہایت اپنائیت سے اس کا ہاتھ تھام لیتی۔

”اوہ کم آن سیفو۔ تم اس حلیے میں کسی پرنس سے کم نہیں لگ رہے، شخصیت کپڑوں کی محتاج نہیں ہوا کرتی۔“ اور وہ حیرت سے پلکیں جھپکے بنا، اس کے لہجے میں چھپی شدتوں اور اس کی آنکھوں سے چھلکتے پیار کو محسوس کیے جاتا۔



لیکن تب اور اب میں جیسے بہت فرق آگیا تھا۔  
تب وہ بے انتہار میں باپ کا بیٹا تھا۔

”بچہ۔“ وہ کھلکھلا کر ہنس دیتی۔  
”بالکل بچہ۔“

ایک وہ دن تھا اور ایک یہ دن ہے۔ جب وہ اس کے ساتھ بیٹھنے پر ندامت محسوس کر رہی تھی۔ اس دن کے بعد سے وہ بس سے کالج چلا جاتا تھا۔ شیرل کو اس کی پروا نہیں تھی، لیکن کبھی کبھار جب وہ موڈ میں آتی تو اسے زبردستی کار میں بٹھالیتی اور کنگ ایڈورڈ تک کا سفر اس کی کچھ داریاتوں میں گزر جاتا۔ کبھی دوستوں کی موجودگی میں اسے منہ تک نہ لگائی، خود کو اجنبی ظاہر کرتی اور کبھی شہد آگیاں لہجے میں اس کے اور اپنے تعلق کو بڑے خوب صورت انداز میں بیان کر دیا کرتی۔

وہ اس کے اسی پل میں تولہ اور پل میں ماشہ مزاج سے الجھا ہوا تھا۔ حد سے زیادہ خائف تھا۔  
وہ جھنجھلا جاتا۔

وہ صاف صاف کیوں نہیں کہہ دیتی تھی کہ جا بھئی، تو اناراستہ ناپ تیرا میرا گزارا نہیں ہو سکتا۔

وہ یہ سب نہیں کہتی تھی اور اس کا دل اس سے دست بردار ہونے کو تیار نہیں تھا اور اس کی باتوں اس کے انداز اور رویے سے خائف اور دل برداشتہ بھی تھا۔

درمیان کا کوئی راستہ نہیں تھا۔  
اس دن کالج کے سرسبز و شاداب گراؤنڈ میں بیٹھتے ہوئے روائے کہا۔

”سیف! آپ کسی دن اپنے محل نما بنگلے کی سیر کروائیں۔ شیرل بہت تعریف کیا کرتی ہے۔“  
”اگنی! ابھی کر لو ردا۔ میں تعریف کیا کرتی تھی، مگر اب نہیں۔“ اس نے لاپرواہی سے کہا تو وہ سر اٹھا کر

اسے دیکھنے لگا جس کے لہجے اور چہرے پر تحقیر آمیز پرچھائیاں تھیں۔  
”کیا مطلب؟“ ردا نے حیرت سے آنکھیں پھیلانیں۔

اب ایک سفید پوش ماں کا واحد سہارا، جو دو سروں کے در پر پڑی تھی۔

وہ کالج بھی الگ سے آنے جانے لگا تھا۔ شیرل کی بات اس کے دل میں انی کی طرح چبھ گئی تھی۔  
اس دن وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھی تھی۔ وہ اس کے برابر کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھنے لگا تو شیرل نے دروازہ اندر سے لاک کر لیا۔

”ہیلے جب میں تمہاری گاڑی میں تمہارے برابر بیٹھتی تھی تو مجھے بہت فخر محسوس ہوتا تھا۔ مگر اب جب تم میری ڈرائیونگ سیٹ کے برابر بیٹھتے ہو تو مجھے ندامت ہوتی ہے۔“ شیرل کے انداز میں رہی سہی مروت بھی معدوم ہو گئی تھی۔

”اور ویسے بھی مرد، خواتین سے لفٹ لیتے ہرگز اچھے نہیں لگتے۔“ شیرل کا انداز روز بروز کٹ دار ہوتا جا رہا تھا۔

اس کی بات پر سیف نے لب بھینچ لیے۔ وہ ایک لفظ بھی نہیں بولا۔ وقت کے کینوس پر دو متضاد تصویریں اس کے سامنے یک لخت ابھر آئیں، جب وہ اس کی بی ایچ ڈی میں اس کے برابر بیٹھتے اپنی خواہش کا اظہار کرتی تھی۔

”سیفو! میرا دل کرتا ہے تمہاری اس گاڑی میں یہ سفر کبھی تمام نہ ہو۔ بولو سیف۔ زندگی کا یہ سفر تم میرے ساتھ ہی طے کرو گے نا۔“

”کیا تمہیں ابھی بھی شک ہے۔ کیا تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں۔“ وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے مسکراتے

پوچھتا تھا۔

”تم پر تو خود سے بھی زیادہ اعتبار ہے سیفو! مگر پھر بھی میں یقین چاہتی ہوں۔“

”بس اتنا یقین کر لو شیرل! جس دن تمہارا خیال بھلا دوں گا، وہ میری زندگی کا آخری دن ہو گا۔“



”بہت تھکے ہوئے نظر آرہے ہو۔ شیرل سے جھگڑا ہو گیا کیا؟“

”یہ جھگڑا تو صدیوں سے چلا آرہا ہے اس دنیا کا یہی تو پرابلم ہے۔ یہاں سب ہی دولت کے پجاری ہیں اور غریب بے چارے دھکے کھاتے پھرتے ہیں۔ اس کی ذات ان کی ہستی کسی کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔“

”تم جانتے ہو سیفو! تمہارے بابا کیا تھے؟“ امی نے اس کے چہرے پر پھیلی شکستگی کو دور کرنے کے لیے کہا۔

”وہ ماضی کی بات ہے امی جان! اور ماضی چاہے کتنا بھی شاندار رہا ہو یہ دنیا تو حال پر نظر رکھی ہے میرے خیال میں امی یہ بندھن زیادہ دیر نہیں نبھ سکے گا۔“

”پتا نہیں لڑکے تو کیسی باتیں کر رہا ہے؟“

”میں شیرل کی بات کر رہا ہوں امی۔“

”تمہارا کیا خیال ہے رشتے جوڑنا اور توڑنا کوئی گڑبوں کا کھیل ہے۔ شیرل اگر کوئی ایسی ویسی بات کر جاتی ہے تو معاف کر دیا کرو اسے۔ اس کی باتوں کو درگزر کر دیا کرو۔ وہ بچی ہے۔ نا سمجھ ہے۔ دنیا کی اونچ نیچ کو نہیں جانتی۔“ امی اسے سمجھانے والے انداز میں بولیں۔

”میں اسے کب تک معاف کرتا رہوں۔ کب تک اپنی شخصیت اور خودداری کو کچلتا رہوں۔“

”دیکھو سیفو! ہماری طرف سے کوئی ایسی بات نہیں ہونی چاہیے جس سے سعید بھائی کو دھوکا پہنچے۔ یا انہیں کسی قسم کا کوئی دکھ ہو۔ انہوں نے مشکل وقت میں ہمیں سہارا دیا ہے۔ یہ بات ہمیشہ یاد رکھنا۔“

”سہارا دے کر انہوں نے ہمیں خرید تو نہیں لیا امی۔ اور پھر جو کچھ بھی انہوں نے کیا وہ ان کا فرض تھا۔“

”سیف! امی نے ایسی نظروں سے دیکھا کہ وہ سر

جھکا کر رہ گیا۔

وہ کبھی بھی اس طرح امی کے سامنے نہیں بولا تھا۔

”مطلب یہ کہ حضرت آج کل خانہ بندوش ہیں۔ فی الحال تو ہمارے گھر پڑاؤ ہے۔ مستقبل میں جانے کہاں ہو گا۔“

”نہیں اب بھی نہیں سمجھی۔“ ردابا لکل ہی کندھ بن بن گئی۔

”بھئی۔ بات یہ ہے کہ موصوف دیوالیہ ہو چکے۔ محل نمائنگلہ علی ایم ڈبلیو شاندار کاروبار سب تباہ ہو چکا۔ قسمت نے بلندیوں سے پستیوں میں دھکیل دیا ہے اس لیے تم محترم کی دکھتی رگ پر ہاتھ نہ ہی رکھو تو بستر ہے۔“

”بچ بچ۔ کب ہو ایہ سب؟ اور تم نے مجھے بتایا بھی نہیں۔“ ردافسوس کرنے لگی۔

”یہ کوئی اشتہار لگانے جیسا معاملہ تو نہیں تھا جو ہر ایک کو بتائی پھرتی شرم کی بات تھی اس لیے خاموش رہنے میں ہی بہتری جانی۔“

شیرل کی بات پر وہ سرخ ہوتا چہرہ جھکا کر رہ گیا۔ ویسے بھی وہ آج کل قسمت کے عطا کردہ نتائج سے کون سا خوش گوار اثر قبول کر رہا تھا۔

اس دن وہ شکستہ دل اور مایوس جلد ہی گھر لوٹ آیا۔ ”کیا بات ہے بیٹا۔ طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔“

امی نے اسے — — خاموش اور چپ دیکھ کر تیسری مرتبہ پوچھا۔ وہ اس کے اچھے بالوں میں اپنی انگلیاں پھیر رہی تھیں۔

”میں ٹھیک ہوں امی!“ اس نے اپنی جلتی آنکھیں نیموا کر کے انہیں دیکھا۔

”مجھے تو ٹھیک نظر نہیں آرہے۔ تمہارا ماتھا بھی گرم ہو رہا ہے۔“ انہوں نے اس کی جلتی پیشانی کو چھوا۔

”بخار کی کوئی دوا لے لیتے۔ تم روز بروز خود سے لاپروا ہوتے جا رہے ہو سیفو۔“

”اور جو قسمت مجھ سے لا پروا ہو گئی؟ جو دوسروں نے اپنا مزاج بدل لیا۔“ اس کے لہجے میں برسوں کی تھکن تھی۔



مزے سے کٹ جائے گی۔ بنا فیس کے بڑا ناؤر مشورہ ہے، میری مانو تو آج ہی سے عمل شروع کرو۔ ان شاء اللہ تعالیٰ ضرور فاقہ ہو گا۔“

”فاقہ نہیں بے وقوف۔ افاقہ۔“ سیف نے مسکراتے ہوئے تردید کی۔

”ارو کو تم نے بالکل لنگڑا کر چھوڑا ہے۔“

”کوئی فرق نہیں پڑتا میاں۔ ہم ڈاکٹر ہیں۔ اسٹریچر لٹا کر دوبارہ آپریشن کر دیں گے۔ اور۔۔“

ظفیری بڑی سنجیدگی سے اپنی بات مکمل کرنا چاہ رہا تھا تب ہی اس کا موبائل بج اٹھا۔ ایمان کا نمبر اسکرین پر روشن تھا۔

”کہو ایمان؟“

”بھیا۔ وہ شمیم آیا آئی ہیں۔ اماں کہہ رہی ہیں کہ آتے ہوئے آپ سمو سے اور جلیبیاں لیتے آئیے گا۔“ ایمان کے ہاتھ پاؤں پھول رہے تھے۔

”اوہ تو شمیم آیا پھر ٹپک پڑیں۔ ان کا اپنے گھر میں دل نہیں لگتا کیا؟“ وہ بے چاری بھلا اپنی ہونے والی ساس کے بارے میں کیا کہتی۔

شمیم آپا کے بیٹے سے ایمان کی منگنی کو دو سال ہونے کو آئے تھے، مگر وہ شادی کا نام تک نہیں لیتی تھیں۔ ہر دو سرے تیسرے دن وہ ان کے یہاں اپنی مہمان نوازی کرانے چلی آتی تھیں۔ خوب خاطر تواضع کروا کر چلتی بنتی تھیں، مگر زبان پر بیٹے کی شادی کا ذکر تک نہیں لاتی تھیں۔

وہ ہر بار یہی کہتیں۔

”زہیر کی اچھی نوکری لگتے ہی ایمان کو بیاہ لے جاؤں گی۔“

اور پتا نہیں زہیر کو کس اچھی نوکری کی تلاش تھی۔ پچھلے دو سالوں سے وہ کسی ایک جگہ بھی ٹک کر کام نہیں کر سکا تھا۔ پہلے ملازمت حاصل کرنے کے لیے جوتیاں چٹھاتا اور پھر دو تین مہینوں بعد نوکری کو خیر باد کہہ دیتا۔ کبھی تنخواہ من پسند نہیں ہوتی اور کبھی اس کا مزاج، باس کے مزاج سے میل نہ کھاتا اور کبھی

وہ بے حد فرماں بردار اور ان کا دل رکھنے والا تھا۔ اس نے صرف ماں کی خواہش پر اپنی برسوں کی انجینئر بننے کی خواہش کو خیر باد کہہ کر میڈیکل جوائن کیا تھا۔ اس نے ماں کی خواہش کو سر آنکھوں پر بٹھایا تھا۔

اس نے اپنے اندر جھانکا۔

وہ سیرل سے دور نہیں رہ سکتا تھا۔ وہ اس سے دور رہنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ مگر اس کا اذیت ناک رویہ اور کٹھلی باتیں اسے اندر تک چھید ڈالتیں۔ لیکن وہ برداشت کر رہا تھا۔

کیوں کہ امی کے بقول یہ بات اسے ہمیشہ ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ سعید بھائی نے انہیں مشکل میں سہارا دیا تھا۔

لیکن سعید انکل نے انہیں مشکل میں سہارا دے کر اسے مزید مشکل میں ڈال دیا تھا۔ اس کا ذکر کئی بار اس نے اپنے جگری یار ظفیری سے بھی کیا۔ تب ظفیری نے مشورہ دیا۔

”یار! تو صاف صاف اس سے بات کیوں نہیں کر لیتا۔“

”تو نہیں سمجھے گا بر شیر، میرے ہاتھ پاؤں باندھ دیے گئے ہیں۔ بقول امی۔ ہمارا بال بال ان کے احسان تلے جکڑا ہوا ہے، یار اس احسان سے رہائی ممکن نہیں۔“

”ممکن ہے۔“ ظفیری کا لہجہ پُرسوج تھا۔

”وہ کیا؟“

”تم سر منڈوا لو۔ نہ رہیں گے بال اور نہ رہے گا احسان۔“

”بہت ذلیل ہو یا ر، کبھی تو سنجیدہ ہو جایا کرو۔“

”یہ زندگی بہت تلخ اور کڑوی ہے بھیا، اس لیے سنجیدگی کا لبادہ اوڑھنا سراسر احمقانہ پن ہے۔“ ظفیری مسکرایا۔

”اور اگر کوئی میری طرح سے انل سے سنجیدہ مزاج ہو تو؟“

”تو سر نیچے اور ٹانگیں اوپر کر لی جائیں۔ زندگی



ملازمت کی نوعیت اس قسم کی ہوتی کہ اسے رات گئے تک کام کرنا پڑتا۔ وہ اتنی سخت کوشی کا عادی نہیں تھا۔ وہ مزاجاً ”سل پسند“ تھا۔ اس لیے وہ نوکری کو لات مارنے سے پہلے ایک لمحہ کو بھی نہیں سوچتا تھا۔

”زیر نوکری جگہ تک کر نوکری کرے تو میں تیری شادی کے بارے میں سوچوں۔“ شمیم آپا سے سمجھاتی تھیں۔

”دیکھ تیری اسی لاپرواہی کی وجہ سے اس بے چاری بچی کے ساتھ بھی زیادتی ہو رہی ہے۔ پچھلے دو سالوں سے وہ تیرے نام کی انگوٹھی پننے بیٹھی ہے۔ وہ بھلے لوگ اور کب تک تیرا انتظار کریں۔“

”وہ میرا انتظار کرنے پر مجبور ہیں اماں۔ بھلا مجھ جیسا اچھا رشتہ انہیں دوبارہ ملے گا اور اگر انہیں شادی کی جلدی ہے تو میں تیار ہوں۔ مگر میری نوکری نہ ہونے کی صورت میں ان کی بیٹی کو نوکری کر کے اس گھر کو چلانا ہو گا۔ آخر کو وہ بی اے پاس ہے۔ کسی بھی اسکول میں اسے آسانی سے ملازمت مل جائے گی۔“

”تو عورت کی کمائی کھائے گا کیا؟“ شمیم آپا کو اس کی سوچ پر حیرت ہوئی۔

”آج کل کے زمانے میں لڑکیاں بھی اپنے پیروں پر کھڑی ہیں۔ اپنی کمائی سے اپنے شوہر اور اپنے بچوں کا پیٹ پالتی ہیں۔ تو کیا حرج ہے اگر وہ بھی منگائی کے اس دور میں میرا بوجھ بانٹ لے۔۔۔ اور پھر میں اسے مستقل ملازمت کا ٹھوڑا ہی کہہ رہا ہوں۔ جب تک میری ملازمت نہ لگے وہ نوکری کر سکتی ہے۔“ زیر بڑی ڈھٹائی سے اپنا موقف بیان کرتا۔

مگر اس کی اس سوچ کا ذکر شمیم آپا نے کبھی ایمان کے گھر والوں سے نہیں کیا تھا۔ اگر وہ یہ ذکر کر دیتیں تو ہو سکتا ہے ظفری اس رشتے کو ختم کرنے میں مل بھر بھی نہ سوچتا۔ کون بھائی گوارا کر سکتا ہے کہ وہ اپنی بہن کو ایک ایسے شخص سے بیاہے جو اپنے گھر کا بوجھ اپنی بیوی سے اٹھوانا چاہتا ہو۔

بس وہ ہر بار ایمان کی ماں جی سے یہی کہہ دیتیں۔

”زیر کی اچھی نوکری لگتے ہی ایمان کو بیاہ لے جاؤں

گی۔“

”مگر پچھلے دنوں تو زیر اچھی بھلی نوکری کر رہا تھا۔“

ماں جی کو سب خبر تھی۔

”وہ نوکری تو اس نے پچھلے مہینے ہی چھوڑ دی۔ دراصل ایک تو تنخواہ اچھی نہیں تھی۔ دوسرے مالک بھی بہت سخت گیر تھا۔ تیسرے رات گئے تک کام کرنا پڑتا تھا۔“

شمیم آپا زیر کے ملازمت چھوڑنے کی ایک نہیں، کئی وجوہات بتا دیتی تھیں۔

”لیکن آپ فکر نہ کریں۔ زیر بہت جلد دوسری نوکری ڈھونڈ لے گا۔ ماشاء اللہ سے میرا بچہ اتنا قابل اتلا لائق ہے کہ اسے نوکری کی کیا فکر۔ اچھا آپ یہ بات چھوڑیں اور یہ بتائیں کیا آپ نے بچی کا جینز مکمل کر لیا؟“

وہ ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پوچھتیں۔

چھوٹے سے گھر میں جینز کی کوئی چیز دکھائی نہیں دیتی تھی۔ نہ فریج، نہ ٹی وی نہ واشنگ مشین۔ نہ ڈیپ فریزر۔ انہوں نے تو۔۔۔ اچھے خاصے جینز کی توقع لگائی تھی۔ خیر سے ظفری ڈاکٹر بن رہا تھا اور ساتھ ساتھ یوشنز بھی کرتا تھا۔ ایک ڈاکٹر اپنی بہن کو اچھا جینز تو دے ہی سکتا تھا۔

”ہم سفید پوش لوگ ہیں شمیم! اپنی حیثیت کے مطابق اپنی بیٹی کو کچھ نہ کچھ ضرور دیں گے۔ ظاہر ہے بچی کو خالی ہاتھ تو نہیں بیاہیں گے نا۔“ ماں جی بات کرتے ہوئے اپنی سفید پوشی کا ذکر بھی کر ڈالتی تھیں۔

”ٹھیک ہے۔ مگر ذہن میں رکھیے گا۔ ہمارے بھی چار رشتے دار ہیں اور سب ہی کی نظریں زیر پر ہیں کہ وہ کس خاندان میں شادی کر رہا ہے اور اس کی بیوی اپنے ساتھ کتنا جینز لائے گی۔“

شمیم آپا کی بات پر ماں جی کے ماتھے پر نظر کی لکیریں ابھر آئیں۔

شمیم آپا کی باتیں ایمان کو ناگوار گزرتی تھیں۔ اس لیے ان کے جاتے ہی وہ ماں جی کے سامنے آ جاتی۔

”ماں جی۔ آپ شمیم آپا کو کھل کر کیوں نہیں بتا



# Art With You

Paint with Water Color & Oil Colour

First Time in Pakistan  
a Complete Set of 5 Painting  
Books in English



Art With You

کی پانچوں کتابوں پر حیرت انگیز رعایت

Water Colour I & II  
Oil Colour  
Pastel Colour  
Pencil Colour

فی کتاب 150/- روپے  
نیا ایڈیشن بذریعہ ڈاک منگوانے پر ڈاک خرچ  
200/- روپے



بذریعہ ڈاک منگوانے کے لئے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37 اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

دیتیں کہ وہ ہم سے چیز کی توقع مت لگائیں۔  
”کیسے کہہ دوں۔ اپنی حیثیت کے مطابق تو تجھے  
کچھ نہ کچھ دینا ہی پڑے گا۔“

”آپ کو ان کی باتوں سے اندازہ نہیں ہوا کہ وہ کچھ  
نہ کچھ کی توقع نہیں بلکہ ”بہت کچھ“ کی توقع لگائے  
بیٹھی ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو شادی کے قریب وہ ہماری  
مجبوری کا فائدہ اٹھاتے منہ کھول کر اپنی ڈیمانڈ بتا  
دیں۔ اس لیے بہتر ہے کہ آپ پہلے سے ہی ان سے  
کھل کر بات کر لیں۔“

ماں جی کو ایمان کا مشورہ درست معلوم ہوتا۔  
”ٹھیک ہے۔ پہلے میں ظفیری سے مشورہ کروں  
گی۔“



سیف نے ان دنوں شیرل سے بات کرنا بہت کم  
کرویا تھا۔ اس نے سوچ لیا تھا وہ اس سے جتنا دور رہے  
گا اس کی زبان اور آنکھوں سے اتنا ہی محفوظ ہو جائے  
گا۔

وہ طے کر چکا تھا وہ واقعی اس گھر سے اور اس لڑکی کی  
زندگی سے چلا ہو جائے گا۔ وہ کہیں اور اپنے رہنے کا  
بندوبست کر لے گا جب اس گھر سے نکلنا ٹھہرا تو انتظار  
کس بات کا۔ وہ ابھی اور اسی وقت یہاں سے چلا جائے  
گا۔ ظفیری تو اسے بارہا اپنے گھر آنے کی دعوت دے چکا  
تھا۔

”اتنے پریشان کیوں ہو۔ میرا گھر بھی تمہارا ہے۔ بلا  
جھجک چلے آؤ۔“

”میں تم پر بوجھ نہیں بننا چاہتا یا۔“ اس نے اپنی  
پیشانی کو انگوٹھے سے رگڑا تھا۔

”غیروں والی باتیں مت کرو۔ دونوں بھائی مل کر  
اس چھوٹے سے گھر میں رہیں گے۔ یہ اور بات ہے کہ  
وہ گھر تمہارے شایان شان نہیں۔ تم محلوں میں رہنے  
والے اور میں ایک جھونپڑی کا باسی اور۔“

”جو مت۔“ ظفیری کی بات پر وہ تپ گیا۔ وقعت  
انسان کی ہوتی ہے۔ اونچے محلوں کی نہیں۔“

اپریل 2015 239



دیتا۔ تم جس نچلی سطح پر آن رکے ہو، چاہتے ہو کہ باقی سب بھی اسی سطح پر آجائیں۔ تو یاد رکھو سیف علی۔ یہ ناممکن ہے۔ مجھ تک پہنچنے کے لیے تمہیں اپنا قد بڑھانا ہوگا۔ تمہیں میرے لیول تک آنا ہوگا۔“

”اوہ نہ۔“ سیف نے غصے سے ہنکارا بھرا اور بیگ اٹھانے کو مڑا۔

”غالباً تم کہیں جا رہے ہو؟“

”تم سے مطلب۔“

”جا رہے ہو تو اس خوش فہمی میں مت رہنا کہ میں تمہیں روک لوں گی۔؟“ شیرل کی نخوت سے بھرپور آواز نے اس کا امی کے کمرے تک پہنچا کیا۔

”خیریت بیٹا۔“ اس کے ہاتھ میں بیگ دیکھ کر امی نے ہول کر پوچھا۔

”مجھے ایسا لگتا ہے امی کہ اس گھر سے میرا دانہ پانی اٹھ گیا ہے۔“

”جذباتی نہیں ہوتے بیٹا۔ زندگی جذبات سے نہیں گزرتی۔ اس کے لیے کسی ٹھوس لائحہ عمل کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس گھر سے نکل کر کہاں جاؤ گے۔ کچھ وقت کی بات ہے۔ تعلیم مکمل ہونے کے بعد سعید بھائی تمہیں کلینک کھول دیں گے اور۔۔۔“

”پلیز امی۔“ وہ ان کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی۔۔۔ ہولے سے چلایا تھا۔ ”اب ان سے ایک پیسے کی مدد بھی قبول کرنا میرے لیے حرام ہے۔ آپ کیا چاہتی ہیں اپنے باپ کے احسان کے بدلے میں شیرل ساری زندگی میرا مذاق اڑاتی رہے، مجھے ذلیل کرتی رہے۔ نہیں امی۔ میں اب یہاں نہیں رہوں گا اور اب آپ مجھے روکیں گی بھی نہیں۔“ اس کا لہجہ پتھر پلا تھا۔

”کہاں جاؤ گے تم؟“

”ظفری کی طرف۔ یہاں مجھے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ اگر آپ اپنے بیٹے کی زندگی چاہتی ہیں تو مجھے مت روکیے گا۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ جلد ہی اپنے پیروں پر کھڑے ہو کر آپ کو بلوالوں گا۔ اور ان

”تو پھر سوچنا کیسا؟ تم گھر آ جاؤ گے تو مجھے بڑا سہارا مل جائے گا۔ ایمان کی شادی آنے والے دنوں میں طے ہو جائے گی تو دونوں بھائی مل کر اس کی شادی کی ارنجمنٹ کریں گے۔ میں اکیلا کہاں بھاگ دوڑ کرتا پھروں گا۔“

”بے فکر ہو جاؤ۔ یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے۔ میں سارا انتظام سنبھال لوں گا۔“ اس نے ظفری کو تسلی دی تھی۔

تیزی سے ادھر ادھر ٹہلتے وہ جیسے کسی حتمی نتیجے پر پہنچ گیا۔ وارڈ روب کھول کر اس نے نچلے خانے سے بیگ گھسیٹا اور کپڑوں کے گولے بنانا کر بیگ میں ٹھونسنے لگا۔ جب ہی پشت پر شیرل کی آواز ابھری۔

”کہیں جا رہے ہو کیا؟“

”معلوم نہیں۔“ اس کے ہاتھوں میں مزید تیزی آگئی۔

”یوں عورتوں کی طرح نخرے دکھاتے ہوئے سخت زہر لگ رہے ہو۔“

وہ رک گیا۔ ”زہر کو زہری مارتا ہے۔“

”کیا مطلب؟“

”تم مجھے کیا سمجھتی ہو شیرل!“ وہ آج سارا حساب بے باق کر دینا چاہتا تھا۔

”ایک سرکش گھوڑا جس کی لگا میں مجھے سوئپ دی گئی ہیں۔“ وہ کھلکھلا کر ہنسی تھی۔ اس کی یہ ہنسی جلتی پرتیل کا کام کر گئی۔

”ایک بات یاد رکھیے گا مس، سرکش گھوڑا خود پر سوار ہونے والے کو زمین پر اتنی زور سے پیچ دیا کرتا ہے کہ اس کی ہڈی پسلی ایک ہو جائے۔ اور جہاں تک رہا سوال لگاموں کا۔ وہ تو کسی وقت بھی چھڑائی جاسکتی ہیں۔“

”مگر تم اپنی لگا میں مجھ سے نہیں چھڑا سکو گے۔“ وہ بہت پر یقین تھی۔

”یہ تمہاری خام خیالی ہے۔“ وہ دانت پیستے بولا۔

”اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں، تم ذہنی طور پر تیار ہو، تمہارے اندر کا کیلیکس تمہیں چین نہیں لینے



شاء اللہ کچھ بن کر دکھاؤں گا۔ یہاں رہتے ہوئے میں بودا اور کمزور ہی رہوں گا۔“ اس کے کبجے کے اتار چڑھاؤ میں اس کا عزم پوشیدہ تھا۔

امی چپ رہ گئیں۔

”تو تم فیصلہ کر چکے ہو۔“ ان کا لہجہ پست تھا۔

وہ سر جھکا کر رہ گیا۔

امی نے اس کے جھکے سر کو دیکھا۔ وہ بیٹے کو سمجھ رہی تھیں۔ اس اضطراب سے بھی واقف تھیں جو مسلسل اس کے وجود کو گھیرے ہوئے تھا۔

”ٹھیک ہے بیٹا۔ مجھے اپنی خیریت کی اطلاع دیتے رہنا۔ اور اپنا خیال رکھنا۔“ دل پر صبر کی سل رکھتے ہوئے وہ مدد محم لہجے میں بولی تھیں۔

”خدا حافظ امی۔“

وسیع و عریض لان عبور کرنے کے بعد جب وہ پورچ میں کھڑی بایک کی طرف بڑھا تو شیرل کو مقابل پایا۔

”اس گھر کی ہر چیز سے ناتا توڑ کر جا رہے ہو تو پھر اس بایک پر حق جمانے سے۔ یہ بھی تو میرے پایا کی عطا کردہ ہے۔“

وہ ایک دو لمحے سن سا کھڑا رہ گیا۔ پھر جیسے بت میں جان پڑ گئی۔

”مائسٹڈ یو شیرل سعید۔ یہ بایک میری اپنی ہے۔ میرے بابا کے زمانے کی۔ ان ہی کے پیسوں سے خریدی ہوئی۔“

”اور اس میں ڈالا ہوا پٹرول، وہ کس کے پیسوں کا ہے۔“

اس کا — تھکا لہجہ اسے اندر تک سلگا گیا۔ وہ اپنی بے انتہا روشن روشن سنہری آنکھیں اس پر مزکور کیے بولا۔

”ٹھیک ہے۔ میں اس بایک سے دستبردار ہو رہا ہوں، بالکل اسی طرح جس طرح میں نے تمہیں چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ حالانکہ میرے بابا اور تمہارے پاپا نے تم پر میرے نام کی اسٹیٹمنٹ لگائی تھی۔“ وہ جیسے بہت چبا چبا کر بولا تھا۔ شیرل کو منگے سے

لگ گئے۔

”میں کوئی فالتو شے نہیں ہوں جسے تم جیسے اپنی مرضی سے توڑ پھوڑ دیں۔ تمہیں چھوڑنے اور اپنانے کا حق میرا ہے۔“

”اس کا فیصلہ وقت پر چھوڑ دو۔“ بیگ پر اپنی گرفت مضبوط کیے وہ گیٹ کی جانب بڑھا۔

”سنو۔“ وحشت کے اس پل میں انتہائی تیزی سے آگے بڑھ کر اس نے سیف علی کا بازو تھام لیا۔ ”تم اپنے رویے کی وضاحت کیے بغیر اس طرح نہیں جاسکتے۔“

”کون سا رویہ۔“ وہ حیرت سے پوچھنے لگا۔ رویہ تو اس نے بدلا تھا۔ انداز تو اس کے تکلیف نہ ہو گئے تھے۔

”تم یوں اس طرح یہ گھر چھوڑ کر نہیں جاسکتے اور میں اپنی توہین کسی قیمت پر برداشت نہیں کروں گی۔“ وہ چلا رہی تھی۔

”میں نے تمہاری کون سی توہین کی ہے۔“ ”تم پر شروع سے میرا حق ہے۔“ وہ اس سے زیادہ جیسے خود کو یقین دلارہی تھی۔

سیف نے بڑے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ رات کے گہرے ہوتے اندھیرے میں وہ اس پر اپنا پورا پورا حق جمارہی تھی، بے اختیار اس کا دل اس گھسور لڑکی کے لیے پکھل سا گیا، لیکن دوسرے ہی لمحے وہ بے حد سنگدلی سے بولا۔

”میں کسی حق کو نہیں مانتا۔“

”سیف۔“ وہ چیخنی۔

”چلاؤ مت۔“ اس نے شیرل کا ہاتھ جھٹک دیا۔ ”سچ ہمیشہ کڑوا ہوتا ہے۔“

”جاؤ۔“ چلے جاؤ یہاں سے۔ اور آئندہ اپنی صورت کبھی مت دکھانا۔“ وہ وحشت زدہ ہو گئی۔

”ٹھیک ہے۔ میں جا رہا ہوں۔ مگر تم یاد رکھنا، خود پسندی کی آگ بڑی خطرناک ہوتی ہے، جلنے والا جل جل کر جسم ہو جاتا ہے۔“ وہ گیٹ کی طرف بڑھا۔

”سنو۔“ مجھے تم سے نفرت ہے۔ بے پناہ نفرت۔



آئی ہیٹ یو۔“  
سیاہ گیت سے باہر نکلتے نکلتے اس کی غصیلی آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی۔ وہ تلخی سے ہنس دیا۔ اسے اندازہ تھا۔ ایک نہ ایک دن اسی قسم کے جملے سننے کو ملیں گے۔

”تم مجھ سے نفرت کرتی ہو، لیکن میں بھی تمہیں بتا دوں گا کہ نفرت کیسے کی جاتی ہے؟“  
محبت تو ہر حال میں دوسرے کو قبول کر لیتی ہے۔ تو پھر یقیناً اس نے محبت نہیں کی تھی۔ وہ شاید اب تک اس کے جذبات سے کھیلتی رہی تھی۔ اسے بے وقوف بنائی رہی تھی۔

وہ حد سے زیادہ دل برداشتہ تھا۔ اور اس کے یوں بدل جانے پر مایوس بھی۔ اسے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے دھند ہی دھند تھی۔ مگر وہ چلتا چلا جا رہا تھا۔ تب ہی سائیڈ سے تیز رفتاری سے اچانک قریب آ جانے والی گاڑی کے ٹائر نور سے چرچائے، لیکن وہ پھر بھی دھکا لگنے سے اچھل کر دور جاگرا۔

آخری احساس اس کے ذہن میں وجود میں اٹھنے والی ٹیسوں کا تھا۔

شدید درد کی ایک تیز لہر بل کھاتی اٹھی تو اس نے کراہ کر آنکھیں کھول دیں، چند لمحے خالی الذہن پڑے رہنے کے بعد سارے منظر نگاہوں کے سامنے واضح ہو گئے۔

”سیف۔ ٹھیک تو ہو۔“ یہ ظفیری کی آواز تھی۔ اس نے گردن گھمائی۔ وہ مہربان مسکراہٹ لیے قریب پڑے بیچ پر بیٹھا تھا۔

”ظفیری۔ میں۔ میں۔“  
”کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ جس گاڑی سے تم ٹکرائے وہ ہاشم کی تھی، تمہیں اسپتال ایڈمٹ کرانے کے بعد وہ مجھے لے آیا۔“

”ہاشم کون؟“ گھومتے سر سمیت اس نے بد وقت تمام پوچھا۔

”تم اسے نہیں جانتے۔ ہمارا جو نیڑے۔“

”لیکن۔“ اس نے ٹانگ ہلانا چاہی، مگر پھر ساکت رہ گیا۔ اس کی بے جان ٹانگ۔ کیا کاشوی گئی تھی۔ اس خیال نے جیسے اس کے سارے وجود کو برف کی مانند جما سادیا۔

”میری ٹانگ ظفیری۔ میری ٹانگ کو کیا ہوا؟“ درد کی تمام تر شدتوں کو بھلا کر وہ پوچھنے لگا۔ اس کے لہجے میں اس کے اندر کا خوف جھانک رہا تھا۔  
”ڈاکٹر نے پلاسٹر چڑھا دیا ہے۔ ٹخنے کی ہڈی میں فریکچر ہے۔ کافی دن لگ جائیں گے، ٹھیک ہونے میں۔“

اور پھر کئی دن گزر گئے۔ ظفیری بلاناغہ حاضری دینے چلا آتا تھا۔ کبھی مرغی کی یخنی لے کر اور کبھی بھنا ہوا قیسم لے کر، اس کے بیڈ کے ساتھ والی ٹیبل وہ پھلوں سے خالی ہونے نہیں دیتا تھا۔

وہ کئی بار ظفیری سے شرمندہ ہوا۔  
”یار تو اتنا کچھ مت کیا کر میرے لیے۔ میں شرمندہ ہوتا ہوں۔“

”شرمندہ تو مجھے ہونا چاہیے سیف کہ میں تیرے لیے بہت کچھ کرنا چاہتے ہوئے بھی کچھ نہیں کیا رہا۔“  
”اس سے زیادہ اور کیا کرے گا۔ یار تو یہ یخنی اور قیسم مت لایا کر۔“

”ڈاکٹر نے کہا ہے کہ اس سے زخم جلد بھر جائیں گے۔“

”یار ایک کام کر۔ تو مجھے گھر لے چل۔ اس طرح خرچہ بھی کم ہو جائے گا اور تو مفت کے چکر لگانے سے بھی بچ جائے گا۔“

”رہائیں وہی گھامڑ کا گھامڑ۔ پیارے کتنی مرتبہ سمجھایا ہے کہ تو میرا ربا ہے۔ تو مجھ پر بوجھ نہیں ہے اور سن لے۔ ایک مرتبہ تو اپنے پیروں پر کھڑا ہو جائے تو سب کچھ سود سمیت وصول کر لوں گا۔ خاطر جمع رکھ۔“  
”برا ذلیل ہے پھر تو۔“

”اے الہ۔ مابدولت کی ذلالت ٹاپنے کا کوئی آلہ اب تک ایجاد نہیں ہوا۔“

سیف نے حادثے کی اطلاع گھر پر نہیں دی تھی۔



”ایک بات سچ سچ بتائیں۔ ڈاکٹر کیا کہتے ہیں‘ میں ٹھیک ہو جاؤں گا ناں۔“

”آپ بالکل ٹھیک ہیں سیف صاحب۔ کل انشاء اللہ آپ کی ٹانگ کا ایکسرے ہو جائے۔ پھر بستر تانج کی توقع ہے۔“

”اور اگر میں ساری عمر کے لیے معذور ہو گیا تو۔۔۔ کبھی چل نہ سکا تو۔۔۔؟“ وہ بے حد خوف زدہ سا ہو گیا۔ اس کی نگاہوں کے سامنے شیرل کا کھلکھلا تا طنزیہ چہرہ لہرا گیا۔

”یہ شیرل کون ہے۔“ وہ غالباً ”با آواز بلند سوچ رہا تھا۔ جب ہی اس کے لبوں سے شیرل کا نام سن کر سامنے کھڑی لڑکی پوچھ بیٹھی تھی۔ وہ لمحہ بھر کو ٹھنک کر فس دیا۔

”میری بچپن کی سنگیت۔ اس سے زیادہ مزید میں کچھ نہیں بتا سکتا۔ آپ بتائیں۔ آپ کا کیا خیال ہے۔ میں ٹھیک ہو جاؤں گا ناں۔“

”اللہ کی ذات پر کامل بھروسہ ہونا چاہیے۔“

”خدا کی ذات پر تو بھروسہ ہے لیکن اپنی تقدیر پر نہیں۔“ اس کی روشن روشن سنہری آنکھیں مایوسیوں میں ڈوب گئیں۔

”آپ کچھ پڑھنا پسند کریں گے۔ میرا مطلب کوئی کتاب وغیرہ۔“

”کیسی کتاب۔“

”شاعری سے تو دلچسپی ہوگی آپ کو۔“

”اے اے کہاں۔ ہم میڈیکل کی تعلیم حاصل کرنے والے لے حد خشک مزاج ہوتے ہیں۔“

”رہی۔ لیکن آپ کو دیکھ کر معلوم نہیں ہوتا۔“

”وہ کیوں۔“ وہ دلچسپی سے پوچھنے لگا۔

مقابل کی گہری آنکھیں خود پر جمی دیکھ کر وہ بے انتہا گڑبڑا سی گئی۔

”بس ایسے ہی۔ اندازہ تھا میرا۔“

اسے اس لڑکی کا یوں گڑبڑانا بہت بھایا۔ پہلی بار اس کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ اس مجروح اور بے بس حالت میں وہ اسے سکون کا احساس دلا رہی تھی۔

سیف نے خاموشی سے اس کی طرف دیکھا۔ وقت کے کینوس پر دو الگ الگ نظارے ایک ساتھ اس کی نظروں کے سامنے جھلکنا گئے۔ ایک وہ تھی۔ جو بچپن کی ساتھی ہونے کا حق رکھتی تھی۔ حسن و جمال کا مریخ جسے دل کی تمام تر شدتوں سمیت چاہا تھا۔

اور ایک یہ تھی قرینے سے سر پر اوڑھے گئے آنچل کے ہالے میں سانولی۔ اور سیاہ آنکھوں والی جس کے لہجے کی نرمی حیا بخش تھی اس نے بے اختیار سوچا۔



شیمم آیا آئی تھیں۔ وہ زبیر کی نوکری کی خوشخبری لائی تھیں۔ ماں جی نے سنا تو خوش ہو گئیں۔ اب یقیناً ”ایمان کی شادی کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ پچھلے دو سالوں سے منگنی تھی۔ وہ رشتہ داروں اور محلے داروں کو جواب دے دے کر تھک چکی تھیں کہ ایمان کی شادی کی تاخیر کی وجہ کیا ہے۔“ ماشاء اللہ سے اچھی تنخواہ ہے اور دیگر سہولیات الگ۔ اس کے پاس کا کہنا ہے کہ اگر وہ دل لگا کر کام کرے گا تو اسے رہنے کو فلیٹ بھی ملے گا۔ اور آنے جانے کے لیے انہوں نے موٹر سائیکل تو ابھی سے دے دی ہے۔“

”ماشاء اللہ۔ ماشاء اللہ۔“ ماں جی خوش ہو گئیں۔

”اللہ اسے مزید ترقی دے۔ وہ دن دو گنی رات چو گنی ترقی کرے۔“

”بس اب میں اپنی امانت جلد ہی لے جاؤں گی۔“ شیمم اپنے جیسے ان کی سوچ پڑھ لی تھی۔

”اب مجھ سے اس عمر میں گھر داری نہیں کی جاتی۔ ایمان آئے اور اپنے گھر کو بھی سنبھالے اور اپنے شوہر کو بھی۔“

اسی دم سر پر دوپٹہ جمائے ایمان چائے کی ٹرے لیے اندر چلی آئی۔ اس نے جلدی سے پکوڑے تل لیے تھے۔ اور محلے کے بچے سے سمو سے بھی منگوا لیے تھے۔ ایک تو شیمم آپا پہلے سے اطلاع دے کر آیا کریں



وہ امی کو پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ان دنوں اس پر شدید قسم کا ڈیپریشن طاری تھا۔ وہ محض بستر کا ہو کر رہ گیا تھا۔ سارے ارادے، سارے منصوبے دھڑے رہ گئے تھے۔ وہ بہتر زندگی کی تلاش میں در بدر ہوا تھا، شیرل کی نظروں میں اونچا ہونا چاہتا تھا، لیکن شاید وقت اور قسمت اس کے خلاف تھی۔

جسم ساری پیٹوں سے ایک ایک کر کے آزاد ہو چلا تھا، لیکن ٹانگے۔ وہ بالکل لپاچ ہو کر رہ گیا ایسے میں کسی ہمدرد اور غمگسار کی ضرورت شدت سے محسوس ہوتی ہے۔ وہ اگر شیرل کو بلا لے تو۔ کئی بار دل نے شدت سے خواہش کی کہ وہ اسے کال کر لے یا پھر اسے موبائل پر ایک ایس ایم ایس ہی کر ڈالے۔

کئی بار اس کی انگلیاں موبائل کے ”کی پیڈ“ پر تھرکتیں، مگر وہ ہر بار میسج لکھ کر مٹا ڈالتا تھا۔ وہ تو شیرل کو میسج نہ کر سکا البتہ شیرل کی طرف سے دل جلانے والا پیغام موصول ہو گیا۔

”آئی ہیٹ یو۔“ اس ظالم لڑکی نے وہی لکھا تھا جو گھر سے نکلتے وقت اس کے کانوں میں اندیلا تھا۔ بہت بحث و دلائل کے بعد ظفیری اسے اپنے گھر لے آیا تھا۔ وہ دو کمروں اور ایک صحن کا چھوٹا سا گھر تھا۔ بہت صاف ستھرے اور نفاست سے ترتیب شدہ گھر کے چھوٹے سے سیڑھیوں کے قریب واقع اس کمرے میں بستر ظفیری کی مدد سے دراز ہوتے ہوئے اس نے بے حد طمانیت محسوس کی۔

صبح آنکھ کھلی تو پھر۔ مایوسیوں نے جیسے یک لخت اس پر یلغار کر دی۔ اس نے پاؤں کو حرکت دی تو درد کی ایک شدید لہر پورے وجود کو کاٹ کر رہ گئی۔

اس کے لبوں سے کراہ سی نکل گئی۔ ایسا آخر کب تک چلے گا؟ کب تک آخر؟ بہت دیر بعد سلگتی سوچوں اور مایوسیوں کے اندھیروں سے ابھر کر اس نے سامنے دروازے کی جانب دیکھا، روشنی کی ایک کرن مقابل تھی۔

ایک تابندہ و درخشاں کرن۔ وہ ہاتھوں میں ٹرے

تھامے کھڑی تھی۔ لبوں پر مہربان مسکراہٹ تھی۔ ”آپ ناشتا کر لیجئے۔“ لہجہ بھی بے حد ہمدرد اور نرم تھا۔

وہ شاید ظفیری کی بہن تھی۔ اس نے بے حد شرافت سے، اچھے بچوں کی طرح ناشتا کرنے کے بعد دوا کھالی تو وہ واپس جانے کو مڑی۔ ”میں آپ کا نام جان سکتا ہوں۔“

”ضرور۔ مجھے ایمان کہتے ہیں۔“ یہ لڑکی بھی اپنے بھائی کی طرح سے بے حد نرم خو اور ہمدرد معلوم ہو رہی تھی۔

کھڑکی سے باہر کھلتے بچوں کی آوازوں پر اس نے اپنے اندر خوشگوار سی کیفیت محسوس کی۔ یہ شور کانوں کو برا نہیں لگ رہا تھا، بلکہ ہمت اور زندگی کی نوید دے رہا تھا۔ وہ تکیوں کے سہارے سنبھل کر بیٹھ گیا۔ ”ہیلو۔ ہیر شیر۔ کیا ہو رہا ہے۔“ ظفیری اندر چلا آیا۔ ہنستا ہوا، کھلکھلاتا ہمیشہ کی طرح ہشاش بشاش۔ ”بستر اینڈ تے ہوئے کیا کیا جاسکتا ہے۔“ اس نے الٹا سوال داغ دیا۔

”بہت کچھ مثلاً“ مستقبل کے سامنے سنے دیکھے جاسکتے ہیں۔“

”پلیز کچھ کرو۔ میں واقعی اس حالت سے تنگ آچکا ہوں۔“

”صبر!“ بچہ صبرا۔“ آپ کے ٹخنے کا ایکسرے ہو گا۔ تب ہی صحیح معلوم ہو سکے گا کہ مزید کتنے دن اور آپ کو بستر بیٹھ کر چین کا طبلہ بجانا ہے۔“

”چین کی بانسری ہوتی ہے۔“ اس نے تصحیح کی۔

”ارے بھئی۔ اردو اپنی ہے اور ہم اردو کے۔ لہذا سب چلتا ہے۔ اچھا تم بیٹھ کر مزید کھیاں مارو۔ میں ذرا روزی روٹی کی فکر کر آؤں۔“ وہ جس تیزی سے آیا تھا، اسی تیزی سے باہر نکل گیا۔ اور وہ جھٹلا کر رہ گیا۔

”ظفیری۔ ظفیری“ ظفیری کو گئے کافی دیر ہو گئی تھی اس نے آواز لگائی۔

”ظفیری بھائی ٹیوشن بڑھانے گئے ہیں، کوئی کام ہے تو تائیں۔“ وہ بے حد شائستہ اطوار لڑکی مخاطب تھی۔



# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو پیسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو مائیل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو
- ✧ ہر پوسٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

**We Are Anti Waiting WebSite**

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

# WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on  
Facebook

[fb.com/paksociety](https://fb.com/paksociety)



[twitter.com/paksociety1](https://twitter.com/paksociety1)



تو چائے پانی کی تیاری میں اتنی پریشانی کا سامنا تو نہ کرنا پڑے۔ اسے ان کا وقت بے وقت ٹپک پڑنا ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔

”یہ پکوڑے لیجئے آیا۔“ انہیں چائے کی پیالی بنا کر دینے کے بعد ایمان نے پکوڑوں کی پلیٹ ان کی جانب بڑھائی تو دعاؤں کا ایک طویل دوران یہ شروع ہو گیا۔ ”جیتی رہ بچی۔ اللہ لمبی حیاتی کرے۔ تیرا آنا ہمارے گھر کے لیے مبارک ثابت ہو۔“

”آمین۔“ ماں جی نے کہا۔

”آپ نے کوئی کرایہ دار رکھ لیا ہے کیا؟“  
”نہیں ظفیری کا کوئی زخمی دوست ہے۔“

ماں جی نے بتایا تو عظیم آپا کے ماتھے پر ناگواری کی سلوٹیں سی ابھر آئیں۔

”اس زخمی کا اپنا کوئی گھر نہیں ہے کیا؟ مجھے محلے والوں سے ہی پتا چلا ہے کہ جوان جہان لڑکا ہے۔ جسے تم نے گھر میں رکھ چھوڑا ہے۔ اور بھلا یہ ظفیری کی عقل کو کیا ہوا؟ جوان بہن کی موجودگی میں اپنے کسی دوست کو گھر میں گھسایا۔“

اس کی باتوں پر ماں جی کے چہرے پر ایک سایہ سا اگر گزر گیا۔

”بس چند دنوں کی بات ہے۔ صحت یاب ہوتے ہی چلا جائے گا۔ دراصل بیچارے کی ٹانگ ٹوٹی ہے۔ وہ جلنے پھرنے سے معذور ہے۔ اچھا چھوڑو۔ تم بھی کیسی باتوں میں الجھ گئیں۔ مجھے بتاؤ۔ شادی کی کون سی تاریخ تمہارے ذہن میں ہے۔“ ماں جی نے عظیم آپا کا دھیان بٹایا تو وہ بولیں۔

”میرے خیال میں دو ماہ کے بعد کی تاریخ رکھ لیتے ہیں۔“

”ٹھیک ہے۔ میں بھی ظفیری سے مشورہ کر لوں۔“  
”ضرور۔“

شام کو ظفیری آیا تو ماں جی کا متفکر چہرہ دیکھ کر چونک گیا۔ ان کی آنکھوں میں عجیب سا اضطراب تھا اور ماتھے پر تردد کی لکیریں۔

”کیا ہوا ماں جی۔“

”تیرا یہ دوست یہاں کب تک پڑا رہے گا۔“  
”کیوں کیا ہوا؟“ ظفیری چونکا۔

”آج عظیم آپا کی تھی ایمان کی شادی کی تاریخ لینے۔ وہی کرید کرید کر تیرے دوست کے بارے میں پوچھتی رہی اور کہہ گئی ہے کہ محلے والے تیرے دوست کی موجودگی پر سو طرح کی باتیں بنا رہے ہیں کہ جوان بہن کی موجودگی میں ظفیری نے اپنے کسی دوست کو رکھ چھوڑا ہے۔ ہمارے پاس ایک عزت ہی تو ہے ظفیری۔ بہتر ہو گا۔ اگر تو اس لڑکے کو کہہ دے کہ وہ اپنا انتظام کہیں اور کر لے۔“

”ماں جی۔ وہ بہت شریف اور اونچے گھرانے کا لڑکا ہے۔ ان دنوں حالات کا مارا ہے اس لیے میری طرف چلا آیا۔ اب یہ مناسب نہیں لگتا کہ مشکل وقت میں میں اپنے دوست کے کام نہ آؤں اور اسے چلتا کروں۔ وہ میرا جلدی یار ہے ماں جی۔ پلیز کسی کی فضول بات پر کلن نہ دھریں۔“

ہمیں اسی محلے میں رہنا ہے۔ ظفر پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ محلے والوں کی باتوں کا اثر قبول نہ کریں۔ کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر لینا مسائل کا حل نہیں ہوتا۔“  
”افوہ ماں جی۔ آپ تو ایک بات کے پیچھے ہی پڑ جاتی ہیں۔“ وہ جھلایا تھا۔

”مجھے اپنی دوستی کے سامنے شرمندہ مت کرائیں۔ مجھے اپنے دوست اور اپنی بہن دونوں پر خود سے زیادہ اعتماد ہے۔ اور پھر سیف منگنی شدہ ہے۔ ایمان کی شادی بھی ہونے والی ہے۔ آپ خواہ مخواہ محلے والوں اور دنیا کی باتوں میں آکر اس نیکی کو برباد نہ کریں۔ میں سیفو کو کہیں بھی جانے نہیں دوں گا۔ وہ جب تک چاہے یہاں رہے۔“

وہ اپنی بات کا رد عمل دیکھے بغیر غسل خانے کی طرف بڑھ گیا۔

سیف کے منحنے کا ایک سرے لے لیا گیا تھا۔ فرہکچو تقریباً ”ٹھیک ہو چکا تھا ڈاکٹرز نے معمولی ایکسر سائز بتائی تھی۔“

ظفیری نے یہ اطلاع بہم پہنچائی تو اس کا دل چاہا کہ



”آپ چائے پیئیں۔“  
میں اتنے میں کمرہ ترتیب دے لوں۔“  
”میں نے آپ کے کمرے پر قبضہ کر لیا ہے۔ آپ  
کو تکلیف تو نہیں ہوئی۔ آئی مین جگہ کی تنگی کی وجہ  
سے۔“

”دل کھلے اور کشادہ ہوں تو جگہ بہت سیف  
صاحب۔“ کبھی کبھی وہ بہت گہری باتیں کر جاتی تھی۔  
وہ اس کے الفاظ کو معنی کا جامہ پہنانے کی کوشش میں  
لگا رہ جاتا۔

”میرے خیال میں رسمی جملے استعمال کرنا آپ کی  
مجبوری ہے۔“ وہ ہنس دی۔ اس کی ہنسی میں اتنا بے  
ساختہ پن تھا کہ سیف لمحہ بھر کر خاموش رہ گیا۔

”سوری۔“ وہ جھینپ گئی۔  
”نہیں۔ مجھے آپ کا ہنسنا اچھا لگا۔ یوں جیسے گہرے  
اندھیرے میں جگنو چمک اٹھیں۔“ اس نے صاف  
گوئی سے کام لیا۔

”آپ شاعری کرنے لگے۔ میرے خیال میں یہ  
نیک شگون ہے۔ آپ مکمل طور پر صحت یاب ہو رہے  
ہیں۔“

”آپ دل میں شکر کر رہی ہوں گی کہ بلا سے جلد  
چھٹکارا مل جائے گا۔“

اس کی بات پر وہ خاموش ہو گئی تھی۔



وہ چلنے پھرنے کے قابل ہو گیا تھا۔ لیکن ذرا سا لنگڑا  
کر چلتا تھا۔ ڈاکٹروں کے مطابق یہ لنگڑاہٹ آہستہ  
آہستہ جائے گی۔

اس نے چھوٹے چھوٹے قدموں سے اس چھوٹے  
سے گھر کے اندر باہر کئی چکر لگائے تھے۔

اس نے کالج جانا بھی شروع کر دیا تھا۔ اس کی  
پڑھائی کا بہت برج ہوا تھا۔ اس لیے دن رات کتابوں  
میں مغز ماری میں مصروف رہتا۔ یا پھر ظفیری اور ماں جی  
کے ساتھ گپ شپ لگا لیتا۔

ماں جی کو یہ لڑکا بھلا مانس لگا تھا۔ شمیم آپا کی باتوں

اٹھ کر خوشی سے ایک ٹانگ پر ناچ لے۔ اس کے دل  
سے ساری مایوسیاں، ہر قسم کے خدشات رفع ہو گئے۔  
ایمان نے پہلی مرتبہ اس کے چہرے پر خوشیوں  
کے اتنے رنگ دیکھے تھے اس سنجیدہ سے چڑچڑے  
بندے کو مسکراتے دیکھا تھا اسے خوش دیکھ کر اس کا  
اپنا دل بھی خوشی سے بھر گیا پتا نہیں کیوں؟

وہ اداسیوں کے بھنور سے نکل آیا تھا۔ اس میں  
ظفیری اور ایمان دونوں پیش پیش تھے۔ تکیے سے ٹیک  
لگا کر شہزادوں کی طرح اپنی خدمت کرواتے وہ بے  
طرح شرمندہ ہوتا رہتا۔

”میں بہت زیادہ زربار ہو رہا ہوں۔“ وہ کھانا لے کر  
آئی تو اس نے احساس تشکر سے مغلوب ہو کر کہا۔

”مت بھولیے۔ آپ بیمار ہیں۔ اور سب سے بڑھ  
کر ظفیری بھائی کے دوست ہیں۔ لہذا دونوں طرح سے  
آپ کی خدمت میرا فرض بن جاتا ہے۔“  
”لیکن پھر بھی۔“ وہ رک گیا۔

”یہ بتائیے اب آپ کیسا محسوس کر رہے ہیں؟ میرا  
مطلب ٹخنے میں زیادہ تکلیف تو نہیں ہوتی۔“

”ارے نہیں۔ اب تو میں آسانی سے اسے ادھر  
ادھر حرکت دے سکتا ہوں۔ ان شاء اللہ ایک ہفتے کے  
اندرا اندر ایک دو قدم چلنے بھی لگوں گا۔“

”اس میں آپ کی ہمت کا زیادہ دخل ہے۔ آپ  
بہت بہادر ہیں۔“

”ارے کہاں۔ میں تو بہت جلد دل چھوڑ دینے  
والوں میں سے ہوں۔ بس اچھے اور پر خلوص دوستوں  
اور ساتھیوں کی عنایتوں کے طفیل اب تک حوصلہ مند  
ہوں۔“

”میں آپ کے لیے چائے لاتی ہوں۔“ وہ کہہ کر  
چلی گئی۔

”آپ کو تکلیف ہوگی پلیز۔ اتنے دنوں سے میں  
آپ پر بوجھ۔“ اس کا جملہ ادھورا رہ گیا۔

ہلکے سے کھٹکے پر اس نے چونک کر دروازے کی  
جانب دیکھا۔ وہ ہاتھ میں چائے کے دو گلیے کھڑی  
تھی۔



نے ان کے دل میں جس قسم کے وسوسے پیدا کر دیے تھے وہ سارے وسوسے اس نوجوان سے مل کر رفع ہو گئے تھے۔ وہ بہت تہذیب یافتہ اور بیبا تھا۔ جیسے جیسے انداز میں گفتگو کرتا وہ دل کے بہت قریب محسوس ہوتا تھا۔ بہت اپنا اپنا سالگتا تھا۔ یوں جیسے وہ ازل سے اس گھر میں رہتا چلا آ رہا ہو۔ وہ انہیں بالکل ظفیری کی طرح سے عزیز ہو گیا تھا۔

”ماں جی۔ آپ کو دیکھ کر مجھے اپنی امی یاد آ جاتی ہیں۔“ وہ ان کے گھٹنوں کو ہاتھ لگاتے کہتا تھا۔

”یہ تم نے اپنی ماں کو کس امتحان میں ڈال دیا ہے پتر۔ کبھی کبھی جا کر اسے مل آیا کر۔ تاکہ اس کی ممتا کی تسکین ہو سکے۔“

ان کی بات پر لمحہ بھر کو ایک تاریک ساسیہ اس کے چہرے پر لہرا گیا۔

”جس دن کچھ بن جاؤں گا تب ہی انہیں اپنی صورت دکھاؤں گا۔ میں گھر سے یہی عزم لے کر نکلا تھا۔ اور خصوصاً وہ لڑکی شیرل۔“

”وہ تمہاری منگیت رہے پتر۔“ ماں جی کو ظفیری نے سب بتا دیا تھا۔

مگر اس دن کالج میں شیرل سے سامنا ہوتے ہی جیسے یقین کا دیا بجھ سا گیا۔

وہ کلاس سے باہر نکل کر کارڈور میں آیا تھا جب شیرل اس کے سامنے آ گئی۔ وہ بالکل ویسی ہی تھی۔ تروتازہ ہشاش بشاش اور حسین تھی۔

اسے اتنے عرصہ بعد دیکھ کر نہ وہ چونکی تھی اور نہ ہی کسی لگاؤ کا اظہار کیا تھا۔ البتہ اس کی چال کی ہلکی سی لڑکھڑاہٹ اس کی نظروں سے پوشیدہ نہیں رہی تھی۔

”تم اتنے دن کہاں غائب رہے اور یہ تمہاری چال کو کیا ہوا؟“ وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے پوچھ رہی تھی۔

”اونچی آذان بھرنے کے چکر میں کیا زمین پر آرہے اور اپنی ٹانگ تڑوالی۔“ وہ کچھ لگا رہی تھی۔

ضبط کی کوشش میں اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا اور پیشانی کی سبز رنگ ابھر آئی تھی۔

”اس طرح جب کیوں کھڑے ہو۔ پہلے تو خوب بولتے تھے۔ چند دنوں کی ٹھوکروں نے کیا سارے کس بل نکال دیے۔“ وہ ذرا بھی نہیں بدلی تھی۔

وہ خاموشی سے ہولے ہولے کارڈور کے انتہائی سرے پر آگیا، شدت ضبط سے اس کی سنہری آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

یہ محض آج کی بات نہیں ہے۔ جب تک اس کا فاسٹل نہیں ہو جاتا۔ اس سے اس کا سامنا روز ہو گا۔ اسے اس کی بد تمیزی کو پس پشت ڈال کر صرف اور صرف اپنے مقصد پر توجہ دینی چاہیے۔

وہ گھر لوٹا تو بہت بد دل تھا۔ شکر ہے ماں جی سے سامنا نہیں ہوا۔ ورنہ وہ اس کا چہرہ پڑھ لیتیں۔ وہ کسی رشتے دار سے ملنے گئی تھیں۔

وہ افسردہ تھا اور مضطرب بھی۔ تب ہی ایمان کھانے کی ٹرے اٹھائے سامنے آ گئی۔

”آپ جلدی گھر لوٹ آئے۔“  
”ہوں۔“ وہ انگلی سے کنپٹیاں دباتے بولا۔  
”یہ کھانا کھالیں۔“

”نہیں۔ میرے سر میں درد ہے۔“  
”تو پھر چائے لے آؤں۔؟“ وہ مدھم لہجے میں پوچھنے لگی۔

اسے اس لڑکی کے خدمت گزار انداز سے جیسے چڑ سی ہونے لگی۔ یہ لڑکی اتنی نرم گفتار اور ویل مہنڈ کیوں ہے اور۔ اور۔ وہ کالونٹ میں پڑھنے والی لڑکی شیرل اتنی بد دماغ، بد تمیز اور جنگلی کیوں ہے۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ایمان کا وجود شیرل کے وجود میں ڈھل جائے۔ اور وہ اپنی تمام اذیتوں سے چھٹکارا حاصل کر لے۔

”آپ سردرد کی ٹیبلٹ کھا کر ذرا دیر آرام کر لیں۔ ضرور افاقہ ہو گا۔“

وہ اپنی بات کا رد عمل جانے بغیر باہر نکل گئی اور اگلے ہی لمحے سردرد کی ٹیبلٹ اس کی پھیلی ہتھیلی پر رکھ دی۔ بنا حجت کے سیف نے گولی کھالی اور چائے پی کر



میں انا اور خودداری نہیں ہوا کرتی میرے یار۔ تم دونوں میں سے ہی کسی کو قدم آگے بڑھانا ہوگا۔“

”تمہاری باتوں میں وزن ہے ظفری۔“ اس نے ایک گہرا سانس بھرا تھا۔

”اور پھر بہت دن ہو گئے امی سے ملے۔“

”امی سے ملے یا امی کی بھتیجی سے ملے ہوئے۔“

ظفری نے ایک آنکھ دبا لی تو وہ جھینپ گیا۔ اس دم دروازے پر کھڑی ایمان نے اس شخص کی جانب دیکھا جس کا چہرہ اندرونی مسرت کے تحت ممتا رہا تھا۔ کتنی دیر تک وہ یوں ہی تصویر کی طرح ساکت جمی رہی۔

”ویسے کب ملنے جا رہے ہو اس سے؟“ ظفری نے اس کی کمر پر دھپ رسید کی۔

”کل ہی جاؤں گا“ جب انا کو پس پشت ڈالنا ٹھہرا تو نیک کام میں دیر کیسی؟ روٹھے ہوؤں کو جتنی جلدی منا لیا جائے اتنا ہی بہتر ہے۔“ وہ پرسوج انداز میں کہہ رہا تھا۔

”گند۔ پہلی بار عقل مندوں کی طرح سوچا ہے تم نے۔“

”عقل مند تو میں شروع سے ہی ہوں۔“

”عقل مند یا عقل بند۔“

”تم سے باتوں میں جیتنا کم از کم میرے لیے بہت ناممکن ہے۔“

اس کا چہرہ تروتازہ تھا۔ شگفتہ اور ہشاش بشاش۔ اور بے تحاشا روشن روشن گہری آنکھوں میں دنیا جیت لینے کی تمنا اور خواہش۔ وہ بے حد سستی اور کاہلی سے اسی طرح دروازے میں جمی رہی۔

”کیا بات ہے یا گڑبلی؟ کوئی کام تھا کیا۔“

اس کی موجودگی کا احساس کرتے ظفری نے گردن گھمائی۔

”وہ ماں جی آپ کو بلا رہی ہیں۔“

”اوکے۔ اور ذرا یہ بتاؤ کھانا کالیا کیا؟“

”نہیں ماں جی۔ گھر پر نہیں تھیں اور مجھے میتھی چنتے ہوئے خاصی دیر ہو گئی۔“

وہ یوں شرمندہ تھی جیسے کوئی نالائق شاگرد حساب کا

آنکھیں موند لیں۔ واقعی تھوڑی دیر سولینے کے بعد طبیعت کسنبھل جائے گی۔

وہ کروٹ بدل کر لیٹ گیا۔

”ہیلو بھئی، کہاں گم ہو؟“ ظفری کی آواز بو جھل فضاؤں میں چکار کی مانند گونجی۔

”اور یہ تم کلج سے جلدی کیوں لوٹ آئے تھے۔ احسن بتا رہا تھا کہ تم آدھے دن بعد ہی روپوش ہو گئے تھے۔“

ظفری کی باتوں پر اس کے چہرے پر ایک سایہ سالہا گیا۔ اس نے منہ پھیر لیا۔

”سیف۔ کیا ہوا ہے؟ کیا مجھے نہیں بتاؤ گے۔“

ظفری کی بات پر سیف پلٹا۔ اس کا چہرہ ستا ہوا تھا اور آنکھوں میں اضطراب کی پرچھائیاں تھیں۔ ”بتاؤ نا سیفو کیا ہوا ہے؟“

”کلج میں سیرل سے سامنا ہوا تھا۔ میں تو سمجھا تھا کہ اس پر میری دوری نے کچھ تو اثر ڈالا ہوگا۔ مگر اس کی زبان ہنوز زہرا لگتی ہے۔“

”اوہ۔“ اس کی بات پر ظفری نے جیسے ایک طویل سانس لی۔ ”سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

”ہمارا شان دار کاروبار تباہ ہو گیا۔ محل نما بنگلہ بک گیا۔ میں اس کے باپ کے در پر جا پڑا۔ کیا اس سب میں میری مرضی کا دخل تھا۔ وہ اشکیوں نہیں سمجھتی کہ قسمت کے سامنے سب مجبور ہوتے ہیں۔“ اس کی آواز جیسے بہت بھاری ہو رہی تھی۔

”ہمت سے کام لو یار۔“ ظفری نے آگے بڑھ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

”تم گھر جا کر اس سے ملو۔ میرا خیال ہے وہ تمہارے گھر چھوڑ دینے پر زیادہ بگڑی ہے۔ اسے تمہارے گھر چھوڑ دینے کا زیادہ رنج ہے۔ اس لیے وہ تمہاری کوئی بات سننے کو تیار نہیں۔ تم نے مجھے خود بتایا تھا کہ وہ تمہیں گھر چھوڑنے سے منع کر رہی تھی۔“

”ہاں۔ ایسی ہی بات ہے۔“ اس کا انداز ڈھیلا پڑ گیا۔

”بس تو پھر اس سے جا کر ملو اور اسے منالو۔ محبتوں



سوال حل نہ کر پایا ہو۔

”تم میٹھی رہنے دو اسے پکانے میں بہت دیر لگے گی اور یہاں بھوک سے جان نکل رہی ہے تم یوں کرو آلیٹ بنالو۔“ ظفیری نے دوپٹے سے الجھتی ایمان سے کہا۔

”جی بہتر۔“ وہ جانے کو پلٹی۔ سیف نے واضح طور پر اس کے قدموں کی لڑکھڑاہٹ کو محسوس کیا۔ صبح سے وہ بہت میٹھی میٹھی سی تھی اور اس کی سیاہ آنکھوں میں کتنی مرتبہ واضح انداز میں پانی کی ایک تہ بھی ابھری تھی۔ اسے لگتا تھا وہ کسی بھی لمحہ رو دے گی۔

”کیوں ظفیری کیا خیال ہے۔ آج کھانا خود نہ پکا لیا جائے۔ ایمان کی چھٹی ذرا ماں جی اور ایمان پر یہ واضح نہ کر دیا جائے کہ ہم بھی کسی سے کم نہیں اور۔“

”اور مستقبل قریب میں بہت ہی سکھڑ شوہر ثابت ہوں گے۔“ ظفیری نے جملہ اچک لیا۔

”بالکل۔ بالکل آج فیصلہ ہو جائے گا۔ چلو ایمان بی بی تم آرام کرو۔ آج تمہیں ہمارے ہاتھ کا پکا کھانا ہو گا۔“

آستہنہ چڑھا کر وہ سیڑھیاں اتر گیا اور کچن کی جانب چلا۔ ظفیری نے بھی پیروی کی۔

”اور اگر میرے پیٹ میں درد ہو گیا تو۔“ وہ رک کر مسکرائی۔ اس نے چہرے پر طاری افسردگی کو نوچ کر پھینک دیا۔

”تو اپنی ڈاکٹری کس دن کام آئے گی۔ تم پر اپنے سارے گھر آزمائیں گے۔“

”گویا آپ لوگوں کے ہاتھوں انجام کو پہنچنے والی میں پہلی ہستی ہوں گی۔“ وہ ان کی حرکات کا معائنہ کرنے ان کے سر پر کچن میں جم گئی۔

سیف نے ہنسیا چو لے پر چڑھادی تھی۔ ظفیری نے سکھڑ بیبیوں کی طرح اٹا گوندھ کر ایک طرف رکھ دیا تھا۔ کھانا پکانے کے دوران ان دونوں سے سرزد ہوتی بو کھلا ہٹوں سے وہ محفوظ ہونے کے ساتھ ساتھ ہنستی بھی رہی۔ اس کی ہنسی نے کتنی ہی پار سیف کو چونکایا۔ یوں ہنستی ہوئی وہ بہت معصوم لگتی تھی۔

”اب تو تمہیں یقین ہو گیا نا کہ ہم بہترین شوہر ثابت ہو سکتے ہیں۔ لہذا ہمارے لیے بے حد پیاری بھابیوں کا جلدی سے انتخاب کروالو۔“ کھانا معدے میں منتقل کرنے کے بعد ظفیری نے بہت سنجیدگی سے کہا۔

”بھئی میں تو ریزرو ہوں۔ تم اپنے لیے کہو۔“ سیف مسکرایا۔

”ارے یار تمہاری ریزرویشن بھی بس ایویں ہی ہے، مبہم مشکوک اور غیر یقینی سی۔“

”تم دیکھنا میرے جاتے ہی سارا معاملہ فٹ ہو جائے گا۔ تمہارے لیے خوش خبری لاؤں گا۔“ وہ بہت پر عزم لگ رہا تھا۔

”انتظار رہے گا۔“ ظفیری نے اس کی کمر پر دھپ رسید کی۔

کتنے بہت سے رنگ اس کے چہرے پر آئے۔ اس کی آنکھوں میں بڑی تیز چمک تھی۔ ایمان نے بڑی گہرائی سے اس کی آنکھیں پڑھیں۔ بہت کچھ پالنے کی خوشی میں وہ سرشار تھا۔

\*\*\*

شام کے تلخجے اندھیروں میں امی سے گلے ملنے اور بہت ساری باتیں کرنے کے بعد وہ شیرل کے کمرے میں چلا آیا۔

”ہیلو شیرل۔“ دل کی گہرائیوں سے نکلی آواز خاصی گونج دار تھی۔

”تم۔“ اسے سامنے دیکھ کر شیرل کی پیشانی پر ناگواری کی کتنی لکیریں ابھر آئیں۔ وہ لیپ ٹاپ پر اپنے کسی فرینڈ سے باتیں کر رہی تھی۔ اس کی مداخلت اسے بہت ناگوار گزری۔

”تم اتنے ان کلچرڈ اور ال مینوڈ کب سے ہو گئے یہ تک بھول گئے کہ کسی کے کمرے میں داخل ہونے سے پہلے ناک کیا جاتا ہے۔“

وہ ویسی ہی تھی، اکھڑ مزاج اور مغرور سی۔ نخوت سے ناک سکوڑے اسے گھور رہی تھی۔



اس کے مزاج میں ذرا بھی فرق نہیں آیا تھا۔ سنہری آنکھوں میں جلتی مشعلیں بجھنے کو تھیں کہ وہ سنبھل گیا۔

”تمہارے کمرے میں داخل ہونے کے لیے مجھے کسی تکلف اور فارملہٹی کی ضرورت نہیں۔“  
”اے آنے کا مقصد بیان کرو۔ کیسے یاد آگئی۔ کوئی ضرورت کھینچ لائی کیا؟“ انداز تیکھا تھا اور اہانت آمیز بھی۔

”ہاں تمہاری ضرورت کھینچ لائی ہے، میں سمجھتا ہوں کہ اب وقت آگیا ہے کہ ہم سارے جھگڑے بھلا کر صلح کر لیں۔“

”جھگڑے برابر کے لوگوں سے کیے جاتے ہیں۔“ اس کے لہجے کی کٹ اندر تک چھید کر رکھ دیتی تھی۔ وہ پہلو بدل گیا۔

”شیرل ہم نے ایک مدت ایک دوسرے کو دیکھا ہے، پر کھا ہے، ہم ایک دوسرے کے بچپن کے ساتھی ہیں۔“

”جملے خوب صورت استعمال کرنے لگے ہو۔“  
”میں سنجیدہ ہوں شیرل۔“ وہ جھنجھلا سا گیا۔

”تم کیا سمجھتے ہو؟ میں تم سے بے خبر رہی ہوں، تم اب تک کہاں تھے مجھے سب علم ہے۔“ وہ خوش ہو گیا۔ اس کے جملے اسے زندگی کی نوید دے گئے۔  
”میں جہاں بھی رہا ہوں شیرل، تمہاری یاد سے غافل نہیں رہا۔ میں نے ہر ہر موڑ پر تمہیں پکارا ہے، تمہارا انتظار کیا ہے۔“

”میرا انتظار۔“ وہ استہزائیہ انداز میں ہنسی۔  
”سیف علی صاحب میں دن میں خواب دیکھنے کی عادی نہیں۔“

”کیا مطلب؟“ وہ سمجھ نہ سکا۔  
”کیا تم اپنے دوست کی بہن سے محبت کی پیٹنگیں نہیں بڑھا رہے۔“

”شیرل۔“ وہ بے حد صبر و تحمل سے بولا۔ ”میرا خیال ہے تم غلط سمجھ رہی ہو۔“  
”جی نہیں۔ تم مجھے غلط سمجھ رہے ہو۔“ وہ چلائی۔

”کیا تم اس دو ٹکے کی لڑکی کو پسند نہیں کرتے۔“  
”سٹ اپ!“ معطل ہوتے حواسوں کو یکجا کر کے وہ دھاڑا۔ ”اس معصوم لڑکی کے لیے ایسے بے ہودہ الفاظ میں برداشت نہیں کر سکتا۔“

”اوہ!“ لمحہ بھر کو شیرل نے اپنے ہونٹ سیٹی بجانے والے انداز میں سکڑے، پھر جیسے ہولے سے پھنکاری تھی۔

”تو بات یہاں تک پہنچ چکی ہے اور اس لڑکی کی چند دنوں کی رفاقت نے اسے میرے مقابل لا کھڑا کیا ہے، کیا گھول کر پلا دیا ہے۔ اس لڑکی نے تمہیں۔“ اس کا دل چاہا، طمانچوں سے اس کا منہ لال کر دے۔  
”اگر میں یہ کہوں کہ میں بقول تمہارے اسے پسند کرتا ہوں تو۔“

”تو میں اپنے حق سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں۔“

”یہ دھمکی تم مجھے پہلے بھی دے چکی ہو۔“ وہ چڑسا گیا۔ اس کا چہرہ کانوں کی لوؤں تک سرخ ہو چکا تھا۔ چند لمحے اس بد تمیز لڑکی کو گھورتے رہنے کے بعد وہ ایک دم ایڑیوں پر گھوما اور دروازے کی طرف چلا۔  
”تم مجھے ٹھکرا نہیں سکتے۔“ وہ حد سے زیادہ پر اعتماد تھی۔

”کیوں۔ تم میں کیا سرخاب کے پر لگے ہیں۔“  
”مجھے معلوم ہے، تم مجھے بے انتہا چاہتے ہو اور دوسرے میرے پیپا کی دولت لوگوں کے لیے بے پناہ اثرائتیشن کا باعث ہے۔“ اس کے لہجے میں نخوت تھی۔

اس کی بکو اس پر وہ لمحہ بھر کو رکا تھا اور پھر پیچھے دیکھے بنا ہر نکل آیا۔

اسے خود پر غصہ آرہا تھا۔ یہاں اگر بات گنوانے کی بھلا کیا ضرورت تھی؟ وہ واپس نہ آنے کا عہد کر کے نکلا تھا۔ تو پھر دوبارہ ذلیل ہونے کے لیے لوٹنے کی کیا تک تھی۔

جب وہ اس دو کمروں والے چھوٹے سے گھر کے دروازے پر کھڑا تھا تو وہ سلونی رنگت والی لڑکی اسے



نہایت حیرت سے تنک رہی تھی۔ وہ تو ایک ہفتے کے لیے گیا تھا۔ لیکن اسی دن ہی لوٹ آیا تھا۔

بہر حال جو بھی تھا وہ خوش تھی۔ جانے کیوں؟ شاید اتنے دنوں میں وہ اس کے وجود کی عادی ہو چکی تھی۔ تب ہی تو آج کا سارا دن ایک صدی بن کر گزرا تھا۔ شمیم آپا نے جس قسم کی بکواس کی تھی اس کے بعد اس شخص کے چلے جانے پر اس نے سکھ کا سانس بھر لیا تھا۔ مگر ساتھ ہی ایک نامعلوم سی بے چینی اور اضطراب بھی تھا۔

اس کے چلے جانے کے بعد وہ سارا دن چپ رہی تھی۔ مگر شمیم آپا جب ماں جی سے ملنے آئیں تو دروازہ کھولتے وہ خوف زدہ بھی ہو گئی۔ خوف سے پہلے بڑے چہرے سمیت بمشکل اس کے لبوں سے سلام پھسلا تھا۔

”دروازے پر کون ہے ایمان؟“ ماں جی کی آواز آئی تو شمیم آپا اس کے سائیڈ سے ہو کر خود ہی اندر چلی گئیں۔

”میں ہوں۔ اتنے دن ہو گئے تھے ملاقات کیے۔ اداس ہو رہی تھی۔ اس لیے ملنے چلی آئی اور ساتھ میں ایمان کے کپڑوں کا ناپ بھی دے دیجئے۔ ابھی سے کپڑے سلوانے لگوں گی تو شادی تک تیاری ہو سکے گی۔“

شمیم آپا نان اسٹاپ بولتی گئیں۔  
”ہاں یہ تو ہے۔“ ماں جی نے اثبات میں سر ہلایا۔  
اور ایمان کو آواز دی۔

”ایمان چائے بنا لاؤ اور ساتھ میں کوئی اچھا سا ناپ والا سوٹ دے دو۔“

”میں نے شادی کا جوڑا سرخ رنگ کا پسند کیا ہے۔ ولیمہ کا جوڑا چونکہ آپ کی طرف سے ہو گا۔ اس لیے جیسا چاہے بنوائیں۔ ویسے زبیر کو ہر رنگ پسند ہے۔ کہہ رہا تھا کہ آپ لوگوں سے کہہ دوں کہ دلہن کے ولیمہ کا جوڑا ہرے رنگ کا ہونا چاہیے۔“

”اے ہر رنگ بھی کوئی ولیمہ کا رنگ ہوتا ہے۔“  
ماں جی نے منہ بنایا۔

”یہ رنگ تو مایوں، مہندی کا ہوتا ہے۔“

”چلیے۔ پھر آپ اپنی پسند کا بنا لیجئے گا۔ ویسے یہ بتائیں وہ لڑکا چلا گیا کیا؟“

شمیم آپا کو نہ تو بیرونی کی بات پر اعتبار تھا اور نہ ہی ایمان کی گواہی کا یقین۔ اس لیے ماں جی سے تصدیق کرنے کی خاطر دوبارہ پوچھنے لگیں۔ ”ہوں۔“ ماں جی نے مبہم سا جواب دیا۔

”بچلوا اچھا ہے جان چھٹی۔“ شمیم آپا کھل گئیں۔  
شکر ہے وہ شمیم آپا کے جانے کے بعد آیا تھا۔ وہ اگر ان کی موجودگی میں آجاتا تو جانے کون سا طوفان بپا ہو جاتا۔

وہ سامنے کھڑا تھا اور وہ اسے دیکھ کر اپنی جگہ جمی رہ گئی تھی۔

”اندر آنے کی اجازت نہیں۔“ تھکن زدہ آواز کو اس نے بے شاشت میں بدلا۔

وہ سٹپٹا کر ایک طرف ہو گئی۔  
”آپ اتنی جلدی لوٹ آئے؟ میرا مطلب وہاں سب خیریت تھی نا اور شیر۔“

”ظفری کہاں ہے؟“ اس کی بات کا جواب نہ دینے کی خاطر اس نے موضوع بدلا تھا۔  
”گھر پر نہیں ہیں۔“

وہ پلٹ کر باورچی خانے میں چلی گئی اور ٹرے میں کافی کے دو گ بنالائی۔ ”ہاں واقعی۔ اس وقت سخت ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ آپ نے بن کے کیسے سمجھ لیا۔“

وہ خاموش رہی۔

”کیا بات ہے بہت حب ہو۔“

وہ کتنی دیر اس کی سیاہ آنکھیں پڑھتا رہا تھا۔

”نہیں تو۔“

”کچھ ہوا ہے کیا؟“

وہ بڑی اپنائیت سے پوچھ رہا تھا۔

وہ سر نہ ہواڑے کافی کے گم میں چمچہ گھماتی رہی۔

شمیم آپا کی گھوجتی نظریں اسے اپنے وجود کا گھیراؤ کی محسوس ہو رہی تھیں۔ ہر طرف سے جھانکتی ہوئی دیوار



”سنو۔ تھوڑی سی کافی اور بنا دو۔ اب کے چینی نہ ڈالنا۔“ وہ خاموشی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔  
ظفری کے آجانے پر دونوں کے قمقمے بلند ہوتے رہے اور وہ اپنے بستر میں دہکی خالی الذہن پڑی رہی۔  
”یار یہ بتا۔ اتنی جلدی کیسے لوٹ آیا؟ جانے سے پہلے تو بہت ایکسائیڈز تھا۔“ ظفری نے حسب عادت اس کی کمر پر دھپ رسید کی۔  
”یا گل تھانا۔“

”تخیر یہ تو میں بہت پہلے سے جانتا ہوں۔ یہ بتا وقت کیسا گزرا۔“ ظفری نے شرارت سے ایک آنکھ دبائی۔

”غارت ہو گیا۔“ جواباً اس نے سرد آہ بھری۔  
”کون۔ محبت کا جنون یا وہ تیز و طرار خاتون۔“  
”ارے نہیں۔ میں وقت کی بات کر رہا ہوں۔“  
”لو۔ پھر تو ٹھیک ہے۔“ ظفری مطمئن ہو گیا۔  
”اب ذرا واضح کرو کہ وقت کس طرح غارت ہوا۔ مثالوں سے واضح کرنا۔“

”میں سنجیدہ ہوں یار۔“ وہ جھنجھلا گیا۔  
”میں بھی مذاق نہیں کر رہا۔ پوچھنا چاہ رہا ہوں کہ خاتون کا دلغ ساتویں آسمان سے نیچے اتر آیا نہیں۔“  
”نہیں۔“

”بس ٹھیک ہے جب اسے تیری پروا تیری قدر نہیں تو تو بھی خود کو بے وقعت مت کر۔ میں مانتا ہوں میرے کہنے پر تو گیا تھا۔ مگر اب جبکہ حقیقت واضح ہو گئی کہ ان تلوں میں تیل نہیں تو دوبارہ اس کی طرف مڑ کر بھی نہ دیکھنا۔“

وہ ظفری کی بات سے اتفاق کرتا تھا۔ اگر دوسری طرف اتنی سرد مہری تھی۔ اتنی لا تعلقی تھی تو پھر وہ کیوں پروا کرتا۔ اس نے صمیم ارادہ باندھ لیا کہ وہ کبھی بھی مڑ کر اس سمت نہیں دیکھے گا۔ جہاں منزلوں کے بجائے راکھ اڑتی ہے۔

صبح ناشتے پر وہ ہمیشہ کی طرح ہشاش بشاش تھا۔ اس نے ذہن پر چھائی ساری افسردگی کو نوچ کر پھینک دیا تھا۔ کسی ٹیبلے پر پہنچ جانے سے کتنی تسلی ملتی ہے۔

سے دروازے سے اور۔ اور۔  
”سب آپ سے مل کر بہت خوش ہوئے ہوں گے۔“ وہ گویا برصیل تذکرہ ہی پوچھ رہی تھی۔  
”ہاں۔ ظاہر ہے۔ میری امی مجھ پر جان دیتی ہیں۔“

”اور شیرل۔“ سیف نے چونک کر سر اٹھایا۔  
”ہوں۔“ وہ سمجھ نہ سکی۔ جانے سے پہلے وہ کتنا غوش، کتنا پرجوش تھا۔ شیرل کا باریبار ذکر کر رہا تھا۔ ظفری بھائی سے بھی چھیڑ چھاڑ ہوئی تھی۔  
لیکن۔

واپسی پر وہ قطعاً ”مختلف“ تھا۔ پرشمرہ اور افسردہ سا۔ اس کا دل چاہا وجہ پوچھ لے۔  
مالی جی کو ہلکی سی حرارت تھی۔ اس لیے وہ دوا کھا کر سو گئی تھیں۔ اس نے ایک نظر درودیوار پر ڈالی اور لمبا سانس کھینچ لیا۔

”اس کمرے سے جانے کیوں بے حد انس ہو چلا ہے۔“ نہ چاہتے ہوئے بھی سیف کے لبوں سے پھسل گیا۔

”حالانکہ ہر مسافر کو لوٹنا ہوتا ہے۔ ہر چیز اپنے اصل کی طرف لوٹنے پر مجبور ہے۔“ جواباً وہ بے حد مدھم لہجے میں بولی۔

وہ لمحہ بھر کے لیے چپ ہی رہ گیا۔ روشن سنہری آنکھوں کا اضطراب دھچکنا ہو گیا۔

”ایمان۔“ بہت دیر بعد اس نے پکارا۔  
”مگر بندہ دوسرے کسی کا دل رکھ لے تو کیا ہرج ہے۔ چاہے جھوٹ بول کر ہی سی۔“ ایمان سے اس کی آنکھوں کی تکلیف چھپی نہ رہ سکی۔

”حقیقت سے فرار بزدلوں کا کام ہے۔“ اس کی بات کاٹ کر وہ بے حد رسان سے بولی۔

”انسان زندگی کی حقیقتوں سے نہیں بلکہ تلخیوں سے فرار چاہتا ہے۔ اگر وہ ایسا نہ کرے تو یقیناً ”لمحہ بھر کو بھی گھل کر سانس نہ لے سکے۔“

”فلسفی بن رہے ہیں۔“  
”فلسفی۔“ وہ سر اٹھا کر ہنسا۔



ظفیری ناشتے سے فارغ ہو کر ہاتھ دھوئے چلا گیا تو اس نے چائے کے گرم گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔  
”ایمان۔ کل آپ نے کہا تھا نا کہ ہر مسافر کو لوٹنا ہوتا ہے۔“

وہ حیرت سے ہاتھ روک کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

”لیکن اگر کسی مسافر کا گھر ہی نہ ہو۔ کوئی اس کا انتظار نہ کرتا ہو تو پھر وہ اس بات پر قادر ہے نا کہ جہاں چاہے پڑاؤ ڈال دے۔“ وہ کچھ بول نہ سکی۔  
وہ جیسے کہہ دیتی کہ بعض پڑاؤ عارضی اور لمحہ بھر کے ہوتے ہیں۔

ماں جی ناشتا کر کے نجانے باورچی خانے میں کیا کر رہی تھیں۔ وہ سکون سے ناشتا کرتا رہا۔ پھر تیار ہونے چلا گیا۔ اسے آج کلج جانا تھا، فائنل ایر تھا۔ اس لیے وہ صرف اور صرف اپنی پڑھائی پر دھیان دینا چاہتا تھا۔



اس دن سے سیف بر جو قنوطیت طاری ہوئی تھی وہ ایمان کی شادی کے دن تک برقرار رہی۔ خود ایمان بھی بہت گم صدمہ تھی۔ نہ اس نے اپنی شادی کی تیاریوں میں حصہ لیا تھا اور نہ ہی اپنی خریداری میں ماں جی اور ظفیری کا ساتھ دیا تھا۔ ظفیری، سیف کو اپنے ساتھ ہر جگہ گھسیٹ کر لے جاتا تھا۔ سیف بازاروں کے اتنے دھکے کھانے کا عادی نہیں تھا۔ مگر ظفیری دوست ہونے کے ساتھ ساتھ محسن بھی تھا۔ اس لیے اس کے ہر کام میں پیش پیش تھا۔

جس دن بارات تھی وہ شدید ڈپریشن اور اضمحلال میں رہی۔ وہ رات بہت وحشت ناک تھی۔ آسمان کالا سیاہ اور تاریک تھا۔ چاند غائب تھا اور ستارے سیاہ گھٹاؤں کے پیچھے پوشیدہ۔ بارات کے آنے کا شور ہوا تو ایک عجیب سے خوف نے اس کے وجود پر اپنا تسلط جما لیا۔ شاں شاں کرتی ہوائیں بہت بہت ناگ آوازیں پیدا کر رہی تھیں۔

وہ دلہن بن کر تیار تھی اور اس سارے عرصہ میں اس نے ایک بار بھی سیف کو نہیں دیکھا تھا۔ پتا نہیں وہ کہاں تھا؟ باہر مولوی صاحب نکاح پڑھانے کو تیار تھے۔ تب ہی اسے کسی ہلچل کا گمان گزرا۔ باہر کوئی گڑبڑ تھی۔ تب ہی ایک لخت خاموشی چھا گئی تھی۔ ٹینٹ گلی میں لگا تھا۔ مگر یہ باہر صحن میں شیمیم آپا اپنی چند رشتہ دار خواتین کے ساتھ کیوں چلی آئی تھیں۔ اس نے بند دروازے کی ذرا سی جھری بنا کر باہر چھانکا۔  
دولہا کی پگڑی بھی خواتین میں نظر آرہی تھی۔  
”مگر یہ سب کیسے ممکن ہے۔ اب جبکہ نکاح ہونے جا رہا ہے تو آپ نے اپنی ڈیمانڈ سامنے رکھ دی ہیں۔ یہ انتہائی نامعقول اور نامناسب بات ہے۔“ یہ ظفیری بھائی کی آواز تھی۔

”آپ کو پہلے سے معلوم تھا کہ ہماری مالی حیثیت کیا ہے۔ ہم نے آپ سے کچھ بھی نہیں چھپایا تھا۔ پھر یہ جینز کی لمبی سی لسٹ اور موٹر سائیکل کی فرمائش۔“  
”آئے ہائے تو ہم نے کون سی بڑی خواہش کا اظہار کر دیا۔ آج کل تو سب ہی لڑکے والوں کو اتنا کچھ دے کر لڑکی کو رخصت کرتے ہیں۔“ شیمیم آپا بولیں۔  
”مگر اپنی اس خواہش کا اظہار تمہیں پہلے کرنا چاہیے تھا نا کہ میں تم پر اچھی طرح واضح کر دیتی کہ یہ سب ممکن نہیں۔ اب جبکہ سارے رشتہ دار جمع ہیں، نکاح ہونے جا رہا ہے تو ایسی فرمائش۔“ ماں جی جیسے صدمہ کے زیر اثر بولی تھیں۔

”جب تک موٹر سائیکل نہیں ملے گی، کوئی نکاح نہیں ہو گا۔“ شیمیم آپا نے آنکھیں ماتھے پر رکھ لیں۔  
ماں جی کو غش آگیا۔

رشتہ داروں، مہمانوں اور محلے والوں کے سامنے ایسی سبکی۔ موٹر سائیکل کی ڈیمانڈ وہ پوری نہیں کر سکتے، تو کیا ان کی ایمان کی بارات یوں ہی لوٹ جائے گی، ہائے ایمان۔ ان کے گلجے پر گھونسا سا پڑا۔

”دیکھیے یہ آپ ٹھیک نہیں کر رہیں۔“ سیف آگے بڑھا اور شیمیم آپا کے مقابل جا کھڑا ہوا۔ ”اگر کوئی آپ کی بیٹی کے ساتھ عین بارات والے دن یہ سلوک



سیف کی کمر پر دو ہتھر سپد کیے۔ ”اس گھر کے سب ہی لوگوں کے دیدوں کا پانی مر گیا ہے۔ نہ بھیا۔ ہمیں زمانے بھر کی بدنامی سمیٹ کر اپنے گھر نہیں لے جانی۔ تو بیٹھ یہیں۔ اڑا گلچھرے اپنے دوست کی بہن کے ساتھ۔ ہماری طرف سے رشتہ ختم۔ بارات واپس جائے گی۔“

”بالکل ٹھیک۔ ہمیں بھی ضرورت نہیں تم جیسے بد ذات، لاپچی اور کم ظرف لوگوں میں اپنی لڑکی بیاہنے کا۔“ ظفیری غصے سے پاگل ہو رہا تھا۔ چہرہ لال سرخ تھا۔

ماں جی بے ہوش ہو چکی تھیں۔ اتنے رشتہ داروں میں ایسی سبکی ایسی تذلیل ان کی جوان لڑکی کی وہ عزت اچھلی کہ اب کوئی اس کا طلب گار بن کر نہیں آئے گا۔ ہائے انہوں نے ظفیری کو آنے والے اس خطرے سے خبردار بھی کیا تھا۔ مگر ظفیری کو دوستی عزیز تھی۔ بہن کی عزت نہیں۔

طوفان آیا بھی اور گزر بھی گیا۔ ایمان سن ہوتے حواسوں کے ساتھ سب کچھ دیکھتی رہی۔ مگر کچھ نہ کر سکی۔ وہ کر بھی کیا سکتی تھی۔ مارتے کا ہاتھ پکڑا جاسکتا ہے زبان نہیں۔

کتنی دیر وہ دروازے کے ساتھ تڑھال، بے دم سی پڑی رہی۔

زمانے کے خوف اور رسوائی نے اسے ادھ موا کر دیا تھا۔ پھر اپنے ٹھکرائے جانے کا دھچکا بھی شدید تھا۔ وہ بے چین ہو کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

باہر موت کا سناٹا طاری تھا۔ اس نے دروازے کی جھری سے دوبارہ باہر دیکھا۔ بارات جا چکی تھی۔ صرف ان کے رشتے دار باہر پنڈال میں موجود تھے۔ تب ہی ظفیری چلا آیا۔ وہ سفید پڑتے چہرے کے ساتھ کھڑی رہ گئی۔

”ایمان۔“ وہ قدم اٹھاتا اس کے قریب چلا گیا۔ ”بھیا۔ میں بے قصور ہوں۔“ یک لخت اس نے چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپالیا اور پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

کرتا تو آپ کے دل پر کیا گزرتی۔ جنہوں نے آپ کو اپنی بیٹی سونپ دی، سمجھو سب کچھ دے دیا۔ زبیر صاحب! آپ کیوں منہ میں گھنگھنیاں ڈالے کھڑے ہیں۔ آپ ہی اپنی والدہ کو کچھ سمجھائیے۔“ وہ زبیر کی طرف گھوما۔

”اے یہ کیوں کچھ بولے اور تم وہی ہونا جس نے اتنے دنوں سے اس گھر میں ڈیرے ڈال رکھے ہیں۔ ایک تو ہم نے اس معاملے کو بھی نظر انداز کر دیا۔ محلے والوں اور دنیا کی باتوں پر کان نہیں دھرے۔“ شمیم آپا غصے سے بولیں تو سیف چونکا۔

”کون سی باتیں۔“

”اے میرا منہ نہ کھلو او۔ یہ ایمان کو بھی پتا ہے۔ اس کی ماں اور بھائی کو بھی پتا ہے۔ ایک تم ہی انجان ہو۔ انہوں نے تو شرم گھول کر لی لی ہے۔ جوان لڑکی کی موجودگی میں تمہیں یہاں رکھ چھوڑا۔ کسے بے وقوف بناتے ہو۔ کیا ہم نہیں جانتے تم کس وجہ سے یہاں جئے ہو۔ اندر ہی اندر کون سا معاملہ ہے۔“

شمیم آپا کو اندازہ ہو چکا تھا کہ یہاں سے کچھ ملنے والا نہیں۔ اس لیے وہ کھل کر سامنے آگئیں۔ انہوں نے تو سوچا تھا۔ عین بارات والے دن وہ اپنی ڈیمانڈز رکھیں گی تو رشتہ داروں کے درمیان ان لوگوں میں انکار کی ہمت نہیں ہوگی اور پھر کون چاہے گا کہ در پر آئی بارات خالی لوٹ جائے۔ لہذا انہیں ان کی شرائط ماننا ہوں گی۔ مگر یہ لوگ تو اصل میں کنکلمے تھے۔ وہ جو سوچ رہی تھیں کہ انہوں نے اندر ہی اندر لڑکی کے لیے بہت کچھ جوڑ رکھا ہوگا۔ سب خام خیالی نکلا۔

”فضول بکو اس نہ کریں۔“ ظفیری سے برداشت نہ ہو سکا۔

”آپ ہماری زبان نہ کھلوائیں، ہم بہت کچھ جانتے ہیں۔“ زبیر والا۔

”بالکل چپ۔ ورنہ زبان گدی سے باہر کھینچ لوں گا۔“ سیف گوناؤ آگیا اور اس نے زبیر کو گریبان سے پکڑ کر دو تین جھٹکے دے ڈالے۔

”ارے اس لڑکے کی ہمت تو دیکھو۔“ شمیم آپا نے



”ایمان!“ ظفیری کا لہجہ سخت ہو گیا۔ ”تم مجھے کیا سمجھتی ہو۔ مجھے تم پر اور سیف پر پورا یقین ہے۔ چند کم ظرف لوگوں کی باتوں میں اگر میں اپنی بہن پر شک نہیں کر سکتا۔“ اس کی آنکھوں سے آنسو جھرجھر بننے لگے۔

”اچھا ہوا ان لوگوں کے لالچ اور ذہنیت کا پہلے سے اندازہ ہو گیا۔ ورنہ تمہارے لیے زندگی گزارنا مشکل ہو جاتی۔“ بھائی اس کا عظیم بھائی۔ اس نے ظفیری کے ہاتھ تھام لیے اور انہیں آنکھوں سے لگا کر ایک بار پھر بے قراری سے رو دی۔

ظفیری کی آنکھیں بھی جھلملا گئیں۔

”ماں جی کہاں ہیں؟“

”ماں جی۔۔۔ باہر نڈال میں ہیں۔۔۔ اور۔۔۔“ وہ لمحہ بھر کے لیے رکا۔

”ماں جی ٹھیک تو ہیں۔“ کسی نامعلوم خیال نے اسے لرزادیا۔

”وہ اب بستر ہیں۔ میں سیف کا تاحیات ممنون رہوں گا۔ اس مشکل وقت میں اس نے صحیح معنوں میں دوستی کا حق ادا کر دیا ہے۔ میں مانتا ہوں۔ یہ فیصلہ اس کے لیے بہت مشکل تھا۔ مگر اس نے بہادری سے اس کٹھن ساعت کو جھیل لیا۔“

ظفیری بھائی کس فیصلے کی بات کر رہے تھے۔ ان کی بات کا سر پیر بھی اس کی سمجھ میں نہیں آیا۔

وہ پوری آنکھیں کھولے انہیں دیکھتی رہی۔

”اور اس بات کو تسلیم کرنا یقیناً تمہارے لیے بھی مشکل ہو گا۔ مگر یہ ہماری عزت کا سوال ہے۔ ماں جی اور میرا بھی یہ ہی فیصلہ ہے کہ مشکل کی اس گھڑی میں سیف کی بات مان لی جائے۔ ہم تمہارا اس سے نکاح کر رہے ہیں۔“

اس کے پیروں میں کوئی گولا سا پھٹا۔ وہ دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔

تو کیا اب وہ زبردستی اس شخص کے سر منڈھ دی جائے گی۔ جس کی ذات اس کی کزن اس کی منگیتر کے گرد گھومتی ہے۔ جس کی پور پور اس لڑکی کی محبت میں

سرشار ہے اور اس کے لیے اس کی بے چینیاں اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھی ہیں۔

”کیا وہ اتنی کم ظرف اور بے حس ہے کہ اپنی عزت بچانے کے لیے اس شخص کی زندگی اور پیار پر نقب لگا ڈالے گی۔“

”یہ۔۔۔ یہ ٹھیک نہیں ہے بھائی۔“ وہ سفید پڑتے چہرے کے ساتھ گھڑی تھی۔

”دیکھو اس وقت یہ ہی مناسب ہے اور پھر ہم نے سیف پر کوئی دباؤ نہیں ڈالا۔ اس نے خود یہ کہا ہے۔ اس کی اس بات پر ماں جی کا سانس بحال ہوا ہے۔ ورنہ تم جانتی ہو کہ کتنی جگ ہنسائی ہوتی۔ بارات لوٹا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔“

ظفیری کے الفاظ منہ میں ہی رہ گئے۔

وہ سب ہی اندر چلے آئے تھے۔ نکاح خواں، گواہان، ماں جی اور رشتہ دار بھی۔ وہ سمٹ گئی، گھونگھٹ چہرے تک لٹکایا۔

مولوی صاحب نے کیا پرہا۔ کیا قبول کروایا۔ اس نے دستخط کہاں کیے۔ ماؤف ہوتے ذہن اور آندھیوں میں گہرے وجود سمیت اسے اندازہ کیوں کر ہوتا۔ وہ تو پھٹتے دل سے ادھ موٹی ہو رہی تھی۔

وہ شخص جو کہیں ذہن کے کسی کونے میں براجمان تھا۔ اچانک اس کے لیے بہت اہم ہو گیا تھا۔ اپنے جگر گاتے وجود سمیت۔ اس کی آنکھوں میں اتر آیا تھا۔

وہ اپنے اندر جھانکتے گہرا رہی تھی۔

یہ مقدر کی شتم ظفر نفی تھی یا اس کے اندر کے کسی جذبے کی سچائی۔ وہ اس بارے میں کچھ سوچنا نہیں چاہتی تھی۔ اسے بس اتنا پتا تھا کہ یہ اس شریف النفس بندے کے ساتھ اچھا نہیں ہوا۔

وہ کسی اور کے ساتھ کا خواہاں تھا اور قسمت نے اس پر ایک اور وار کر کے اسے کسی اور کا بنا دیا تھا۔

نکاح کے بعد ظفیری کے گلے لگتے سیف نے اتنا کہا۔ ”مجھ پر اعتماد کرنے کا شکریہ دوست۔۔۔ مانتا ہوں“

ابھی میں بے گھر ہوں۔ کسی کام دھندے پر بھی



نہیں۔ لیکن وعدہ کرتا ہوں۔ بہت جلد تمہاری بہن کو دنیا کی ساری خوشیاں دوں گا۔  
”یہ باتیں کر کے مجھے چھوٹا مت کرو یا۔“ ظفیری کتنی در اسے گلے سے لگائے رہا۔ ”تمہارا احسان تو میں مر کر بھی نہیں چکا سکتا۔“

”مقدّر یہ ہی ہے دوست، کہیں کی راہیں، کہیں اور آن ملیں۔ دو مختلف سمتوں کے راہی اس طرح بھی ہم سفر بن جاتے ہیں۔“

اس ٹھنڈی سیاہ رات میں وہ اپنی وحشت دور کرنے کھڑکی میں آن کھڑی ہوئی۔ گزشتہ لمحات اس کی آنکھوں کے سامنے تھرک رہے تھے۔ شمیم آپا کی بدزبانی ظفیری اور زبیر کا دست و گربان ہونا۔ سیف کی مداخلت اور پھر رات کا لوٹ جانا اور سب سے بڑھ کر اس کا سیف سے نکاح اور اب وہ اس کمرے میں تھی جس کمرے میں سیف کا ڈیرا تھا۔

پتا نہیں سیف نے اسے کس دل سے قبول کیا ہو گا۔ نکاح کے بعد وہ گھر سے باہر چلا گیا تھا اور ابھی تک نہیں لوٹا تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں وہ جذبات میں آکر اٹھائے ہوئے اس قدم پر پچھتا رہا ہو۔

آسمان پر برستا پانی تیز ہو گیا تو وہ مرے قدموں سے سیڑھیاں اتر آئی۔ مین کی چھت پر تیزی سے پڑتی بوندوں کی زوردار آواز روٹے کھڑے کپے دے رہی تھی۔ وہ جاگتی رہی۔ کھلی آنکھوں سے اس کی منتظر رہی جو اس سے نکاح کے دو بول پڑھوا کر جانے کہاں روپوش ہو گیا تھا۔

رات کے جانے کون سے سپر کواڑ بجا تو وہ برق رفتاری سے اٹھی۔ دوڑتے ہوئے صحن عبور کیا۔ ”کلب۔ کون؟“ اس کے لرزے لبوں سے گھٹے گھٹے انداز میں نکلا۔

”سیف ہوں۔“

اس نے کندا کھول دیا۔

”کیا بات ہے۔ دروازہ کیوں نہیں کھول رہی تھیں۔ سردی سے میں تو اکڑ گیا۔“

وہ اس لہجے کی کھنک سے ٹانوس نہیں تھی۔ اس

کے آجانے سے تحفظ کا کیسا انوکھا احساس ہو رہا تھا۔ نکاح کے دو بول میں اتنی طاقت تھی کہ ایک عجیب سی اپنائیت نے دل و دماغ کا کھیراؤ کر لیا تھا۔ وہ چند قدم اس کے قریب بڑھ آئی۔  
”آپ بھیگ گئے ہیں، جلدی سے کپڑے بدل لیں۔“

”تم بھی تو بھیگ رہی ہو۔“

وہ ویسا ہی تھا۔ نرم لہجے والا۔ اس کے چہرے اور آنکھوں سے کسی پچھتاوے اور رنج کا اظہار بھی نہیں ہو رہا تھا۔

پتا نہیں وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے اور چہرے کو پڑھتے کیا کھوجنا چاہ رہی تھی۔

”میری بات دو سری ہے۔ آپ کپڑے تبدیل کر لیں۔ میں کھانا لاتی ہوں۔“

”نہیں۔ مجھے بھوک نہیں، اور پھر تم کہاں اتنی رات کو تردد کرو گی۔“

وہ بڑی تیزی سے باورچی خانے کی طرف جاتے جاتے رک گئی۔ تردد تو اجنبیوں کے لیے کیا جاتا ہے۔ جبکہ وہ بھول گیا کہ ابھی چند گھنٹوں پہلے وہ رشتہ ازدواج میں منسلک ہوئے ہیں۔

باورچی خانے کے دروازے میں داخل ہونے سے پہلے وہ لحد بھر کو اس کی طرف پشت کیے کھڑی رہی۔ یادوں کا شور اور بوندوں کی جھنکار شدت لیے ہوئے تھی۔

”کافی تو ضرور چلے گی اس موسم میں۔ وہ بنا دو۔“

وہ تیزی سے کپڑے بدلنے اپنے کمرے کی طرف لپکا۔ وہ باورچی خانے میں چلی آئی۔ وہ رے میں کافی لیے کمرے میں آئی تو وہ کمبل میں دبکا ٹھنڈا تھا۔  
”بہت ٹھنڈ ہے بھئی۔“

اس کا لہجہ ہمیشہ کی طرح تھا۔ یوں جیسے اس کی زندگی میں کوئی بڑا انقلاب نہیں آیا۔ یوں جیسے کسی انہونی نے اسے امتحان میں نہیں ڈالا۔ سب کچھ پہلے جیسا ہی تھا۔ وہ صرف اس کے دوست کی بہن ہے اور بس۔؟  
”بارش نے اس میں اضافہ کر دیا ہے۔“



وہ بھی بظاہر نارمل رہ کر یہ ثابت کرنا چاہتی تھی کہ گزشتہ واقعہ نے ہرگز اس کے اعصاب پر برا اثر نہیں ڈالا۔

”تمہیں رنج تو ہوا ہو گا۔ ہمارے تعلقات کی نوعیت کے بدلنے کا۔ یقیناً“ زیر کے حوالے سے تم نے خواب دیکھے ہوں گے اور پھر یکلخت تمہاری آنکھوں سے وہ خواب نوچ لیے گئے اور میں۔۔۔“

”زیر سراسر ماں جی کا انتخاب تھا۔“

اس نے سوکھے لبوں پر زبان پھیرتے ہوئی پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔

”بے شک وہ ماں جی کی پسند تھا۔ لیکن یہ انسانی فطرت ہے۔ وہ جس سے منسوب ہو جاتا ہے۔ اس کے حوالے سے بہت کچھ سوچتا ہے۔“

اس کا سانس بند ہونے لگا۔

”نہیں یہ صحیح نہیں ہے۔“

وہ بتانا چاہتی تھی کہ وہ کبھی۔۔۔ زیر کے لیے پاگل نہیں رہی۔ پاگل تو وہ اپنی کزن سیرل کے لیے رہا ہے۔

اس نے سیرل کے لیے اس کی بے تمایاں اور بے چینیاں اپنی آنکھوں سے دیکھی ہیں۔

”زیر سے متعلق تمہاری غلط فہمی اور بدگمانی میرے لیے سب سے زیادہ اذیت ناک ہوئی۔“

بڑی تکلیف دہ خاموشی تھی۔ اس نے کئی بار ہونٹوں پر زبان پھیر کر اسے مخاطب کرنا چاہا مگر آواز حلق میں پھنس گئی۔ وہ کہے بھی تو کیا؟

سیف نے اس لڑکی کی جانب دیکھا جو ہنوز عروسی جوڑے میں ملبوس تھی۔ وہ بہت اداس اداس اور مایوس لگ رہی تھی۔

”بہتر تھا تم کپڑے بدل کر ایزی ہو جاتیں۔ ویسے بھی تم بھگ چکی ہو۔“ وہ بولا۔

”ویسے بھی مجھے تم سادہ اور سہل (Simple) زیادہ اچھی لگتی ہو۔“

اس کا انداز ایسا تھا جیسے اپنے کسی دوست کو مشورہ دے رہا ہو۔ ایک افسردہ سی مسکراہٹ۔۔۔ نے ایمان کے لبوں کو چھوا۔

یہ لڑکی آخر اتنی اداس اور خاموش کیوں ہے۔ وہ یقیناً ”زیر سے شادی نہ ہونے کی وجہ سے اداس ہے۔ یا پھر اس کے ساتھ نئے تعلق کے بندھنے نے اسے ہزار کر دیا ہو۔ وہ تو شروع ہی سے بد قسمت تھا اس معاملے میں۔“

”کیا سوچ رہی ہو؟“

سیف کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

”کچھ نہیں۔“

”مجھے بتاؤ۔ شاید میں تمہاری پریشانی دور کر سکوں۔ میں یقین دلاتا ہوں کہ میں اتنا بے حس نہیں ہوں۔ جتنا تم خیال کرتی ہو۔“

ایمان نے اس کی طرف دیکھا۔

جانے وہ اس سے کیا سننا چاہتا تھا۔

”مجھے کوئی پریشانی نہیں ہے۔“ اس نے سادگی سے کہا۔



ان دونوں کی روٹین اور زندگی میں کوئی خاص فرق نہیں آیا تھا۔ وہی عام سی روٹین تھی۔ وہ باقاعدگی سے۔۔۔ کلج جا رہا تھا اور اپنی پڑھائی پر زیادہ توجہ دے رہا تھا۔

وہ رات گئے تک پڑھتا تھا۔ اس کے ڈسٹرب ہونے کے خیال سے ایمان نیچے ماں جی کے ساتھ سوئی تھی۔

البتہ رات کو وقفے وقفے سے اٹھ کر کبھی اسے نیم گرم دودھ کا گلاس دے جاتی اور کبھی چائے۔۔۔ مقابل کی نظروں میں اس کے لیے ممنونیت کے تاثرات ابھر آتے تھے۔

اس دن صبح میں جھاڑو لگاتے لگاتے وہ ٹھٹک گئی۔

وہ جانے کون بھی جو بلا جھٹک اندر چلی آئی تھی۔

اس نے ہاتھ روک کر اسے دیکھا۔ وہ دھپ دھپ کرتی اندر گئی اور دھپ دھپ کرتی ہی باہر آگئی۔

”سنو۔ سیفو کہاں ہے؟“

”کلج گئے ہیں۔“

آنے والی کی کلف زدہ گردن ذرا سی تر چھٹی ہوئی تھی۔ وہ تیکسی نظروں سے سامنے ہاتھ میں جھاڑو لیے



اس عام سی لڑکی کو دیکھ رہی تھی۔  
 ”مجھے کلج میں ہی اسے پکڑ لینا چاہیے تھا۔ لیکن  
 اگر یہاں نہ آتی تو مجھے کیسے اندازہ ہوتا کہ وہ کتنی  
 پستیوں میں جا کر آ رہی ہے۔ تم کون ہو۔“  
 اس نے درو دیوار پر ایک نظر ڈال کر ناک بھونچ کر  
 چڑھائی۔

”یہی وہ جگہ ہے جس کے لیے اتنے شاندار محل کو  
 ٹھکرا دیا۔ اوہ گاڑ۔ سیف کا اسٹینڈرڈ کس قدر گھٹیا ہو  
 چلا ہے۔ چھوٹے لوگوں کے ساتھ رہنے سے ذہنیت  
 انہی کی طرح ہو جایا کرتی ہے۔ اس میں اس بے  
 چارے کا بھی کوئی قصور نہیں۔“ وہ حیرت سے  
 آنکھیں کھولے اس فیشن زدہ لڑکی کو ہاتھ لہراتے دیکھتی  
 رہی۔

”ارے۔۔ تم نے بتایا نہیں۔ تم کون ہو؟ گوئی ہو  
 کیا؟“

”میں عیس ایمان ہوں۔“

”ایمان کون؟ تمہارا سیف سے کیا رشتہ ہے۔“

”میں ظفیری کی بہن ہوں۔“

”اوہ۔۔“

”جیسے انداز میں اوہ کو لہبا کرتے ہوئے اس نے  
 خونخوار نظروں سے اسے سر سے پیر تک گھورا۔  
 ”تم ہی وہ بلا ہو جو میرے منگیتر کو چمٹ گئی ہے۔ مگر  
 کان کھول کر سن رکھو۔“ تم مجھ سے نہیں جیت  
 سکتیں۔“

”جی۔“ اس کا چہرہ زرد ہو گیا تھا۔

تو یہ سیف کی منگیتر ہے۔ وہ تو بہت خوب صورت  
 ہے اسی لیے تو سیف اب تک اس کے سحر سے آزاد  
 نہیں ہو پایا۔ وہ اگر اس کی زلفوں کا اسیر ہے تو کچھ غلط  
 نہیں ہے۔ وہ بھی ایسی کہ اسے چاہا جاتا۔ اپنی  
 شخصیت کے دلنواز ہونے کا اسے اچھی طرح اندازہ تھا،  
 جیسی وہ لوگوں کو ٹھوکروں پر رکھتی تھی اور کسی کو گھاس  
 تک نہیں ڈالتی تھی۔

اور وہ خود کیا ہے۔ ایک عام سی لڑکی۔ اس کا اس  
 ماڈرن لڑکی سے کیا مقابلہ اس میں ایسا کیا تھا جو سیف

اس کے ساتھ کو ہنسی خوشی قبول کر لیتا۔  
 وہ خود کو اس کے مقابلہ پر ڈالنا نہیں چاہتی تھی۔  
 لیکن ایک ہی شخص کی زندگی میں ان دونوں کا عمل  
 دخل تھا۔ لہذا مقابلہ بازی کی۔ صورت حال از خود  
 پیدا ہو جاتی تھی۔

”تمہاری معصومیت سیف کو امپریس کر سکتی ہے  
 مجھے نہیں۔ اف توبہ، بو کتنی ہے اس گھر میں مجھ سے تو  
 سانس بھی نہیں لیا جا رہا۔“

وہ سر جھکائے خاموش کھڑی رہی۔

غریبی کا مذاق اڑانے والی اس لڑکی کی زبان تو نہیں  
 پکڑ سکتی تھی۔ وہ لوگ جیسے بھی تھے جس حال میں بھی  
 تھے خوش تھے اسے اپنے بھائی کی توجہ اور محبت  
 نصیب تھی۔ وہ اپنی ماں جی کی شفقت سے مالا مال  
 تھی۔ یہی بہت کافی تھا اس کے لیے۔

وہ بیرونی دروازے تک گئی ہی تھی کہ پھر واپس آ  
 گئی۔

”سنو۔ وہ آئے تو کہہ دینا کہ گھر لوٹ آئے۔ میں  
 انتظار کروں گی۔“

اس نے دروازے سے قدم باہر نکالا، لیکن اندر  
 جھانک کر دوبارہ نخوت بھرے انداز میں بولی۔

”سیف کو الٹی سیدھی پٹیاں پڑھانے کی کوشش  
 مت کرنا۔ وہ تمہارے ہتھکنڈوں میں آنے والا نہیں۔  
 وہ چند دنوں تمہارے ہاں کیا آ رہا، تم لوگوں نے اس پر  
 اپنا حق ہی سمجھ لیا۔ یاد رکھنا۔ اس کے دل پر میری  
 محبت کے نقش اتنے گہرے ہیں کہ وہ چاہ کر بھی کہیں  
 اور کا رخ نہیں کر سکتا اور خصوصاً تم جیسی لڑکی کی  
 طرف۔ لہذا تم اس سے دور ہی رہو تو بہتر ہے۔“

اونہ۔ سیف جیسے بچہ ہی تو تھا۔ کم عقل اور  
 معصوم جو اس کے سکھانے میں آ جاتا۔ وہ اپنا اچھا برا  
 خوب سمجھ سکتا تھا۔ وہ اس کی انگلی پکڑ کر چلنے کا محتاج  
 نہیں تھا۔

وہ سلگتا ذہن لیے اپنی جگہ جی اس کنڈے پر نظریں  
 جمائے رہی جو دروازہ نور سے بند ہو جانے کے سبب  
 تیزی سے ٹل رہا تھا۔



”شیرل آئی تھی۔ وہ ہلا کر گئی ہے۔ آپ سے ملنا چاہتی ہے۔“  
اس کی آنکھوں اور اس کے چہرے سے برستے سکون نے اس بات کو ظاہر کر دیا کہ وہ سنبھل جانے کی ہمت رکھتی ہے۔ کہ اسے کوئی صدمہ نہیں پہنچا۔  
اس نے کچھ دیر کے لیے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

یہ بڑی تکلیف دہ بات تھی۔ وہ اس جگہ پر تھی جہاں آنکھیں سچ جھوٹ پر بے اختیار رہ جاتی ہیں۔  
کتنے بہت سے رنگ اس کے چہرے پر آئے۔ وہ انگوٹھے سے کنپٹی دہاتے ہوئے کچھ سوچا لگ رہا تھا۔  
”تم نے ہمارے تعلق کے بارے میں تو کچھ نہیں بتایا ہے۔“

وہ یوں۔۔۔ بوجھ رہا تھا جیسے اگر وہ اس تعلق کو بتا چکی تو یہ بہت بڑی فطرتی ہوگی۔

”میں نے اسے اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔“  
وہ لبوں پہ زبان پھیرتے پھنسی پھنسی آواز میں بولی۔  
”یہ بہت عقل مندی کی تم نے۔“  
اس کے جواب پر اس نے کب کا رکا سانس بحال کیا۔

”اور۔۔۔ اور وہ تو تم سے کچھ کہہ کر نہیں گئی۔؟“  
سیف کا دوسرا سوال اسے پھر مصیبت میں ڈال گیا۔

”نہیں۔۔۔ نہیں۔“  
اس کے چور کچے پر ٹھٹھک کر رہ گیا۔  
”میں مان ہی نہیں سکتا۔“  
”کیا۔۔۔“

”یہی کہ وہ آئی ہو اور اس نے کچھ کہا نہ ہو۔ میں اس کی رگ رگ سے واقف ہوں۔“  
وہ شاید کوئی پیام سننے کو بے تاب تھا۔ کوئی گلاب پیام اس کی بے تمنا شا جھمکائی آنکھوں میں کتنے رنگ چل رہے تھے۔ وہ مایوس کھڑی رہ گئی۔  
”میں کمر جا رہا ہوں۔ تم۔۔۔ میرے بغیر گھبراؤ گی تو نہیں؟“

شکر ہے ماں جی کمر نہیں تھیں۔ پڑس میں مٹی تھیں۔ اگر ان کے سامنے یہ سب تماشا ہوتا تو انہیں کتنا صدمہ ہوتا اس کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔  
ابھی شام پوری طرح درودروار پر چھائی بھی نہیں تھی کہ سیف لوٹ آیا۔ اور اس کی سرخ انگارہ آنکھیں دیکھ کر چونک پڑا۔  
”تم۔۔۔ تم روتی رہی ہو؟“

اس کے استفسار پر آنکھیں پھر جھلکنے کو بے تاب ہو گئیں۔ یہ بے چارہ۔ کیا معلوم تھا اسے کہ اس کی نگہباز کچھ سنا کر گئی ہے۔ کیسے ان دونوں کے تعلق کے نیچے ادھیڑ کر گئی ہے۔

”مجھے بتاؤ ایمان۔ کیا ہوا ہے۔“

وہ تیزی سے کمرے میں چلی آئی۔  
وہ اس کے پیچھے پیچھے آگیا اور دروازے پر رک گیا۔  
”کوئی بات نہیں ہے۔“

”اس کا مطلب۔۔۔ تم اب تک مجھ پر اعتماد نہیں کر پائیں۔ حالات نے جس تعلق میں ہمیں باندھا ہے۔ تم اس تعلق کو قبول نہیں کر پائیں۔ اس لیے تم اپنی کوئی پریشانی مجھ سے شیر نہیں کرنا چاہتیں۔“  
وہ کھانا کھاتے ہوئے بھی ستا چہو لیے بیٹھی رہی۔  
ظفیری اور سیف دونوں میں نوک جھونک چلتی رہی۔  
ماں جی تھک کے لیے جلدی سوچ گئی تھیں۔

رات کو اس نے سونے سے پہلے اس کا گھبراؤ کر لیا۔ پہلے وہ اسے اپنے دن بھر کی مصروفیات کے بارے میں بتاتا رہا۔ پھر ادھر ادھر کی ہانکتا رہا۔ لیکن اسے ٹس سے مس نہ پا کر پھر شاید اس میں برداشت کا یارا نہ رہا۔  
”ایمان ادھر دیکھو میری طرف۔“

اس نے جھپکتے ہوئے پلکیں اٹھائیں جن کی نوک پر ابھی تک موتی اٹکے تھے۔

”کیا میں تمہیں صورت سے گدھا دکھائی دیتا ہوں؟“

اس نے نفی میں گردن ہلا دی۔  
وہ مسکرا دیا۔ لیکن پھر سنجیدہ ہو گیا۔  
”مجھے بتاؤ کیا ہوا جو تم روتی رہی ہو؟“



وہ کون سا اس کا مضبوط سہارا تھا۔  
 چہرے پر چھائی زردی کو چھپانے کے لیے وہ مسکرا  
 دی۔ یونہی بنا کسی خوشی کے اس کو مسکرانے کی عادت  
 تھی۔ اسے کسی خاص محنت کی ضرورت نہ ہوتی۔  
 ”میں لوٹ آؤں گا۔“  
 ”جیسے آپ کی خوشی۔“

اس نے ایمان کا پر سکون چہرہ بھی دیکھا اور  
 آنکھوں میں انگڑائیاں لیتا اضطراب بھی۔ پھر کلائی پر  
 بندھی گھڑی دیکھی۔  
 ”او کے چلتا ہوں۔ خدا حافظ۔“

وہ تیز تیز قدم سے باہر نکل گیا۔ اس کے تیزی سے  
 اٹھتے قدم اس کے جذبات کے غماز تھے۔ وہ چلا گیا اور  
 اسے مایوسیوں کے اندھیروں میں چھوڑ گیا۔  
 تو یہ ہے اس کا اور سیف کا بے نام سا تعلق۔ جس  
 کی کوئی وقعت، کوئی حیثیت نہیں۔ وہ پہلے دن سے ہی  
 اسے ادھورا ملا تھا۔ کسی اور کی امانت تو کیا وہ بد نیت ہو  
 گئی تھی اور اس بد نیتی کی سزا۔ اسے اپنی بارات کے  
 لوٹنے کی صورت میں ملی تھی۔ شاید اس کے دل میں  
 شروع دن سے ہی۔ کوئی چور دروازے سے اندر چلا آیا  
 تھا۔

وہ خاموشی سے اپنے کاموں میں مصروف رہی۔  
 وہ اپنا تماشا نہیں بنوائے گی۔ وہ اس کا انتظار نہیں  
 کرے گی۔ اس نے ابھی سے اپنے ہتھیار پھینک  
 دیے تھے اور شیرل کے حق میں دستبردار ہو گئی تھی۔  
 یہ کھٹن کیسی تھی۔  
 یہ درد کیسا تھا۔ ہڈیوں کو کھا جانے والا۔  
 وہ اپنی منگیتر کو چاہتا تھا۔ اس کے ایک پیغام پر دوڑا  
 دوڑا چلا گیا تھا۔ اس بات کا خیال کیے بغیر کہ وہ اب اس  
 کی بیوی ہے۔  
 وہ بے چین ہو کر اٹھ کھڑی ہوئی۔  
 ”سیف کہاں گیا ہے؟“  
 ماں جی نے بھی اس کی غیر موجودگی کو محسوس کیا۔  
 ”وہ اپنے گھر گئے ہیں۔“  
 اس نے صاف گوئی سے کہا۔ بھلا سچائی چھپانے

اگلی شام ظفیری اور سیف ساتھ ساتھ گھر میں  
 داخل ہوئے۔ وہ بچن میں مصروف تھی۔ باورچی  
 خانے کی کھڑکی سے اس نے جھانکا۔ وہ بے حد تھکا تھکا  
 اور مضطرب تھا۔ سنہری آنکھیں دھواں دھواں تھیں۔  
 ”بڑا اچھا فیصلہ کیا ہے تم نے سیف۔ بہت عقل  
 مندی کا ثبوت دیا ہے۔“ ظفیری بھائی کہہ رہے تھے۔  
 ”اگر اس حقیقت کو واضح نہ کرتا تو وہ میرے لیے  
 درد سر کا باعث بنی رہتی۔“ وہ آہستگی سے بولا۔  
 وہ کرسی پر بیٹھا تھا۔ ایک دم سے اس نے سر جھکا لیا  
 اور پھر ایک گہرا سانس بھر کے ادھر ادھر دیکھا۔  
 ”کیا بات ہے۔ آج چائے نہیں ملے گی؟“  
 اس سے پہلے کہ ظفیری اسے آواز لگاتا۔ وہ ٹرے  
 اٹھا لائی۔ چائے کا کپ اسے تھماتے ہوئے اس نے  
 دیکھا۔ وہ کہیں اور گم تھا۔  
 ”چائے۔“ وہ آہستگی سے بولی۔  
 اس نے نظریں نہیں اٹھائیں اور کپ تھام لیا۔  
 ایمان کو اس کا یہ نیا انداز اذیت دیتا لگ رہا تھا۔  
 اس نے ایک بڑا سا گھونٹ بھرا اور پیالی واپس رکھ

دی۔  
 ”تمہیں معلوم ہے کہ میں ہمیشہ پھکی پیتا ہوں۔  
 میری یہ معمولی سی عادت بھی تم دونوں میں بھول  
 گئیں۔“  
 ”سوری میں ابھی بنالاتی ہوں۔“

260



”نہیں۔ اب یہ تکلیف کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اور ایک بات اور۔ امی تم سے ملنا چاہ رہی ہیں۔ لہذا چلنے کی تیاری کرو۔“

”کب؟“ اس کا منہ حیرت سے کھل سا گیا۔

”ابھی میں نے ظفیری اور ماں جی کو بتا دیا ہے۔ انہیں کوئی اعتراض نہیں۔ اگر تمہیں اعتراض ہو تو بتاؤ۔“

وہ لمحہ بھر کو اسے دیکھتا رہا۔ پھر اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر اٹھ کر اندر ظفیری کے پاس چلا گیا۔ اس کے دل پر ایک بوجھ سا آگرا تھا۔

وہ بڑا سا محل نما بنگلہ تھا۔ جس کے آرام دہ کمرے میں وہ مہران ڈھونڈتا تھا جس کا لرزتا ہاتھ کتنی دیر اس کے سر پر کانپتا رہا تھا۔

”سیفو نے اگر تمہارا انتخاب کیا ہے تو سوچ سمجھ کر کیا ہو گا۔ مجھے اس کی پسند پر کوئی اعتراض نہیں۔ بس اتنا افسوس ضرور ہے کہ اس کے بچپن کا رشتہ جو اس کا باپ جوڑ کر گیا تھا پروان نہ چڑھ سکا۔ پتا نہیں غلطی شیرل کی ہے یا سیفو کی۔ بہر حال جو بھی ہو ان دونوں کی زندگی کی راہیں الگ الگ ہو گئیں جس کا قلق مجھے تاحیات رہے گا۔“

وہ بہت آہستگی سے جھلملاتی آنکھوں سمیت کہہ رہی تھیں۔

وہ خاموشی سے ان کی باتیں سنتی رہی۔ سیف نے اس کے ساتھ نکاح کر کے غلطی کی۔ وہ اپنی ماں کی دیرینہ خواہش کا احترام کر لیتا۔ وہ بے قصور ہوتے ہوئے بھی مجرم بن گئی جیسے سارا قصور اس کا ہے۔

”تم ملیں شیرل سے؟“ انہوں نے اس سے پوچھا۔

”جی شیرل ہی اس سے ملنے آئی تھی۔“ اس کے بجائے سیف نے جواب دیا۔

”اچھا کب۔؟“ امی چوہکیں۔

”پچھلے دنوں۔ اور وہ ملاقات کچھ اتنی خوشگوار نہیں تھی۔“

”یہ تمہیں کیسے پتا۔؟“ دروازے سے شیرل کی

آواز ابھری۔

ایمان اندر سے لرز گئی۔ سیف نے گردن ذرا سی ترچھی کر کے آنے والی کو دیکھا اور پھر گردن دوبارہ اسی زاویے پر کر لی۔

وہ بکھرے بالوں اور تلکے حلیے سمیت کچھ بکھری بکھری لگ رہی تھی۔ پچھلے دنوں والی ناراضی اور غرور اس وقت غائب تھا۔ وہ کھلے دروازے سے تیر کی طرح

سیف کے بالکل سامنے آن کھڑی ہوئی اس نے سامنے بیٹھی بے وقعت لڑکی پر دھیان نہیں دیا۔

”تم اسے یہاں کیوں لائے ہو؟“ وہ ہولے سے جیسے غرائی تھی۔

”اوشیرل۔ تم ملیں ایمان سے۔ یہ ایمان ہیں۔ اس دن تم ان ہی پر اپنا نزلہ گرا کر گئی تھیں۔“

وہ اس کے سوال کو نظر انداز کرتے قدرے خوش دلی سے بولا تھا۔

”تو اور کیا کرتی، کوئی تمہیں مجھ سے چھین لے لے یہ مجھے قطعی گوارا نہیں۔“ وہ مسکراتے ہوئے سامنے بیٹھی ناپسندیدہ لڑکی کے وجود کو یکسر بھول گئی۔

”میں اپنے گزشتہ رویے پر شرمندہ ہوں سیفو۔“

”تم مجھے معاف نہیں کرو گے؟ پچھلے دنوں جو کچھ ہوا اسے بھول جاؤ۔ وہ میری نادانی تھی۔ میں تمہارے لوٹ آنے پر خوش ہوں۔ بہت خوش۔“

”تعجب ہے۔ مگر اتنا بتاؤ پچھلی تلخ یادیں بھلا نا کیا اتنا ہی آسان ہے۔“

”اگر دل میں محبت ہو تو ممکن ہے۔“

تیز روشنی کی زد میں دھواں دھواں ہوتے چہرے پر سیف کی ایک نظر پڑی۔ وہ کسی پتھر کی طرح ساکت و جامد تھی۔

وہ کانپتے دل سے اور لرزتے وجود سمیت اپنی ذات کے بے وقعت اور کم مایہ ہونے پر غور کر رہی تھی۔ اپنی دیرینہ محبت کو سامنے پا کر وہ یقیناً اپنی جلد بازی اور جذباتی پن پر افسوس کر رہا ہو گا۔

”ایمان ایمان۔“



”مگر وہ شیرل؟“  
 ”اس کی طبیعت اچھی طرح صاف کر کے آ رہا ہوں۔ اسے صاف ہٹا دیا ہے کہ تم میری بیوی ہو۔ اور اس کے علاوہ میری زندگی میں کسی اور کی گنجائش نہیں۔“  
 دھندلائی آنکھوں سے وہ گرنے کو تھی۔ لیکن سنبھل گئی۔  
 ”دیکھو سنبھل کے۔ ابھی ہم نے بہت سا سفر اٹھائے۔ طے کرنا ہے۔“  
 اس کی بے تحاشا روشن آنکھیں مسکرا رہی تھیں۔ اسی مسکراہٹ کے ساتھ اس کا دل بھی مسکرا دیا۔

”آؤ اب چلیں۔“

”کہاں۔“

”اپنا گھر مل کر بنا لیں گے۔“

”اور یہ گھر۔“

”یہ گھر نہ پہلے میری منزل تھا اور نہ اب۔ فی الحال۔۔۔ واپس تمہاری ماں جی کی طرف چلتے ہیں۔ میری جاب لگتے ہی ہم اپنا گھر لے لیں گے اور پھر میں یہاں سے امی کو بھی لے جاؤں گا۔“

اس نے ساری پلاننگ کر لی تھی۔

”اس دن جب شیرل تمہاری بے عزتی کر گئی تھی میں نے تب ہی سوچ لیا تھا کہ اب میں اپنی شادی کے بارے میں بتا دوں گا۔ تاکہ اس پر ثابت ہو جائے کہ میری زندگی میں تمہاری کیا حیثیت ہے۔“

اس نے اپنی نظریں اس پر مرکوز کر دیں۔ اس کی آنکھوں میں اس ساتھ پر سکون کی پرچھائیاں تھیں۔

ایمان کو اس احساس نے تقویت دے دی کہ اس کی حیات میں شہد آگیاں ملھاس گھل گئی تھیں۔ اور اس کی راہوں کے تمام کانٹے پھول بن گئے تھے۔

وہ سلگتی سوچوں میں اتنی کم تھی کہ اس کی درشت آواز بھی نہ سن پائی۔

”بہری ہو چلی ہو کیا؟“ وہ جھلا رہا تھا۔

”تم ہا ہر چلو۔ میں آ رہا ہوں۔“ وہ اپنے مخصوص انداز میں اس سے کہہ رہا تھا۔ اس کے سخت لہجے پر وہ آنکھوں میں اترتے آنسو اندر اتار گئی۔

”تم اسے گھر چھوڑ آؤ تو بہتر ہے۔“

شیرل۔۔۔ فتح کے نشے میں سرشار ہوئی۔

”میں ایسا ہی کروں گا۔“ وہ بولا۔

شیرل کسی فاتح کے انداز میں کھڑی تھی۔ وہ اسے خود بہت اوجھی بہت بلند دکھائی دی۔ آسمان کے درخشاں ستارے کو چھوڑ کر زمین کے معمولی سے ذرے کی خواہش کوئی پاگل ہی کر سکتا ہے۔

”اچھا بھئی۔ خدا حافظ۔“ شیرل نے اکڑی گردن سمیت ایمان کو دیکھا تھا۔ یوں جیسے کہہ رہی ہو اب بیٹھی کیوں ہو۔ دفع کیوں نہیں ہو جاتیں۔

ایمان نے شکست خورہ نظروں سے دونوں کی طرف باری باری دیکھا اور پھر مرے مرے قدموں سے کمرے سے باہر چلی آئی سیف کی بے رخی بے حد اذیت ناک تھی۔

تو پھر سیف کی سنگین تربیت ہی گئی ناں۔

اور

وہ اس کی بیوی ہوتے ہوئے بھی ہار گئی۔

اور کچھ نہیں تو اپنے دوست کی بہن ہونے کے ناتے ہی اس کا کچھ لحاظ کر لیتا۔ آنسو اس کے گالوں پر دائیں بائیں لڑھکتے رہے۔

”دور ہی ہو کیا۔؟“

اس کی آواز پر آنسوؤں سے بھری آنکھیں اٹھائیں۔ وہ اس کے بالکل سامنے شان سے ایستادہ تھا۔ وہ گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔

”آپ آگئے؟“

”ہاں آ گیا ہوں۔“ وہ مسکرا رہا تھا۔ ”ایک سیات سن رکھو نہ تو مجھے کوئی تم تک آنے سے روک سکتا ہے اور نہ ہی تم مجھے اپنے دل سے نکال سکتی ہو۔“







## یہ بستیاں ویراں نہیں،

نہیں یہ بستیاں ویراں نہیں  
اب بھی یہاں کچھ لوگ رہتے ہیں  
یہ وہ ہیں جو کبھی  
زخم و فابازار تک آنے نہیں دیتے  
یہاں کچھ خواب ہیں

جس اللہ لیتے ہیں  
جوان خوابوں کو تم دیکھو تو دجاؤ  
فلک آشار، بام و در  
یہاں وقعت نہیں رکھتے  
کلاہ و ذریہاں قیمت نہیں رکھتے  
یہ جتنے لوگ ہیں

بے نام ہیں، بے لاگ ہیں  
بے ساختہ جینے کے طالب ہیں  
یہ دل کے بوجھ کا احوال  
اپنے حرف خود لکھنے کے طالب ہیں  
اہالے کی سنی کرنوں کو  
زندیاں سے رہائی دو

ادا جعفری

تب سے سوچ رہا ہوں، میری آنکھوں نے کیا دیکھا ہے  
کیسے برے دنوں میں کیسا اچھا چہرہ دیکھا ہے

نیلی نیلی آنکھوں میں جبرت سی آنکھ و جنت سی  
سبز ہزاروں کے دامن میں روپ سویرا دیکھا ہے  
نگری نگری پھرتے پھرتے اپنے بال سفید ہوئے  
تب ان دکھ کی داتوں میں اک سکھ کا پناہ دیکھا ہے

اس کے دیچے چلتے چلتے گھر سے نکل جاؤ گے دور  
تم نے کس کی سمٹی میں خوشبو کا جھونکا دیکھا ہے

کتنے دنوں کے بعد عطا نے اپنے ہل سنوارے ہیں  
آئیے میں اس نے اپنا ہنستا چہرہ دیکھا ہے  
عطا الحق قاسمی



# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو پیسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریزیوم ایبل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✧ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

**We Are Anti Waiting WebSite**

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

# WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on  
Facebook

[fb.com/paksociety](https://fb.com/paksociety)



[twitter.com/paksociety1](https://twitter.com/paksociety1)



لطف وہ عشق میں پائے ہیں کہ جی جانتا ہے  
رنج بھی ایسے اٹھائے ہیں کہ جی جانتا ہے

جو زمانے کے ستم ہیں وہ زمانہ جلنے  
تو نے دل اتنے ستائے ہیں کہ جی جانتا ہے

سکراتے ہوئے وہ مجمع اغیار کے ساتھ  
آج یوں بزم میں آئے ہیں کہ جی جانتا ہے

سادگی، باتچین، اغماض، شرارت، شوخی  
تو نے انداز وہ پائے ہیں کہ جی جانتا ہے

کعبہ و دیر میں پتھرا گئیں دونوں آنکھیں  
ایسے جلوئے نظر آئے ہیں کہ جی جانتا ہے

دوستی میں تری در پردہ ہمارے دشمن  
اس قدر اپنے پرائے ہیں کہ جی جانتا ہے

داع وارفہ کو ہم آج ترے کوچے سے  
اس طرح کھینچ کے لائے ہیں کہ جی جانتا ہے

داع دہلوی

رنگ تصویر سے نہیں نکلے  
غراب تعبیر سے نہیں نکلے

تورڈ ڈالا حصارِ زنداں بھی  
پاؤں زنجیر سے نہیں نکلے

جو خزانے ملے خرابوں میں  
کسی تعمیر سے نہیں نکلے

گیت نکلے عینِ قلم بقعر سے  
کسی شمشیر سے نہیں نکلے

گھر سے نکلے جو کارِ دنیا کو  
کبھی تاخیر سے نہیں نکلے

تیر تو زخم سے نکل آیا  
زخم ہی تیر سے نہیں نکلے

ہے سحر وہ بھی اک طلسم کدہ  
سخنِ میر سے نہیں نکلے  
سحر انصاری



ہیں جو آپ کا بیٹا پاس ہو جائے گا۔“  
ظہیر مجتبیٰ۔ فیصل آباد  
ظلم

دو ہم شکل جڑواں بچے سردی کے موسم میں اپنے  
کمرے میں بیٹھے تھے ان میں سے ایک ہنس ہنس کے  
لوٹ پوٹ ہو رہا تھا اور دوسرا اداس کونے میں بیٹھا  
کانپ رہا تھا۔

باپ نے پوچھا تم اتنا کیوں ہنس رہے ہو؟“  
وہ بولا کچھ نہیں پایا آج امی نے دونوں بار اسی کو  
نہلا دیا ہے۔“

### ذرا سی بات

ایک بچہ روتا ہوا ماں کے پاس آیا۔ ماں نے رونے  
کی وجہ پوچھی تو بچے نے کہا۔ ”ابا جان دیوار میں کیل  
ٹھونک رہے تھے تو ان کے ہاتھ پر ہتھوڑی لگ گئی۔“  
ماں بولی۔ ”بیٹا بہادر بچے ذرا ذرا سی بات پر روتے  
نہیں ہیں تمہیں تو ہنسنا چاہیے تھا۔“  
بچے نے کہا۔ ”امی جان میں ہنسا ہی تو تھا۔“

### عمل

ایک سردار صاحب ڈاکٹر کے پاس گئے اور کہا ”ڈاکٹر  
صاحب مجھے رات بھر نیند نہیں آئی۔“  
ڈاکٹر صاحب نے کہا ”آپ رات کو دو ہزار تک  
گنتی گنا کریں۔ نیند آجائے گی۔“ دو دن کے بعد سردار  
صاحب پریشان شکل لیے پھر ڈاکٹر کے پاس پہنچ گئے۔  
ڈاکٹر صاحب نے پوچھا ”جی سردار صاحب نیند آئی“  
عمل کیا آپ نے؟“ سردار بولا ”جی ہاں کیا تھا بہت  
مشکل کام تھا ایک ہزار تک گنا تو نیند آنے لگی پھر تیز

### حادثہ

ایک صاحب ملازمت کے لیے انٹرویو دے رہے  
تھے انٹرویو لینے والے صاحب نے پوچھا۔

”آپ کبھی بیمار رہے ہیں؟“

”جی نہیں۔“

”کوئی حادثہ وغیرہ پیش آیا؟“

”ہرگز نہیں۔“

”لیکن انٹرویو دینے کے لیے آپ بیساکھیوں کے  
سہارے تشریف لائے ہیں۔“

انٹرویو دینے والا۔ ”دراصل میں کل آیا تھا اور  
زبردستی اندر آنا چاہ رہا تھا آپ کے چپڑاسی نے مجھے اٹھا  
کر کھڑکی سے نیچے پھینک دیا تھا۔“

انٹرویو لینے والا۔ ”اس کا مطلب ہے کہ آپ کو  
حادثہ پیش آچکا ہے۔“

انٹرویو دینے والا ”جی نہیں یہ حادثہ نہیں تھا آپ  
کے چپڑاسی نے جان بوجھ کر ایسا کیا تھا۔“

### رزٹ

باپ نے اپنے بیٹے سے پوچھا۔ ”اپنے رزٹ کے  
بارے میں بتاؤ؟“

”وہ ہیڈ ماسٹر صاحب کا بیٹا فیل ہو گیا ہے۔“ بیٹے نے  
جواب دیا۔

”اپنے بارے میں سنو۔“ باپ نے پوچھا۔  
”ڈاکٹر صاحب کا بیٹا بھی فیل ہو گیا ہے۔“ بیٹے نے

جواب دیا۔  
”بد تمیز! میں کہہ رہا ہوں کہ تم اپنے نتیجے کے  
بارے میں بتاؤ۔“ باپ نے غصے میں کہا۔

بیٹے نے برہستہ جواب دیا۔ ”تو آپ کون سے علامہ



پتی والی جائے پی اور وہ ہزار گنتی پوری کی۔“

### دھیان

ماں نے بیٹے سے پوچھا ”ٹیپو سلطان کون ہے؟“  
 ”پتا نہیں۔“ بیٹے نے جواب دیا۔ ”پڑھائی پر دھیان  
 دو شاں نے قصہ سے کہا پھر بیٹے نے پوچھا۔  
 ”ماما؟ یہ نو شین آئی کون ہیں؟“  
 ”پتا نہیں۔“ ماں نے جواب دیا تو بیٹے نے کہا۔ ”ماما!  
 بابا پر دھیان دیں۔“

### ٹھوس ثبوت

تیز رفتاری کے جرم میں ایک صاحب کا چالان ہوا  
 اور انہیں مجسٹریٹ کے سامنے پیش کیا گیا۔ انہوں نے  
 صحت جرم سے انکار کرتے ہوئے کہا۔ ”جناب عالی!  
 میں تو صرف تیس کلو میٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے جا رہا  
 تھا۔“  
 ”کیا تم اپنی بات کا کوئی ثبوت پیش کر سکتے ہو؟“  
 مجسٹریٹ نے دریافت کیا۔  
 ”جناب! ثبوت کے طور پر صرف اتنا جان لینا کافی  
 ہے کہ اس وقت میں اپنی بیوی کو لینے اپنے سسرال  
 جا رہا تھا۔“ ان صاحب نے جواب دیا۔  
 سارہ ظفر۔ ساہیوال

### انداز بیاں اور

ماں نے دوسرے کمرے سے آواز دے کر بیٹے سے  
 پوچھا۔  
 ”بیٹا تمہارا چھوٹا بھائی کیوں رو رہا ہے؟“  
 ”مئی۔ میں اپنے بسکٹ کھا رہا ہوں اور اسے نہیں  
 دے رہا اس لیے رو رہا ہے۔“ بیٹے نے جواب دیا۔ ”تو  
 اس کے پاس اپنے بسکٹ نہیں ہیں کیا؟ میں نے اسے  
 بھی تو دیے تھے۔“ ماں نے پوچھا۔  
 ”مئی۔ جب میں اس کے بسکٹ کھا رہا تھا یہ تب  
 بھی رو رہا تھا۔“ بڑے بیٹے نے شکوہ کرتے ہوئے کہا۔  
 مول آفتاب۔ کراچی

### حفظ ماں قدم

ایک مقام پر پاگل خانے کے پاگلوں سے مشقت لی  
 جا رہی تھی۔ کچھ پاگل ایک سیڑھی والی ٹرائی میں اینٹیں  
 ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے پر مامور تھے۔  
 سہرا نذر نے دیکھا کہ ایک پاگل ٹرائی الٹی کیے کھینچتا ہوا  
 لا رہا ہے۔ اس نے پاگل سے پوچھا۔ ”تم یہ ٹرائی الٹی  
 کیوں لا رہے ہو؟“

پاگل ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ”وہاں  
 ایک پاگل کھڑا ہے۔ میں جب بھی ٹرائی لے کر وہاں جاتا  
 ہوں وہ اسے اینٹوں سے بھر دیتا ہے میں اس سے بچ  
 رہا ہوں۔“

### باعث افسوس

کرکٹ کے ایک جنونی شائق نے اپنے دوست کو  
 بتایا۔ ”میری بیوی نے دھمکی دی ہے کہ اگر میں نے  
 کرکٹ کو ترک نہ کیا تو وہ مجھے چھوڑ کر چلی جائے گی۔“  
 ”ہاں! واقعی۔ یہ تو بہت برا ہوگا۔“ دوست نے  
 افسوس سے کہا۔  
 ”میں ٹھیک کہتے ہو میں اس کی شدت سے  
 محسوس کروں گا۔“ کرکٹ کے شائق نے افسردہ ہوتے  
 ہوئے کہا۔

دانیہ عامر۔ کراچی

### بے بسی

”تمہاری یہ جرات کہ تم میرے ڈیڈی کو فضول اور  
 بے ہودہ انسان کہہ رہے ہو۔“ لڑکی نے اپنے بوائے  
 فرینڈ پر براہم ہوتے ہوئے کہا۔  
 ”تو اور کیا کہوں؟“ بوائے فرینڈ نے بے بسی سے  
 ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔ ”میں ان سے تمہارا رشتہ مانگنے  
 گیا۔ میں نے ان سے کہہ دیا کہ میں تمہارے بغیر زندہ  
 نہیں رہ سکتا۔ اس پر وہ بولے کہ کوئی بات نہیں۔  
 تدفین کے اخراجات میں ہداشت کر لوں گا۔“  
 شینہ اعجاز۔ جہلم





# ماہنامہ شعل

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،  
حضرت عبداللہ بن مسعود سے روایت ہے کہ رسول اللہ  
صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔  
”تم ہائید اہل نہ بناؤ، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تمہاری  
رحمت دنیا میں بڑھ جائے گی“  
(ترمذی)

فائدہ:-

صنعت، تجارت اور کاروبار میں اتنا زیادہ اہٹاک  
اور دلچسپی نہیں ہونا چاہیے کہ انسان کا مقصد زندگی  
رضائے الہی کے بجائے بھی چیسز بن جائیں اھاس  
کے شب و دن ناسی تک وہ وہیں صرف ہوں اور نہ  
سب ضرورت و کفایت تو زمین، کاروبار اور جائیداد  
دھرو بنانا اور کفایت سب ہائے ممنوع نہیں۔

## حکمت عملی

حضرت عمر فاروق کے دور حکومت میں ایک صوبے  
میں محمدی اور ڈاکازی کی وارداتوں میں اضافہ ہو گیا۔  
صوبے کے گورنر کو تنبیہ کے باوجود حالات ٹھیک نہ  
ہوئے تو حضرت عمرؓ نے گورنر تبدیل کر دیا۔ چند ماہ  
بعد رپورٹ ملی کہ صورت حال ہنوز ویسی ہی ہے۔  
حضرت عمرؓ نے طرہوں کا خفیہ دورہ کیا اور بتا  
چلا کہ اس صوبے میں روزگار کے مواقع کم ہیں اور عزت  
بہت زیادہ ہے۔ اور عوام دو وقت کی روٹی سے بھی  
بے تک ہیں۔

حضرت عمرؓ نے سزائوں میں نرمی کی اور روزگار کے  
مواقع مہیا کر کے لیے پالیسیاں بنائیں۔  
کچھ ہی عرصے بعد محمدی اور ڈاکازی کی وارداتوں  
میں کمی آنا شروع ہو گئی اور بالآخر چند برسوں کے بعد  
حالات ٹھیک ہو گئے۔

حضرت عمرؓ نے پھر احکامات جاری کیے کہ اب  
سزائوں میں پھر سختی کر دی جائے گی کیونکہ اب وہاں  
روزگار کے مواقع بیکسر آ گئے ہیں۔  
ترقی یافتہ ممالک نے یہ راز جان لیا کہ جرائم میں  
اخلاقی کی اصل وجہ بے روزگاری اور عزت ہے اس  
لیے وہاں ہر سہ روزہ روزگار شہری کو اسٹیٹ کی ذمہ داری  
قرار دیا گیا ہے۔

صدف عمران۔ کے ڈی، اے سوسائٹی

## سہری کریں،

۱۔ جو شے ناپسند ہو اس کو پسند اور برداشت کرنا  
صبر کہلاتا ہے۔  
۲۔ فضول گوئی سے دل سخت ہو جاتا ہے۔  
۳۔ زیادہ ہلنے سے چہرے کا نور ختم ہو جاتا ہے۔  
سونیا قریشی۔ ملتان

## سخاوت،

حضرت علی بن حسین جو امام زین العابدین کے  
لقب سے مشہور ہیں، حضرت امام حسین کے صاحبزادے  
تھے۔ کربلا کے میدان میں اہل بیت میں سے آپ ہی  
ہاتھی پہرے تھے۔ بڑے گنا اور دریا دل تھے۔ رات  
کی تاریکی میں غلہ کے بورے پشت پر لا کر عزیمتوں  
کے گھر پہنچاتے تھے۔ وفات کے بعد جب غسل  
دیا جائے گا تو جسم مبارک پر نیل کے نشان نظر آئے۔  
معلوم ہوا، آٹے کی بوریوں کے بوجھ کے باعث ہیں جنہیں  
آپ دلاؤں کو لا کر عزیمتوں کے گھر پہنچاتے تھے۔

## حدیث کا احترام،

امام مالکؒ ایک دفعہ حدیث کا درس دے



رہے تھے۔ پھو قیص کے اندر گھس گیا اور گیارہ بار  
ڈنک مارا مگر آپ کے آف نہ کی اور برابر اپنا بیان  
ہاری رکھا۔ جب درس ختم ہوا تو آپ نے قیص اتاری۔  
جسم پر گیارہ زخم تھے۔

### بات تو سچ ہے،

۱۔ جہاں عزت اور خلوص نظر نہ آئے وہاں سے دوستی  
کا ہاتھ ہٹالو۔ کیونکہ اس سے بہتر تنہائی ہے۔  
۲۔ انسان پریشانیوں کی گنتی کا ماہر ہے لیکن نعمتوں  
کا حساب رکھنا بھول جاتا ہے۔  
۳۔ انسان اتمول نہیں ہوتا، اس کا کردار اسے اتمول  
بناتا ہے انسان کی فطرت ہے کسی بھی چیز کی  
صرف دوبارہ قدر کرتا ہے۔ ملتے سے پہلے، کھو  
دینے کے بعد۔

۴۔ دنیا نصیب سے ملتی ہے اور آخرت محنت  
سے، مگر آج ہماری محنت دنیا کے لیے ہے اور  
آخرت کو ہم نے نصیب پر چھوڑ دیا ہے۔  
۵۔ بہت سے نقصان انسان کو اس وجہ سے ہوتے  
ہیں کہ وہ کسی سے مشورہ نہیں لیتا۔  
۶۔ جس انسان کی سانس نکل جائے تو وہ زندہ نہیں  
رہتا اور جس انسان سے احساس نکل جائے تو  
وہ انسان ہی نہیں رہتا۔

۷۔ لوگ کیا کہیں گے، یہ ایک ایسا فقرہ ہے جو  
روزانہ لاکھوں خواب چکنا چور کر دیتا ہے۔  
۸۔ مجھے تنہا رہنے سے نفرت ہے۔ لیکن یہ اس  
سے بہتر ہے کہ مجھے بار بار تکلیف پہنچے۔  
۹۔ زندگی میں کبھی خود کو کسی کا عادی مت بناؤ  
کیونکہ انسان بہت خود غرض ہے جب آپ کو  
پسند کرتا ہے تو آپ کی برائی بھول جاتا ہے۔  
اور جب آپ سے نفرت کرتا ہے تو آپ کی  
اچھائی بھول جاتا ہے۔

۱۰۔ اچھے وقت کی ایک خامی ہے کہ جلدی ختم ہو جاتا  
ہے اور برے وقت کی ایک خوبی ہے کہ ہمیشہ  
نہیں رہتا۔

رضوانہ فکیل راؤ۔ لودھراں

### عقل مند،

حضرت عبداللہ بن مبارک کے بیٹے کے انتقال پر  
ایک مجوسی تعزیت کے لیے آیا۔ اس نے ایک جملہ کہا۔  
حضرت عبداللہ بن مبارک کو وہ جملہ اتنا پسند آیا کہ فوراً  
نکلے لیا، وہ جملہ یہ تھا۔

”عقل مند وہ ہے جو اس کام کو آج کرے جس کو  
جاہل نادان پانچ دن بعد کرے گا۔“  
صبر جاہل، نادان بھی کرتا ہے لیکن وقت نکلنے  
کے بعد مجبوراً۔

ملیحہ رضوان۔ اسلام آباد

### موتی چنے ہیں،

۱۔ اگر آپ سے نیک عمل نہیں ہو رہا تو اس کا مطلب یہ  
ہے کہ غلط عمل نے اس کا راستہ روکا ہوا ہے،  
اس لیے آپ غلط عمل کو نکال دو۔  
۲۔ اپنے غم کو مختصر بناؤ، کیونکہ غم کو غصہ وہ بناتا  
ہے جو کسی تقدیر کو نہیں مانتا اور جو کسی خدا کو نہیں  
مانتا۔

۳۔ بدی دُعا پر سے اعتماد اٹھا دیتی ہے اور جو دُعا  
کے قریب نہیں جاسکتا، وہ خدا کے قریب نہیں  
جاسکتا۔

۴۔ تقاضا چھوڑ دیں، شکایت کرنا بند کر دیں، بلکہ کرنا  
چھوڑ دیں تو زندگی آسان ہو جائے گی۔  
(دعائے علی و اصف)

### صبر،

صبر کا مفہوم یہ ہے کہ مشکل تو ہو لیکن اس کا بیان  
نہ ہو۔

### غزور،

امام اصغرؑ کہتے ہیں۔  
ابو عمر بن العلاء کی انگوٹھی پر یہ عبارت درج تھی۔  
”وہ آدمی جس کی تنگ و دور دنیا ہی ہو تو وہ غزور  
کی رہتی تھا مے ہوئے ہے۔“  
میں نے ان سے اس کے نقش کرنے کی وجہ پوچھی،



توانہوں نے بتایا میں دوسرے کو اپنے مال و اسباب کی تنگ و دو میں گھوم رہا تھا کہ ایک کہنے والے کو سنا، جو یہ کہہ رہا تھا۔

”یہی گھر ہے“

اس کا مطلب تھا یہ مال و اسباب فقط یہیں کام آئے گا۔ میں نے جب دیکھا تو کوئی نظر نہ آیا۔ میں نے پوچھا انسان ہو یا جن؟ کہا جن ہوں۔ اس وقت سے میں نے اپنی انگوٹھی پر اس عبارت کو نقش کرایا ہے۔

سچ،

ایک شیخ نے اپنے مرید کو خرقہ خلافت عطا کیا، اور اسے کسی بستی میں تبلیغ کے لیے بھیج دیا۔ کچھ عرصہ بعد شیخ کو اطلاع ملی کہ ابن کا مرید بڑا کامیاب ہے۔ سب لوگ اس سے خوش ہیں۔

شیخ نے مرید کو طلب کیا اور کہا خرقہ خلافت واپس کر دے۔

مرید نے شیخ سے ملاصافی کا سبب دریافت کیا۔ شیخ نے کہا۔

”سنا ہے سب لوگ تجھ سے خوش ہیں۔“

مرید نے کہا ”اللہ کی مہربانی ہے“ شیخ نے غصے سے کہا ”سب لوگوں کا خوش ہونا اس بات کا ثبوت ہے کہ تو نے سچ بولنا چھوڑ دیا ہے“

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا کلام،

جو شخص حرام چیزوں سے لذت اور لطف حاصل کرتا ہے اس کو یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ ان اشیاء کی لذت تو فنا ہو جاتی ہے۔ لیکن ان کا گناہ اور ذنوب باقی رہ جاتے ہیں۔

حرام کی لذت ختم ہونے کے بعد اس کے برے عواقب و نتائج فنا نہیں ہوتے تو پھر اس لذت کا کیا فائدہ جس کا انجام جہنم کی آگ ہو۔

ظالم کو سزا،

نوشیرواں کے عہد میں ایک ظالم نے ایک ضعیف کے طانچہ مارا نوشیرواں نے اس کی گردن اڑا دی۔ ایک صاحب نے کہا ”تھوڑی سی خطا پر ایسی سخت سزا؟“

نوشیرواں نے کہا ”میں نے آدمی کو نہیں مارا بلکہ ایک بھیڑیے کو قتل کیا ہے تاکہ بھیڑ میں محفوظ رہیں“ حکمران کے لیے ظلم کے غلے کے لیے ظالم کو سخت سزا دینا ضروری ہے۔

بڑے لوگ، بڑی باتیں،

مہم جو ش اور ہوش بہت کم بکجا ہوتے ہیں، لیکن جس میں یہ دونوں وصف موجود ہوں اس سے کبھی لغزش نہیں ہوتی۔

ہم آپ سے کتنا چاہیں تو آپ کی ہر غلطی آپ کو سبق دے سکتی ہے۔ (ایمر بن ابی بکر)

ہم دنیا میں کئی عجوبے ہیں لیکن انسان سے بڑا عجوبہ کوئی نہیں ہے۔ (سوفوکلز)

ہم اپنی نیکیوں کے لیے پوشیدہ جگہ بناؤ، جیسے برائیوں کے لیے بناتے ہو۔ (بیٹھی برنگی)

ہم خاموش اور کم گو آدمی کا ہر جگہ ہر وقت استقبال ہوتا ہے۔ (برنارڈ شا)

ہم ہر مشکل انسان کی ہمت کا امتحان لیتی ہے۔ (سقراط)

ہم سچی محبت یہ بھی ہے کہ بھڑ جانے کے بعد بھی اس کی کسک محسوس کرو۔ (ہراج ساسنی)

ہم محبت کا سبق بارش سے سیکھو جو پھولوں کے ساتھ ساتھ کانٹوں پر بھی برکتی ہے۔ (جارج واشنگٹن)

(جارج واشنگٹن)  
نمرہ، اقرا۔ کراچی





نکال پیچلائی

# نکال پیچلائی

ناہید صفر آرائش \_\_\_\_\_ لالہ موسیٰ  
وہ موم میرے عشق کی تاثیر سے ہوا  
لیکن یہ واقعہ بڑی تاثیر سے ہوا  
مصباح نشار \_\_\_\_\_ ڈونگہ بونگہ  
کیا بتاؤں کہتا مشکل ہے  
جس کے لیے جینا اس کے بغیر جینا  
عمارہ نشار \_\_\_\_\_ ڈونگہ بونگہ  
لا حاصل ہی سہی مگر محبت  
اسی سے ہی امداد اسی سے ہے  
ملیر رحمان \_\_\_\_\_ اسلام آباد  
آہل تو جانتے تھے اس کے وعدوں سے میرا دل نہیں  
پلیں گی پانی میں کاغذ کی کشتیاں کب تک  
شنا عہد القیوم \_\_\_\_\_ بنکہ چیمہ  
بھری شب میں قید کیسے یا صبح وصال میں رکھے  
اچھا مولا! چیری مرضی تو جس حال میں رکھے  
سکیل یہ کیسا کھیل رہی ہے دل سے تری محبت  
اک پل کی سرشاری دے اوروں ہلال میں رکھے  
نشاہ منظور \_\_\_\_\_ بھریاروڈ  
رات بیتی تو گئے آبلے امداد بھر سوچا  
کون تھا باعثِ آفتاب سفر شام کے بعد  
اردی عتار \_\_\_\_\_ میاں چٹوں  
اگر بہ عیب جا ہو تو فرشتوں سے نباہ کر لو  
میں آدم کی نشانی ہوں مجھے انسان ہی پہنچو دو  
آمنہ اجمالا \_\_\_\_\_ ڈہری  
سنا ہے اس کے عہدِ وفا میں ہوا بھی مفت نہیں ملتی  
ان گلیوں میں ہر رسانی پہ بھرتے ہیں جہانے لوگ  
انجیل \_\_\_\_\_ ڈہری  
اگر تم سے کوئی پوچھے بتاؤ زندگی کیا ہے  
بھیلی پہ فلاسی خاک رکھنا امداد ادیشا

زارا شاہ \_\_\_\_\_ کوٹ نجیب اللہ  
ایک پل نہیں گزرتا تھا جس کے بنا اپنا!  
میرے حوصلے کی دلدور کہ اک عمر گزلی ہے اس کے بغیر  
اقربا بٹ \_\_\_\_\_ گوجرانوالہ  
محبت پھر اس طرح سے وارد ہوئی ہے میری ذات پر  
خزاں کے موسم میں کوئی پھول کھلا ہو جسے  
اقصی ناصر \_\_\_\_\_ کراچی  
ایک عشق کے بزور سپہ سالار اگر میرا حوصلہ تو ذکیہ  
تغیا کھڑا ہوں میں تیری یادوں کے لشکر کے سامنے  
نور اقرار \_\_\_\_\_ کراچی  
مرا درد نغمہ ہے صدا  
مری ذات ڈرہ ہے نشان  
مرے درد کو جو زباں ملے  
مجھے اپنا نام و نشان ملے  
ملائکہ کوثر \_\_\_\_\_ بسم اللہ  
لبوں پہ گیت تو آنکھوں میں خواب رکھتے تھے  
کبھی کتابوں میں ہم بھی گلاب رکھتے تھے  
کبھی کسی کا جو ہوتا تھا انتظار ہمیں  
بڑا ہی شام و سحر کا حساب رکھتے تھے  
رافیہ کنول \_\_\_\_\_ دائرہ دین پناہ  
میں پانہ سا آج تک اس غلش سے چھٹکا لا کھن  
وہ مجھے محبت بھی سکتا تھا مگر ہارا کیوں  
عالمہ جمیل \_\_\_\_\_ لاہور  
ہاتھوں میں مشعلیں لیے کچھ لوگ رات کو  
دھڑکے فریبِ زندگی بستی جلا گئے





میں کابلی آجانی ہے اور خط کے جواب ارسال کرتی سوئٹ  
سی ہستی کا کیا ہی کہنا۔

سلسلہ وار ناولز میں نہ بھی لکھوں تو اظہر من الشمس  
ہے۔ ہماری ”یارم“ کی تخلیق کار سوپر ڈوپر ہٹ ہیں۔  
”ایک تھی مثال“ اب مطالعہ میں نہیں رہا۔ ”رقص  
بسل“ کو نظروں سے گزار لیتے ہیں نازیبا جمال میری ناقص  
معلومات کے تحت شاید نیا نام ہے مگر تحریر میں پختگی اور  
دلچسپی کا عنصر کسی منجھی رائٹر سے کم نہیں تھا، شعاع کے  
دستر خوان پر کوئی بھی کھانا بے لذت ہو ہی نہیں سکتا۔  
جو یہ شاہ کے احساسات میں ہر گھر کی کہانی پوشیدہ تھی۔  
”غریقِ رحمت“ کی آخری قسط بو جھل دل کے ساتھ  
بڑھی۔ حق یہ ہے کہ سحر ساجد نے پروردگار گناہگار اور توبہ  
کے درمیان ربط بیان کرنے کا حق ادا کر دیا۔

ج۔ پیاری فریدہ! شعاع کی محفل میں خوش آمدید۔  
آپ کی ایک کہانی شائع ہو چکی ہے اور دوسری کہانی  
موصول ہو گئی ہے۔ ناقابل اشاعت تحریروں کے بارے  
میں ہم پرچے میں نہیں لکھ سکتے البتہ یہ ضرور بتا سکتے ہیں  
کہ کون سی تحریر موصول ہو گئی ہے۔ دن بھر فونز کا مانتا  
بندھا رہتا ہے اس لیے ہمارا نمبر مشکل سے ملتا ہے۔ آپ  
جب کہانی بھجوائیں تو اپنا فون نمبر ضرور لکھیں۔ ہم آپ کو  
خود فون کر کے کہانی کے قابل اشاعت ہونے کے بارے

میں بتا دیں گے۔

شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

شمرہ احمد بٹ نے پتو کی سے لکھا ہے۔

کافی عرصے کے بعد وجہ حارث قیوم، سحر ساجد غریق  
رحمت کے ساتھ ایک بہت اچھا قدم۔ عمیرہ، شمرہ اور  
عنیزہ سید کے بعد ان کی تحریر سمجھ دار سمجھ داری ہے۔  
اچھی لگی دراصل ایک قاری بہن کا خط بڑھا کہ اب قلم  
کے بعد بچوں جیسی کہانیاں انسپائر نہیں کرتیں ان کی بات  
بالکل بجائے لیکن نئی بچیوں کی حوصلہ افزائی ہوتی رہے،  
تب ہی تو وہ بھی عمیرہ، شمرہ، عنیزہ، میمونہ، نگہت، شمرہ،  
عالیہ، راحت، سسٹرز، راشدہ آمنہ بنیں گی۔ دل بڑا کریں  
قارئین کرام۔

پلیز عالیہ سے کہیں کہ آکر رونق دوبالا کریں بمع راحت  
سسٹرز راشدہ اینڈ آمنہ ریاض۔ ذاتی طور پر مجھے بھی محبت



رخصتہ جمیل



خط بھجوانے کے لیے پتا

ماہنامہ شعاع - 37 - اردو بازار، کراچی۔

Email: info@khawateendigest.com  
shuaamonthly@yahoo.com

آپ کے خط اور ان کے جوابات لیے حاضر ہیں۔  
آپ سب کی عافیت، سلامتی اور دائمی خوشیوں کے لیے  
دعا میں!  
اللہ تعالیٰ آپ کو، ہم کو، ہمارے پیارے وطن کو اپنے حفظ و  
امان میں رکھے۔ آمین۔

پہلا خط پاک چین سے فریدہ فرید کا ہے، لکھتی ہیں۔

دلفریب سرورق بر ماڈل تو جو تھی سو تھی، جیولری غضب  
کی تھی۔ پہلی شعاع کا بغور مطالعہ کیے جان سے پارے  
نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتوں سے فیض حاصل کیے،  
میری پہلی چھلانگ ”خط آپ کے“ پر تھی انٹرویوز سے  
زیادہ دلچسپی نہیں ہے، شعاع کو جہاں بہترین رائٹرز کا ساتھ  
حاصل ہے وہیں ہماری قاری بہنوں کا شعور بھی داد کا  
مستحق ہے ایک اسٹوری کو پڑھ کر جو بھی پوائنٹس میرے  
ذہن میں اٹھتے ہیں وہ سب میرے فریڈز کے خطوط میں  
موجود ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات قلم اٹھانے



سمیرا۔ اللہ نے بہت محبت سے بہت خاص بنایا ہے آپ کو۔

رشتہ کیا امر ہے جس کے پاس دادا جیسا رشتہ ہے۔ اور دل شدید دکھ سے بھر گیا۔ اپنے لیے جس کے پاس نہ دادا ہے نہ باب۔ پر بہت خوش ہوں کہ ویرا جیسی بہت پیاری دوست عظمیٰ ہے۔ سادھنا کے جیسی پیاری بہن عذرا ہے۔

پیاری شائلہ! اللہ آپ کے ان رشتوں کو سلامت رکھے۔ سمیرا تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے۔

ڈاکٹر ساحرہ تبسم نے اوکاڑہ سے لکھا ہے

روز رفتہ ہانگ کانگ سے بہ میعاد تین برس کے مراجعت ہوئی۔ بذریعہ برٹش ایرویز ہم سرزمین کراچی پر وارد ہوئے اور ریل سے رنگ رنگ کر (کیونکہ وہاں کی ریل کی نسبت یہاں کی ریل ریگتی ہی ہے) اوکاڑہ پہنچے اسٹیشن پر اسٹال پہ شعاع کے سرورق سے متاثر ہو کر چل گئے۔ سو خرید اور گھر آئے اور اراق کی نکلت دلفریب اور تحریروں کا شعاع و تلون جی لہھا گیا۔ کل شب خط آپ کے 'اول تا مکمل ناول' آخر تمام پڑھ ڈالا۔ علی الصبح والا نامہ لکھتی ہوں۔

جدت کے دور حاضر میں جہاں ٹی وی اور انٹرنیٹ علم و ادب کی تنزل پذیری کا موجب ہوئے وہاں شعاع کے اجرا نے ہمارے لٹریچر کو احیا کیا۔ مجھے جس قدر مسرت ہوئی وہ الفاظ میں بیاں و عیاں کرنا ناممکن۔

"یارم" کی جس قدر تعریف کی جائے کم ہے۔ سمیرا نے واقعی میرے دماغ کے ستون ہلا دیے۔ میں نے اس سے قبل اتنی بہترین منظر کشی گوروں کی تخلیق میں دیکھی تھی، اور ایک لمحے کے لیے تو یوں ہی لگا کہ کسی گورے کی تصنیف کا اردو میں بڑی مہارت سے ترجمہ کیا گیا ہے۔ سمیرا اپنے کام میں مناقب کاملہ اور مہارت نامہ رکھتی ہیں۔ تحریر میں فصاحت بھی عمدہ رہی۔

"غریقِ رحمت" میں سحر نے واقعی سحر کر دیا۔ بہت عمدہ سب افسانے بالخصوص جھجک بہترین گئے۔ موجودہ دور میں ہر گھر میں ایک حریم اور عفرات ہیں۔ انٹرویو پڑھ کر مزہ آیا۔ شعاع کے ساتھ ساتھ کی شیرینی بھی قابلِ تحسین ہے۔ بات

بھری مگر ٹھوس کہانیاں پسند ہیں۔ عشق حقیقی سے مزین عمیرہ احمد کی اور فلسفے بھری عنیزہ سید کی 'رومانٹک با کردار عالیہ' آمنہ اور راحت + میمونہ کی یہ سارے پھول آپ کے گلہ سستے یعنی (شعاع، خواتین) کو مہکاتے مہکاتے تھک گئے یا پھر لمبی چھٹی پر اپنی زندگی میں گم ہو گئے انہیں تلاش کرنے کی محال میں نے فرمائشوں کے ساتھ ساتھ سحر ساجد کی بھی حوصلہ افزائی کرنی ہے کہ وہ زینب آیا، حارث قیوم، شفیق بھائی + ڈاکٹر حسنا کے ساتھ اچھی بامعنی کہانی لکھ سکیں۔ خاص طور پر توبہ "کو سر فرست رکھا۔ لمحہ ہدایت دیکھنے بڑھنے" سننے میں عام سالفظ ہے کہ ہر دوسرا شخص اس کو دہرا تا رہتا ہے مگر ہاں جب یہ کسی کی زندگی میں آتا ہے تو ہرگز ہرگز عام نہیں ہوتا۔ "کہانی کی یہ لائن کہانی کی جان ہے قارئین نے "یارم" سمیرا حمید کی بہت پسند کی لاسٹ والی قسط مارچ 2015ء شعاع میں ابھی بڑھی تو معلوم ہوا لوگ سچ ہی تعریف کرتے ہیں۔ "ایک بھی مثال" رخسانہ نگار کی باقاعدہ پڑھ رہی ہوں۔

نئے نئے افسانے، اللہ بخشے، جھجک، بامعنی اور باحقیقت رہے، نازیہ جمال یہ تو دل کی بات ہے۔ ایک ہلکی پھلکی پیاری سی تحریر لاکس "رفص بسل" میں نبیلہ عزیز اب اینڈ کس طرح کریں گی؟ انتظار ہے فیورٹ اسٹوری ہے کچھ کچھ تجسس لیے۔ مومنہ افتخار کی تحریر قید فلسفی رہی۔ چلیں جناب ایک دو تحریریں فلسفی بھی ہونی چاہئیں۔ ہر کردار کے جذبات و احساسات کو نہایت عمدہ لفظوں میں بیان کیا گیا جس سے ناول کی خوب صورتی مزید بڑھ گئی۔

پیاری شمع! شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ آپ کی پسندیدہ مصنفین تک آپ کی فرمائش پہنچا رہے ہیں۔ یہ ہماری بھی دلی خواہش ہے کہ وہ شعاع کے لیے لکھیں۔ سمیرا حمید کے ناول کی آپ نے تعریف کی لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ آپ کو آخری قسط پڑھ کر اندازہ ہوا کہ لوگ سچ تعریف کرتے ہیں۔ کیا آپ نے شروع سے "یارم" کی اقساط نہیں پڑھیں؟

شائلہ شریف کھدیاں خاص قصور سے لکھتی ہیں

یارم! یارم! یارم! انویسٹمنٹ تک قائم رہنے والا سحر جانے کب ختم ہو گا اب۔ تعریف کے لیے الفاظ ہی ختم ہیں



سب بھی مہرہ رہا۔  
حراقہ شہی نے ملتان سے لکھا "ساڑی طرفو مبارک!"  
حراجی۔ طرفو اردو لفظ طرف کی بڑی شکل ہے، پنجابی میں  
دلوں استعمال ہوتا ہے۔ خیر میں تنقید نہیں کر رہی۔ آخر  
میں جاتے جاتے منہ می سی دھا۔  
"رب العزت اس منبر نشاں اور رہنا کار عظیم کو اوج  
کمال و ریخت کرے۔ آمین

پیاری ساحرہ آپ نے وضاحت نہیں کی کہ یارم کی  
آخری قسط پڑھی ہے یا آپ ہانگ ہانگ میں بھی شعاع  
پڑھتی رہی ہیں۔ بہر حال بصرے سے تو لگتا ہے کہ شعاع کا  
اور آپ کا طویل ساتھ ہے۔  
آپ کی تحریر کی فصاحت و بلاغت بھی اپنی جگہ بہت  
خوب ہے۔ بہت شکریہ آپ نے خط لکھا، اب باقاعدگی  
سے خط لکھتی رہے گا۔

سحرش خان بھٹو نے کراچی سے شرکت کی ہے۔ لکھتی  
ہیں

مارچ کا شعاع ملا رنگوں اور خوشبوؤں سے بھی سمیرا  
حمید کی تحریر "یارم" نے تو ہمیں سیدھا سمیرا سندری کا ہی  
دیوانہ بنا ڈالا۔ ویل ڈن۔ ویل ڈن لیر سمیرا آپ نے بہت  
ہی اچھا لکھا۔

آخر میں فرحت آبی سے کہیں کہ وہ جلدی سے ایک  
امچی سی تحریر لے کر حاضر ہو جائیں۔  
پیاری سحرش! آپ کی تعریف سمیرا تک اور فرمائش  
فرحت تک پہنچا رہے ہیں۔

لبنی یوسف نے مراد پور انسہو سے شرکت کی ہے  
لکھتی ہیں

پچھلے آٹھ سالوں سے شعاع۔ خواتین کی خاموش  
قاری ہوں خاموشی توڑنے پہ مجبور کیا "یارم"۔ سمیرا جی  
نے پچھلے ماہ جتنا رلایا اس ماہ اتنی ہی خوشی ملی یار آخر کو  
ہماری امرہ اور عالیان ایک جو ہو گئے ہیں یارم کے لیے  
کوئی بات سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے آپ نے  
سمیرا حمید کی Pic دیکھی تھی میڈ پہ مگر مجھے نہیں لگتا  
کہ یہ سمیرا جی ہیں کیونکہ میں ان کو کوئی تنگ سی کرل  
سمجھتی تھی اور Pic میں وہ آنٹی ہیں۔ پلیز مجھے ان کی مہر  
تادیں کہ میری لفظ منی دور ہو کیونکہ Pic میں وہ سوئی سی

ہیں اور تنگ بھی لگی ہوئی ہے ان کے نام پہ ایک وہی تنگ  
آئی ہے میں سرج کر کر کے تنگ مٹی ہوں اور اس ماہ کی  
سب سے اچھی بات کہ میں اور زینب میری چھوٹی بہن  
اس ماہ لڑے کہیں کیونکہ ہر ماہ ڈائجسٹ کے آتے ہی  
ہماری لڑائی ہوتی کہ پہلے میں پڑھوں گی مگر اس ماہ ہم دونوں  
نے سر جوڑ کر پڑھا یارم کو اور بہت مزا بھی آیا ہمارے  
پیارے بھائی ہر ماہ اپنی پاکٹ منی سے خواتین اور شعاع لا  
کر دیتے ہیں۔

ج : پیاری لبنی! آپ اپنی لفظ منی دور کر لیں۔ یقیناً  
آپ نے کسی اور سمیرا کی تصویر دیکھی ہے سمیرا حمید بالکل  
بھی سوئی نہیں ہیں وہ بہت اسارت ہیں۔ کم عمر ہیں اور کم  
عمر نظر بھی آتی ہیں۔ چشمہ بھی نہیں لگاتی ہیں۔ شعاع کی  
پسندیدگی کے لیے شکریہ اپنے بھائی کو بھی ہمارا شکریہ پہنچا  
دیں جو ہر ماہ آپ کو رسالے لا کر دیتے ہیں۔

خدیجہ فواد نے لاہور سے لکھا ہے

شعاع اور خواتین کو اتنے عرصے سے پڑھنے اور پسند  
کرنے کے باوجود یہ ہمارا پہلا خط ہے۔ وہ بھی سمیرا حمید کے  
شاہکار "یارم" کی بدولت اور نہ ہم نے اپنی خط لکھنے کی  
صلاحیت کو زندہ ہی نگاہ بناتھا۔

جی تو "یارم" پہلی قسط ہی سے بہت انوکھا منظر اور نرالا  
ساگ۔ سمیرا نے اسے بہت ہی پیار سے لکھا ہے اور محنت  
سے جو کہ اس کی ہر ہر سطر میں نظر آ رہی ہے۔ بعض دفعہ  
ایسا لگتا تھا کہ سمیرا حمید امرہ کے ساتھ ساتھ ہیں۔ ہر منظر  
ہر بات کو اپنے قلم سے قید کرنے کے لیے۔ سب کردار  
ایسے حقیقی لگتے ہیں۔ تصوراتی تو بالکل بھی نہیں۔

سمیرا حمید نے اتنی خوب صورتی سے ایک بات کو دس  
دس زاویوں سے پیش کیا کہ پڑھنے والا ان لفظوں کے سحر  
سے ہی نہ لکل پائے۔ اس تحریر نے بہت ہسایا اور رلایا  
بھی۔ خیر سمیرا حمید نے آخری قسط میں سب کے صدمے  
دور کر دیے۔ بہت تفصیلی قسط تھی۔ اسپیشلسی ویڈنگ  
پرائکس کہ اب ان کے بغیر تو ہمیں شادیاں اور موری لگیں  
گی۔

دل چاہ رہا ہے کہ کچھ مہینوں میں ہونے والی اپنے بھائی  
کی شادی پر میں بھی دو تین ویڈنگ پرائکس ترتیب دے  
ڈالوں۔ لیکن ہمارے ہاں کے بڑے بوڑھے تو چھوڑنے  
والے نہیں۔ چلو کوئی بات نہیں اپنے بچوں کی شادیوں پر



موقع نہ ملتا تو (پوتے پوتیوں) کی دفعہ دل کے ارمان نکال لوں گی۔ آخر تب دیلی کی بڑی بوڑھی میں بن گئی ہوں گی ناں، افسالوں میں یلومہ صدیقی کا السانہ اچھا لگا۔ ایک بھی مثال بہت ڈپریس جا رہی ہے۔ پلیز اس میں کچھ لکھل ہوئی جا ہے۔ حنا کنول کا شعاع کا ساتھ پسند آیا۔ خطوط بھی سب اچھے تھے۔

شعاع کے ہائی سلسلوں میں پیارے نبی کی پیاری باتیں اور تاریخ کے جھروکے میری امی ساس بہت شوق سے پڑھتی ہیں۔ موسم کے پکوان میں زنگریرگر کی رہسہ بھی اچھی لگی اور ضرور ثرائی بھی کدوں کی۔ کیونکہ میری بیٹی بہت شوق سے کھاتی ہے۔

پیاری خدیجہ ہمیں السوس ہے کہ آپ کا پورا خط شعاع نے کر سکے۔ آپ اتنا اچھا خط لکھتی ہیں پھر کبھی لکھنے میں اتنی سستی اب ہر ماہ ہمیں خط لکھو گا۔

جعفری ظفر نے رحیم یار خان سے لکھا ہے

ٹائٹل بس ٹھیک تھا۔ ماڈل کی صرف چوڑیاں اچھی لگ رہی تھیں۔ میں خط صرف اپنے لیورٹ ناول "یارم" کی وجہ سے لکھ رہی ہوں کیونکہ آخری قسط تو بہترین تھی۔ آخر کار ایک اور زبردست ناول اتمام پذیر ہو گیا۔ حیرت ہوتی ہے کہ سیرا چھوٹی سی عمر میں اتنا عمدہ لکھ لیتی ہیں۔ اور آخر میں ایک ریکویسٹ کہ پلیز میرے پسندیدہ گلوکار عاطف اسلم اور شالو یعنی کہ ماہرہ خان کا تفصیلی انٹرویو شائع کریں۔

پیاری جعفری! حیرت تو ہمیں بھی ہوئی تھی اور سیرا سے ملے تھے تو پہلا سوال ان سے یہی کیا تھا۔ انہوں نے انتہائی معصومیت سے کہا "زہن میں آتا ہے تو لکھ دیتی ہوں۔" یہ واقعی ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ خداداد صلاحیت ہے۔

نور عبد السلام تو اب شاہ سے شریک محفل ہیں لکھا ہے

حمد و نعت پڑھ کر اور پیاری باتیں پیارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پڑھ کر آگے بڑھتے۔ ساری کہانیاں پڑھ کر آخر میں "یارم" پڑھی۔ زبردست بہت ہی اچھی توقعات سے بھی بڑھ کر ڈیل ڈن سیراجی! بہت اچھا اینڈ کیا ہے نقد بھی مکمل ناول اچھا لگا ہائی سب سلسلے مکمل تھے۔

"یارم" کی سب سے اچھی بات "زندگی کو فیری ٹیل ہماری سوچ بناتی ہے۔ پرنس چارمنگ وہ نہیں جو ایک بڑی سلطنت کا شہزادہ ہے یا جو بہت خوب صورت ہے۔ پرنس چارمنگ ہر وہ انسان ہے جو ایک شفاف دل کا مالک ہے جو بلا امتیاز انسانوں سے محبت کرتا ہے میں "تم" عالیان امرجہ کا دل ہم سب۔"

پیاری نور! شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ سیرا اور دیگر مصنفین تک آپ کی رائے ان سطور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے۔

حمیرا نوشین نے منڈی ساوالدین سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

آغا علی عباس کی جدوجہد سے پڑ زندگی سے متاثر ہو کر سحر ساجد کی "غریق رحمت" کی طرف بڑھے۔ بہت عرصہ کے بعد روح و دل کو جھنجھوڑ دینے والی تحریر پڑھنے کو ملی۔ اسے پڑھتے ہوئے کبھی روٹ گئے کبھی بے ہوئے تو کبھی آنکھوں سے اشک رواں ہو گئے۔ کبھی ملال ہوا تو کبھی نمل ہوئے۔

حمیرہ احمد کا پیر کامل، نمر احمد کا مصحف اور اب سحر ساجد کے غریق رحمت کے سحر سے میں کبھی لکھنا نہیں چاہتی۔ نور عین کے السانے کو دلچسپی سے پڑھا۔ یلومہ صدیقی نے لوگوں کی ایک عام برائی کی طرف ہلکے پھلکے انداز میں توجہ مبذول کرائی۔ جو یہ شاہ کا السانہ بھی ٹھیک ہی لگا۔ مجموعی طور پر رسالہ خوب تھا۔

پیاری حمیرا! شعاع کی پسندیدگی کے لیے تمہ دل سے ممنون ہیں، آپ کی تعریف متعلقہ مصنفین تک پہنچا رہے ہیں۔

یعنی جعفری نے جلال پور ہمدانیاں ضلع خوشاب سے لکھا ہے

"یارم" زندہ دل لوگوں کی زندہ دل داستان جس نے مجھ سے کہا۔ "بول کہ لب آزاد ہیں تیرے" یارم بے چینوں کو سکون اور مایوسیوں کو امید کی کرن دکھاتا ہے "بے مثل گھینہ" بہت حمید کے لکھے لفظ لفظ نے ہمیں اپنا گرویدہ کر لیا، بات آج کی نہیں نو ماہ پہلے کی ہے۔ یارم کی پہلی قسط پڑھی۔ واہ! کیا بات ہے۔ زندگی ایسی بھی ہوتی ہے اور جوں جوں یارم اپنی تمام تر خوب صورتیوں سمیت آگے بڑھا، مانو



ایک سحر میں جکڑنا چلا گیا۔ الفاظ ہیں یا کوئی جادو نگری ایسے جادو کی اسم کہ سحر زدہ کر دیں۔ اور کردار ایسے جیسے آسمان سے اتاری خاص مخلوق آخر کیا ہیں سمیرا جی....؟ کہاں سے آیا ان کے پاس علم کا یہ وسیع خزانہ۔ یارم کے ساتھ روئے بھی، بنے بھی اور افسردہ بھی ہوئے لیکن اختتام پہ سمیرا جی بس سرگردیا۔ کاش ایک کارل ہمارے پاس بھی ہوتا۔ سمیرا جی پلیز لکھتی رہے۔

پیاری عینی! آٹھ سال کی طویل مدت اور صرف ایک خط اور صرف ایک کہانی پر بصرہ.... اتنے خوب صورت الفاظ لکھنے والی عینی کو تو ہر ماہ خط لکھنا چاہیے۔ عینی آپ میں صلاحیت ہے آپ دوسرے سلسلوں میں بھی حصہ لیں اور کہانیاں لکھنے پر بھی توجہ دیں۔

فوزیہ شمرٹ اور ام ہانیہ عمران گجرات سے شریک محفل ہیں، لکھا ہے

ٹائٹل ذرا سا بھی اچھا نہیں تھا۔ نہ ہی اچھی جیوری اور ڈریس تو بالکل بھی اچھا نہیں تھا۔ بدلتے موسم کے لحاظ سے سرورق ہونا چاہیے۔ خیر پہلی شعاع اچھی باتیں۔ پیارے نبی کی پیاری باتیں دل و جان کو معطر کرتی ہوئیں آغا علی عباس کی باتیں اچھی لگیں۔

سب سے پہلے یارم کو پڑھا۔ ایک خوب صورت تحریر کا پیارا سا بیبی اینڈ۔ کارل ہمیشہ ایک اچھی یاد کی صورت ذہن میں نقش ہو گیا۔ مجھے تو یارم کی ہر ہر سطر اچھی لگتی تھی۔ مشعل فیاض انسان نہ تو الفاظ بھولتا ہے اور نہ ہی کہانی اگر تحریر کو دل کی گہرائیوں سے پڑھا جائے میرے خیال میں سمیرا حمید کے قلم نے ہمیشہ اپنی انفرادیت رکھی ہے۔ اور یہی ان کی تحریروں کی خوب صورتی ہے۔ اور ہاں مختلف آرا سامنے آئیں کہ کہانی کم تھی فلسفہ زیادہ پھر بھی

تمام کے تمام کردار مثل بے مثال تھے۔

مستقل ناول رقص جہل۔ بالکل سلو جا رہا ہے۔ انیسویں قسط ہو گئی اب تو پردہ غائب سے ماورا کا مقصد باہر لائیں ایک تھی مثال بھی روئین وائز جا رہا ہے۔ غریق رحمت اینڈ اچھا تھا۔ بہت دل دکھا اس تحریر کو پڑھ کر۔ پتا نہیں بھائی جیسی مخلوق اوپر والے نے اتنی بے حس کیوں بنائی ہے۔

یہ ناول کی بات ہے کمال کی ترجمانی کی ہے رائٹر نے

میری زندگی کی۔ عمیر کو بس چار جوتے لگانے کی حسرت رہ گئی۔ اور ہاں یہ بھابھیاں (تمام نہیں) کس خاص فارمولے میں رب بناتا ہے۔ جیتی جاگتی شیطان کی ماسیاں (خلائیں)

افسانے سب ہی اچھے لگے۔ جھک یہاں بھی ایک بھابھی صاحبہ براجمان ہو گئیں اب یہ مخلوق.... مارچ کا شمارہ 2 کو ملا تھا۔ آج 5 کو بیٹھی خط لکھ رہی ہوں پلیز خط شامل ضرور کیجئے گا اور کیا نادیہ امین شعاع کے لیے ایک پیارا سا ناول نہیں لا سکتیں۔ دستک میں شائستہ جبین کو ضرور لائیں۔

دعاؤں میں ضرور شامل رکھیے آج کل شدت سے ضرورت ہے ان کی مجھے۔

ہم نے یہ سوچ کر ہنسنے کا ہنر سیکھ لیا درد رکھنا ہے تو پھر دیدہ تر کیا رکھنا پیاری فوزیہ! ہماری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کی زندگی میں آسانیاں پیدا کرے۔ لیکن بھابھیوں کو شیطان کی ماسیاں کہنے والی بات ہمیں اچھی نہیں لگی۔ سندس بھی کسی کی بھابھیاں ہوتی ہیں اور پانچوں انگلیاں کبھی برابر نہیں ہوتیں۔ آپ کی پیاری بیٹی ام ہانیہ عمران کو سالگرہ کی مبارک باد اور دعائیں۔ اگرچہ یہ شمارہ آپ کو ملے گا تو ام ہانیہ اپنی سالگرہ منا چکی ہوں گی۔ نادیہ امین تک آپ کا پیغام پہنچا رہے ہیں ہماری بھی خواہش ہے کہ وہ ہمارے لیے کوئی اچھا سا ناول لکھیں۔ بصرہ ہمیشہ کی طرح دلچسپ اور تفصیلی ہے۔ تمہ دل سے شکریہ۔

لاہور سے سین مغل لکھتی ہیں

سب سے پہلے میں فروری 15ء کے شمارے کا ذکر کروں گی۔ اس میں فرح بخاری کی تحریر ”شام خزاں طویل سہی“

میں ایک جگہ ہیروئن ”خزران“ نماز عصر کے بعد شکرانے کے نوافل ادا کرتی ہے۔ جبکہ میری معلومات کے مطابق عصر کی نماز پڑھنے کے بعد مغرب کی نماز ادا کرنے تک کوئی سجدہ نہیں کیا جاسکتا۔ اسی وجہ سے اس دوران نوافل کی ادائیگی منع ہے۔ اب آپ سے پوچھنا یہ ہے نہ کون سی بات درست ہے؟

اس ماہ کا سرورق ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے اشارہ بس کے



اب تک۔ آگے میں نہیں جانتی۔  
 پیاری عاتکہ! آپ نے ایک ہی خط میں شعاع اور  
 خواتین کی کہانیوں پر بھرہ کیا ہے نمل اور "آپ حیات"  
 خواتین ڈائجسٹ میں شائع ہو رہی ہیں۔  
 آپ کا پہلا خط تھا۔ اس کے شائع کر دیا۔ آئندہ  
 خواتین اور شعاع کے لیے خط لکھیں تو علیحدہ صفحات  
 استعمال کریں۔

عابدہ بشیر عالی احمد نے گجرات سے لکھا ہے  
 سب سے پہلے یارم میرا آپی کا پڑھا۔ میرا آپی کے  
 الفاظ سیپ میں بند خوب صورت موتیوں کی طرح ہیں۔  
 شاید میرے پاس ایسے نادر و نایاب الفاظ ہی نہیں جو میرا  
 آپی کی تعریف میں کہہ سکوں۔ قید ناول بھی اچھا تھا۔  
 افسانے بھی تینوں بیسٹ تھے۔ نازیہ جمال خیر نے بھی اینڈ  
 تک پکڑے رکھا۔ سارا رسالہ بیسٹ تھا۔ اب بات  
 کروں گی کچھ قاری بہنوں کی جنہوں نے "یارم" میں  
 فلسفے کی بات کی۔ اپنے اپنے مزاج کی بات ہے۔ مجھے شدید  
 تپ چڑھ گئی یا اگر فلسفہ ہے تو فلسفہ لکھنے والے کو اس  
 فلسفے کی سمجھ بوجھ تھی تب ہی تو یہ لکھا گیا۔ (معذرت کے  
 ساتھ)

ج۔ پیاری عابدہ! ہمیں بے حد افسوس ہے کہ آپ کا  
 افسانہ ناقابل اشاعت ہے دوسرا افسانہ پڑھ کر ہی بتایا  
 جاسکتا ہے۔ قابل اشاعت ہے یا نہیں۔ شعاع کی  
 پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

ندا غوری نے غازی روڈ لاہور سے لکھا ہے  
 اس ماہ کا سرورق بہت ہی فضول تھا بلکہ ہر بار ہی  
 تقریباً "ٹائٹل بہت برا ہوتا ہے۔" "یارم" بہت زبردست  
 اور مزے کا ناول تھا لیکن حقیقت سے کافی دور اور فلسفہ  
 ایکسٹرا آؤٹری تھا۔ "یہ تو دل کی بات ہے" اور "غریق  
 رحمت" بھی اچھی کہانیاں تھیں۔ میرا درود میں میرا حمید

سے یہ سوال ہے کہ ان کی پہلی کہانی کون سی تھی؟ اور  
 ڈائجسٹ کے آفس میں کہانی بھجھنے کے کتنے عرصے بعد ان  
 کی کہانی شائع ہوئی؟ اور پلیز مجھے کرن ڈائجسٹ میں خط و  
 کتابت کا پتہ دیں۔ (آئی مین ایڈریس) نمرہ احمد سے مجھے یہ  
 کہنا تھا کہ وہ برائے مہربانی حد سے زیادہ منظر نگاری وہ بھی  
 جو سوچی نہ جاسکے پڑھنے والے کو تھکا دیتی ہے۔ دوسری

ڈراموں کی کوئی ہیروئن کی تصویر لگا دی گئی ہو۔ (ہاں ہمیں  
 رسالہ دیکھتے ہی ایسا خیال کیوں آیا.....؟) سب سے پہلے تو  
 میرا حمید کا ذکر کروں گی۔ "یارم" لکھ کر انہوں نے ہمیں  
 دوبارہ اس جگہ پہنچا دیا جہاں آج سے کچھ عرصہ پہلے ہم  
 اپنے تعلیمی اداروں میں تھے۔ میرا خیال ہے کہ میرا کارل  
 کے کردار کو ابھی آگے کسی دوسری تحریر میں لائیں گی۔  
 کیونکہ انہوں نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "اسی فلم سے میں  
 دوبارہ آنے کے لیے جا رہا ہوں۔ میرا انتظار کیا جائے۔"  
 ہمیں میرا سے ایک شکوہ ہے کہ وہ "دیرا" کے ساتھ کچھ تو  
 اچھا کرتیں۔ اتنی پیاری لڑکی کا اگر کارل کے ساتھ جوڑنا  
 دیتیں تو کتنا اچھا ہوتا۔ افسوس!

سحر ساجد کی تحریر "غریق رحمت" ایک بہترین تحریر  
 تھی۔ حارث کا اس سے بہتر انجام اور کوئی ہو ہی نہیں سکتا  
 تھا۔ اس میں بدکار عورت کا واقعہ اور پانی کے گلاس میں  
 سیاہی والی مثال بہت ہی اچھی لگی۔ رخسانہ صاحبہ کا ناول  
 اچھا ضرور ہے مگر چیونٹی کی رفتار سے (ادھو! چیونٹی تو تیز  
 چلتی ہے) کچھوے کی چال چل رہا ہے۔ اسے جلد مکمل  
 کریں اور کوئی مکمل ناول لکھیں ٹاپلینز۔

پیاری بہن! آپ کی معلومات بالکل درست ہیں۔ عصر  
 کی نماز کے بعد کوئی سجدہ جائز نہیں یعنی عصر کی نماز کے بعد  
 مغرب تک کوئی نفل نماز نہیں پڑھنا چاہیے۔ یہ سہواً  
 لکھا گیا۔ ہمیں اس کی تصحیح کرنا چاہیے۔ یہ ان اکثر  
 پروف پڑھتے ہوئے نظر چوک جاتی ہے اور اس طرح کی  
 غلطیاں ہو جاتی ہیں۔

آپ کی بسن فرحین خورشید کو مسز فرحین احتشام بننے پر  
 مبارک باد! آپ ان سے کہیں کہ شعاع کے ساتھ ساتھ وہ  
 دوبارہ لکھ دیں ویسے بھی وہ اب مسز فرحین احتشام بن گئی  
 ہیں۔ زندگی میں تبدیلی کے ساتھ ساتھ معاملات بھی  
 تبدیل ہوئے ہوں گے۔  
 شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

عاتکہ عامر۔ کراچی سے شریک محفل ہیں لکھا ہے  
 مارچ کا شعاع اچھا تھا نمل، ایک تھی مثال اور آب  
 حیات یقیناً "زبردست" تحریریں ہیں پلیز رخسانہ جی سے  
 کہیں کہ وہ مثال اور واقعہ کو ملا دیں۔ میں ان کی یہ پہلی  
 تحریر پڑھ رہی ہوں تو پلیز اس کے علاوہ نمل ایک طرح سے  
 فلمی کہانی ہے پر مزہ دیتی ہے اب حیات سوپر ڈوپر ہٹ ہے



عروج مغل نے للہ ٹاؤن سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

سلام عرض ہے کہ باقی شعاع پر تبصرہ بعد میں، ابھی صرف "یارم" پر تبصرہ کرنا ہے۔ میں شعاع میں خط لکھواں اور نمبر احمد کا ذکر نہ ہو، یہ تو ممکن ہی نہیں۔ نمبر احمد ایک ایسی رائٹر ہے جسے میں استاد کا درجہ دیتی ہوں۔ روحانی استاد۔ سمیرا حمید اور "یارم" سمیرا حمید نے میرے سامنے لکھنا شروع کیا ہے۔ یہ ایسی رائٹر ہیں جنہوں نے اپنا کیریئر ہی پیک سے شروع کیا ہے۔ انہوں نے پڑھا ہے بہت پڑھا ہے اور اب اگلے لکھی ہیں تو لکھنا شروع کر دیا ہے۔ یہ جملے میں نے کہیں پڑھے تھے اور مجھے ان پر بالکل صادق لگے ہیں۔

ج۔ پیاری عروج اسمیرا حمید اور نمبر احمد تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچا رہے ہیں۔ آئندہ تفصیلی تبصرہ کے ساتھ شرکت کیجئے گا۔

پارس ہنت زاہدہ لکھتی ہیں

میری موست فیورٹ رائٹر... نمبر احمد ہیں۔ ان کے لیے تو میرے پاس لفظ ہی نہیں ہیں نا۔ سمیرا حمید بھی بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔ ان کا یہ ناول "یارم" بہت ہی فٹنٹک تھا۔ بہت بہت مبارک باد جی... اتنا زبردست ناول تخلیق کرنے پر۔ "یارم" ہی پڑھا ہے اب تک۔ باقی رسالہ پڑھنے کی ہمت نہیں ہوئی، ابھی تک اس کے سحر میں جو جکڑے ہوئے ہیں اب تک تمام کردار ہی بہت اچھے تھے۔ مجھے کارل کا کردار بہت پسند آیا ہے۔ یہ ناول بھی برسوں شاید تاحیات "جنت کے پتے" اور "پیر کامل" اور "مصحف" کی طرح ہمارے دلوں میں زندہ رہے گا۔ ہنت حمید مجھے تو لگتا ہے کہ آپ واقعی ہی ساحرہ ہیں۔

پارس اشعاع کی بزم میں خوش آمدید! اتنی کم عمری میں اتنا اچھا لکھنا خدا داد صلاحیت ہے اور بہت کم لوگوں کو ملتی ہے۔

ہات کہ دیکھنے اور امیجن کرنے میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ اس لیے وہ تمام رائٹرز جو آج کل غیر روایتی کہانیاں لکھنے کے چکر میں کہانی کو حقیقت بالکل سے دور لے جاتی ہیں اور لگتا ہے جیسے یہ ناول زمین کے بجائے مریخ پر بیٹھ کر لکھا گیا ہے، یعنی ناقابل تصور۔ وہ یہ بات ذہن میں رکھا کریں کہ ہم زمین پر رہتے ہیں اور وہ بھی پاکستان میں سحر ساجد، فرح بخاری اور صوفیہ چشتی میری فیورٹ رائٹر ہیں۔ ج۔ پیاری ندا اسمیرا حمید اور نمبر احمد کا شمار اس وقت ہماری مقبول ترین مصنفین میں ہوتا ہے۔ خط لکھنے کا شکریہ۔

## قارئین متوجہ ہوں!

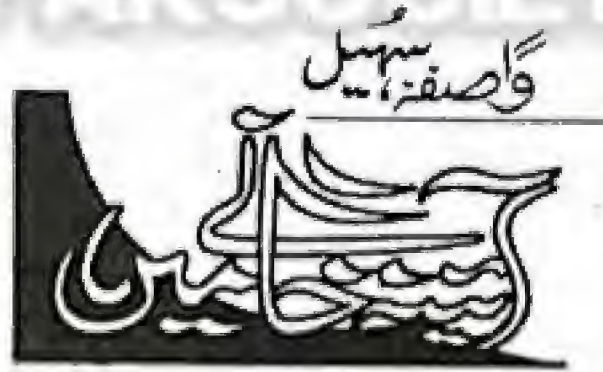
- 1- ماہنامہ شعاع کے لیے تمام سلسلے ایک ہی لفافے میں بھجوائے جاسکتے ہیں، تاہم ہر سلسلے کے لیے الگ کاغذ استعمال کریں۔
- 2- اگلے سالے ناول لکھنے کے لیے کوئی بھی کاغذ استعمال کر سکتے ہیں۔
- 3- ایک سطر بھراؤ کہ خوش خط لکھیں اور سطر کی پشت پر یعنی سطر کی دوسری طرف ہرگز نہ لکھیں۔
- 4- کہانی کے شروع میں اپنا نام اور کہانی کا نام لکھیں اور اختتام پر اپنا مکمل ایڈریس اور فون نمبر ضرور لکھیں۔
- 5- مسودے کی ایک کاپی اپنے پاس ضرور رکھیں، ناقابل اشاعت کی صورت میں تحریر واپس ممکن نہیں ہوگی۔
- 6- تحریر روانہ کرنے کے دو ماہ بعد صرف پانچ تاریخ کو اپنی کہانی کے بارے میں معلومات حاصل کریں۔
- 7- ماہنامہ شعاع کے لیے اگلے سالے، خط سلسلوں کے لیے انتخاب، اشعار وغیرہ درج ذیل پتے پر جبری کروائیں۔

ماہنامہ شعاع

37- اردو بازار کراچی

ماہنامہ خواتین ڈائجسٹ اور ادارہ خواتین ڈائجسٹ کے تحت شائع ہونے والے پرامن ماہنامہ شعاع اور ماہنامہ کنک میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی لی وی کاپی یا ڈراما یا فلمی کاپی اور سلسلہ وار قسط کے کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے پیشتر سے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ صورت حال ادارہ قانونی کارروائی کا حق رکھتا ہے۔





پسند

شمعون عباسی کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں اپنی عمدہ اداکاری کی وجہ سے شمعون عباسی نئے فلسازوں کی اولین پسند ہیں۔ آج کل وہ اپنی فلم گدھ اور دیبل کی تیاریوں میں مصروف ہیں۔ اب ہدایت کار بلال لاشاری نے انہیں اپنی فلم ”مولا جٹ 2“ میں لے لیا ہے۔ (کوئی اور موضوع نہیں ملا جو...) اس سے پہلے اس فلم میں حمزہ علی عباسی، صنم جنگ (کیا۔ حمزہ علی عباسی اور صنم جنگ اور جٹ؟) اور عدنان جعفر کے ناموں کا اعلان کیا گیا تھا۔ اب اس لسٹ میں شمعون بھی شامل ہو گئے ہیں یہ اطلاع نہیں مل سکی کہ شمعون اس میں جٹ بنیں گے یا ”نوری نت“ (ہمارا خیال ہے کہ وہ اس میں ”نوری نت



نقصان

اپنے بچوں کو چیونگم کھانے سے روکے، کیوں کہ طبی ماہرین کہتے ہیں کہ چیونگم کے اجزاء ہمارے خون میں جذب ہو کر متعدد امراض کا باعث بنتے ہیں۔ اس میں پانچ اجزاء شامل کیے جاتے ہیں جو کہ صحت کے لیے انتہائی مضر ہیں۔ ماہرین کے مطابق چیونگم چبانے سے جو جسمانی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ ان میں سے بیشتر کی وجہ اسپہارٹیم ہے جو چیونگم میں مٹھاس پیدا کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ مادہ زہریلی خاصیت رکھتا ہے۔ جس کی وجہ سے اعصابی بیماریاں بھی پیدا ہو جاتی ہیں۔ چیونگم میں شامل بی ایچ ٹو کی زیادتی جگر، گردوں کی بیماری پیدا کرتی ہے۔ اسی طرح چیونگم میں شامل باقی تین اور اجزاء سینے کی جلن، بد ہضمی اور الرجی کے ساتھ ساتھ دے کے مرض میں مبتلا کر سکتے ہیں۔





دنیا سے جائیں تو دنیا میں ان کی شخصیت کو یاد رکھا جائے وہ ایک محب وطن سعودی خاتون ہیں۔ وہ چاہتی ہیں کہ سعودی عرب کے بارے میں جو غلط اور منفی پروپیگنڈہ پھیلا ہوا ہے اسے میڈیا کے ذریعے درست کریں۔

### گود بھرائی

لیجئے جناب، بہروز سبزواری دادا بنے تو جاوید شیخ نے بھی نانا بننے کی تیاری کر لی۔ جی ہاں ان کی بیٹی مول شیخ اپنی زندگی کی سب سے بڑی خواہش پوری ہونے پر بہت خوش ہیں اس بات کا اعلان انہوں نے ایک گرینڈ گود بھرائی کی رسم میں کیا جس میں بہت سارے فنکاروں نے شرکت کی اور فنکار گھرانے کی اس تقریب میں تھیم پروڈیوٹنگ کی گئی (جی ہاں پیسوں کے چوٹیلے ہیں یہ سب) اس تقریب کو دیکھ کر گود بھرائی کے بجائے کسی فیشن شو کا گمان گزرتا تھا (ایک ایسے ملک میں جہاں مٹھی میں بھوک سے بچے مر رہے ہیں، ایک آنے والے بچے کا اس طرح استقبال...) جہاں پر ہونے والے بچے کی خالائیں اور پھوپھیاں بھی ایک خاص طرز کے کپڑے پہنے اپنی محبتوں کا اظہار کرتی نظر آئیں۔ ہماری دعا میں مول اینڈ فیملی کے لیے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کی خوشی کو قائم دائم رکھے۔



”کا کردار کریں گے“ خیر وہ اس میں جو بھی ہمیں اور ان کے پرستاروں کو امداد ہے کہ وہ اپنا کردار انتہائی خوب صورتی سے ادا کریں گے۔

### حیرت

ارمنا خان کو آپ آج کل ڈراما سیریل ”عشق پرست“ میں دیکھ رہے ہیں (اور دیکھ کر سرپیٹ رہے ہوں گے کہ کیا ہمارے یہاں فنکاراؤں کا کال پڑ گیا یا ساری کی ساری بھارت کو ”پیاری“ ہو گئیں) جو ارمنا خان کینیڈا میں پیدا ہوئیں اور یو کے کے بعد یو اے ای میں ہی پکی بڑھیں۔ ارمنا ان دنوں دو فلموں میں بھی کام کر رہی ہیں۔ جن میں ایک تو ہمایوں سعید کی ”بن روئے“ ہے، دوسری فلم ”یلغار“ ہے جس میں وہ بلال اشرف کے ساتھ آ رہی ہیں۔ ارمنا خان اس بات پر بہت خوش ہیں کہ وہ مسز عمران خان (بھئی وہی دھرنے والے) یعنی رجحام خان کی پروڈکشن میں بننے والی ایک فلم میں بھی مرکزی کردار کر رہی ہیں۔ رجحام خان کا یہ پہلا فلمی پروجیکٹ ہے جسے وہ عمران کاظمی (یعنی عمران ہی ہو چاہے خان یا کاظمی...) کے ساتھ مل کر کر رہی ہیں۔ یہ ایک رومینٹک کامیڈی فلم ہے۔ (عمران خان... کی بیگم... فلم... بنا رہی ہیں؟ اور وہ بھی رومینٹک... اور کامیڈی حیرت ہے بھئی۔)

### مشن

جدہ سے تعلق رکھنے والی پہلی خاتون فلمساز سمیرا عزیز جن کے والدین پاکستانی تھے تاہم وہ سعودی شہری ہیں، بھارت میں سعودی پروڈکشن ہاؤس کے ہنر مند تیلے فیچر فلم بنا رہی ہیں۔ سمیرا عزیز کہتی ہیں کہ اگر وہ چاہتیں تو ان کے لیے مشکل نہ تھا کہ وہ عام سعودی خواتین کی طرح عیش و عشرت سے بھری زندگی میں رنج بس جاتیں۔ رات بھر سیلیوں سے کپیں لگاتیں اور دن بھر سویا کرتیں، خریداری اور سیر و سیاحت میں وقت صرف کرتیں۔ لیکن ان کو ایک مشن کے ساتھ زندگی گزارنا پسند ہے۔ کہ جب وہ اس



شعار کے پچھلے شمارے میں ایک قاری بہن نے تحریروں میں ہندی الفاظ کی شمولیت پر اعتراض کیا تھا۔ ساتھ رضا نے اس مضمون میں اپنا نقطہ نظر واضح کیا ہے۔

## اردو ہے جس کا نام ساتھ رضا

جس واقعہ کا ذکر کیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اردو کی بنیاد حضرت نظام الدین اولیاء کے حکم پر رکھی گئی۔ مندر ہر دو لکھتا ہے۔

”ایک رات حضرت محبوب الہی نے اپنی مجلس خاص میں امیر خسرو خواجہ حسن بھڑی خواجہ سید محمد ان کے بھائی خواجہ سید موسیٰ اور اپنی بہن کے پوتے خواجہ سید رفیع الدین ہارون میرے ہم وطن سب بھل دیو، چیتل دیو، سیٹل دیو اور مجھے طلب کیا۔ پھر جب لوگ جمع ہو گئے تو ارشاد فرمایا۔

”تم سب مل کر ایک ایسی زبان تیار کرو جو ہندوستان کے اپنے اور باہر کے آئے ہوئے مسلمان استعمال کریں تاکہ تمام لوگوں کو آپس کی بات چیت اور لین دین کے معاملات طے کرنے میں آسانی ہو۔ حضرت امیر خسرو اور حضرت خواجہ سید محمد نے بیک زبان عرض کیا۔

”ہم دونوں مخدوم کے حکم پر عمل کر رہے ہیں۔“ امیر خسرو نے مزید عرض کیا۔ ”میں بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے ایک مختصر کتاب تحریر کر رہا ہوں۔ جس کا نام خالق باری تجویز کیا ہے۔“

”اس کتاب کا کچھ حصہ سناؤ۔“ حضرت نظام الدین اولیاء نے حضرت امیر خسرو کو حکم دیا۔

حضرت امیر خسرو نے اپنی اس منظوم کتاب خالق باری کے اشعار پوروں مرشد کو سنائے۔ حضرت محبوب الہی نے ان اشعار کو پسند کرتے ہوئے ارشاد فرمایا۔

”بہت مفید چیز ہے مگر ہندی زبان میں ایسے اشعار بھی لکھو جنہیں لوگ گایا کریں۔“

کسی دانا کا قول ہے اپنے کام سے کام رکھنا چاہیے۔ اور عام بول چال میں کہوں تو پرانے پھڑے میں ٹانگ نہیں اڑانی چاہیے۔ مگر کیا سمجھئے کہ سارا جہاں کا اردو ہمارے جگر میں ہے۔ اسی لیے جگر چھلنی ہے دل گھبرا رہا ہے۔

کچھ قارئین کہتی ہیں اردو کا جنازہ جا رہا ہے۔ جی ہاں۔

ہماری کچھ بہنوں کو لگتا ہے خدا نخواستہ اردو مر رہی ہے۔ میری پیاریوں اردو کیسے مر سکتی ہے۔ جب تک آپ جیسی پڑھنے والی موجود ہیں۔ اور ہم جیسی (ناچیز) لکھنے والیاں اردو کیسے مر سکتی ہے۔ ہم بھلا مرے دیں گے۔ کہ اردو مرنے سے تو ہمارا (لکھنے والیوں کا) تو وہی حال ہو گا۔ جو پرانے ہندو رسم و رواج کے مطابق پتی کے ساتھ پتی کو بھی ستی کر دیا جاتا تھا۔ یعنی اردو کی موت ہم سب کو بھی چتا پر لا بٹھائے گی کہ۔

ہم سب خشم ہو جائیں گی اور بقول شاعر  
مڑا ہمیں تو اور کوئی کام بھی نہیں آتا  
میرے اس مکتوب کا ہرگز یہ مقصد نہیں کہ میں لکھنے والیوں کے حق میں بیان دوں گی کہ وہ ہندی کے الفاظ دھڑلے سے استعمال کرتی رہیں اور احتجاج پر قطعاً ”کان نہ دھریں۔“ (ان کی اتنی ہمت۔)

مگر میں کچھ حقائق کو بیاں کرنا چاہتی ہوں۔ اور حقائق بھی کیا بس کچھ غلط فہمیاں ہیں اور تاریخی تناظر میں اردو کی تاریخ بس۔

اردو زبان کی ابتدا کے بارے میں کئی روایات مشہور ہیں لیکن مندر ہر دو نے اپنے دوتاہے میں



چھاپ تلک سب چھین لی موسے لہنوں ملائے  
کے۔ (امیر خسرو)

(جہی ایک نظر کا یہ اثر ہے کہ تو نے بت پرستی کے  
سارے نشانوں کو مٹا ڈالا۔)

اس کے بعد حضرت شیخ نے دوسرے لوگوں کو  
مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

”آج کل ہماری ”فارسی“ اور امیر خسرو کی ”ترکی“

زبان کے ساتھ ہندوؤں کی بول چال کے بہت سے

الفاظ مل گئے ہیں اور اب لوگ اپنے گھروں اور محفلوں

میں ہندی کے الفاظ استعمال کرنے لگے ہیں۔ لیکن

بعض حضرات ایسے بھی ہیں جو فارسی، عربی اور ترکی

زبانوں میں ہندی کی آمیزش نہیں چاہتے اس لیے

انہیں سمجھانا چاہیے کہ ان کا اور حکومت کا فائدہ اسی

میں ہے کہ ہندوستانیوں کو اپنے دل کی بات سمجھا سکیں

اور خود ان کے دلوں کی حالت کو سمجھ سکیں۔ اور یہ

جب ہی ہو گا کہ وہ ضد چھوڑیں۔ اور اپنا مقصد حاصل

کرنے کے لیے ہندی بول چال کو فروغ دیں۔

یہ 636ء سے 725ء تک کے واقعات ہیں اور

الحمد للہ اب ایسی صورت حال نہیں کہ دنیا گلوں

و بلج بن چکی ہے۔ چیزیں مختصر سے مختصر ہو چکی ہیں۔

ماوی جائیں بھی اور غیر ماوی بھی۔ بکے جتنا بڑا ریڈیو

اب انگلی کی پور برابر کان میں گھسا ہے۔ مجھے تم سے

محبت ہے۔ جیسا ہماری بھر کم جملہ Love You

I سے سٹ کر I-L-U ہو گیا ہے۔

میں خود مسجج لکھتے ہوئے آپس کی انگلی

Ofc لکھتی ہوں ناول کو Nve لکھتی ہوں۔

(اور اس کے لیے لکھ رہی ہوں)

خیر یہ موضوع بحث نہیں۔

ہم سب کو ذہنی روشن خیالی اور مصیبت کے منفی

اثرات سے بچ کر چلنا ہو گا۔

لکھاری انگلی کے الفاظ کا استعمال کرے۔

ہکسپنڈ اور ملٹن کی بات کرے تو بہت پڑھا لکھا

کھلائے گا۔ درجہ سب سے اوپر۔

لکھاری عربی تشبیہات لکھے تو زبان دان۔

فارسی لکھے تو علم دان۔

علاقائی زبانوں کا تڑکا لگا دے تو قدردان۔ اور ہندی

لکھیں تب اگال دان۔

سفال گر میں می رقم پڑھ کے ہم سرد خستے ہیں۔

می رقص کیا پاکستان میں بولی جانے والی اردو ہے۔

قوی ترانے کے الفاظ میں سے ترکی زبان کے لفظ

نکال دیں تو پیچھے صرف سالتے کھاتے بچ جاتے ہیں۔

اب گالیں۔

جنوبی ایشیاء میں بولی جانے والی بیشتر زبانوں کا منبع

قدیم سنسکرت ہے۔ چھٹی میں لے کر اردو کو چھان

لیں۔ خالص اردو کے نام پر خالی ہاتھ رہ جائیں گے۔

پریم چند اردو کے ناول نگار، السانہ نگار بہت بلند

مرتبہ۔ دہات اور ہندو گھرانوں کی زبان استعمال کرنے

میں انہیں ملکہ حاصل تھا۔

محمد عظیم اللہ خان نے ہندی کی بحر میں لے کر

انہیں نئی نئی شکلیں دیں اور شاعری کی موسیقیت میں

اضافہ کیا۔

مجھے ہیبت کایاں کوئی پھل نہ ملا

میرے جی کو یہ آگ جلا سی گئی

(وقت اور جگہ کی شدید ترین کمی۔ کاش میں یہ

نظمیں غزلیں پوری لکھ سکتی)

اگر خواتین شعاع کی قارمین کا دل صفا کرنے پر

آجاؤں تو اردو اختیاری کی کتاب سے یہ اور اوراق پھاڑتی

ہوں۔ اردو کی کتاب میں ہندی، بھوں اور تشبیہات کا

کیا کام ہے کتاب آدمی رہ گئی۔ ہندی کے بوجھ سے

آزاد۔ جلد میں جمولتے چند اوراق۔

ورق پھاڑنے پر ہی آئی ہوں تو نسخہ ہائے وفا کا صلہ

533 بھی نکال دیتے ہیں۔

موری ارج سنہ (نذر خسرو)

چاہے وہ آئیں یا نہیں آئیں

آگھیں موند کے نٹیل دیکھیں



اب اور کیا لکھوں، حالانکہ اتنا کچھ ہے کہ چناؤ مشکل ہے۔ میرے اس مکتوب کا ہر گز یہ مقصد نہیں کہ میں ہندی لکھنے والوں کی ہمت بربھاری ہوں کہ لگے رہو۔ قطعی نہیں۔ میری چھوٹی بیٹی بھی اس منحوس مارے چھوٹے بھیم کو دیکھ دیکھ کر ”سنے“ ہی دیکھتی ہے۔ تب میں اسے خواب بتاتی ہوں۔ اس کے جملوں پر ہندی کے گہرے اثرات ہیں۔

مگر خرابی کی جڑ کو پکڑنے کی ضرورت ہے۔ شاخوں سے کیا جھونکا۔ ذرا دل پر ہاتھ رکھ کے بتائیے۔ پاکستان میں میڈیا کی ترقی کا ڈھول پیٹا جا رہا ہے۔ اتنے ڈرامے بن رہے ہیں کہ دو دو سال کے فاصلے پر اداکار دستیاب نہیں۔ ایک سے ایک نامور پروڈکشن ہاؤس اور مالکان کی گردن میں سرپا، کسی ایک نے بھی بچوں کے لیے سلیبس اردو میں کوئی ڈراما بنایا۔ نہیں ناں۔ اور خدا کی قسم یہ لائسنس لکھتے ہوئے میرا دل بھر آیا ہے۔ بچے پھر کیا کریں گے۔ چھوٹا بھیم دیکھیں گے ناں۔ ہاکی میو، گجراتی زبان بولجی۔

ہم صرف ڈائجسٹ رائٹرز کو مورد الزام کہے شہر سکتے ہیں جو صرف اود صرف لکھنے کی روانی (ماشاء اللہ) لکھتی چلی جاتی ہیں۔ میرا نہیں خیال کہ ہماری کوئی بھی لکھنے والی بہن شعوری کوشش یا کسی خفیہ منصوبے کے تحت ہندی کا ترکا لگاتی ہوگی۔ جب سائرہ رضائری اوچھمگوری لکھتی ہے، تب امرکلا ہندی ہی بولے گی۔

اب امرکلا کلام غالب بزبان ضیاء محی الدین سنانے سے تو رہی۔

جس طرح مال کی زکوٰۃ ہوتی ہے ایسے ہی جسم کی زکوٰۃ روزہ ہوتی ہے۔ ایسے ہی ہنر کی بھی زکوٰۃ نکالی جاسکتی ہے۔ میں رومانٹک بلکی پھلکی معاشرتی کہانی لکھتی ہوں۔ لیکن میں بلدیہ فیکٹری کے حادثے سے ہی متاثر ہوتی ہوں۔ تھر کا غم بھی رلاتا ہے مجھے سانحہ پشاور بھی میرے دل کو لہو کرتا ہے پھر اس عالم میں جب قلم اٹھاتی ہوں تب میں اسے اپنے ہنر کی زکوٰۃ

کہتی ہوں۔ تو کیا اسی سوچ کو ذہن میں رکھ کر چمنلز اور پروڈکشن ہاؤسز، رائٹرز اور اداکار کوئی کام نہیں کر سکتے۔ جس سے قوم کے بچوں کی تربیت ہو سکے۔ مگر نہیں ہم نے ”سب لی وی“، ”پوگو“ اور کارٹون نیٹ ورک پر بچوں کو لگادیا ہے۔ اپنے ہنر اور کام کی بھی زکوٰۃ نکالنی چاہیے کہ کسی نیک کام میں لگایا صرف مال بنایا۔؟

اردو بہت سلیس اور خوب صورت زبان ہے۔ اور دن بدن نکھرتی ہی جاتی ہے۔ ہماری گلیوں بازاروں میں پٹوری لنگوٹج نہیں بولی جاتی۔

تیرے کو آنے کا نہیں۔ میرے کو جانے کا نہیں، اے کیا بولتی تو۔ ہمارے بازاروں، راستوں گھروں، سکولوں میں تو بڑی شستہ اردو بولی جاتی ہے۔ اور اردو کی خوب صورتی سے کسے انکار ہے۔ ہم تو خود داغ کے طرف داروں میں سے ہیں کہ

اردو ہے جس کا نام ہم ہی جانتے ہیں داغ سارے جہان میں دھوم ہماری زبان کی ہے اور پھر مشہور فلمی شاعر گلزار کی اردو شاعری۔ بس بندہ دل پکڑ لے۔

ہو جس کی زبان اردو کی طرح میری شام رات، میری کائنات، وہ یار میرا چھیاں چھیاں

اور جاتے جاتے یہ بھی بتاؤں (مرے پہ سو درے) 2013 میں بی کام کے نصاب سے اردو کو نکال دیا کہ یہ غیر ضروری مضمون ہے۔

افسوس ناک خبر یہ بھی ہے کہ انگلش میڈیم اسکولوں کے نام پر ہمارے بچے اب اردو اسلامیات اور معاشرتی علوم میں سہلی لاتے ہیں۔

سو میں بھی ان ہی بہنوں کی حامی ہوں جو اردو کے لیے پریشان ہیں۔ مجھے بھی آغاز کی جگہ لفظ شروعات ناپسند ہے۔ کر کے اور لے کر کے کا فرق معلوم ہے۔ اور ناگوار گزرتا ہے۔ اور حتی الامکان کوشش کروں گی کہ آئندہ ایسا نہ ہو۔ لیکن لکھنے کی روانی میں ہمیں بعض اوقات بالکل پتا نہیں چلتا کہ کیا لکھ رہے ہیں۔ صحیح یا غلط، میرے ساتھ تو اکثر ایسا ہوتا ہے۔





”مجھے کپڑوں کا بہت شوق ہے، تو زیادہ فضول خرچی کپڑوں پہ ہی ہو جاتی ہے۔ مجھے چوڑی دار پاجامہ اور کرتا پسند ہے۔ گھر میں ابھی زیادہ تر یہی لباس پہنتی ہوں یا پھر جینز۔“

”دلی بہت ہیں آپ؟“

”نہیں۔۔۔ اس سے یہ نہ سمجھے گا کہ میں کھانے کے معاملے میں گنجوس ہوں۔ بھوک تو مجھ سے برداشت ہی نہیں ہوتی۔ بس قدرت مجھ پر مہربان ہے کہ وہ مجھے موٹا ہونے نہیں دیتی۔ کچھ لوگ ہوا کھا کے بھی موٹے ہو جاتے ہیں اور کچھ کھا کے بھی موٹے نہیں ہوتے تو میرا یہ ہی حساب ہے۔“

”عام زندگی میں کیا مزاج ہے آپ کا؟“

”تھوڑی سنجیدہ ہوں، شوخ و چٹیل ٹائپ کی لڑکی نہیں ہوں، زیادہ تقریبات میں جانا اور ہلا گلا کرنا مجھے پسند نہیں ہے۔ دوستوں کے ساتھ گھومنے پھرنے جاتی ہوں، مگر زیادہ نہیں۔“

”ہوں گٹھ۔ میرے خیال سے اب آپ لچ کر لیں۔“

”جی شکریہ۔“

منشا پاشا

”کیسی ہیں آپ؟“

”اللہ کا شکر ہے۔“

”ڈراڑیں میں آپ کی پر فار منس بہت عمدہ تھی۔“

”اچھا ریسانس ملا ہو گا؟“

”شکریہ۔ ریسانس بہت اچھا ملا۔ لوگوں نے

میرے کام کو کافی پسند کیا ہے۔“

”کہانی حقیقت سے قریب لگی؟“

”بالکل لگی۔ کیونکہ یہ ہمارے معاشرے کی جیتی

جاگتی کہانی تھی اور ”بے وفائی تیرے نام“ اس میں بھی

میرا کردار بہت اچھا ہے دیکھ رہی ہیں آپ؟“

”جی بالکل دیکھ رہی ہوں۔ عام ڈراموں سے

ہٹ کر آپ کا کردار ہے منفرد۔ اور مزید کام ہو رہا ہے؟“

”ہاں۔۔۔ اللہ کا شکر ہے۔ مگر میں ہر ڈرامہ سائن نہیں کرتی، تھوڑی سلیکشن ہوں، جو کردار دل کو چھوتا ہے، وہ ہی کرتی ہوں۔“

”ماشاء اللہ کافی ڈرامے کیے، مگر لوگوں کو زندگی اور میرے اپنے میرے سنے یاد ہیں کیوں؟“

”اچھا۔ میں تو سمجھتی ہوں کہ ایسا نہیں ہے شاید اس لیے کہ وہ میرے شروع کے ڈرامے تھے اور کردار بھی اچھے تھے، اس لیے یاد ہوں گے۔ میں تو کوشش کرتی ہوں کہ میرے سب ہی ڈرامے لوگوں کو یاد رہیں۔“

”آئندہ زندگی کے کیا پلان ہیں؟“

”لمبی پلاننگ نہیں کرتی، ایک تو زندگی کا بھروسہ نہیں، پھر وقت اور حالات کا بھی کچھ پتا نہیں ہوتا، تو اس سال کے لیے کچھ ڈرامے پلان کیے ہیں، کچھ سائن بھی کیے ہیں، تو بس یہ ہی کچھ ہے۔“

”کمرشلز بھی ساتھ ساتھ چل رہے ہوں گے؟“

”جی جی۔ کمرشلز کے لیے بھی چوڑی ہوں۔“

”سب کو لیں نہیں کرتی۔ بے شک پیسہ اچھا ملتا ہے، مگر سب کچھ پیسہ ہی تو نہیں ہوتا۔“





# مجموعہ کیکوان

## خالہ جیلانی

### اردی کے کباب

ضروری اجزا :

اردی  
پیار  
(باریک چوپ کر لیں)  
بیسن (بھون لیں)  
لال مرچ پاؤڈر  
نمک  
گرم مسالا پاؤڈر  
انار دانہ کھٹائی  
ہری مرچیں  
ہرا دھنیا  
تیل

ایک کپ  
ڈیڑھ چائے کا چمچ  
حسب ذائقہ  
آدھا چائے کا چمچ  
ایک ایک چائے کا چمچ  
تھوڑی سی (باریک کٹی ہوئی)  
آدھا کھنسی (باریک کٹا ہوا)  
تلنے کے لیے

ترکیب :

اردی کو ابال کر چھیل لیں اس کا بھرہ بنالیں  
'بھرتے میں پیاز'، 'لسن کٹا ہوا'، 'دو جوے'، 'بیسن'، 'لال  
مرچ پاؤڈر'، 'نمک'، 'گرم مسالا پاؤڈر'، 'پسی کھٹائی'، 'انار دانہ  
کٹا ہوا'، 'ہری مرچیں'، 'ہرا دھنیا' ڈال کر مکس کر لیں اب  
ان کی چھوٹی چھوٹی ٹکیاں بنا کر گرم تیل میں گولڈن  
ہونے تک تلیں۔ کھجپ کے ساتھ سرو کریں۔  
پرائے یا طہری کے ساتھ بھی کھا سکتے ہیں۔

### چکن دہی دھواں

اشیاء :

چکن  
دہی  
پیاز  
پیتا  
لال مرچ پس

آدھا کلو  
ایک پاؤ  
دو عدد  
دو کھانے کے چمچ  
دو چمچ

ہسارم مسالا  
نمک  
پسا ہوا دھنیا  
ہری مرچ

آدھا چائے کا چمچ  
حسب ذائقہ  
ایک کھانے کا چمچ  
تین سے چار

### آدھی کھنسی

ہرا دھنیا  
ترکیب :

چکن میں لسن، اورک، لال پس، مرچ، گرم مسالا،  
نمک، پسا ہوا دھنیا اور پیتا لگا کر ایک گھنٹے کے لیے رکھ  
دیں اور اس میں کوئلے کی دھونی دے دیں۔ پیاز کو تل  
لیں سنہرا ہونے پر اس میں گوشت ڈال دیں اور اس کو  
بھون لیں۔ جب گوشت گل جائے اور اس کا پانی خشک  
ہو جائے تو اسے سرونگ ڈش میں نکال لیں۔ دہی کو  
الگ سے پھینٹ کر اس میں چٹنی، بھر نمک ملا لیں اور  
اس کو بھنے ہوئے گوشت پر پھیلا دیں۔ پھر اس کے اوپر  
کٹی ہوئی لچھے دار پیاز، ہرا دھنیا ڈال کر حسب ذائقہ  
چاٹ مسالا اور ہری مرچ کاٹ کر ڈال دیں۔ چپاتی یا  
نان کے ساتھ نوش کریں۔

### اسٹریٹ مصالحہ بریانی

ضروری اجزا :

مرغی کا گوشت  
پیاز (سلائس کاٹ لیں)  
نمک

ایک کلو  
تین عدد  
ایک پاؤ  
دو کھانے کے چمچ  
ایک کھانے کا چمچ  
ایک کھانے کا چمچ  
دو کھانے کے چمچ  
حسب ذائقہ  
ایک ایک کپ

اورک، لسن پیسٹ  
حبابت گرم مسالا  
ذریہ  
دھنیا، سرخ مرچ پاؤڈر  
نمک  
تیل دہی



آلو بخارے

10-13 عدد

چاولوں کے لیے

چاول

ثابت گرم مسالا

نمک

کھانے کا زرد رنگ

ٹماٹر (سلاٹس کاٹ لیں)

پودینہ

اورک (جولین کٹ)

ہری مرچیں

ترکیب :

ایک کلو

ایک چمچ

حسب ذائقہ

حسب ضرورت

دو عدد

آدھا کپ

دو کھانے کے چمچے

چار سے پانچ عدد

کہ سب سے اوپر چاولوں کی تہہ ہونی چاہیے۔ اس کے اوپر ٹماٹر کے سلاٹس پودینے کے پتے اورک اور ہری مرچیں رکھ دیں۔ کھانے کا زرد رنگ پانی یا دودھ میں کھول کر چاولوں کے اوپر چھڑک دیں۔ پتیلی کا منہ تختی سے بند کر کے 20-15 منٹ تک دم لگا دیں۔ مزیدار اسٹریٹ مصالحہ بریانی رائتے کے ساتھ پیش کریں۔

## دہی چکن سینڈویچ

ضروری اجزاء :

دہی (چھینٹ لیں)

چکن (بون لیں)

ڈبل روٹی

کھیرا (درمیانہ)

ٹماٹر

آدھا کپ

آدھا کپ

آٹھ عدد

ایک عدد

دو عدد (باریک چوکور کاٹ لیں)

ہر ادھنیا (باریک کاٹ لیں) دو چمچے

ہری مرچ

سیاہ مرچ پاؤڈر

نمک

زیرہ پاؤڈر

ترکیب :

چکن اُبال۔ کر رشہ کر لیں۔ دہی میں چکن، کھیرا،

ٹماٹر، ہر ادھنیا، ہری مرچ، سیاہ مرچ پاؤڈر، نمک اور زیرہ

پاؤڈر ملا دیں۔ ایک سلاٹس لے کر اس پر یہ آمیزہ

لگائیں اور اوپر دوسرا سلاٹس رکھ دیں پھر چگون شکل

میں دو پس کاٹ لیں۔ اسی طرح تمام سلاٹس بنالیں۔

دہی چکن سینڈویچ تیار ہیں چائے کے ساتھ سرو کریں۔ یا بچوں کو لچ میں دیں۔

چاولوں کو آدھا گھنٹے کے لیے پانی میں بھگو دیں۔

پتیلی میں تیل گرم کر کے اس میں پیاز شامل کریں۔

پیاز کی رنگت سنہری ہو جائے تو نکال لیں۔ تلی ہوئی

پیاز، ٹماٹر اور دہی بلینڈ کر کے پیسٹ تیار کر لیں۔

بقیہ تیل میں اورک، لہسن پیسٹ ڈالیں۔ ہلکا سا

فرائی کر کے گوشت شامل کریں۔ گوشت کی رنگت

تبدیل ہونے لگے تو اس میں تین چھوٹی لاپچی، ایک

بڑی لاپچی، پانچ لونگس، آٹھ ثابت سیاہ مرچیں، ایک

انچ کا ٹکڑا دار چینی ڈال دیں۔ زیرہ بھی شامل کر دیں۔

پیاز اور دہی کا پیسٹ ڈال دیں سرخ مرچ پاؤڈر، ادھنیا

پاؤڈر اور نمک شامل کریں۔ گوشت گل جائے اور

گریوی تیار ہو جائے تو اس میں آلو بخارے شامل کر

کے چولے سے اتار لیں۔

چاول تیار کرنے کے لیے پتیلی میں پانی اٹھانے کے

لے رکھیں، ایک بڑی لاپچی، ایک ٹکڑا دار چینی، تین

لونگس، پانچ ثابت سیاہ مرچیں اور نمک شامل کر دیں

پانی ابل جائے تو چاول ڈال دیں۔ ایک کئی باقی رہ جائے

تو چاول نختیار لیں۔

ایک پتیلی لے کر اس کو ہلکا سا چکنا کر لیں۔ اس میں

تیار شدہ گوشت ڈالیں۔ اس کے اوپر چاولوں کی تہہ

لگائیں۔ اس کے اوپر دوبارہ گوشت کی تہہ لگائیں اس طرح تہہ در تہہ گوشت اور چاول بچا دیں خیال رہے







اور جہاں آرا کو دیکھتے ہوئے اس نے پھر کہا۔ ”مراد! روشن آرا، محی الدین اور تم! سب ہی تو میری آنکھوں کا نور ہیں۔ سب ہی تو میرے دل کا سرور ہیں، لیکن یہ نور۔“

پھر اس کے لبوں پر ہلکی سی ہنسی آئی۔

## بٹی کی محبت

لال قلعہ جس کی تفصیل کے سنگ سرخ صاحبزادے شاہجہاں کی عظمت و شوکت اور جاہ و جلال کی منہ بولتی داستان تھے۔ آج نہ جانے کیوں اور اس تھے اچانک نوبت شاہی کی آواز گونجی، قرنا نے صدا دی۔

”بے شک شاہ جہاں ہندوستان کا عظیم بادشاہ ہے۔ بے شک سلطنت مغلیہ دنیا کی عظیم سلطنت ہے۔“

”لیکن ادھر قرنا خاموش ہوئی اور ادھر ٹھون پکارا۔“

”اللہ اکبر۔“

اور شاہ جہاں نے علالت کے بستر پر کروٹ بدلتے ہوئے کہا۔

”خدا کی قسم! تو ہی سچا ہے۔ تو ہی عظیم ہے اور کبریائی تیری ہی چادر ہے۔ شاہ جہاں کی عظمت کا سفینہ دریا پر تیرنے والے ایک حباب سے زیادہ نہیں ہو۔ موج اچھلی اور حباب ٹوٹا۔“

جہاں آرا۔ اس کی ذہین و فہیم اور چیتی بٹی تھی۔ وہ اس پس منظر کو عقل کی نگاہ سے دیکھ رہی تھی جو شاہ جہاں کے لیے سوہان روح بن گیا تھا۔ وہ باپ کے قریب آگئی کہ شاید شفیق باپ کے دل کو ڈھارس دے سکے۔ لیکن آج تو شاہ جہاں اپنے سایہ سے بھی بدگمان تھا کہ اس کے جگر نے اس کے دل سے بغاوت کر دی تھی اور وہ محسوس کر رہا تھا کہ یہ انقلاب وقت ہے اور اس کا مقدر پلٹ چکا ہے۔

شاہ جہاں نے حسرت بھری نظر سے جہاں آرا کو دیکھا۔ شاہ جہاں کے لب تھر تھرائے۔ اس نے آہستہ سے زیر لب کہا۔ ”شریار!“ پھر ایک لمحہ کے لیے رکا۔

”ایسا لگتا ہے میری آنکھوں کی پتلیوں کو چھوڑ رہا ہے۔ دل کہتا ہے کہ سرور سے جگہ خالی ہے اور اسی خالی جگہ میں رنج و الم بھر گیا ہے۔ تم یہاں کیوں ہو۔ چلی جاؤ یہاں سے“ شاہ جہاں کی آواز بلند ہوئی۔

”کیا دیکھنا چاہتی ہو کہ شاہ جہاں کے پاؤں میں بجنے والی زنجیروں کا ترنم کیسا ہے۔“

جہاں آرا اچانک جھکی اور اس نے شاہ جہاں کے پاؤں پر سر رکھ دیا۔

”میرے لیے ان ہی تلوؤں کے نیچے بہشت پنہاں ہے۔ زندگی صرف اقتدار نہیں ہے، زندگی صرف دولت و ثروت نہیں ہے۔ کبھی بادشاہوں کو زندانوں سے رسوائی ملتی ہے۔ کبھی یوسفوں کو قید خانوں سے اعزاز ملا ہے۔ شاہ جہاں بھی اگر پاؤں میں بیڑیاں اور ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پہنے گا تو عبرت دنیا ہی سہی۔ صاحب اقتدار سے اقتدار چھین لینے کی ناروا کوشش سہی۔ شکست حق تو نہیں۔ ہزیمت شاہ جہاں تو نہیں۔ میں آپ کے ساتھ ہوں اور اس وقت تک آپ کے ساتھ ہوں کہ موت ان رشتوں کو توڑ دے جن میں فطرت نے باپ اور بیٹی کو عمر بھر کے لیے باندھ دیا ہے۔“

شاہ جہاں کے چہرے پر ایک رنگ آیا، اطمینان کا رنگ۔

اچانک باپ کے لرزے ہوئے ہونٹوں پر تبسم کی ایک لہر آئی۔ اس نے کانپتے ہوئے ہاتھ پھیلائے۔

”جان من! میری لاڈلی۔ آ اور میرے سینے سے لگ جا۔ ہم نہیں جانتے کہ قسمت ہمارے ساتھ کیا کھیل کھیل رہی ہے۔ ایک باپ کی محبت وہ تھی کہ بیٹا بیمار ہوا اور باپ نے دعا کی۔ ”اللہ! اس کی آنٹی مجھے



دے دے۔“ اور اللہ نے دعاسن لی۔ ”بیٹا صحت یاب ہو گیا اور باپ نے جان دے دی۔ ایک بیٹے کی محبت یہ ہے کہ باپ بیمار ہے اور وہ اس کی مزاج پر سی و عیادت کے لیے لوہے کی زنجیر لا رہا ہے۔ وہ باپ بھی ہمارے ہی خاندان کا تھا اور یہ بیٹا بھی ہمارے ہی خاندان سے ہے۔“

”آپ نے درست فرمایا۔ وہ ہمارے جدا مجد تھے اور ہم ان کی ذات پر ناز کرنے کا حق رکھتے ہیں اور۔“ جہاں آرا نے گردن جھکاتے ہوئے کہا۔ ”یہ بھی میرے ہی بھائی ہیں اور میرے لیے پاس ادب ہے کہ میں اپنے بھائیوں کے حق میں خاموش رہوں۔“

”اور یہ ان کا پاس ادب ہے کہ وہ ہمارے لیے زنجیریں لا رہے ہیں۔ انہیں شکایت ہے کہ ہمارا اقتدار دین کی راہ میں کمزور ہو گیا ہے۔ لیکن میری لاڈلی۔ یہ جامع مسجد میرے ایمان کی گواہ ہے۔ جب بھی موزن ماؤنہ میں اذان دے گا۔ شاہ جہاں آباد کی فضا میں اللہ اکبر کی آواز گونجے گی۔ جب بھی منبر پر خطبہ دے گا تو لوگ کہیں گے کہ وہ ایمان دار تھا، یہ مسجد اس کے ایمان کی گواہ ہے۔“

جہاں آرا نے گردن جھکالی۔

”کیا کہنا چاہتی ہو کہو۔ ہمارے کان تمہاری ہر بات سننے کی تاب رکھتے ہیں۔“

”میری ناچیز استدعا ہے کہ مجھے اجازت دی جائے کہ میں اپنے عزیز بھائی سے مل سکوں، پوچھ لوں کہ کیا ایک شفیق باپ کے لیے قید خانہ سے بہتر کوئی دوسری جگہ نہیں ہے۔“

”نہیں! ہماری غیرت کو یہ گوارا نہیں۔ ہم نہیں چاہتے کہ ہم رحم کی بھیک مانگیں۔ ہم نہیں چاہتے کہ ہم اپنے بیٹے کے سامنے ہاتھ پھیلائیں۔ اب تک آل تیمور کی یہ ریت رہی ہے کہ بیٹے باپ کے سامنے آتے تھے تو سر خرو ہو کر۔ لیکن اب ہماری آنکھیں یہ بھی دیکھنا چاہتی ہیں کہ باپ بیٹے کے سامنے جاتا ہے تو اپنے سر کے لہو میں ڈوب کر۔ بھائی بھائی کے سامنے

آتا ہے تو اپنے خون میں رنگا ہوا شہابی جوڑا پہن کر۔“

”نہیں۔ نہیں۔ خدا کی قسم ایسا نہیں ہو سکتا۔“

جہاں آرا کی آواز گلو گیر ہو گئی۔

”جان من! ایسا ہی ہوتا ہے۔ ایسا ہی ہو گا کہ اقتدار کی ایک نیام میں دو تلواریں نہیں رہ سکتیں۔ اب ہم شاہ جہاں نہیں ہیں۔ ایک قیدی ہیں تمہارے بھائی کے قیدی۔“

”لیکن آپ شاہ جہاں ہیں اور شاہ جہاں ہی رہیں گے۔ جب تک یہ لال قلعہ ہے۔ جب تک یہ جامع مسجد ہے۔ خدا کی قسم، سلطنت مغلیہ کی تاریخ میں آپ شاہ جہاں ہی رہیں گے۔ آپ کی عظمت ان پتھروں کی ایک لکیر ہے جو کبھی مٹ نہیں سکتی۔“

اچانک بادشاہ خاموش ہو گیا۔ فوج کے افسروں نے اسے اپنے حلقہ میں لے لیا، ایک فرمان۔

”اب آپ ہمارے قیدی ہیں۔“

”بے شک تم ہمارے جسم کو اسیر کر سکتے ہو، لیکن یاد رکھو کہ ہمارا دل ہماری روح، ہمارا دماغ تمہارا اسیر نہیں ہے۔“

جہاں آرا یاس و حماں کی ایک تصویر بنی کھڑی تھی۔ باپ قیدی بنا تو وہ آگے بڑھی، کیا ہمارے بادشاہ کی اجازت ہے کہ میں اپنے باپ کے ساتھ قید میں رہوں۔“

”ہاں اجازت ہے۔“ ایک افسر نے جواب دیا۔

اور جہاں آرا نے اپنے ہاتھ سے اپنی کلائیوں میں جھٹکڑی ڈالی۔ اپنے پاؤں میں بیڑی پہن لی۔

اس نے سجدہ کیا۔ ”اے خدا! شکر ہے مجھے اطاعت پدری کی توفیق دے کہ میں اس راہ سے صبر کے ساتھ گزر جاؤں۔“

اور وہ اس راہ سے صبر ہی کے ساتھ گزر گئی۔ تاج محل نے اگر شاہ جہاں کو خلعت جاوہانی دے دیا ہے تو اطاعت پدری نے جہاں آرا کو بھی زندہ جاوید بنا دیا ہے، جب بھی شاہ جہاں کا نام دنیا کی زبان پر آئے گا تو جہاں آرا کی وفا بھی یاد آئے گی۔





# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو پیسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریزیوم ایبل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✧ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

**We Are Anti Waiting WebSite**

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

# WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



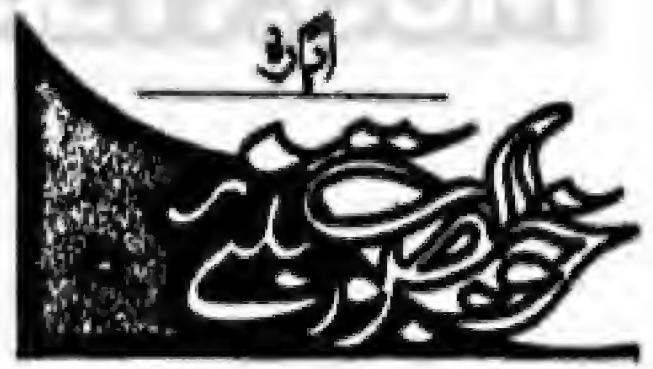
Like us on  
Facebook

[fb.com/paksociety](https://fb.com/paksociety)



[twitter.com/paksociety1](https://twitter.com/paksociety1)





☆ چکنی جلد پر پاؤڈر ہیں میک اپ مناسب رہے گا۔  
☆ لپ اسٹک کو ہونٹوں پر پھیلنے سے بچانے کے لیے فاؤنڈیشن ہونٹوں پر بھی لگالیں۔

### میک اپ

سب سے پہلے آنکھوں کے نیچے اور ناک وغیرہ کے دھبوں کو چھپانے کے لیے کنسیلر لگالیں۔ ٹھوڑی اور ناک کے دائیں بائیں حصے پر کنسیلر لگانا مت بھولے گا۔ یہ تمام حصے چہرے کے دیگر حصوں کے مقابلے میں ذرا گہرے رنگ کے حامل ہوتے ہیں۔ اب اپنی جلد سے ایک شیڈ گہرا فاؤنڈیشن چہرے پر اچھی طرح لگالیں۔ کان اور گردن پر فاؤنڈیشن لگانا مت بھولے گا۔ چہرے پر پف پاؤڈر لگا کر ذرا اندر پاؤڈر برش کی مدد سے جھاڑ لیں۔ اب رخساروں پر ہلکا سا بلشر لگالیں ساتھ ہی ٹھوڑی اور کانٹیووں پر بھی بلشر کے پلکے سے اسٹروک لگالیں۔ بھنوووں پر پمپل لگانے سے قبل دیکھ لیں کہ اچھی طرح بنی ہوئی ہیں یا نہیں؟ پمپل لگانے کے بعد لباس کے رنگ سے میچ کرتا ہوا یا پھر پمپل کمر آئی شیڈ لگالیں۔ آپ آئی شیڈ کی جگہ آئی پمپل بھی لگا سکتی ہیں پھر آئی لائنز لگالیں۔ لائنز بہت احتیاط سے لگائیں۔ اب مسکارا لگائیں۔ پہلے مسکارے کا ایک کوٹ سوکھنے دیں پھر دوسرا کوٹ لگائیں۔ ہونٹوں کی آؤٹ لائن لپ پینسل سے سنوار کر برش کی مدد سے لپ اسٹک لگالیں۔ ٹشو ہونٹوں میں دھانے کے بعد زائد لپ اسٹک صاف ہو جائے گی۔ بچے آپ کا میک اپ مکمل ہے۔ مہمانوں کو خوش آمدید کہنے کے لیے تیار ہو جائیے۔

لپ اسٹک میک اپ کا فنشنگ لیج ہوتا ہے۔ لپ اسٹک کا رنگ چہرے پر موجود دوسرے رنگوں کا آپس میں میلان بناتا ہے اور یوں چہرہ زندگی سے بھرپور لگنے لگتا ہے۔

### فیشل

سب سے پہلے کولڈ کریم سے خوب اچھی طرح مساج کر لیں۔ اتنا مساج کر لیں کہ چہرہ سرخ ہو کر دھکنے لگے۔ اب کسی برتن میں ابلتا ہوا گر مہانی لے کر چہرے اور گردن کو تولیے سے خوب اچھی طرح ڈھانپ کر بھاپ لیں۔ خیال رہے کہ برتن ذرا فاصلے پر ہونا ضروری ہے۔ جب ہینڈ آجائے تو تولیے سے چہرہ صاف کر لیں۔ فیشل کے ذریعے آپ کے چہرے کے مسامات میں پھنسا میل آسانی سے صاف ہو جائے گا۔

### ماسک

سب سے پہلے اپنی جلد کی مناسبت سے ماسک کا انتخاب کر لیں، مثلاً خشک جلد کے لیے مونسجھرا ائزر ماسک، چکنی جلد کے لیے کلہنڈنگ ماسک اور نارمل جلد کے لیے کوئی بھی ماسک منتخب کیا جاسکتا ہے۔ چہرے پر ماسک اس طرح لگائیں کہ آنکھوں اور ہونٹوں کا حصہ خالی رہے۔ ماسک خشک ہو کر سکڑنے لگے تو کھیرے کے دو قتلے آنکھوں پر رکھ لیں۔ اچھی طرح ماسک خشک ہو جائے تو پانی سے چہرہ دھو کر اسکن ٹانک لگالیں تاکہ کھلے مسام بند ہو جائیں پھر مونسجھرا ائزرگ لوشن سے اچھی طرح مالش کریں۔ چہرہ صاف ہو گیا۔ اب میک اپ کی تیاری کرتے ہیں لیکن اس سے پہلے چند ٹپس ملاحظہ کیجئے جو آپ کے کام آئیں گے۔

☆ چہرے اور ہاتھوں کے نشان کو کنسیلر کے ذریعے چھپالیں۔

☆ چکنی ہونی اور روکھی جلد پر میک اپ سے پہلے روغن بادام لگالیں پھر آئس کیوب کا مساج کریں۔ اب چہرے کو پونچھ ڈالیں۔ چہرہ میک اپ کے لیے تیار